جلد دوم

آداب فہم قرآن

سید جواد نقوی

مرکز تحقیقات اسلامی بعثت
متاب پبلیکیشنز

بسم الله الرحمن الرحيم

آدابِ فہمِ قرآن

(جلد دوم)

نام کتاب: آدابِ فہمِ قرآن

مؤلف: حجۃ الاسلام والمسلمین سید جواد نقوی

ترتیب: مرکز تحقیقاتِ اسلامی بعثت

ناشر: متاب پبلیکیشنز

اشاعت اول: جمادی الاول ۱۴۳۳ھ (مئی 2012 عیسوی)

تعداد: ۲۰۰۰

جملہ حقوق متاب پبلیکیشنز کے لئے محفوظ ہیں

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آداب فہم قرآن آج لباس طباعت میں ملبوس پیروان قرآن کریم کی خدمت میں حاضر ہے،اس کا ماجرا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے طالب علم کی حیثیت سے بارگاہِ کتابِ الٰہی میں حاضری کی توفیق تو نصیب ہوئی لیکن یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ نگاہیں تو کلامِ الٰہی کے نورانی الفاظ کی زیارت سے منور ہیں، سماعتیں خوش الحان قاریوں کی آواز سے لطف اندوز، زبانیں تلاوتِ کلامِ وحی سے معطر، حافظے آیات قرآن سے مملو اور محفلیں ذکر کتابِ خدا سے مزیّن جبکہ دل نورِ کلامِ الٰہی سے خالی ہیں۔

اس محرومیت اور خلاء پر بے تابی و بے چینی نے اسباب محرومیت تلاش کرنے کی جستجو ایجاد کی۔ اس کے نتیجے میں ایک کھلی، آشکارا اور بیّن حقیقت سامنے آئی کہ قرآن کریم کی کتابت میں خوشخطی کا نہایت اعلیٰ اہتمام کیا جاتا ہے یعنی آیاتِ الٰہیہ کو لکھنے کے مرحلے میں تمام آدابِ کتابت بروئے کار لائے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں حسین و زیبا رسم الخط سے مزین نسخے معرضِ طباعت میں آئے ہیں اور آج دُنیا بھر میں ہنری شاہکار مانے جاتے ہیں۔ ایسے ہی تلاوت کے مرحلے میں خوش لحن قاری تجوید و قرأت کے تمام آداب کے ساتھ جب آیات کلامِ خدا پڑھتے ہیں تو سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ علم تجوید و قرأت ان آداب کا مجموعہ ہے جو قرآنی آیات کی تلاوت کو نہایت حسین بنا دیتے ہیں اور سماعتوں کو کلامِ الٰہی کی طرف جذب کر لیتے ہیں۔

لیکن جب قرآنِ کریم کو سمجھنے کا مرحلہ آتا ہے تو وہ لطف و سرور جو دلوں میں حاصل ہونا چاہیے محسوس نہیں ہوتا جبکہ آیاتِ الٰہی دلوں کے لئے اُتری ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سمجھنے کے بھی آداب ہیں جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ آداب فہم قرآن کلام کو سمجھنے کے لئے دلوں کو کہیں زیادہ آمادہ تر کر دیتے ہیں بہ نسبت پڑھنے اور لکھنے کے آداب کے۔

چنانچہ قم المقدسہ میں ایک ماہ رمضان المبارک میں بعض طلاب کرام کے لئے اس بحث کا

آغاز ہوا، محور کے طور پر صدر المتالہینؒ کی کتاب مفاتیح الغیب کو انتخاب کیا گیا اور اس طرح آدابِ فہم قرآن کی پیدائش ہوگئی، کافی عرصہ تک اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا تا اینکہ کچھ قرآن دوست ادب پسندوں نے اس کی تحریر کا فریضہ نبھا دیا۔

دیگر بیسیوں عناوین کی طرح یہ موضوع بھی کمپیوٹر کے حافظے اور متاب کی بے نظمی میں خاموش زندگی بسر کر رہا تھا کہ جناب سید وصال حیدر نقوی صاحب کے علم میں آگیا، پھر کیا تھا کہ سیّد صاحب نے فوراً اس کی طباعت کا اصرار شروع کر دیا۔ ہماری تمام تر ٹال مٹول کے باوجود انہوں نے تمام مراحل سے سرخروئی سے چھاپ ہی دیا۔ اس بابت جس ہستی نے ناقابل توصیف عرق ریزی کی، دن رات کی محنت، شوق، جذبہ اور نہایت ادب کے ساتھ آداب فہم قرآن کو قرآن دوستوں تک پہنچایا وہ عزیز القدر جناب دانش صاحب ہیں۔ وصال صاحب کے اہتمام اور دانش صاحب کی محنت نے یہ اُمید پیدا کر دی ہے بلکہ اسے یقینی بنا دیا ہے کہ انشاء اللہ سستی، غفلت، ٹال مٹول، لاپروائی جیسے غبار کے نیچے دبے ہوئے سینکڑوں موضوعات اب طباعت کے لباس میں ملبوس ہو کر قارئین کرام تک پہنچتے رہیں گے۔

غلطیاں انسانی کام کا لازمہ ہیں، مشاہدے کی صورت میں عفو و درگزر کے ساتھ مطلع فرمائیں۔ شکریہ

خداوند متعال سے ان عزیزوں اور ہر اس عزیز کے لئے توفیقاتِ فراوان کے متمنی ہیں جس نے آداب فہم قرآن کے طباعتی سفر میں کوئی قدم اُٹھایا ہے۔

احقر العباد

سید جواد نقوی

جامعہ العروۃ الوثقیٰ۔ لاہور

04/05/2012

فہرست

فصلِ ادبِ ششم　16

رفعِ موانعِ فہم

(حصہ اول)

۱) اکثریت کو قرآن کیوں سمجھ نہیں آتا؟　18

۲) موانع کب رکاوٹ بنتے ہیں؟　19

☆ مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں　22

۳) بے رغبتی، محرک نہ ہونے کی وجہ　26

۴) علامت سے رغبت کی پہچان　28

۵) ناکامیوں کی بڑی وجہ　28

۶) موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے　29

۷) موانعِ علم　33

۸) عبادت کی راہ میں حائل موانع　35

۹) دل مانندِ آئینہ　36

۱۰) دل کی راہ میں دو مشکلات　37

۱۱) فہم کی راہ میں حائل رکاوٹیں　40

☆ طفولیت　40

☆ بلادت　43

فصلِ ادبِ ششم 52

رفعِ موانعِ فہم

(حصّہ دوم)

۱) فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ 54

☆ مخارج کیلئے حساسیت پیدا نہ کریں 57

☆ عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں 59

☆ قاریٔ قرآن ہونا عالمِ قرآن ہونے کی دلیل نہیں 62

۲) تقلیدِ محض 63

☆ تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ آبائی میں فرق 64

☆ تقلید کی مزید وضاحت 66

☆ مذموم تقلید 69

☆ طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں 70

☆ درس پڑھنے کا نسخہ 72

☆ جمود، باعثِ تعصب 73

☆ کمزور نفوس کی مشکل 75

☆ استاد اور شاگرد کا رابطہ 76

☆ رشد حاصل نہ ہونے کی وجہ 78

☆ شیطانِ تقلید کا حملہ 80

☆ تعصّبات، مذہبی دنیا کا بڑا مسئلہ 83

☆ تضاربِ آراء کو تحمل کریں 84
☆ علم کے ساتھ حلم کی ضرورت 86
☆ صوفیاء کی حقیقت 88
☆ عرفاء کے نزدیک علم حجاب ہے 90
☆ ٹھگ صوفیاء وعرفاء 91
☆ محقق عرفاء کی بات کا صحیح معنیٰ مراد لیں 93
☆ جدلی مزاج، مذہبی دنیا کی ایک اور مشکل 94
☆ تقلیدی وجدلی علم حجاب ہے 97
۳) عربی علوم 100
☆ معانی فقط الفاظ میں منحصر نہیں ہوتے 102
☆ عربی ضرور سیکھیں لیکن افراط وتفریط کے بغیر 105
☆ مقصودِ اصلی قرآن 108
۴) تفاسیر پر جمود 110
☆ تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء 113

فصلِ ادبِ ششم 121

رفعِ موانعِ فہم

(حصّہ سوم)

۱) قلبی میلانات، لہو ولعب 122

۲)عدم تدبر در آیات 127
۳)قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا 128
☆استخارے کی حقیقت 132
۴)وہم وخیال 136
۵)زود باوری اور شکاکیت 137
۶)ظاہر بینی 139
۷)ہویٰ وہوس 141
۸)دنیا پرستی 142
۹)غرور وتکبر 143
۱۰)تنگ نظری 145
۱۱)دنیوی افکار ونظریات سے متاثر ذہن 147
۱۲)سائنس زدہ ذہن 149
۱۳)عوام زدگی 154

فصلِ ادب ششم 163

رفعِ موانعِ فہم

(حصّہ چہارم)

۱)ظن وگمان پر اکتفا کرنا 165
☆یقینِ حقیقی 166

☆جہلِ مرکب 168
☆تقلیدی یقین معرضِ زوال میں 171
☆یقینِ حقیقی کیلئے تین ارکان 171
☆اوائلِ قرآن میں مُخاطَبِینِ قرآن کی تقسیم 172
الف) پہلا طبقہ 172
ب) دوسرا طبقہ 173
ج) تیسرا طبقہ 174
☆عُلَماء اور ظُنَنَاء 175
☆امانی، بنی اسرائیل کی مشکل 175
۲) قساوتِ قلبی 178
۳) ترکِ عمل 182
۴) قرآن کا آلائی استعمال 185
۵) کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا 192
۶) جلد بازی 197
۷) لکیر کا فقیر ہونا 199
۸) خود کو راہنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھنا 202
۹) ثانوی مطالب پہ توجہ دینا 207
۱۰) اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجہی 212
۱۱) فقط انتخابی آیات پر توجہ دینا 212

فصلِ ادبِ ہفتم 218

تخصیص

۱) تخصیص سے مراد 220

۲) فقط لافظِ قرآن نہ بنیں 221

۳) خود کو مُخاطَب نہ سمجھنا، قرآن کی مہجوریت کا سبب 223

۴) دعا کو اپنے دل کی آواز بنائیں 224

☆ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں میں استغفار کی وجہ 225

☆ تعلیم دینے کی دو صورتیں 226

☆ معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں 228

۵) قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں 231

۶) مُخاطَبِ قرآن نہ بننے کا نقصان 232

۷) انسان عکس العمل کب دکھاتا ہے؟ 234

۸) مُخاطَب بننے کے ثمرات 236

۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ تربیت 239

۱۰) قرآن کو قصۂ شب نہ سمجھیں 240

☆ خود کو قلبِ قصہ میں ڈھال کر پڑھیں 242

۱۱) حیوانات اور دیگر موجودات سے عبرت 245

۱۲) قرآن کی ہر آیہ میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں 247

۱۳) قرآن کا اندازِ تخاطب خطابی ہے 249

۱۴)مخاطب بننے کے اثرات 254

۱۵)شکر سے مراد 258

۱۶)قرآن فقط معصومین علیہ السلام کیلئے نازل نہیں ہوا 259

۱۷)مذہبی طبقے کی دیگر مشکلات 261

فصلِ ادبِ ہشتم 265

تاثر و وجد

(حصّہ اول)

۱)وجد کا معنیٰ 268

۲)اللہ کو پانا ہے، نہ کہ سمجھنا ہے 269

۳)قرآن کو اپنے وجود میں اتاریں 273

۴)وجد، اہلِ معرفت کی نظر میں 274

۵)متاثر ہونا کمال کی علامت 277

۶)ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف ہے 278

۷)وجد، شوق کی ایک حالت 279

۸)حالتِ وجد کے اثرات 282

۹)عشق، اصطلاحِ دینی 286

۱۰)انسان پر قرآن کی مقناطیسیت کی علامات 287

۱۱)کسی چیز کو پانے اور سمجھنے میں فرق 289

۱۲)معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں 290
۱۳)رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد 295
۱۴)جیسی آیت ویسی حالت 297
۱۵)عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ہے 299
۱۶)شوق و وجد، عالم توحید و ملکوت کے مقناطیس 300
۱۷)قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ 303

فصلِ ادبِ ہشتم 306

تاثر و وجد

(حصّہ دوم)

۱)دل کب متاثر ہوتا ہے؟ 308
۲)قلب کو تاثر کیلئے آمادہ کرنے والی چیزیں 309
☆خشیت 310
☆راہب دل 311
۳)دل کی سختی و نرمی کے اسباب 314
۴)تاثر، انسان کے بلوغ کی نشانی 316
۵)عزت کا معنی 318
۶)بہترین دل معرفت سے متاثر ہوتا ہے 320
۷)عشقِ الٰہی کی مقناطیسیت 321

۸) منظومۂ شمسی، عکسِ منظومۂ انسانی 325
۹) طبیعت وفطرت میں محاذ آرائی 329
۱۰) مولا علی علیہ السلام، فانی در ذاتِ خدا 332
۱۱) مجنوں کیلئے لیلیٰ کے خط کی اہمیت 333
۱۲) مشکلات میں شکرِ خدا 337
۱۳) عاشقانہ دعا ومناجات کریں 339
۱۴) اہلبیت علیہم السلام کی سیرت میں جاذبۂ خدا 340
۱۵) قرآنی زبان سے مراد 341

فصلِ ادبِ ہشتم 346

تاثر و وجد

(حصّہ سوم)

۱) اقسامِ انسان بلحاظِ اوصاف 348
☆ صاحبِ اوقات 348
☆ صاحبِ احوال 349
☆ صاحبِ مقامات 349
۲) قسی القلب، غیر متاثر نفس 352
۳) آیاتِ وعید کا انسان پر اثر 354
۴) خدا کی ربوبیت رحمانی ہے 355

۵) خدا کا غضب بھی بغیر رحمت کے نہیں 358
۶) آیاتِ رحمت کا اثر 360
۷) ہر عبادت کی بنیاد معرفت ہے 363
۸) گستاخ افراد کے اقوال پر مشتمل آیات کا اثر 367
۹) جنت کے ذکر کا انسان پر اثر 371
۱۰) جہنم کے ذکر کا انسان پر اثر 372
۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرآن سے اثر لینے کی کیفیت 373
۱۲) فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ محققِ قرآن بنیں 376
۱۳) آیاتِ توکل کا انسان پر اثر 378
۱۴) آیاتِ صبر کا انسان پر اثر 380
۱۵) انسان میں قرآنی صفات پیدا نہ ہونے کا نتیجہ 381
۱۶) غیر متاثر افراد کیلئے قرآن کیا کہتا ہے؟ 385
۱۷) قرآن کا ہدف، انسان کو صفاتِ ربوبیہ سے متصف کرنا 387
۱۸) اعلیٰ مرتبۂ معرفت 390

فصلِ ادبِ ہشتم 397

تاثر و وجد

(حصّہ چہارم)

۱) بصیرتِ کشفیہ کا مطلب 398

۲)بصیرۃ کشفیہ:قرآن مجدد الانزال ہے	400
۳)تمثیلِ استوائے قرآن برقلب	401
۴)خَلق اور خُلق کا فرق	407
۵)خُلق کے منابع	408
۶)خَلق اور خُلق میں ہم آہنگی کی ضرورت	409
۷)استوائے قرآن برقلب نہ ہونے کا نتیجہ	411
۸)تالیٔ قرآن کون ہے؟	412
۹)نزولِ قرآن بمناسبتِ دل	414
۱۰)دل کب تابعِ قرآن ہوتا ہے؟	420
۱۱)جیسا عارف ویسی معرفت	423
۱۲)مکاشفۂ قرآنی	425
۱۳)قرآنِ مجید خُلقِ رسول ﷺ ہے	429

فصلِ ادبِ ہشتم

434

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ پنجم)

۱)رسولِ اکرم ﷺ کا طریقۂ تلاوت	435
۲)عینِ تدبر و فہمِ قرآن	436
۳)عرشِ دل پر قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ	438

۴) فقط ظواہرِ قرآن پہ توجہ مطلوب نہیں 442
۵) فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے 444
۶) حقیقتِ تقویٰ اور اس کے آثار 447
۷) قرآن اور انسان میں تشابہ، کب اور کیسے؟ 451
۸) فہمِ حقیقی، مرادِ متکلم کا حصول 455
۹) قرآن کو خود متکلم سے سمجھیں 457

فصلِ ادبِ نہم 462

ترقی

(حصہ اول)

۱) تکامل کیلئے ترقی کا حصول 463
۲) ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں 465
۳) ترقی کے لایقفی مراتب 467
۴) بے ادبوں سے عبرت 468
۵) دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے 471
۶) مرتبوں کی طلب میں اضافہ 472
۷) ارتقاء یا زوال، تیسری حالت محال 474
۸) باطنِ قرآن عمیق ہے 478
۹) تالیِ قرآن ہی ارتقاء کرتا ہے 481

فصلِ ادبِ نہم 489

﴿ترقی﴾

(حصّہ دوم)

۱)قرآن میں ارتقاء کے مختلف پہلو 490

☆ارتقاء کا پہلا پہلو 490

(الف) پہلا درجہ 490

(ب) دوسرا درجہ 492

(ج) تیسرا درجہ 495

۲)ظہورِ ذات برائے ذات 495

۳)پوری کائنات تجلیٔ الٰہی 497

۴)خود بینی، خدا بینی میں مانع 500

۵)مشاہدۂ متکلم میں استغراق 501

۶)سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات 504

۷)مقربین کیلئے امام صادق علیہ السلام کا فرمان 512

۸)عظمت کا اثر 514

۹)عبادات وتلاوتِ قرآن میں حلاوت 517

۱۰)توحیدِ خالص سے مراد 522

فصلِ ادبِ نہم 530

﴿ترقی﴾

(حصّہ سوم)

۱)ارتقاء کا دوسرا پہلو	531
☆ پہلا مرحلہ	531
☆ دوسرا مرحلہ	532
☆ تیسرا مرحلہ	533
۲)ارتقاء کا تیسرا پہلو	534
۳)ارتقاء کا چوتھا پہلو	535
۴)ارتقاء کا پانچواں پہلو	540
۵)ارتقاء کا چھٹا پہلو	547
☆ پہلا مرحلہ	547
☆ دوسرا مرحلہ	548
☆ تیسرا مرحلہ	550
۶)ارتقاء کا ساتواں پہلو	552
۷)ارتقاء کا آٹھواں پہلو	554
۸)ارتقاء کا نواں پہلو	555

فصلِ ادبِ دہم

فصلِ ادبِ دہم	567
تبری	
۱) تبری کا معنیٰ	568
۲) تولا و تبرا، انسانِ سالک کے دو پَر	570
۳) عبادات میں سفرِ قربی و سفرِ بُعدی	572
۴) انسان ہجرت کیوں نہیں کر پاتا؟	573
۵) تولا و تبرا کی وسعت	574
۶) اپنی حول و قوت سے تبرا	575
۷) قارونِ علمی نہ بنیں	579
۸) جسے خدا اپنے حال پہ چھوڑ دے وہ مغضوب ہے	582
۹) برائت کا دوسرا مرتبہ	584
۱۰) انسان اپنی معرفت پیدا کرے	586
۱۱) انبیاء علیہم السلام انسان کو انسان بنانے آئے ہیں	589
۱۲) انسان ترقی پذیر ہے	593
۱۳) موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا، ترقی کی ضمانت	595
۱۴) کون لوگ مطمئن ہیں؟	601
فہرستیں	606

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ اول)

۱)اکثریت کوقرآن کیوں سمجھ نہیں آتا؟

۲)موانع کب رکاوٹ بنتے ہیں؟

☆مال ودولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

۳)بے رغبتی،محرک نہ ہونے کی وجہ

٤)علامت سے رغبت کی پہچان

٥)ناکامیوں کی بڑی وجہ

٦)موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے

۷)موانعِ علم

۸)عبادت کی راہ میں حائل موانع

۹)دل مانندِ آئینہ

۱۰)دل کی راہ میں دو مشکلات

۱۱)فہم کی راہ میں حائل رکاوٹیں

☆طفولیت

☆ بَلَادَتْ

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ ششم رفعِ موانعِ فہم ہے یعنی جب انسان قرآن کی بارگاہ میں آئے تو موانع ہٹا کر آئے یعنی انسان جب بارگاہِ قرآن میں حاضر ہوتا ہے اور قرآن سے کچھ لینے کی کوشش کرتا ہے تو پہلے اپنے آپ کو آمادہ کرے، اپنے دل، وجود اور روح سے موانعِ فہم کو برطرف کرے کیونکہ انسان کا دل بعض اوقات ایسے موانع اور رکاوٹوں سے دوچار ہو جاتا ہے کہ عملِ فہم اس سے سرزد نہیں ہو پاتا ہے اور دل کوئی چیز قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ قرآن کا بھی ادب ہے اور ہر اس کام کا ادب ہے کہ جس سے انسان کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر پڑھنا چاہتا ہے، محصل بننا چاہتا ہے، عالمِ دین بننا چاہتا ہے تو پہلے اپنی راہ سے اور اپنے وجود سے موانعِ تحصیلِ علم کو برطرف کرے، اسی طرح اگر کسی اور میدان میں حتیٰ کسی دنیوی میدان میں بھی وارد ہوتا ہے تو بھی اس کو پہلے اس میدان میں موجود موانع کو برطرف کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ چیزیں فہم کے آگے حائل ہیں جو انسان کو فہم کے مرحلے میں آگے نہیں بڑھنے دیتی ہیں لہٰذا انسان یہ ساری رکاوٹیں اتار کر آئے، یہ نہ ہو کہ قرآن پڑھتے ہوئے مزید کئی رکاوٹیں ساتھ لے آئے۔

بعض اوقات انسان کے اندر قرآن کو سمجھنے کا ارادہ موجود ہوتا ہے، شوق اور رغبت بھی موجود ہوتے ہیں لیکن جب قرآن کی طرف آتا ہے تو موانع ساتھ لے کر آتا ہے یا انسان کی فہم میں اور قرآن میں موانع حائل ہو جاتے ہیں اور اسی عالم میں کوشش کرتا ہے کہ قرآن کو سمجھے۔ ظاہر ہے کہ یہ موانع انسان کو فرصت و مہلت نہیں دیتے ہیں کہ حقیقتاً انسان قرآن کی مراد اور سر کو کہ جو قرآن میں موجود ہے درک کر سکے، پس قرآن شناس کو یا قرآن خواں کو ان موانع سے آزادی کیلئے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

۱)اکثر یت کو قرآن کیوں سمجھ نہیں آتا؟

ایسے بہت سے موانع انسان کی راہ میں حائل ہیں کہ جو قرآن کو سمجھنے نہیں دیتے ہیں اور ہمارے ساتھ یہی اتفاق روز تکرار ہوتا ہے، قرآن تو روز پڑھتے ہیں، انشاء اللہ، حُسنِ ظن تو یہی ہونا چاہئے کہ روز قرآن پڑھتے ہیں لیکن جب قرآن پڑھتے ہیں اکثر کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے اور جو کچھ یہ بزرگان بتا رہے ہیں کہ اس طرف آجاؤ، قرآن کی اس حقیقت کی طرف آجاؤ تو اس طرف ہم نہیں جاتے ہیں، کیوں نہیں جاتے ہیں؟ ان رکاوٹوں اور موانع کی وجہ سے، فرماتے ہیں کہ چونکہ قرآن کا محل دلِ انسان ہے، کان وزبان نہیں ہے، قرآن اترا بھی دل پر ہے، سمجھنا بھی دل کا کام ہے، شہیدِ لیلۃ القدر حضرتِ امیر المومنین علیہ السلام نے کمیلؒ سے یہی بیان فرمایا کہ

يَا كُمَيْلُ بْنَ زِيَادٍ، اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ أَوْعِيَةٌ، فَخَيْرُهَا أَوْعَاهَا......(۱)

اے کمیلؒ یہ دل ظرف ہے، ظرفِ حقائق ہے، ظرفِ معرفت ہے، ظرفِ قرآن ہے اور ان میں سے بہترین دل وہ ہے کہ جس کی ظرفیت بہت زیادہ ہو،

فَخَيْرُهَا أَوْعَاهَا......

ان دلوں کو تیار کرو چونکہ دل درحقیقت ظرفِ نزولِ قرآن وظرفِ فہمِ قرآن ہے، دل آمادہ کرنا ہے، آداب اسی لئے ہیں کہ دل آمادہ ہو، فہم کے لئے آمادہ ہو لیکن اس دل کے سامنے بہت ساری رکاوٹیں حائل ہیں۔

۲) موانع کب رکاوٹ بنتے ہیں؟

البتہ موانع تک نوبت اس صورت میں پہنچتی ہے کہ جب محرک موجود ہو، اگر انسان کسی چیز کو انجام دینے کا عملی ارادہ رکھتا ہو تو پھر اس کے بعد دیکھتا ہے کہ مجھے کون کونسے موانع درپیش ہیں۔ یہ عقلائی قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کے اندر محرک موجود نہ ہو تو موانع تک اس کی نوبت نہیں پہنچتی ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ موانع اس کی راہ میں حائل ہیں، اگر محرک اس شے کو تحریک دیں اور پھر کسی مرحلے پر جاکر حرکت کے دوران اس کو مسائل درپیش ہوں تو پھر کہا جاتا ہے کہ اس کو موانع درپیش ہیں، اس کے لئے عملی و علمی بہت ساری مثالیں دی جاسکتی ہیں مثلاً فرض کریں کہ ایک گاڑی میں انجن نہیں ہے اور آگے پولیس نے روڈ بھی بند کیا ہوا ہے، ناکہ بندی بھی ہے، دیوار بھی لگی ہوئی ہے، روڈ سے آگے جانے بھی نہیں دیا جاتا ہے، آپ کیا کہیں گے کہ یہ گاڑی آگے کیوں نہیں جارہی ہے؟ چونکہ آگے پولیس نے سخت ناکہ لگایا ہوا ہے یا روڈ بلاک کیا ہوا ہے اس وجہ سے گاڑی نہیں جارہی ہے؟ اگر پولیس ناکہ اٹھالے تو پھر پہنچ جائے گی؟ یا یہ کہ اس میں تو سرے سے انجن ہی نہیں ہے، محرک ہی نہیں ہے چونکہ محرک نہیں ہے اس وجہ سے یہ شے منزل تک نہیں پہنچ سکتی ہے، موانع تک تو نوبت ہی نہیں آتی ہے، پہلے کسی شے کو موانع تک تو پہنچنا چاہئے پھر نوبت آتی ہے کہ اب کون کونسے موانع درپیش ہیں؟ یا اگر ایک انسان کہیں سفر کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کے اندر سفر کا محرک موجود ہو، وہ محرک اس کو سفر کیلئے اکسائے، محرک کوئی مادی فائدہ بھی ہوسکتا ہے اور معنوی فائدہ بھی اور سب سے بڑا محرک انسان کے اندر اس فائدے کے حصول کا ارادہ ہے، اگر انسان کے اندر ارادہ موجود ہو تو انسان اس

موانع کس طرح رکاوٹ بنتے ہیں؟

مقصد تک پہنچنے کے لئے حرکت کرتا ہے لیکن جس انسان کے اندر سفر کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو یعنی اندر کوئی چیز محرک کے طور پر نہ ہو کہ جو اسے اُکسائے اور اُٹھائے تو پھر راستے بھی بند ہوں اور یہ انسان سفر نہ کر پائے تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہ موانع کی وجہ سے سفر نہیں کر سکا، ہر چند موانع بھی موجود تھے لیکن سفر نہ کرنا محرک کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

مثالِ دیگر بعنوانِ طالب علم ہے، خصوصاً اس جہت سے کہ بعض مسائل میں انسان غور وفکر کرتا ہے اور کرنی بھی چاہئے اور ہر ایک کی فکر کا ایک نتیجہ بھی ہے، ہم ان مسائل میں بھی حتماً غور وفکر کریں کہ ہم حوزۂ علمیہ میں بعنوانِ طلاّب اردو زبان مختلف علاقوں عموماً ہندوستان اور پاکستان سے موجود ہیں اور دوسری زبانوں کے طلاّب بھی ہیں لیکن اردو زبان بولنے والے طلاب کسی حد تک کثرت سے ہیں، فرض کریں کہ دوسرے لوگ عربی اور فارسی بولنے والے لوگ ہیں، عربی بولنے والوں میں عراقی، لبنانی، بحرینی اور فارسی بولنے والوں میں ایرانی اور افغانی سرفہرست ہیں، اردو زبان بولنے والوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کی مادری زبان اردو ہی ہو، اس کا مطلب ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے لوگ، لیکن حوزوی رشد اور ارتقاء کے لحاظ سے دوسری زبانیں بولنے والوں کا تناسب اردو بولنے والوں سے زیادہ ہے مثلاً اگر ہم فقہی میدان کے اندر، تفسیر میں، حدیث میں اور دیگر حوزوی علوم میں کہ جو رائج ہیں اجتہاد کی بات کریں تو ان علمی درجوں کے لحاظ سے اردو زبان حضرات اس جگہ نہیں پہنچتے کہ جہاں دوسرے پہنچتے ہیں، اکا دکا کوئی استثنائی پیدا ہو جائے تو الگ بات ہے لیکن کوئی قاعدہ وضابطہ نہیں ہے، دوسری زبانوں میں قاعدہ و

ضابطہ ہے، ان میں معلوم ہے کہ اتنے فیصد اس مقام تک پہنچ جائیں گے لیکن یہاں توقع بھی نہیں ہوتی ہے، بہت سارے لوگ اس مطلب کو سوچتے ہیں اور غور کرتے ہیں۔

حتیٰ قم میں بعض ایسے افراد کہ جو اس مسئلے میں سوچتے تھے اور اس بابت پریشان تھے، انہوں نے متعدد جلسات بھی تشکیل دیئے اور اس مسئلے کی تحلیل بھی کی کہ ایسے کیوں ہوتا ہے؟ بہت سارے لوگوں نے وہاں جو آراء دیں ان کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی اور پاکستانی طلاب کی راہ میں فراواں موانع حائل ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم اعلیٰ علمی درجات تک نہیں پہنچتے ہیں اور بہت جلد یا تو تعلیم ترک کر دیتے ہیں یا وہ موانع ہم سے چھڑا دیتے ہیں یعنی اس مطلب پر ایک قسم کا اجماع تھا کہ اعلیٰ علمی درجات تک ہم لوگ ان موانع کی وجہ سے نہیں پہنچ پاتے ہیں، اگر وہ موانع برطرف ہو جائیں تو ہم بھی وہاں پہنچ سکتے ہیں کہ جہاں دوسرے پہنچتے ہیں اور عمدتاً جو موانع ذکر کئے گئے تھے وہ سارے موانع بھی مادی تھے یعنی چونکہ مادّی لحاظ سے ہندوستان و پاکستان کے طلاب فقیر و نادار اور بے کس ہیں، ان کے پاس پیسے کم ہوتے ہیں تو اس وجہ سے یہ اعلیٰ علمی درجات تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ ان بحثوں میں وارد ہونا چاہئے لیکن اس وجہ سے نہیں کہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں گے بلکہ حقیقت کو تلاش کرنے کے لئے تاکہ اس حقیقت کو تلاش کر کے پھر اس کیلئے کوئی راہِ حل پیش کریں۔

ہندوستان، پاکستان کے طلاب استعداد کے لحاظ سے اگر نہ کہیں کہ بہت ساروں سے بہتر ہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں، کم از کم مبالغہ کئے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اوسطاً ہندوستان و پاکستان کے طلاب کی استعداد دوسروں سے کم نہیں ہے بلکہ برابر ہے لیکن نتیجہ اور کارکردگی میں بہت

موانع کس رکاوٹ بنتے ہیں؟

فرق ہے، یہ فرق کیوں ہے؟ یہ ان بزرگان کے نزدیک موانع کی وجہ سے ہے۔اب اخیراً کچھ موانع اس میں اضافہ کر دیئے گئے ہیں کہ جو باہر بہت زیادہ تبلیغ ہوئے ہیں اور معلوم نہیں کہ کس طرح سے اور کیسے نیت سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کہ ہندوستانی و پاکستانی طلاب کو جان بوجھ کر مجتہد بننے نہیں دیا جاتا ہے یعنی ایرانی مسئولین یا ایرانی ذمہ داران یا یہاں پر ایسا تفکر ہے کہ وہ کسی کو مجتہد بننے نہیں دیتے ہیں، علمی ارتقاء میں آگے بڑھنے نہیں دیتے۔غرضیکہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موانع حائل ہیں، ان موانع میں بعض مادی و مالی موانع کے قائل ہیں اور بعض قائل ہیں کہ یہاں کا نظام ہمارے لئے مانع ہے لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ موانع کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

ہمیں غور کرنا چاہئے کہ واقعاً موانع کی ہی وجہ سے ہمیں یہ مشکل پیش آئی ہے یا اس کا کوئی اور سبب ہے؟ کیوں ارتقاء کا تناسب وہ نہیں ہے کہ جو دوسرں میں ہے؟ اب ایک ناقص رائے کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ موانع کی وجہ سے نہیں ہے، بے شک موانع بھی ہیں، میں موانع کا انکار نہیں کرتا ہوں البتہ یہ موانع نہ مالی ہیں اور نہ ہی وہ موانع ہیں کہ جو حوزے کے اندر اور باہر زیادہ ترویج ہو رہے ہیں جو کاذب موانع ہیں۔

☆مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

☆مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

بعض کہتے ہیں کہ ہم لوگ اس وجہ سے مجتہد نہیں بنتے ہیں چونکہ ہماری جیب میں پیسے نہیں ہوتے ہیں اور دوسرے اس وجہ سے مجتہد بنتے ہیں کہ ان کی جیب میں مال ہوتا ہے۔ پیسوں سے کوئی

مجتہد نہیں بنتا ہے، جو لوگ کسی اعلیٰ علمی درجے پر پہنچے ہیں ان کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت فقر و کسمپرسی میں پڑھ کر یہاں تک پہنچے ہیں، ان میں بہت سارے یتیم تھے، دربدر تھے، کفالت نہیں تھی۔

حضرت آیت اللہ تبریزی قدس سرہ کے حالاتِ زندگی پر نظر کریں، جب یہ قم میں پڑھتے تھے تو ان کا جی چاہتا تھا کہ پڑھنے کے لئے نجف بھی جائیں لیکن ان کے پاس قم سے نجف تک کا کرایہ نہیں تھا، سالہا سال اس انتظار میں رہے کہ کرایہ مل جائے اور اس وقت بس میں جانے کا کرایہ بھی معمولی سا تھا، آخر کار کسی مجلس میں انہوں نے اپنی ذہانت و فطانت دکھائی اور کسی شخص نے کوئی سوال کیا کہ جس کا جواب باقی بزرگان نہیں دے سکے، انہوں نے ایک طالب علم ہونے کے حوالے سے جواب دے دیا، اس شخص کو یہ جوان طالب علم پسند آیا اور ان کی یہ ذہانت دیکھی تو اس نے پوچھا کہ آپ کی کوئی خواہش ہو تو بتائیں، انہوں نے کہا کہ میرے پاس نجف کا کرایہ نہیں ہے اگر آپ لطف کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کرایہ دے دیں، غور کریں کہ اس طرح کے لوگ بھی تھے۔

استاد تقی جعفریؒ کہ جو ایک عالمی علمی شخصیت ہیں، جب وہ نجف جا رہے تھے تو راستے میں ایک جوتا گم ہو گیا، ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اپنے لئے ایک جوتا خرید سکیں، ایک جوتے میں ایران سے نجف چلے گئے۔ اسی طرح سے آپ دوسرے بزرگان کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو جو اعلیٰ درجات تک پہنچے ہیں وہ پیسوں کی وجہ سے نہیں پہنچے ہیں اور نہ ہی اس وجہ سے کہ انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا، مجتہد بننے کے میدان میں کوئی ان کی راہ میں حائل نہیں تھا، رکاوٹیں بھی

فراواں تھیں لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے اندر ایک بہت قوی محرک موجود تھا۔

ہمیں علمی ارتقاء کے درجے میں موانع بھی درپیش ہیں لیکن وہ دونوں موانع نہیں ہیں، نہ مال مانع ہے کہ الحمد للہ بہت ساروں کی حالت بہتر ہے، مالی لحاظ سے کوئی فقر کی وجہ سے حالتِ احتضار میں نہیں پہنچا ہوا اور نہ ہی یہاں کوئی ایسا مانع ہے کہ یہ لوگ ہمارے طلاب کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ یہ اعلیٰ درجات تک نہ پہنچ جائیں، بڑی وجہ یہ ہے کہ محرک کی کمی ہے، بڑے درجات تک پہنچنے کا ارادہ نہیں ہے۔

☆ مال و دولت کی کمی مجتہد بننے میں رکاوٹ نہیں

حوزے میں ہمارے ایک دوست تھے لیکن انہوں نے چند سال پڑھا، جب وہ واپس جا رہے تھے تو ان سے کہا کہ آپ کچھ عرصہ اور ٹھہر کر پڑھیں تو انہوں نے کہا کہ چند سال اور پڑھ کر جو کچھ ملے گا وہ اگر آج ہی مل رہا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے یہاں پر عمر ضائع کرنے کی، یعنی چند سال اور پڑھ کر مجھے کیا ملے گا؟ لوگ قبول کریں گے، مقبولِ عام ہو جاؤں گا، مشہور ہو جاؤں گا، بڑی شخصیت بن جاؤں گا، بغیر پڑھے اگر بڑی شخصیت بن سکتا ہوں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ یہاں حوزے میں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کروں۔ پس محرک نہیں ہے ارادہ نہیں ہے اور اس ارادے کے پیچھے کوئی اکسانے والی چیز نہیں ہے، دوم یہ کہ موانع بھی ہیں لیکن وہ موانع کچھ اور سنخ کے ہیں، وہ موانع کچھ ہمارے اندرونی ہیں، کچھ ہمارے ماحول سے مربوط ہیں، کچھ ہماری سوچ سے مربوط ہیں اور کچھ ہمارے اردگرد موجود ہیں۔

اسی طرح سے اگر انسان کے اندر قرآن فہمی کا محرک موجود ہو تو پھر موانعِ قرآن فہمی تک

نوبت آتی ہے، یعنی دل کے اندر، قلبِ انسان میں محرکِ قرآن موجود ہو، قرآن کی طرف آنے کا جاذبہ اور کشش موجود ہو، کوئی چیز ہمیں قرآن کی طرف لانے کے لئے اکسارہی ہو، قرآن کی طرف آنے کے لئے دل آمادہ ہو پھر اسکے بعد ہم یہ بحث کریں گے کہ اب قرآن فہمی میں کون کونسے موانع پیش آگئے ہیں، فرض کرلیں کہ ہم نے باقی آداب حاصل کر لئے اور ہمارادل اس وقت آمادہ ہے، محرک بقدرِ کافی وقوی موجود ہے کہ جو ہمیں قرآن کی بارگاہ تک لے آیا ہے تو اب موانع کی نوبت آتی ہے، بعض لوگ ہیں کہ جن کے اندر محرک موجود ہے، ان کو قرآن سے شدید عشق ومحبت ہے اور اتفاقاً قرآن کی طرف آتے بھی ہیں پھر اچھا خاصا وقت بھی قرآنی مسائل اور قرآنیات پر صرف کرتے ہیں، بعض تو قرآنی مسائل میں اور قرآنی آیات کے اندر اپنی پوری عمر گزار دیتے ہیں لیکن اسکے باوجود فہم سے قاصر رہتے ہیں، اس نکتے سے قاصر رہتے ہیں کہ جو قرآن بتانا چاہتا ہے، پیغامِ قرآن دریافت کرنے سے محروم رہتے ہیں، یہاں کہا جا سکتا ہے کہ محرومیت از فہم درحقیقت موانع اور رکاوٹوں کی وجہ سے ہے۔

یہ نکتہ صرف اس لئے عرض کیا کہ ہمیں قاعدہ سمجھ میں آجائے کہ جب کہا جاتا ہے کہ کسی شے کی راہ میں موانع حائل ہیں تو یہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب محرک کے بارے میں ہم مطمئن رہیں کہ اس کے اندر محرک موجود ہے اور محرک کے بعد اب یہ شخص موانع سے دوچار ہوا ہے لٰہذا یہ رکاوٹیں اس کی راہ سے برطرف ہونی چاہئیں۔

☆مال ودولت کی محبت فہم میں رکاوٹ ہے

۳) بے رغبتی، محرک نہ ہونے کی وجہ

غالباً ناکامیاں انہیں چیزوں کا نتیجہ ہیں کہ ہم کسی میدان کے اندر اس طرح سے داخل ہو جاتے ہیں کہ جس کا ہمارے اندر ارادہ وشوق موجود نہیں ہوتا کیونکہ بعض دوسرے عوامل ہمیں اس میدان میں دھکیل دیتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ تعلیمی میدان میں خود شخص کے اندر بقدرِ کافی شوق موجود نہیں ہوتا مثلاً بچے کے اندر رغبت موجود نہیں ہوتی ہے لیکن والدین اصرار کر کے اسے ایک میدانِ علمی میں ڈال دیتے ہیں مثلاً ایک بچے کو انجینئر بننے کا، ڈاکٹر بننے کا یا پائلٹ بننے کا شوق نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کسی اور میدان کی طرف رغبت و میلان ہے لیکن والدین کے اصرار پر یا معاشرے کی وجہ سے یا ماحول کی وجہ سے وہ کسی ایسے میدان میں قدم رکھ دیتا ہے کہ جس کے لئے اس کے اندر رغبت نہیں ہے لہٰذا یہ اس میدان میں ناکام ہے، ممکن ہے کہ وہ ڈگری حاصل کر لے لیکن کبھی بھی اس میدان کا ایک اچھا ماہر یا ایک اچھا انسان ثابت نہیں ہوگا، ہمیشہ یہ میدان اس کے لئے بوجھ ہی رہے گا اور ترقی نہیں کر پائے گا، ممکن ہے کہ وہ اپنا ٹائم پاس کر لے لیکن کبھی بھی اس میدان میں ترقی نہیں کر سکے گا اور اتفاق سے ہر دوسرے تیسرے آدمی کے ساتھ یہی الجھن اور المیہ موجود ہے کہ اسے ناخواستہ طور پر بعض میدانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔

جب بچوں اور نوجوانوں کے پاس اختیار نہیں ہوتا ہے تو ان کو ایسی وادیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے کہ جن کیلئے ان کے اندر کوئی میلان نہیں ہوتا ہے اور جب وہ صاحبِ اختیار ہوتے ہیں تو پھر اپنے پسند کے میدان کا ٹائم گزر چکا ہوتا ہے، اس لئے وہ دونوں میدانوں میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

بے رغبتی محرک نہ ہونے کی وجہ

اسی طرح علمِ دین میں بھی بہت سارے لوگوں میں اندرونی رغبت اور شوق نہیں ہوتا ہے لیکن ان کے والدین متدین ہوتے ہیں اور وہ والدین کے اصرار پر آجاتے ہیں یا چونکہ ان کا اختیار نہیں ہوتا ہے لہٰذا ناخواستہ و بے اختیار طور پر انہیں اس میدان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ارتقاء و ترقی نہیں کر سکتے ہیں چونکہ ان کے اندر محرک موجود نہیں ہے، یہاں موانع رکاوٹ نہیں ہیں بلکہ محرک و شوق و رغبت موجود نہیں ہے۔ اسی طرح انسان جب قرآن کی طرف آتا ہے تو سب سے پہلے اپنے اندر رغبت و شوق پیدا کرے لیکن اس کے بھی اسباب و عوامل ہیں۔

بے رغبتی محرک نہ ہونے کی وجہ

موانع کی بات اس وقت شروع ہوتی ہے کہ جب رغبت، شوق اور اندرونی طور پر محرک موجود ہو لہٰذا جب انسان محرک و رغبت کے ساتھ کسی میدان میں اترتا ہے یا قرآن کی وادی میں آتا ہے تو پھر ایک ایک کر کے موانع سر اٹھانا شروع کرتے ہیں مثلاً تعلیمی میدان میں اگر ایک شخص بقدرِ کافی رغبت اور شوق رکھتا ہے، بقدرِ کافی تعلیمِ دین کا شوق رکھتا ہے تو جب اس میدان میں داخل ہوتا ہے تو ایک ایک کر کے موانع اس کی راہ میں پیش آنا شروع ہو جاتے ہیں، یہاں یہ بحث شروع ہوتی ہے کہ ان موانع کو برطرف کریں، کچھ موانع قبل از ورود یعنی اس سے پہلے کہ میدان میں وارد ہوں کچھ موانع برطرف کرنا ضروری ہیں اور کچھ موانع اثنائے عمل میں برطرف کرنا ضروری ہیں یعنی جب انسان میدانِ علمی میں داخل ہوتا ہے تو تعلیم سے پہلے اور پڑھائی کے دوران ان موانع کو پہچانتا بھی ہے اور ایک ایک کر کے ختم بھی کرتا ہے۔

٤)علامت سے رغبت کی پہچان

چونکہ اس مسئلے کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے لہٰذا یہ ہر ایک کے لئے مبتلا شدہ مسئلہ ہے، ممکن ہے کہ ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہو کہ ہمیں کیسے پتہ چلے کہ یہ ہمارا اپنا شوقیہ میدان ہے، رغبت کا میدان ہے یا ہم پر ٹھونسا گیا میدان ہے۔ رغبت کی کوئی نہ کوئی علامت ضرور ہوتی ہے لہٰذا ان علامتوں کے ذریعے سے ہم آسانی سے پرکھ سکتے ہیں۔ انسان جس شعبے میں بھی جائے اور جانے کے بعد انسان کو قلبی طور یہ احساس ہو کہ گویا مجھے اپنی کوئی گمشدہ چیز مل گئی ہے تو سمجھ لیں کہ یہی آپ کی مطلوبہ چیز تھی۔ آپ کا ضمیر، آپ کا وجدان، آپ کا نفس، آپ کی روح اسی کی تلاش میں تھی اور جس میدان میں بھی بیزاری اور اکتاہٹ ہو اور یہ احساس موجود نہ ہو کہ مجھے اپنی گمشدہ چیز ملی ہے اور اس کے اندر لذت و سرور محسوس نہ ہو تو جان لے کہ یہ میدان میرا مورد رغبت نہیں ہے۔ اگر والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ارتقاء و ترقی کریں تو انہیں چاہئے کہ وہ بچوں اور جوانوں کی راہنمائی کریں لیکن انتخابِ علم میں، میدان اور شعبے کے انتخاب میں بچوں کی رغبت و شوق کو پہلی ترجیح حاصل ہے لیکن اگر ملازمین بنانا چاہتے ہیں اور ٹائم پاس کرنے کے لئے ایک فرضِ تربیت کرنا چاہتے ہیں تو یہ چیز انہیں مشکلات میں دھکیل دیتی ہے۔

٥)ناکامیوں کی بڑی وجہ

ناکامیوں کا پہلا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمیں اپنی رغبت اور شوق کے میدان میسر نہیں آتے

ہیں، لوگ ناخواستہ معاشرے، والدین، اردگرد کے لوگ، بزرگان اور تقلیدِ ناخواستہ کی وجہ سے بعض وادیوں کے اندر اُتر جاتے ہیں اور اگر انہیں تھوڑی سی آزادی دیں، اگر انہیں لوگوں کی سرزنش کا خطرہ نہ ہو کہ کوئی ہمیں برا بھلا نہیں کہے گا، کوئی ہم پر تہمت و بہتان نہیں باندھے گا، کوئی ہماری حوصلہ شکنی نہیں کرے گا تو آپ دیکھیں گے کہ بہت سارے لوگ میدانوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے مثلاً یہی طلابِ علومِ دینی کہ اگر بعض جبر اِن سے اٹھالئے جائیں مثلاً والدین، سوسائٹی (Society)، بزرگان اور مسئولین کی سرزنش کا خوف اور انہیں آزادی دیدی جائے کہ جو پڑھنا ہے پڑھیں تو پھر پتہ چلے گا کہ رغبت سے کتنے لوگ پڑھتے ہیں؟ عبادت بھی وہ فائدہ مند ہے کہ جو رغبت کے ساتھ ہو یعنی اگر جہنم کا کوڑا اٹھا بھی لیا جائے اور جنت کی لالچ ہم سے لے بھی لی جائے لیکن پھر بھی انسان عبادت کرتا رہے تو وہ حقیقی عبادت گزار ہے۔ رغبت و شوق کی عبادت، عبادتِ مشتاقانہ اور عبادتِ عاشقانہ ہو نہ کہ عبادتِ عبادانہ کہ جو غلاموں کی طرح یا کوڑوں کے ڈر سے کام کرتے ہیں یا عبادتِ تاجرانہ کہ جو سود و زیاں کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں لہٰذا رغبت و شوق کا نہ ہونا ناکامی کی بڑی وجہ ہے۔

٦) موانع کی صحیح تشخیص ضروری ھے

ناکامیوں کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ جس میدان میں انسان حتیٰ رغبت اور شوق کے ساتھ بھی اترتا ہے تو موانع کو نظر انداز کر کے اترتا ہے اور شناخت نہیں کرتا ہے کہ اس راہ کے اصلی موانع

کون کونسے ہیں؟ پس پہلا امر شناختِ موانع ہے، انسان اسی وقت موانع کو برطرف کرنے پر قادر ہے کہ جب متوجہ ہو کہ اصل موانع کیا ہیں؟ اگر توجہ اور شناخت ہی نہ ہو تو خوانخواہ انسان ان سے دوچار رہتا ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص طالب علم بننا چاہتا ہے، دینی علم پڑھنا چاہتا ہے تو عموماً سوچتا ہے کہ رہائش کہاں ہوگی؟ پیسہ کتنا ملے گا؟ مہینہ گزرے گا؟ یا نہیں گزرے گا؟ عموماً یہ سوالات کرتے ہیں درحالیکہ یہ زندگی کی راہ کے موانع ہیں نہ کہ تعلیم کی راہ کے موانع ہیں مثلاً اقامہ ہونا یا نہ ہونا یہ تو تحصیلِ علم میں دخیل نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ آپ کے بعض دیگر امور اور زندگی کے مسائل میں مانع ہو۔ موانع کی شناخت کریں کہ عبادت کے موانع کونسے ہیں؟ آسائش کے موانع کونسے ہیں؟ زندگی کے موانع کونسے ہیں؟ ان کو مخلوط نہ کریں، ایک دوسرے کے اندر خلط ملط نہ کریں، بعض امور کے موانع کی دیگر چیزوں کے موانع کے ساتھ ملاوٹ نہ کریں مثلاً ممکن ہے کہ ایک مانع انسان کے سونے میں حائل ہے، بعض انسانوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر لائٹ کھلی ہوئی ہو تو نہیں سوسکتے ہیں، جب تک پورا اندھیرا نہ ہو جائے وہ نہیں سوسکتے لیکن یہ نیند کا مانع ہے نہ کہ تعلیم کا، اگر وہ حوزہ چھوڑ کر چلا جائے اور کوئی پوچھے کہ کیوں چھوڑ کے آگئے ہو؟ تو کہے کہ رات کو میرے کمرے میں لائٹ آف نہیں کرتے تھے اس لئے میں نہیں پڑھ سکتا ہوں۔ آپ یہ کہیں کہ میں وہاں سو نہیں سکتا تھا نہ کہ پڑھ نہیں سکتا تھا، نیند کی راہ کے موانع اور ہیں اور تعلیم کی راہ کے موانع اور ہیں، ہم عموماً بعض موانع کہ جو تعلیم کی راہ میں حائل نہیں ہیں انہیں موانعِ تعلیم سمجھتے ہیں اور جو موانع تعلیم کے ہیں ان کی طرف اصلاً سرے سے

موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے

توجہ نہیں ہے بلکہ ان سے صرفِ نظر اور چشم پوشی کرتے ہیں۔ لہٰذا انسان پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے، بہت سارے لوگ رغبت وشوق سے پڑھنے کے لئے آتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں اور کسی مقام و درجۂ علمی تک نہیں پہنچتے ہیں چونکہ ان موانع کے اندر ہی رہتے ہیں اور انہیں برطرف نہیں کرتے ہیں۔

موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے

سب سے پہلے شناختِ موانع ضروری ہے، ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں جس وادی میں اترا ہوں اس وادی کے موانع کونسے ہیں؟ رکاوٹیں کونسی ہیں؟ اب کسی کا جو بھی میدان ہو لیکن چونکہ ہماری بحث قرآن کے بارے میں ہے لہٰذا ہمیں سب سے پہلے قرآن کے موانع سے آشنا ہونا چاہئے لیکن قاعدہ وضابطہ عام ہے، ہر شعبۂ زندگی میں یہ عمل ہمیں پہلے انجام دینا ہوگا تاکہ ناکام نہ رہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم مایوس ہو جائیں اور پوری عمر اس میدان میں لگا کر نادم اور پشیمان نہ ہوں۔

پس پہلے رغبت پیدا کریں، قرآن کی طرف آئیں اور شوق پیدا کریں، شوق کے بعد پھر موانع کی شناخت کریں کہ عمدتاً قرآن کے اندر مشغول لوگوں کی راہ میں کیا کیا موانع ہیں کہ جس کی وجہ سے قرآنی میدان میں ناکام رہ جاتے ہیں اور کسی مقام و مرتبے تک نہیں پہنچتے ہیں، مقام و مرتبہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ تفسیر نہیں کر سکتے یا کتاب نہیں لکھ سکتے ہیں، بلکہ چہ بسا قرآن کی تفسیر بھی کرتے ہیں اور قرآن کے بارے میں کتابیں بھی لکھتے ہیں لیکن پھر بھی میدانِ قرآن میں ناکام انسان ہیں چونکہ حقیقی ہدایتِ قرآنی انہیں حاصل نہیں ہوئی۔

کامیاب اور ناکام لوگوں کا تذکرہ خود قرآن نے بھی کیا ہے کہ

أُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o (۲)

یہ کامیاب لوگ ہیں، موافق لوگ ہیں اور بعض کو کہا ہے کہ

أُولٰئِکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ o (۳)

یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن سے مطلوبہ ہدایت نہیں ملتی یا ناکامی کا معنیٰ یہ ہے کہ انہیں ہدایت نہیں ملتی ہے، پہلے انہیں اسباب تلاش کرنے چاہئیں کہ ہم کیوں خاسرین میں سے ہیں، سب کچھ کرنے کے باوجود بھی خسارے میں سے ہیں، اس بارے میں فراواں روایات ہیں۔

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ یَلْعَنُهُ...... (۴)

کَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ یَلْعَنُهُ...... (۵)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ یَلْعَنُهُ...... (۶)

یعنی بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے،

بعض قرآن خواں ایسے ہیں کہ جن پر قرآن لعنت کرتا ہے اور یہی ناکام لوگ ہیں باوجود اینکہ انہوں نے ساری عمر قرآن کے اندر صرف کی ہے، پس پہلے ہم موانع کی تلاش کریں، نہ وہ موانع کہ جو دوسرے کاموں میں موانع ہیں اور ہم ان کو قرآنی موانع شمار کرتے ہیں مثلاً آپ کے پاس ایک اچھا پرنٹڈ (Printed) قرآن موجود نہیں ہے لہٰذا یہ قرآن کے نہ سمجھنے کا ایک مانع ہے۔ یہ مانع فہم قرآن نہیں ہے یا مثلاً یہ کہے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اس وجہ سے قرآن سمجھ نہیں آتا ہے تو یہ بھی

موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے

مانعِ فہمِ قرآن نہیں ہے لہٰذا پہلے موانع کی صحیح تشخیص ضروری ہے تاکہ انسان انہیں برطرف کرنے کی کوشش کر سکے۔

۷)موانعِ علم

بہت سے موانع علم کی راہ میں حائل ہیں، کہا جاتا ہے کہ

لِکُلِّ شَیْءٍ آفَةٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ......(۷)

ہر چیز کی ایک آفت و بیماری ہے لیکن علم کے لئے بہت ساری چیزیں آفت ہیں، ہر چیز علم کی رکاوٹ ہے، اگر ایک انسان علم حاصل کرنے آئے لیکن آتے ہوئے جتنے بھی دوست، عزیز، ہمسائے، رشتہ دار اور ٹرین پہ بیٹھا تو اس کے گارڈ، قلی، مسافر اور ٹکٹ کلکٹر تک سے ٹیلیفون نمبر اور موبائل نمبر ساتھ لیتے ہوئے آئے، بارڈر کراس (Cross) کیا ہے تو وہاں پر دونوں طرف کے لوگوں کا یا ایئر پورٹ والوں سے ٹیلیفون نمبرز لے کر آئے کہ میں پہنچتے ہی آپ سب سے رابطہ کروں گا، جب آپ اتنے ٹیلیفون نمبرز اور ای میل ایڈریس ساتھ لے کر آئے ہیں تو پھر آپ پڑھیں گے کب؟ اگر آپ پڑھنے کے لئے آئے ہیں تو یہ سارے موانع ہٹا کر آئیں، یہ آفاتِ علم ہیں کہ جو آپ ساتھ لے آئے ہیں۔

بعض اساتیدِ بزرگان کے بقول طالب علم کو آتے ہوئے ایک بات گھر میں کہہ کر آنی چاہئے کہ جب تک میرا کوئی خط نہیں آتا تو سمجھو خیریت سے ہوں یعنی جب تک ٹیلیفون نہیں کرتا ہوں

اس وقت تک سمجھو خیریت سے ہوں، ٹیلیفون آیا تو سمجھو کہ کوئی نہ کوئی مشکل ہے، جب تک خیریت سے ہیں تو ٹیلیفون نہ کریں اور اس کے بعد پڑھائی میں مشغول ہو جائیں، ورنہ انسان اتنے تعلقات اور اتنے موانع خود لے کر آئے تو ٹیلیفون الگ کرے، پھر رات کو مہمان کی دعوت کرے اور جس رات مہمان اِدھر نہ آئے تو یہ خود کسی کے ہاں مہمان چلا جائے، پھر یہ پڑھے گا کس وقت؟ حرم کے جتنے خادم ہیں سب کے ساتھ اسکا رابطہ ہو، جتنے مدرسہ کے خادم ہیں ان سب کے ساتھ اس کے تعلقات ہوں، جتنے ٹیکسی ڈرائیورز ہیں سارے اس کے دوست ہوں تو اس صورت میں یہ انسان کب پڑھے گا؟

پڑھائی کے لئے موانع ہیں، ان موانع کو ہٹا کر، ان رکاوٹوں کو ہٹا کر ادب کے ساتھ پڑھو۔ پڑھنے کے آداب ہیں، اسی طرح سے قرآن کی بارگاہ میں جب آتے ہو تو بھی موانع ہٹا کر آؤ، جس طرح سے نماز ہے کہ جب نماز کی طرف آتے ہو تو موانع ہٹا کر آؤ،

اِنِّی أَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًیo(۸)

میں ہی آپ کا رب ہوں، پس اپنی جوتیاں اتار دیں، بتحقیق آپ طویٰ کی مقدس وادی میں ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام جب معراج پر بارگاہِ خدا میں پہنچے تو خداوند نے فرمایا کہ یہ ساتھ کیا لے کر آئے ہیں؟ نالین!

فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ......

پس اپنی جوتیاں اتار دیں......

اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی٥

آپ کو معلوم نہیں ہے کہ وادئ مقدس میں نالین پہن کر آ رہے ہیں، نعلین سے مراد فقط جوتے نہیں ہیں، جوتوں میں اضافی چیزیں بھی ہیں، یہ نہیں کہا کہ فاخلع قدمیک کہ پاؤں اتار کر آؤ نہیں، بلکہ پاؤں میں فالتو چیزیں اُتار کر آؤ، نعلین فالتو چیزیں ہیں، پاؤں کے ساتھ آؤ لیکن جوتوں کے ساتھ نہ آؤ چونکہ پاؤں تمہارا جزو ہے لیکن جوتے تمہارے جز و نہیں ہیں۔ انسان جب حوزے میں آئے تو نعلین اتار کر آئے، نعلین یعنی وہ سارے تعلقات چھوڑ کر آئے، ساری وابستگیاں اور دلبستگیاں ترک کر کے آئے۔

۸) عبادت کی راہ میں حائل موانع

اس طرح جب انسان نماز میں داخل ہوتا ہے تو اسی طرح موانعِ حضورِ بارگاہِ خدا ہٹا کر نماز میں جائے ورنہ نماز میں بعض ہوتے ہیں کہ ٹی وی بھی آن کر کے رکھتے ہیں، ٹیلیفون بھی آن کر کے رکھتے ہیں، سب کچھ آن کر کے اللہ اکبر کہتا ہے تا کہ اگر نماز میں بھی کہیں ٹیلیفون آ گیا تو اس کو ریسیو (Receive) کر کے زور سے کہوں کہ سبحان ربی العظیم و بحمدہ، تا کہ اس کو پتہ چلے کہ میں نماز میں مصروف ہوں، لہٰذا دوبارہ کال کرے گا، پھر کہتا ہے کہ حضورِ دل نہیں ہوتا ہے، مولانا کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ حضور کے ساتھ نماز پڑھوں؟ جب سارے موانع حضور بھی ساتھ

ہیں تو کس طرح سے حضور پیدا ہوگا؟ اسی طرح دعا و مناجات اور خدا کی بارگاہ میں راز و نیاز کے دوران ہم بہت سارے موانع کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور نتیجے میں مطلوبہ مقاصد تک نہیں پہنچ پاتے۔

جب قرآن کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو نالین اتار کر آئیں نعلین سے مراد ذہنی نالین، فکری نالین اور فالتو چیزیں ہیں، جتنی بھی فالتو چیزیں ہیں سب چھوڑ کر آئیں، اپنی ساری رکاوٹیں اتار کر محض قرآن کی خدمت میں آجائیں۔

دل مانندِ آئینہ

۹) دل مانندِ آئینہ

ایک تشبیہ کے ساتھ فرماتے ہیں کہ دل مانندِ آئینہ ہے، دل کی مثال ظرفِ فہم ہونے کے اعتبار سے مانندِ آئینہ ہے، آئینے میں اگر غور کریں تو اپنے دل کی کیفیت سمجھ میں آجائے گی۔ آئینے کے حالات پر، آئینے کی مختلف شکلوں اور آئینے کی مختلف صورتوں پہ غور کریں تو اپنے دل کی حالت کو سمجھے میں آسانی ہوگی۔ بسا اوقات ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو اس کے اوپر غبار پڑا ہوتا ہے، عموماً جو آئینے کھلی ہوا میں، کھلی فضا میں ہوتے ہیں اور روزانہ ہوا چلتی ہے تو ان کے اوپر مٹی اڑتی ہے لہٰذا ان کے اوپر غبار پڑا ہوتا ہے، عموماً جب اس آئینے کے سامنے جا کر کھڑے ہوتے ہیں تو تصویر نظر نہیں آرہی ہوتی ہے لہٰذا فوراً آئینے کو غبار سے پاک کرتے ہیں، اسی طرح سے دل پر بھی انسان کا غبار چڑھ جاتا ہے، جب آئینہ صاف کر رہے ہوتے ہیں تو پہلی توجہ دل کی طرف ہو کہ جب

یہ صورت کا آئینہ اور جسمانی آئینہ غبار آلود ہے تو کہیں قرآن کا آئینہ بھی غبار آلود نہ ہو، وہ بھی تو میں نے کھلی فضا میں رکھا ہوا ہے، ہر ایک کے سامنے یہ دل رکھا ہوا ہے، ہر چیز اس پر اثر ڈال رہی ہے، اس دل پر بھی غبار آجاتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ آئینے کے لئے دو قسم کے موانع ہیں بعض موانع آئینے کے اندرونی ہیں کہ جو رُکاوٹیں خود آئینے کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض رکاوٹیں باہر سے آئینے کے اوپر آجاتی ہیں، فرماتے ہیں کہ اندرونی رکاوٹیں یا سلبی اور عدمی ہیں یا منفی رکاوٹیں اور وجودی ہیں یعنی یا کسی چیز کا نہ ہونا ایک رکاوٹ ہے یا کسی موجود کا، کسی حالت کا، کسی صفت کا اس کے اوپر طاری ہونا دوسری رکاوٹ ہے اور اسی طرح سے بیرونی رکاوٹیں بھی دو طرح کی ہیں، یا عدمی رکاوٹیں ہیں یا وجودی رکاوٹیں ہیں، عدمی رکاوٹیں یعنی جو چیز باہر سے ہونی چاہئے تھی وہ موجود نہیں ہے یا پھر وجودی رکاوٹیں ہیں یعنی جو چیزیں باہر سے نہیں ہونی چاہئے تھیں وہ بھی آئینے کے اوپر موجود ہیں۔

۱۰) دل کی راہ میں دو مشکلات

اسی طرح سے انسان کا دل بھی مانندِ آئینہ ہے، دل کے کچھ اندرونی مسئلے ہیں، دل کی اندرونی مشکلات ہیں اور یہ دو طرح کی ہیں یعنی سلبی اور اثباتی، اسی طرح سے دل کے اوپر باہر سے جو چیزیں آکر طاری ہو جاتی ہیں یہ بیرونی رکاوٹیں ہیں اور ان کی بھی دو صورتیں ہیں سلبی اور اثباتی و ایجابی یعنی کچھ ایسی منفی چیزیں ہیں کہ جو دل کے اوپر آکر چھا گئی ہیں، طاری ہوگئی ہیں اور کچھ ایسی

مثبت چیزیں ہیں، وجودی چیزیں ہیں، مثبت سے مراد وجودی چیزیں ہیں کہ جنہیں نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن یہ بھی دل کے اوپر طاری ہیں، حائل ہیں، اس قسم کا دل جو ان موانع میں مبتلا ہو تو جب یہ قرآن کے سامنے آتا ہے تو اگر باقی سارے آداب انسان نے فراہم کر بھی لئے ہیں لیکن یہ رکاوٹیں برطرف نہیں کی ہیں تو قرآن ہرگز دل میں نہیں اترتا کیونکہ رکاوٹوں نے دل کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔

کونسی حالتیں ہیں کہ جو اندرونی اور سلبی ہیں کہ جو نہیں ہونی چاہئے تھیں اور دل کے اندر موجود ہیں، فرماتے ہیں کہ جس طرح آئینے کے اندر بسا اوقات داغ و دھبہ لگ جاتا ہے، کیونکہ بعض آئینے ناقص جنس سے بنے ہوتے ہیں یا رطوبت کی فضا میں رہتے ہیں تو ان کے اندر زنگ کا داغ پڑ جاتا ہے چونکہ آئینے کے پیچھے سیسہ لگا ہوتا ہے، اس وجہ سے وہ زنگ ایجاد کرتا ہے، آئینہ تو شیشہ ہوتا ہے، شیشے کے پیچھے اگر سیسہ لگا دیں تو اس کو آئینہ بنا دیتا ہے، اس کے اندر انعکاس کی خصوصیت پیدا کر دیتا ہے، اسی طرح سے دل کے اندر بھی انعکاس کی خصوصیت ہے لیکن اگر یہ دل پڑا رہے، اس کا خیال نہ رکھیں اور اس کو نہ بچائیں تو اس کے اندر خود ہی خود رطوبت آجاتی ہے اور زنگ لگ جاتا ہے، اس کے اندر داغ و دھبہ آجاتا ہے۔ دل کی اندرونی کیفیت آئینے کی طرح ہے اور بعض اوقات دل پر باہر سے کوئی غبار آکر بیٹھ جاتا ہے، جس طرح آئینے پر باہر سے مثلاً گرد و غبار آکر طاری ہو جاتا ہے تو اسی طرح سے دل پر بھی باہر سے کوئی غبار آکر بیٹھ جاتا ہے اور یہ مانع بنتا ہے، یہ بھی اندرونی رکاوٹ ہے یعنی دل کی کیفیت بھی مانندِ آئینہ ہے، اندرونی وجودی چیز اور اندرونی عدمی چیز یعنی بسا اوقات آئینہ اندر سے آمادہ نہیں ہوتا اور بسا اوقات اندر سے کوئی ایسی وجودی چیز آئینے میں پیدا

ہو جاتی ہے، اسی طرح دل کے اندر بھی کبھی ایک سلبی چیز پیدا ہوتی ہے، دل کے اندر عدمِ آمادگی پیدا ہوتی ہے اور دل کی اندرونی حالت ضعیف ہو جاتی ہے، جیسے طفولیت و بچپنہ ہے یا بلادت وحماقت ہے۔

یعنی دل کی کچھ اندرونی رکاوٹیں ہیں اور فہم کی راہ میں کچھ بیرونی رکاوٹیں ہیں، یہاں پر صدرالمتألھینؒ کا زیادہ تر نکتہ کہ جس کے اوپر انہوں نے بحث کو متمرکز کیا ہے وہ موانعِ بیرونی ہیں یعنی باہر سے جو موانع دل کو پیش آتے ہیں چونکہ اندرونی موانع سے پہلے درج کر آئے ہیں کہ ان سے تطہیر ہونی چاہئے، دل پاک وصاف ہو، دل آمادہ ہو یعنی ادبِ دوم کہ جو طہارتِ قلب کے بارے میں ذکر کیا تھا اس کے اندر تقریباً اندرونی موانع کی نشاندہی موجود ہے کہ جن کو برطرف کرنے کی ضرورت ہے۔ خارجی موانع میں سے جو موانع اکثر اہلِ علم کو پیش آسکتے ہیں اور مبتلا بہ موانع ہیں ان سے خال خال انسان مستثنیٰ ہیں، اکا دکا افراد ہیں کہ جنہوں نے ان موانع کو عبور کیا ہے اور یہ ان کی راہ میں حائل نہیں ہیں، ان میں بھی فرماتے ہیں کہ کچھ عدمی ہیں اور کچھ وجودی ہیں۔ وجودی موانع وہ ہیں جو خارج سے انسان کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

آپؒ مزید فرماتے ہیں کہ اندرونی رکاوٹیں دو طرح کی ہیں، عدمی ہیں اور وجودی ہیں یعنی سلبی اور اثباتی ہیں، عدمی رکاوٹیں یعنی کچھ امور جنہیں ہونا چاہئے تھا اور نہیں ہیں، یہ نہ ہونا رکاوٹ ہے اور دوسری قسم کی اندرونی رکاوٹ وہ چیزیں ہیں کہ جو وجودی ہیں یعنی وہ امور کہ جو موجود ہیں اور انہیں نہیں ہونا چاہئے تھا، سلبی وعدمی رکاوٹوں میں مثال دیتے ہیں کہ قرآن فہمی کے لئے دل کے اندر

عدمِ بلوغ، طفولیت اور انسان کا بچپنہ رکاوٹ ہے یا بَلادَت وحماقت مانع ہے۔ یہ دل کے اندرونی حالات کے نام ہیں یعنی پیدائشی طور پر یا ابھی بالغ نہیں ہوا ہے، فقدانی حالت ہے یا عدمِ بلوغ ہے تو اس وجہ سے بھی دل کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے یا بَلادَت کی وجہ سے ہے یعنی بالغ تو ہوگیا ہے لیکن اَبلہ ہے، اَبلہ یعنی بیوقوف، احمق، نافہم اور کند ذہن ہے۔

۱۱)فہم کی راہ میں حائل رکاوٹیں

☆ طفولیت

موانعِ فہمِ قرآن میں ایک مانع طفولیت ہے کہ جس کا صدر المتالھینؒ کی کتاب مفاتیح الغیب میں ذکر موجود ہے۔ طفولیت یعنی عدمِ بلوغ، جب انسان بچہ ہو، بالغ نہ ہو اور رشدِ ذہنی و رشدِ فکری موجود نہ ہو تو انسان کے اندر یہ ایک سلبی و عدمی مانع ہے، اب انسان اس مانع کے برطرف ہونے کا انتظار کرے، ظاہر ہے کہ بچپنہ اختیاری نہیں ہے، عمر گزارے اور کچھ عرصہ انتظار کرے تا کہ رشدِ ذہنی اور بلوغِ ذہنی کی حد تک پہنچے، یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ انسان کو جسمانی بلوغ کے ساتھ ساتھ عقلی اور قلبی بلوغ بھی حاصل ہو، چہ بسا جسمانی بلوغ انسان کو حاصل ہوجاتا ہے لیکن عقلی بلوغ حاصل نہیں ہوتا ہے، بعض اوقات انسان مثلاً تیس چالیس سال کا یا اس سے بھی بڑا ہوجاتا ہے لیکن ذہنی طور پر، سوچ کے لحاظ سے، فہم کے لحاظ سے، فکر کے لحاظ سے ایک بچہ ہی ہوتا ہے لیکن کبھی برعکس ہوتا ہے، بعض انسان جسمانی طور پر بلوغ سے پہلے ذہنی طور پر بالغ ہوجاتے ہیں لیکن اسے عمومیت

حاصل نہیں ہے۔

یہ دونوں اتفاق استثنائی ہیں، کم لوگ ایسے ہیں کہ جو جسمانی طور پر بالغ ہو جاتے ہیں لیکن ذہنی طور پر نہیں ہوتے ہیں اور ان سے بھی کم تر لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جو ذہنی طور پر بالغ ہو جاتے ہیں اور ابھی جسمانی طور پر بالغ نہیں ہوتے ہیں، عمومیت اور اکثریت ان لوگوں کی ہے کہ جن کے ہاں جسمانی اور ذہنی بلوغ تدریجاً ایک ساتھ پیدا ہوتا ہے، اگر یہ لوگ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں تو بلوغِ ذہنی کا انتظار کریں۔

اس نکتے کی طرف توجہ کی شدید ضرورت ہے کہ ہم بچوں کے اوپر قرآن کو ٹھونسیں نہیں بلکہ ان کے ذہن، سن اور عمر کے مطابق قرآن میں وارد کریں کہ ان پر بوجھ نہ ڈلے، ایسا نہ ہو کہ یہ بیزار ہو جائیں، بسا اوقات یہی ہوتا ہے، یہ آفات میں سے ہے اور نقصان دہ چیز ہے کہ بچوں کو بجائے اس کے کہ قرآن سے اس طرح آشنا و مانوس کریں کہ آئندہ مستقبل میں یہ انسانِ قرآنی اور قرآن شناس انسان بنیں لیکن کچھ قرآنی کرتب کہہ لیں یا کچھ قرآنی ہنر اور فن ان کو سکھا دیتے ہیں اور پھر مجمع لگا کر اس کے سامنے وہ بچہ لوگوں کو محظوظ کرنے کے لئے مظاہرہ کرتا ہے یعنی لوگ قرآن سے مانوس نہیں ہو رہے ہوتے ہیں بلکہ بچے سے مانوس ہو رہے ہوتے ہیں کہ کیا بچہ ہے؟ کیا کمال کرتا ہے یہ بچہ؟ کچھ عرصے بعد بچے میں بھی قرآن کیلئے جاذبہ نہیں رہتا ہے بلکہ لوگوں کی واہ واہ اس کو پسند آ جاتی ہے چونکہ قرآن کے ذریعے سے اور قرآن کے بعض مسائل حفظ کرنے سے یا ہنرمندی دکھانے سے لوگ اس کو اچھا کہتے ہیں لہٰذا یہ اور شوق سے پڑھتا ہے، یہ قرآن آموزی کا طریقہ نہیں ہے۔

☆ طفولیت

بچے کی سطح تک بچے کو قرآن بتایا جائے یعنی جتنی اس کی سطحِ ذہنی ہے چونکہ اس بچے کو بالغ
ہونا ہے، ابھی نہ جسمانی طور پر بالغ ہے اور نہ ذہنی طور پر بالغ ہے، ہم ہرگز اس بچے سے توقع نہ رکھیں
کہ یہ بڑوں جیسے قرآن کے مفاہیم، معانی اور معارف کو درک کرے گا اور وہ طوطا وار رٹا کے اسے پھر
تکرار کروانا بھی بچے کے تکامل پر کوئی دلیل نہیں ہے، ایک وقت میں آ کر یہی چیز اس کیلئے نقصان دہ
ثابت ہوسکتی ہے چونکہ ابھی بچہ ہے، لوگوں کو محظوظ کرتا ہے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے یہ بعد میں بڑا
ہو جائے گا، داڑھی مونچھ نکل آئے گی، اب وہ جاذبہ اس کے اندر موجود نہیں ہوگا اور یہ پہلے سے پُر
توقع بچہ بن چکا ہے، پہلے سے تالیوں کا، واہ واہ کا، نعروں کا اور صلواتوں کا عادی وخوگر ہو چکا ہے لیکن
جب اس کی داڑھی نکل آتی ہے تو اب لوگ اس سے محظوظ نہیں ہوتے ہیں، داڑھی والا قرآن پڑھتا
ہے تو اسے پڑھنے دو اس سے ہمیں کیا ہے مزہ تو یہ ہے کہ چھوٹا سا بچہ پڑھے، لوگ اسی وجہ سے بچے
سے محظوظ ہوتے ہیں، بڑا ہو کر جب اس کو یہی پروٹوکول (Protocol) نہیں ملتا ہے تو اس کے لئے
مشکل پیش آتی ہے، نفسیاتی طور پر الجھن کا شکار ہو جاتا ہے، پھر کاذب حرکتیں کرنا شروع کرتا ہے
صرف لوگوں کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے کے لئے۔ یہ اچھی مثال نہیں ہے لیکن اس مثال کے بغیر
چارہ نہیں ہے کہ جس طرح سے فرض کریں کہ ایک جوان لڑکی ہے، جوانی کی وجہ سے خوبصورت ہے
اور لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے لیکن بالآخر جب اس کی عمر ڈھلتی ہے تو یہی حسن ماند پڑ جاتا ہے، چہرے پہ
جھریاں پڑ جاتی ہیں، بڑھیا ہو جاتی ہے لیکن وہ لوگوں کی نگاہوں کی ابھی بھی تشنہ ہے اور ان نگاہوں کو
اپنی طرف جذب کرنے کے لئے ہر حرکت کرتی ہے، کبھی الٹے سیدھے لباس پہنتی ہے، کبھی سرخی

لگاتی ہے اور کبھی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے تا کہ وہ نگاہیں جو پہلے میری طرف تھیں، کوچہ و بازار میں جب باہر نکلتی تھی تو سب مثلاً اپنے کام بھول جاتے تھے اور مجھے دیکھنا شروع کر دیتے تھے، اب بھی وہی رونما ہونا چاہیے، یہ پر توقع ہے لیکن اسے معلوم نہیں ہے کہ وہ کسی اور وجہ سے تھا۔

بچے کو اگر آپ نے پر جاذبہ بچہ بنا دیا ہے تو یہ پر توقع بچہ ہے، یہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اس کی توقعات زیادہ ہوتی جاتی ہیں، پھر یہ پوری کرنا مشکل ہیں اور جب درست راستوں سے پوری نہیں ہوں گی تو وہ کاذب راستے، اسی بڑھیا جیسے، اجو بن جیسے راستے اپنائے گا، اس کو کاذب شخصیت بنانی پڑے گی، شروع سے آپ بچے کو نہجِ قرآن پہ ڈال دیں، بچے کے اندر قرآن فہمی کی لحاظ سے ایک چیز مانع ہے اور وہ یہ ہے کہ ابھی طفل ہے، نابالغ ہے، نابالغ یعنی اندرونی مانع اس کے اندر موجود ہے اور سلبی مانع ہے۔

پس مانعِ قرآن میں ایک وجہ عدمِ بلوغت ہے، غیر بالغ انسان کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے البتہ یہ برطرف کرنا اختیاری نہیں ہے، برطرفی کیلئے انتظار اختیاری ہے کہ تھوڑا انتظار کر لیں، اس وقت تک بچے کے اندر قرآن کے بارے میں اور فہمِ قرآن کیلئے رغبت پیدا کریں۔

☆ بَلادتْ

☆ بَلادَت

فہمِ قرآن کی راہ میں دوسرا مانع بلادَت ہے یعنی کند ذہنی، بے وقوفی اور فقدانِ عقل، ابلہ ہونا یعنی ذہن کا درست کام نہ کرنا، جیسے کچھ لوگوں کا ذہنی رشد اصلاً کم ہوتا ہے، بہت سارے مسائل

کی وجہ سے ان کے اندر فہم کم ہوتی ہے، یہ بھی ایک اندرونی وسلبی مانع ہے، چہ بسا انسان اسّی (80) سال تک پہنچ جائے لیکن بلادت کی وجہ سے انسان کو رشدِ ذہنی حاصل نہ ہو، یہ اور بات ہے کہ عمر کے لحاظ سے انسان میں عقل نہ ہو، بلوغ نہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ عمر کے لحاظ سے جسمانی طور پر بالغ ہو جائیں لیکن ابھی بھی اس کے اندر عقل نہیں آئی ہو لہٰذا اس کو اَبلَہ یعنی بیوقوف، نافہم اور ڈل (Dull) انسان کہتے ہیں، اس کو جتنا بھی سمجھاتے رہیں لیکن کوئی چیز اس کے پلے نہیں پڑتی ہے کہ متأسفانہ بعض ایسے ہیں کہ جن کے اندر یہ عارضہ موجود ہے یا پیدائشی طور پر ہوتا ہے یا بعد میں حالات کی وجہ سے ان کے اندر یہ بلادَت آجاتی ہے اور اتفاقاً آج کل تھوڑا تو فرق پڑا ہے لیکن پاکستان میں سنی اور شیعہ دونوں کے اندر یہ ایک رجحان تھا کہ جو بچہ اَبلَہ ہوتا تھا، ڈل ہوتا تھا، نافہم اور کند ذہن ہوتا تھا اس کو قرآن حفظ کرنے کے لئے بھیج دیتے تھے یعنی میدانِ قرآن کے لئے اَبلَہ لوگوں کو بھیجتے تھے اور ان کو بھی سالہا سال لگ جاتے تھے، حفظِ قرآن کبھی الٹالٹکا کے حفظ کروایا جاتا تھا، کبھی زنجیروں میں باندھ کر حفظ کروایا جاتا تھا، بعض چینلز (Channels) نے حفظِ قرآن پر فلمیں بھی بنائی ہیں کہ کس طرح سے پاکستان میں حفظ کراتے ہیں یعنی ان استادوں کے ڈنڈے کی مار کھا کھا کے وہ جان دے دیتے ہیں، مر جاتے ہیں چونکہ کند ذہن ہیں اور حفظ نہیں کر سکتے ہیں۔

اسی طرح سے علمِ دین پڑھنے کے لئے بھی پاکستان میں وہی معیار ابھی بھی ہے لیکن پہلے زیادہ تھا کہ کند ذہن ترین آدمی کو علمِ دین کے لئے انتخاب کر کے بھیجتے تھے، جو بچہ اچھا ہو اس کو اسکول میں، تجارت میں یا کسی اور میدان کے لئے انتخاب کرتے تھے اور جو کند ذہن ہو وہ دین پڑھنے

چلا جائے اور نتیجہ بھی ظاہر ہے کہ جب کند ذہن لوگ قرآن کی طرف آئیں گے، کند ذہن لوگ دین پڑھنے کے لئے آئیں گے تو اس دین کا کیا حشر ہوگا؟ اس قرآن کا کیا حال ہوگا؟ اس مذہب کا کیا حال ہوگا؟ کہ جس کے علماء یا جس کے طلبہ یا جس کی طرف رغبت رکھنے والے لوگ کند ذہن لوگ ہوں۔ قرآن اگر کند ذہنوں کا میدان ہو جائے تو نتیجہ وہی ہوگا کہ جو آج ہے، اس سے بہتر نہیں ہوسکتا ہے، یہ انہی کند ذہن طبقے کے دین کی طرف آنے کا نتیجہ ہے کہ جو آج موجود ہے، کند ذہنی بھی ایک مانع ہے، خدا کا لطف اگر کسی کے شاملِ حال ہو جائے تو یہ برطرف ہوسکتی ہے، مگر کند ذہنی کا کوئی علاج نہیں ہے، خصوصاً حماقت اور بیوقوفی کا کوئی علاج نہیں ہے۔

حتیٰ انبیاء علیہم السلام بھی احمقوں اور ابلہ لوگوں سے پناہ مانگتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ خدایا میں لا علاج مریض کا علاج کرسکتا ہوں، مردہ زندہ کرسکتا ہوں، مبروص ومجذوم کا علاج کرسکتا ہوں، ہر بیمار کا علاج کرسکتا ہوں لیکن احمق اور اَبلَہ کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے یعنی ہر دردمند انسان میری طرف بھیج دے میں علاج کرلوں گا لیکن بیوقوف سے میرا پالا نہ پڑے اسلئے کہ بیوقوفی کا کوئی علاج نہیں ہے مگر یہ کہ لطفِ خاصِ خدا شاملِ حال ہو جائے، بعض افراد کے حالاتِ زندگی میں ہے کہ لطفِ خدا ان کے شاملِ حال ہوا ہے یعنی اوائلِ عمر میں کند ذہن تھے لیکن بعد میں یا دعا کی یا توسل کیا، بالآخر کچھ بھی اتفاق ہوا لیکن ان کی وہ کند ذہنی برطرف ہوگئی اور انہی لوگوں نے بہت علمی کارنامے انجام دیئے، دنیوی میدان میں یا دینی میدان میں ہر دو میں ایسا اتفاق ہوا ہے۔

یہ جو مخترِ بلب ہے یعنی ایڈیسن، یہ اَبلَہ ترین انسان تھا اور بلادت و کند ذہنی کی وجہ سے اس کو کوئی اسکول میں داخلہ نہیں دیتا تھا بلکہ نکال دیتے تھے حتیٰ اس کی ماں نے ان استادوں کے ساتھ لڑائی کی، شاید ان کی ماں کی ان کے ساتھ ہاتھا پائی تک ہوئی چونکہ اس کے بچے کا سر زیادہ فوق العادہ تھا، موٹا تھا، اس کی جسامت سے زیادہ بڑا سر تھا اور اس وجہ سے وہ کہتے تھے کہ یہ کند ذہن ہے، ابلہ ہے، اس کو معمولی چیزیں سمجھ نہیں آتی تھیں مثلاً ان کے بقول اس کو اے بی سی بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور ماں نے عہد کیا کہ جسے تم کند ذہن سمجھ کر نکال رہے ہو میں اسی کو تعلیم دوں گی یعنی آپ یہ کہیں کہ محکمہ ٔتعلیم نے اس کو کند ذہن ہونے کا رسمی سرٹیفیکیٹ (Certificate) دے دیا تھا تو ماں نے یہ چیلنج قبول کیا، خواتین یہ مطالب ذہن میں رکھیں کہ اس ماں نے اپنے لئے اس کو ایک چیلنج سمجھا اور کہا کہ جس کو تم نے کند ذہن قرار دے کر نکال دیا ہے میں اسی کو تعلیم دے کر تمہارے سامنے پیش کروں گی اور نہایتاً اس ماں کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے اس بچے کے اندر رغبت بھی پیدا کی، اس کو تعلیم بھی دی اور نہایتاً وہ دنیا کے نامی گرامی ترین انسانوں میں سے ایک انسان بنا یعنی وہ کام جو بڑے بڑے نام اور ذہن نہیں کر سکے وہ اس ابتدائی عمر کے کند ذہن بچے نے کر دیا اور اس نے نابغہ لوگوں میں اپنا نام درج کروایا، ایسے نمونے اور بھی موجود ہیں، بہر کیف اس کے اندر لطفِ خدا اہم شرط ہے۔ باقی کوئی طبی علاج یا یوگا (Yoga) جیسا کوئی علاج نہیں ہے کہ جس سے انسان کی کند ذہنی برطرف ہوتی ہو، خدا سے دعا کریں، لطفِ خدا ہو جاتا ہے، بہت سارے دینی نمونے بھی ہیں، میں ان شخصیات کے جان بوجھ کے نام نہیں لے رہا ہوں، ممکن ہے کہ ذہنوں میں تصویر اچھی بنی ہوئی ہے اور اگر ان کے

ابتدائی زمانے کے بارے میں ایسے ذکر کیا جائے کہ کند ذہن تھے تو تھوڑا فرق پڑ جاتا ہے، احترام کم ہو جاتا ہے لیکن یقین جان لیں کہ دینی میدان میں بھی بعض افراد ایسے ہیں کہ حوزۂ علمیہ میں گئے تو وہاں کند ذہن تھے لیکن خدا سے دعا کی، روئے، گڑگڑائے کہ کیوں دوسروں کو مطلب سمجھ میں آتا ہے اور ہمیں سمجھ نہیں آتا چنانچہ خدا نے ایک لطف ان کے شاملِ حال کیا اور انہوں نے بہت بڑے علمی کارنامے انجام دیئے۔

روایت میں ہے کہ

أَكْثَرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ اَلْبُلْهُ......(۹)

اکثر اہلِ بہشت ابلہ ہوں گے......

چونکہ ان کا گناہ نہیں ہوتا ہے، یہ مکلّف نہیں ہوتے ہیں اور کسی بے گناہ کو خدا جہنم میں نہیں ڈالے گا تو ظاہر سی بات ہے کہ یہ پھر جنت میں ہی جائیں گے۔ ابلہ لوگ یعنی جن کی سوجھ بوجھ صحیح نہیں ہے، جن کو عموماً عام عوام الناس اللہ والے کہتے ہیں اور بعض کے بقول یہ جنت جائیں گے بھی تو بغیر حساب وکتاب کے جائیں گے، ظاہر ہے کہ ان کی عقل وہوش تو ہے نہیں لہٰذا ان کو کسی جگہ ٹھہرایا بھی نہیں جائے گا، ان سے پوچھا بھی نہیں جائے گا، ان سے حساب وکتاب بھی نہیں ہوگا، جن کا حساب کتاب زیادہ ہو تو ان کو ٹائم بھی زیادہ لگتا ہے لیکن جن کا حساب نہ ہو تو وہ جلدی نکل جائیں گے، حساب کتاب والے جب پہنچیں گے تو جنت میں آگے رش ہوگا کیونکہ یہ سارے وہاں پہلے سے موجود ہوں گے۔

چونکہ یہ مکلّف نہیں ہیں اس وجہ سے ان کا کوئی گناہ بھی نہیں ہے، کہتے ہیں کہ یہ مَرفوع القلم ہیں لیکن جن کو خدا نے عقل جیسی نعمت دی ہے ان کے لئے معاملہ دشوار ہے، اسی لئے خداوند نے فرمایا تھا کہ انسان نے اپنے لئے ایک ایسا پرخطر راستہ انتخاب کیا ہے کہ

اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا٥(١٠)

بیشک ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا بس انسان نے اسے اٹھالیا کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔

ان کو کیا پتہ کہ یہ کیسی وادی ہے؟ اور یہ سفر کیسے طے ہونا ہے؟ یہ انسان ظلوم وجہول ہے، ظلوم ہے یعنی حدیں تجاوز کرے گا، ظالم یعنی تجاوزِ حد کرے گا، جانا کہیں اور ہے اور یہ کہیں اور چلا جائے گا، جہول ہے یعنی اصلاً اس کو پتہ نہیں ہے، اس کو اندازہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے لئے کتنا پرخطر راستہ انتخاب کیا ہے؟ ہم نے جب یہ امانت کائنات کو پیش کی تو اس نے قبول نہیں کی لیکن انسان نے بڑھ کر قبول کیا، وہ ظلوم اور جہول ہے۔ یہی پرخطر وادی تھی کہ عقل خدا نے دی ہے، دل خدا نے دیا ہے اور یہ اس دل کو قابو میں نہیں رکھ پائے گا، اس دل کو آلودگیوں سے نہیں بچا سکے گا، اس دل کو موانع سے نہیں بچا سکے گا، اس دل کے اندر موانع آجائیں گے، کچھ غیر اختیاری موانع ہیں، جیسے طفولیت ہے اور ابلہ ہونا ہے، یہ عیب نہیں ہے بلکہ اس میں فائدہ بھی ہے، بعض عقل مندوں نے خدا سے دعا

کی تھی کہ اے کاش! خدایا ہمیں بھی اسی طرح بیوقوف بنا دیتا، یہ اتنے درد و رنج، اتنی مشکلات، اتنے مصائب اور یہ سب کچھ نہ ہوتا، جس طرح وہ خوش ہیں اس طرح ہم بھی خوش ہوتے، کیوں ہمیں اتنی سوجھ بوجھ دی ہے کہ ہمیں ہر چیز سمجھ میں آتی ہے؟ ان کی طرح بنایا ہوتا کہ جن کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

یہ مانع اگر برطرف ہو جائے تو فَبِھَا، جیسے طفولیت ہے کہ ایک دن برطرف ہو جائے گی لیکن یہ بلادت، حماقت اور سفاہت برطرف ہونے والی نہیں ہیں، یہ آخر تک رہتی ہیں اور سخت بیماریاں ہیں کہ خدا کسی کو ان میں مبتلا نہ کرے۔

ان کے علاوہ کئی دیگر موانع بھی موجود ہیں کہ جو فہمِ قرآن کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، انشاءاللہ اس فصل کے حصہ دوم میں ان موانع کی نشاندہی بھی کی جائے گی۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱)......(شرح نهج البلاغة - المقتطف من بحار، الجزء ۱، صفحه ۱)
(جلوه تاریخ در شرح نهج البلاغه، الجزء ۱۹، صفحه ۱)(مناقب أمير المؤمنينؑ - محمد بن سليمان الكوفي، الجزء ۲، صفحه ۷۷)(سیمای کارگزاران علیؑ ابن ابی طالبؑ، الجزء ۱۷، صفحه ۱۳)

(۲)......(سورهٔ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۵۷)

(۳)......(سورهٔ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۷)(سورهٔ مبارکہ انفال، آیہ ۳۷)(سورهٔ مبارکہ عنکبوت، آیہ ۵۲)
(سورهٔ مبارکہ زمر، آیہ ۶۳)

(۴)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰه جوادی آملی مدظله)
(تفسير القرآن الكريم - السيد مصطفى الخمينیؒ، الجزء ۲، صفحه ۱۸۹)
(بحار الأنوار - علامه محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحه ۱۸۴)
(مستدرک سفينة البحار - العلامة آية اللّٰه الشيخ على النمازی، الجزء ۸، صفحه ۱۲۴)(ميزان الحكمة - الريشهری، الجزء ۸، صفحه ۲۱۰)

(۵)......(فی رحاب القرآن)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - الحاج ميرزا حسين النوری الطبرسیؒ، الجزء ۴، صفحه ۲۵۰)(سنن النبی الاکرمؐ)

(۶)......(روح المعانی فی تفسير القرآن العظيم والسبع المثانی، الجزء ۱۱، صفحه ۳۶۵)

(۷)......(كشف الخفاء و مزيل الالباس - العجلونی، ناشر: دار احياء التراث

العربی،الجزء ۲،صفحہ ۱۴۵)

(۸)......(سورۂ مبارکہ طہ،آیہ۱۲)

(۹)......(مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ،الجزء ۱۱، صفحہ ۱۹۵)(امالی السید المرتضیؒ)(بحار الأنوار - العلامة المجلسیؒ،الجزء ۵، صفحہ ۱۲۸)(مستطرفات السرائر - ابن ادریس الحلیؒ،الجزء ۱،صفحہ ۱۹) (مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازیؒ،الجزء ۱، صفحہ ۴۲۱)(کلمات الرسول،الجزء ۱،صفحہ ۲۶۷)(العمدة- ابن البطریق، الجزء ۱،صفحہ ۱۸۹)(اختیار مصباح السالکین)(رجال الکشی)(جواهر القرآن - ابو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی،المتوفی: ۵۰۵ ھ، الجزء ۱،صفحہ ۲۷)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ احزاب،آیہ ۷۲)

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ دوم)

۱)فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ

☆مخارج کیلئے حساسیت پیدا نہ کریں

☆عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں

☆قارئ قرآن ہونا عالمِ قرآن ہونے کی دلیل نہیں

۲)تقلیدِ محض

☆تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ آبائی میں فرق

☆تقلید کی مزید وضاحت

☆ مذموم تقلید

☆طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں

☆درس پڑھنے کا نسخہ

☆جمود، باعثِ تعصب

☆کمزور نفوس کی مشکل

☆استاد اور شاگرد کا رابطہ

☆رشد حاصل نه هونے کی وجه

☆شیطانِ تقلید کا حمله

☆تعصبات،مذهبی دنیا کا بڑا مسئله

☆تضاربِ آراء کو تحمل کریں

☆علم کے ساته حلم کی ضرورت

☆صوفیاء کی حقیقت

☆عرفاء کے نزدیك علم حجاب هے

☆ٹهگ صوفیاء و عرفاء

☆محقق عرفاء کی بات کا صحیح معنٰی مراد لیں

☆جدلی مزاج،مذهبی دنیا کی ایك اور مشکل

☆تقلیدی وجدلی علم حجاب هے

۳)عربی علوم

☆معانی فقط الفاظ میں منحصر نهیں هوتے

☆عربی ضرور سیکهیں لیکن افراط و تفریط کے بغیر

☆مقصودِ اصلئ قرآن

٤)تفاسیر پر جمود

☆تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء

آدابِ فہمِ قرآن میں ہماری بحث ادبِ ششم میں جاری ہے اور وہ ادب رفعِ موانع سے عبارت ہے، بعض موانع ایسے ہیں کہ جو باہر سے انسان کے دل پر طاری ہوجاتے ہیں اور فہمِ قرآن میں رکاوٹ بنتے ہیں یعنی نورِ قرآن انسان کے دل میں نہیں اترتا ہے۔صدر المتألھینؒ نے کتاب میں کچھ بیرونی موانع ذکر فرمائے ہیں کہ جن کی تشریح ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

۱)فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ

الاول: ان یکون الانسان مصروف الھم الی تحقیق الحروف و اخراجھا من المخارج......

صدر المتألھینؒ کے مطابق بیرونی موانع میں سے پہلا مانع یہ ہے کہ انسان اپنی ساری تحقیق ہمت، طاقت و ارادہ ادائے حروف و الفاظ میں صرف کردے یعنی جو لوگ قرآن کی طرف رغبت رکھتے ہیں یا انہیں اس طرف ڈال دیا جاتا ہے غالباً نوخیز لوگوں کو، کم عمر لوگوں کو کہ جن کے اندر محبت و رغبتِ قرآن ہے لیکن شناختِ کافی نہیں ہے یا یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہمیں کس طرح سے قرآن سے استفادہ کرنا ہے لہٰذا یہ کسی بڑے سے پوچھتے ہیں اور راہنمائی لیتے ہیں لیکن وہ راہنما بھی انہیں عموماً ان کاموں میں ڈال دیتا ہے کہ یہ کام کریں اور پھر ساری عمر اسی کے اندر صرف کردیتے ہیں۔

جب انسان قرآن پڑھنے لگتا ہے تو اس پر یہ قاری حضرات زیادہ حساسیت ایجاد کردیتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک حرفِ قرآن مثلاً ''الف''، ''ب'' یا وہ حروف کہ جو عربوں کے علاوہ دوسروں سے تلفظ نہیں ہوتے ہیں غلط پڑھے تو اس کیلئے جہنم ہے، مثلاً اگر کسی نے درست طریقے سے ''ض'' ادا

نہ کیا تو وہ جہنم چلا جائے گا، اگر کسی نے ''س'' اور ''ص'' میں فرق نہ کیا تو وہ جہنم میں جائے گا، ظاہر ہے کہ جہنم سے تو کسی نہ کسی طرح بچنا ہے، بعض لوگ یہ فرق نہیں کر سکتے ہیں اسی لئے وہ قرآن پڑھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ جہنم کیوں جائیں، اگر قرآن پڑھیں تو بھی جہنم جانا ہے کہ ہم ''س'' اور ''ص'' میں فرق نہیں کر سکتے ہیں تو بہتر ہے کہ قرآن نہ پڑھیں اور جہنم میں جائیں، توجہ فرمائیں کہ درست ہے یہ روایات میں بھی ہے کہ قرآن عربوں کی طرح پڑھو، عربی لحن میں پڑھو لیکن جس کو تکلیفِ مالایطاق کہتے ہیں یعنی طاقت سے باہر تکلیف وہ خدا نے کسی پر عائد نہیں کی ہے، مکلّف نہیں بنایا ہے،

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا مَا آتَاهَا...... (۱)

اللہ کسی کو اس سے زیادہ مکلّف نہیں بناتا جتنا اسے دیا ہے......

اور قرآن نے مزید کہا کہ

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا...... (۲)

اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا......

جتنی خدا نے طاقت دی ہے اتنی ہی ذمہ داری ڈالی ہے، یہ طاقت مختلف لحاظ سے ہے، از جملہ علاقائی اور نژادی تفاوت جو اس وقت موجود ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پورے مخارج کے ساتھ یعنی گلے کے نیچے جو مخرج موجود ہے جو آخری سینے کے ساتھ متصل ہے وہاں سے لے کر لب تک بیچ میں تمام مخارج ہیں اور ان تمام مخارج کو استعمال کرو کہ اس طرح جیسے عرب بولتے ہیں۔ عرب جب بولتے ہیں تو وہ اس داخلی فضا کی ہر جگہ سے ایک نہ ایک حرف نکال لیتے ہیں، ایک صوت نکال لیتے

فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ

ہیں لیکن ساری قومیں ایسی نہیں ہیں، سارے علاقے ایسے نہیں ہیں، بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو سرے سے بولنے میں گلا استعمال نہیں کرتے ہیں یعنی ان کے گلے سے کوئی صوت نہیں نکلتی ہے اور یہ نکال بھی نہیں سکتے ہیں، اگر ان کو مجبور کریں کہ گلے سے نکالو تو ان کو اِستفراغ ہونے لگتی ہے، مثلاً ہمزہ (ء) ہے، عموماً آپ دیکھیں کہ حمزہ قلب سے ادا ہوتا ہے، یہ عربوں کے اندر بعض قرائتوں میں ہے کہ ''ع'' سے بھی زیادہ غلیظ ہمزہ ہے چونکہ حمزہ جب عرب تلفظ کرتا ہے تو اس طرح سے کہ جیسے انسان تھوع یعنی متلی کرتا ہے کہ اندرونی مواد باہر نکلنا ہوتا ہے، ہمزہ ادا کرتے وقت انسان کی وہ حالت بنی ہوتی ہے اس لئے خود عرب بھی پسند نہیں کرتے ہیں کہ گفتگو میں ہمزہ ادا کریں، چونکہ خود انہیں بھی اچھا نہیں لگتا ہے کہ قرأت میں بولتے ہوئے تھوع کی حالت ہو لہٰذا وہ عموماً ہمزہ کو سلب کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ کسی اور آسان سے مخرج کا استعمال کرتے ہیں کہ جہاں یہ حالت ادا نہ کرنی پڑے۔

فقط مخارج کی ادائیگی پر توجہ

یہ عربی لہجے اور عربی علاقے کی ایک خصوصیت ہے، عربی ماحول میں جب بچہ پرورش پاتا ہے تو بچپن سے ہی وہ گلے اور گلے کے اطراف کی ساری آوازوں سے صوتیں نکالنا سیکھ لیتا ہے، اس کی مشق ہوتی ہے لیکن فرض کریں کہ ایک کورین، ایک جاپانی، ایک چائنیز کہ جو صرف ہونٹوں سے بولتے ہیں اور پورا منہ بھی استعمال نہیں کرتے ہیں یعنی یہ لوگ جو صوت نکالتے ہیں تو اپنے منہ کا داخلی حصہ بھی پورا استعمال نہیں کرتے ہیں اور سب سے زیادہ چار سو (400) کے قریب چائنیز کے حروف تہجی ہیں، یہ سارے چار سو حروف ہونٹوں سے ادا کرتے ہیں یعنی منہ کے داخلی حصے کہ جن کو تالو کی فضا یا جوفِ دہن کہتے ہیں یعنی یہ جو منہ کا داخلی اور بتیسی کے اندر کا حصہ ہے اس کو بھی استعمال نہیں کرتے

ہیں، یہ ساری لغت جس نے ہونٹوں سے بولنی ہے اس کو اگر آپ کہیں کہ وہ تہہ دل کے ساتھ وہ مخرج کہ جو سینے کے ساتھ اور پھیپھڑے کے ساتھ اٹیچ (Attach) ہے اس کو بھی تم نے استعمال کرنا ہے تو اصلاً اس کے لئے یہ مقدور نہیں ہے۔

☆مخارج کیلئے حساسیت پیدا نہ کریں

بعض لوگ مخارج کی ادئیگی کیلئے اسی طرح سے حساسیت پیدا کرتے ہیں خصوصاً غیر عربوں کے لئے کہ ان کو اس طرح سے حساس بنا دیا جائے کہ انسان عِفرِیت کی حد تک آجائے اور فقط درست ادائیگیٔ الفاظ پر ہی اکتفا کرلے، اس کے معانی یہ نہیں ہیں کہ ادائے الفاظِ قرآن نادرست بھی درست وصحیح ہے، انسان ہرلحاظ سے کوشش کرے کہ قرآن کا درست تلفظ کرے لیکن درست تلفظ پر ہی نہ رک جائے کہ انسان ساری ہمت درست الفاظ کی ادائیگی پر ہی صرف کردے اور اسی میں ساری عمر گزاردے۔

اتفاقاً ایک دفعہ سفرِ تبلیغی میں ایک معمر خاتون نے مجلس و درس سنا اور پھر آخر میں کہنے لگی کہ ایک مشکل ہے، انہوں نے بتایا کہ میں پہلے قرآن سے مانوس تھی، قرآن پڑھتی تھی اور مجھے قرآن میں لذت محسوس ہوتی تھی، اس نے بتایا کہ میں پہلے کس طرح سے قرآن پڑھتی تھی؟ نماز پڑھتی تھی؟ کہا کہ بعد میں قم سے پڑھی ہوئی ایک محترمہ آئیں اور انہوں نے آکر ہمیں اچھے طریقے سے تبلیغ کی اور از جملہ انہوں نے یہ تجوید وقرأت وغیرہ بھی سکھائی، انہوں نے کہا کہ مثلاً نماز میں اس طرح سے

مخرج نکالتے ہیں، صراط کو میں پہلے سراط کہتی تھی، اس نے کہا کہ نہیں اس طرح سے ادا کرنا ہے اور اسی طرح بتایا کہ نعبد کس طرح کہتی تھی؟ نستعین کس طرح کہتی تھی؟ اس نے سارے مخارج ٹھیک کرائے، الحمد پہلے میں اور طرح پڑھتی تھی اور اس نے اور طرح سے پڑھایا پھر اس نے اتنا ڈرایا کہ ہم نے اسی سے یہ سارا کچھ سیکھا، سیکھنے کے بعد بھی اب ظاہر ہے کہ بڑھاپے میں وہ کس طرح سے ادا کریں، اس نے اپنی الجھن ذکر کی اور وہ بیان کرتے ہوئے رو پڑی کہ اب میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ میں جب قرآن پڑھتی ہوں تو بسم اللہ کا مجھ سے درست تلفظ نہیں ہوتا ہے اور میں کئی دفعہ پڑھنے کے بعد اکتا کر قرآن بند کر کے رونا شروع کر دیتی ہوں، مجھ سے نہ رحمٰن ادا ہوتا ہے نہ رحیم ادا ہوتا ہے درحالیکہ پہلے رحمٰن و رحیم غلط پڑھتی تھی لیکن مجھے پتہ تھا کہ رحمتِ خدا میرے شاملِ حال ہے، نہ نماز میں وہ لطف رہا نہ لذت رہی، نہ قرآن میں وہ لذت رہی، کہا کہ میں اس کے لئے دعا کرتی ہوں لیکن اس نے مجھے ایسی الجھن میں ڈال دیا ہے کہ اب سب عبادتیں آہستہ آہستہ مجھ سے چھٹتی جا رہی ہیں، کہا کہ میں پہلے ہر نماز کے بعد مناجات و کثرت سے مفاتیح پڑھا کرتی تھی لیکن مجھے خود پتہ ہے کہ میں غلط پڑھ رہی ہوں لہٰذا اب دعا و مناجات پڑھنے کو جی نہیں کرتا ہے۔

جب انسان اپنا سارا ہم و غم اسی مخرج پر لگا دے تو ایسے ہی ہوتا ہے، آپ حتی المقدور کوشش کریں، جس زبان کا تلفظ کر رہے ہیں اس کا صحیح تلفظ کریں لیکن مقدور بھر حد تک، ظاہر ہے کہ ایک عرب کے لئے جو مقدور ہے وہ ایک عجم کے لئے قطعاً مقدور نہیں ہے کہ عجم اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے عرب بن جائے، زندگی، کاروبار، بیوی، بچے سب کو چھوڑ کر عرب بننے کی کوشش کرے کہ اپنا

☆ مخارج کیلئے حساسیت پیدا نہ کریں

مخرج درست کریں یہ درست نہیں، جتنا آپ کے لئے مقدور ہے کوشش کریں کہ اس زبان کو اسی کے لہجے میں پڑھیں۔ جب ہم دوسری زبانیں بولتے ہیں تو کیا معنی بدل جاتا ہے؟ مثلاً آپ انگریزی بولتے ہیں، انڈین اور پاکستانی کا انگریزی میں اپنا خود ایک مستقل لہجہ ہے کہ جو انگریزوں کو بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے اور اصلاً کوئی پرواہ نہیں ہے، بڑی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ جب عرب فارسی بول رہا ہوتا ہے تو کیا معنی بدل جاتے ہیں؟ جب وہ عربی لہجے میں فارسی بول رہا ہوتا ہے تو کیا الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں؟ مثلاً جب ایرانی کہتا ہے کہ **حال شما چطورِہ** لیکن عرب کسی اور طریقے سے بولتا ہے تو کیا اس میں معنیٰ بدل جاتا ہے؟ کیا چطورہ اور چہ تورہ سے معنیٰ بدلتے ہیں؟ واقعاً یہ مانع ہے اور بعض صرف اسی کو کلِ قرآن سمجھتے ہیں، اگر ہم درست تلفظ کی یہ قدرت پیدا کرلیں تو کیا جبرئیل علیہ السلام سے بھی بڑھ کر قرآن شناس بن جائیں گے؟ مصری قاریوں کا تخصص فقط یہی ہے۔ ''س'' کے ساتھ سراط ہو یا ''ص'' کے ساتھ صراط ہو، لیکن یہ صراط کیا ہے؟ اس کیلئے ان مخارج کی مشق نے فرصت ہی نہیں دی تا کہ ہم اس کے معنیٰ کی طرف بھی جانے کی کوشش کرتے۔ مگر ہم لاابالی رہیں اور غلط سلط پڑھیں وہ بھی درست نہیں ہے، اس قید کے ساتھ کہ مقدور بھر حد تک درست پڑھے، اس سے کوئی غلط معنیٰ اخذ نہ کرے، جتنا عجم کے لئے مقدور ہے۔

☆عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں

عجم کو عرب بنانا خدا کی طرف سے فریضہ نہیں ہے۔ اگر سارے عجم چاہیں کہ عرب بن

☆عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں

جائیں تو نہیں بن سکتے ہیں، اصلاً پیدائشی طور پر ہم نے وہ مخارج کبھی استعمال ہی نہیں کیے ہیں، ہماری زبانوں میں، اردو میں، فارسی میں اور دوسری زبانوں میں وہ مخارج ہیں ہی نہیں تو ہم کس طرح مہارت سے ادا کر سکتے ہیں مثلاً یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک عرب کو کہیں کہ ''ڈ'' ادا کرو، کیا وہ کر سکتا ہے؟ جو ''ڈ'' ادا نہیں کر سکتا ہے وہ جہنم میں جائے گا، کیسے جہنم میں جائے گا؟ عرب والے ''ڈ'' ادا نہیں کر سکتے ہیں، ''ٹ'' ادا نہیں کر سکتے ہیں، کچھ چیزیں ہیں کہ جو ہم ادا کر سکتے ہیں اور وہ ادا نہیں کر سکتے ہیں اور کچھ چیزیں ہیں کہ جو وہ ادا کر سکتے ہیں اور ہم ادا نہیں کر سکتے ہیں، مثلاً ایک عرب نے آ کر عجم کے سامنے اپنا کوئی مدعا بیان کرنا ہے تو حتماً پہلے ''ٹ'' کی تمرین کر کے آئے، مشق کر کے آئے، ''ڈ'' کی تمرین کر کے آئے، پہلے ''ڑ'' درست کر کے آئے، وہ یہ کام نہیں کر سکتا ہے اور نہیں کرتا لیکن پھر بھی معنیٰ نہیں بدلتا ہے، ہم جس کو ڈالڈہ کہتے ہیں وہ دالدہ ہی کہتے ہیں، پھر بھی ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے؟ ہم ''ٹی'' کہتے ہیں وہ اس کو ''تی'' کہتا ہے، وہ ''ٹی'' نہیں بول سکتے ہیں چونکہ ان کے لئے مقدور نہیں ہے۔

☆ عجمی کو عرب بنانا مقصود نہیں

آپ ایک ایرانی سے ''ڑ'' کا تلفظ ادا کروا کے دیکھ لیں، ہمارے لئے ''ڑ'' بولنا کتنا آسان ہے، مثلاً اسے کہو کہ آڑو بولو جنت میں جاؤ گے تو وہ نہیں بول سکتا ہے، یہ اس کی زبان نہیں ہے، اس کا مخرج نہیں ہے، اس کی تمرین اور اس کی مشق نہیں ہے، کیوں اس پر ایسا غیر طبعی بوجھ ڈالتے ہو؟ عربی درست پڑھو، فارسی کا درست تلفظ کرو، ہر زبان درست پڑھو لیکن مقدور بھر حد تک۔ یہ کبھی بھی نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم ایرانیوں کی طرح فارسی بول سکیں، ہم جتنی بھی کوشش کریں کہ وہی لہجہ بنا لیں تو پھر بھی

کہیں نہ کہیں پکڑے جاتے ہیں۔ یہ ترک جو ایرانی ہیں یہ فارسوں کے لہجے میں نہیں بول سکتے ہیں تو ہم باہر سے آکر کیسے فارسی لہجے میں بول سکتے ہیں؟ یہ ساری زبانوں کا مسئلہ ہے، قرآن کی ایک عربی زبان ہے، عجم کے لئے اس کے مخارجِ دقیقِ عربی مشکل ہیں لیکن اب اپنے لئے چیلنج نہ سمجھ لیں کہ اب یہی کرنے ہیں اور یہ قدرت وصلاحیت بعض میں کثرتِ تمرین سے پیدا ہو جاتی ہے، ان سے جا کر کوئی پوچھے کہ آپ کو یہ مخارج درست کرنے میں کتنا وقت لگا؟ مثلاً ایک عجم قاری کو تلفظ درست کرنے میں کتنے سال لگتے ہیں؟ پس مقدور بھر حد تک ہو اور پھر اس کے بعد اصل مقصود کی طرف آئے، اصل معنیٰ کی طرف آئے۔

☆ عجم کو عرب بنانا مقصود نہیں

یہ مُسامحت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھی اور سب سے بڑی مثال خود رسول اکرم ﷺ وحضرتِ بلالؓ ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ شاید یہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حکمت تھی، حضرت بلالؓ عرب نہیں تھے، افریقی تھے، عربوں کے اندر افریقی کو اذان دلواتے تھے یعنی غیر عرب کو اور وہ اذان درست بھی نہیں دے سکتا تھا، عملِ رسول ﷺ تو ہمارے لئے حجت ہے لہٰذا مقدور بھر کوشش کریں، ظاہر ہے کہ بلالؓ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے تھے، کوشش کرتے تھے کہ ''ش'' کہیں لیکن نہیں نکلتا تھا، وہ ''س'' ہی کہتے تھے اور اس ''س'' سے رسول اللہ ﷺ کو اتنا سکون ملتا تھا کہ جب اذان کا وقت ہوتا تھا تو فرماتے تھے کہ

اَرِحْنَا یَا بِلَالُ...... (۳)

اے بلالؓ ہمیں سکون پہنچا دیجئے (یعنی نماز کیلئے اذان کہیے)......

☆قاریٔ قرآن ہونا عالمِ قرآن ہونے کی دلیل نہیں

اس وقت بڑے معروف عالمی شہرت کے حامل و مالک قاریانِ قرآن موجود ہیں کہ جو مخارج میں، صوت میں، لحن میں مجتہد نما ہیں لیکن اگر ان سے کبھی معانیٔ قرآن و مفاہیم و معارفِ قرآن کے بارے میں ایک سوال ہو جائے تو انہیں معلوم نہیں ہے، درحالیکہ فوق العادہ اجتہاد ہے، اس وقت بعض لوگ قرآن کے الفاظ کی ادائیگی میں ایسے مرتبے پر ہیں کہ اجتہاد سے بھی بالاتر اگر کوئی ڈگری تعبیر ہو تو وہ اس پر فائز ہیں، حقیقتاً فائز ہیں لیکن معانیٔ قرآن سے خود وہی غافل ہیں اور ان کی وجہ سے ایک جمعیتِ کثیر معانیٔ قرآن سے غافل ہے۔

اتفاقاً اسی مضمون کی عیناً حدیث بھی میزان الحکمہ میں موجود ہے، میزان الحکمہ میں بابِ قرآن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے مستقبل کے بارے میں یہ خوف ہے یا احتمال ہے کہ قرآن مَزامِیر بن جائے گا، اسی طرح رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے کہ

فَعِنْدَهَا يَكُوْنُ أَقْوَامٌ يَتَعَلَّمُوْنَ الْقُرْآنَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَيَتَّخِذُوْنَهُ مَزَامِيرَ ...... (۴)

اس وقت لوگوں کے کئی گروہ ہوں گے جو قرآن کو غیر اللہ کیلئے سیکھیں گے اور اسے مزامیر (دھن) قرار دیں گے......

مزامیر یعنی فقط دھن بن کر رہ جائے گا، لحن بن کر رہ جائے گا اور منع کیا کہ ایسا نہ کرو کہ قرآن تمہارے اندر فقط مزامیر بن کر رہ جائے، مزامیر یعنی ردھم کے ساتھ قرآن پڑھنا، جیسا کہ بن گیا ہے یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کی عجیب حدیث ہے کہ جو کچھ اس میں منع کیا گیا کہ ایسا نہ ہو کہ قرآن

☆قاریٔ قرآن ہونا عالمِ قرآن ہونے کی دلیل نہیں

تمہارے درمیان فقط مزامیر بن جائے یعنی دھن بن کررہ جائے تو یہ واقعاً محض دھن بن کررہ گیا ہے، اس وقت دُھنِ مصری ہے، عربی دھن ہے، سعودی دھن ہے، شامی دھن ہے، ایرانی دھن ہے اور فلانی دھن ہے، قرآن بالکل مزامیرِ محض بن کررہ گیا ہے، اس کے بارے میں کتاب میں بھی وضاحت موجود ہے۔

تقلیدِ محض

۲)تقلیدِ محض

☆ و ثانيها: التقليد لمذهب سمعه من الشيوخ و جمد عليه......

اور دوسرا مانع تقلید ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جب معانیٔ قرآن میں غور کرتا ہے تو اس سے پہلے بعض بزرگان کہ جنہوں نے تفسیر کی ہے یا قرآن کے بارے میں کوئی اظہار کیا ہے ان میں سے کسی ایک کے مسلک کا قائل ہوجاتا ہے، انسان کسی سے متاثر ہوجاتا ہے یا ایسی شخصیت ہے کہ اس کے اندر جاذبہ ہے، اسی طرح علمیت، شہرت، قابلیت یا روحانی اور نفسیاتی اسباب کی وجہ سے انسان کسی شخصیت کا گرویدہ ہوجاتا ہے اور اسی کے مسلک کے پیچھے چل پڑتا ہے کہ غالباً اکثر افراد اس مشکل میں گرفتار ہیں کہ جو لاشعوری طور پر یا ناخواستہ طور پر کسی نہ کسی شخصیت کے حصار میں آجاتے ہیں، اس کی کشش میں آجاتے ہیں اور پھر یہ طے کرلیتے ہیں کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ ہم قبول کریں گے اور اس کے علاوہ نہ خود غور کرنا ہے اور نہ کسی دوسرے سے کوئی بات سننی ہے یعنی انسان قرآن کی طرف مقلدانہ ذہن لے کر آئے۔

☆تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ آبائی میں فرق

تقلید سے مراد وہ دینی تقلیدِ شرعی نہیں ہے کہ جو عوام الناس کے لئے ہے کہ وہ احکامِ فقہ میں مجتہد و مراجع کی تقلید کریں، وہ ایک الگ باب ہے، مقلدانہ ذہن یعنی دوسروں نے جو کچھ کہا ہے اس کو بلا دلیل و حجت قبول کرنا، تقلید کا یہی معنیٰ ہے کہ کسی سے کوئی بات دلیل و حجت کے بغیر قبول کرنا اور وہ تقلید جو دین میں ہے، احکامِ شریعہ میں ہے وہ اسی لئے درست تقلید ہے چونکہ اس میں ہم بغیر دلیل و حجت کے کوئی بات قبول نہیں کرتے ہیں، پہلے ثابت کرتے ہیں کہ آیا یہ فقیہ ہے؟ مجتہد ہے؟ اس کے پاس دلیل و حجت ہے؟ اور دلیل و حجت سے استنباط کرنے کے قابل ہے یا نہیں ہے؟ عادل ہے یا نہیں ہے؟ عاقل ہے یا نہیں ہے؟ دنیا پر حریص ہے یا نہیں ہے؟ یہ ساری تحقیقات کر کے پھر اس کی تقلید کرتے ہیں لیکن تقلیدِ عام اسے کہتے ہیں کہ جیسے عام کوچہ و بازار میں سب تقلید کر رہے ہیں، سب ایک طرف جا رہے ہیں، دوسرے بھی ان کے پیچھے پیچھے اُدھر ہی جا رہے ہیں، معلوم نہیں ہے کہ کیوں جا رہے ہیں؟

ایران میں جب راشن سسٹم تھا، کیونکہ ابھی تو پٹرول کا راشن سسٹم ہے لیکن پہلے ضروریات زندگی کا بھی راشن سسٹم ہوتا تھا، ایران میں جنگ کے زمانے میں راشن کے لئے جگہ جگہ دکانوں پر کوئی نہ کوئی چیز راشن کے طور پر مل رہی ہوتی تھی، کہیں کمبل مل رہا ہوتا تھا، کہیں ہیٹر مل رہا ہوتا تھا، کہیں گوشت مل رہا ہوتا تھا، کہیں چینی مل رہی ہوتی تھی اور ہر دوسری تیسری دکان کے آگے لائن لگی ہوتی تھی، کسی دن سورج نکلنے سے پہلے ایک شخص دکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور دکان کو تالا لگا ہوا تھا،

پھر دوسرا شخص آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا، پھر تیسرا آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور کرتے کرتے ایک بہت لمبی لائن لگ گئی، جب آخری آدمی آیا تو اس نے پوچھا کہ کیا مل رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں نہیں معلوم، اگلے سے پوچھا کہ کیا مل رہا ہے، اسے بھی معلوم نہیں تھا، اس سے اگلے کو بھی نہیں معلوم تھا کیونکہ بغیر پوچھے ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے، یہ سوال منتقل ہوتا ہوتا اس پہلے شخص تک جا پہنچا جو سب سے پہلے کھڑا ہوا تھا، اس سے پوچھا کہ کیا مل رہا ہے؟ تو اس نے کہا کہ کچھ نہیں مل رہا ہے، لوگوں نے پوچھا کہ پھر کس لئے کھڑے ہو؟ کہا کہ میں تو کسی کے انتظار میں کھڑا ہوا ہوں یہاں پر کچھ نہیں مل رہا ہے۔

یہی اتفاق مقلدین کے ساتھ رونما ہوتا ہے، جس کے پیچھے ہم جا رہے ہیں اسکا پتہ نہیں ہے کہ کس لئے جا رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ ہم سمجھ رہے ہیں کہ یہ دین کی طرف جا رہا ہے، خدا کی طرف جا رہا ہے۔ ہر ایک کے پیچھے تو نہیں چلا جاتا ہے۔ خصوصاً قرآن کو سمجھنے کے لئے آپ راہنمائی ضرور لیں، سب سے راہنمائی لیں لیکن مقلدِ محض نہ بنیں کہ جس نے جو بات کہہ دی اسی پر جمود ہو جائے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہی ماننا ہے اور اس کے علاوہ خود سے کچھ بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی ہے۔ یہ انسان کے علم کی راہ میں بھی مانع ہے کہ بعض اوقات انسان کسی ایک شخصیت کی راہ کو اپنا لیتا ہے یا اس کے افکار کو لے لیتا ہے پھر اس کے طریقۂ کار کا جمود اختیار کر لیتا ہے اور بالآخر اس کا مقلدِ محض بن جاتا ہے اور خود غور نہیں کرتا ہے، خود اپنے آپ کو زحمت نہیں دیتا ہے کہ تفکر کرے، تدبر کرے اور بصیرت سے پرکھے، اس شخصیت نے جو کچھ کہا ہے بس اسی کو دیکھتا ہے، اس کے علاوہ ممکن ہے کوئی مطلب جدید،

☆ تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ آبائی میں فرق

نکتۂ جدید اس کے ذہن میں آجائے لیکن اس کو مجاز نہیں سمجھتا ہے، اپنے لئے روا اور جائز نہیں سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس شخصیت نے کہا ہے اس سے ہٹ کر بھی میں کسی مطلب پر غور کر سکتا ہوں۔

☆تقلید کی مزید وضاحت

وہ تقلید کہ جو عوام مجتہد کی کرتے ہیں اس کا تقلید سے الگ کوئی نام رکھتے تو بہتر ہوتا۔ تقلید اس عمل کے لئے کہ جو عوام علماء کی کرتے ہیں ایک نامناسب نام ہے، چونکہ یہ ایک رائج چیز ہے لہٰذا میں اشارہ کرتا چلوں کہ کسی کی ذہن میں اس کے بارے میں شبہہ قائم نہ ہو جائے، چونکہ وہ تقلید اس وجہ سے ہے کہ جس طرح سے قرآن نے بھی کہا ہے کہ

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَo(۵)

ان سے کہئے کہ اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔

اور عرفِ عام میں بھی یہ کام ہوتا ہے، دین سے باہر بھی یہ کام ہوتا ہے مثلاً جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو طبیب کی طرف رجوع کرتا ہے یا کسان کو اگر فصل اگانے کے بارے میں، کھیت کے بارے میں یا کھاد کے بارے میں کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی تو وہ زرعی ماہرین کی طرف رجوع کرتا ہے، اس شخص کی طرف رجوع کرتا ہے کہ جو جانتا ہے، اگر ہم قدیمی معاشرہ، روایتی اور سنتی معاشرہ دیکھیں تو اس میں بھی یہی ہے کہ رجوعِ جاہل بہ عالم اور دین کے اندر بھی یہی ہے کہ رجوعِ جاہل بہ عالم، اس کا نام تقلید نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن اب رائج ہو گیا ہے، مگر لغتاً جس کو تقلید کہتے ہیں یا جس کو

تقلیدِ رائج کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بلا حجت و بلا دلیل فقط کسی کی بات کو مان لینا کہ یہ کہہ رہا ہے، درحالیکہ جب انسان مجتہد کی تقلید کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کرتا کہ مجتہد مان رہا ہے، چونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس نے قرآن سے، سنت سے، منابعِ دین سے یہ مطلب پڑھا ہے، استنباط کیا ہے اور مجھے بتایا ہے یعنی یہ رجوعِ جاہل بہ عالم ہے۔

جاہل کا عالم کی طرف رجوع کرنا ایک عرفی چیز ہے اور یہ ہر شعبۂ زندگی میں ہے اس معنیٰ میں ہمارا سارا عمل تقلیدی عمل ہے چونکہ ہم جو شعبہ نہیں جانتے ہیں اس میں اس شعبے کے ماہر کی طرف رجوع کرتے ہیں حتیٰ یہی مرجعِ تقلید جب بیمار ہوتا ہے تو ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے، خود بیماری میں مقلدِ طبیب ہو جاتا ہے اور طبیب دین میں مقلدِ مرجع ہو جاتا ہے۔

☆ تقلید کی مزید وضاحت

فرض کریں کہ اگر مرجع کے گھر میں نلکے کی ٹونٹی خراب ہوگئی ہے یا پانی کا پائپ لیک (Leak) ہوگیا ہے تو وہ پلمبر کو بلاتا ہے کہ آکر ٹھیک کرے یعنی اس مسئلے میں وہ نہیں جانتا ہے، انجان ہے اور جاننے والے کی طرف رجوع کرتا ہے۔ فنی مسائل ہوں، علمی مسائل ہوں یا روزمرہ کے معمولات کے مسائل ہوں اسی عمل پر انسانی معاشرتی زندگی استوار ہے، اگر رجوعِ عالم بہ جاہل بیچ میں سے نکل جائے تو علماء بھی بے کار ہو جائیں گے اور دیگر شعبۂ زندگی کے ماہرین بھی بے کار ہو جائیں گے لہٰذا یوں ہی ہونا چاہئے کہ کوئی شخص جو چیز نہیں جانتا ہے وہ اس میں اس شعبے کے ماہر کی طرف رجوع کرے۔

اسی طرح دین کے بھی ماہرین اور متخصص لوگ ہیں لہٰذا جو نہیں جانتے ہیں وہ ان کی طرف

رجوع کریں، اسی لئے جو جانتے ہیں ان کے لئے یہ کام حرام ہے یعنی جو خود دین سمجھتے ہیں، خود دین جانتے ہیں اور جاہل نہیں ہیں وہ دوسرے کی طرف رجوع نہ کریں بلکہ خود سے دین کو شناخت کریں اور اپنے احکام استنباط کریں، اسی لئے اعتقادات میں رجوع نہیں کر سکتے ہیں چونکہ اعتقادات میں آپ کو عالم بننا ضروری ہے، فقط فروعی مسائل میں تقلید جائز ہے، فروعی مسائل میں چونکہ علم نہیں چاہئے بلکہ عمل چاہئے، جس طرح سے ہم زندگی کے دیگر مسائل میں دوسروں کی طرف رجوع کرتے ہیں مثلاً جب ہم طبیب کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں بیماری کا علم اور اس سے متعلقہ ساری چیزوں کی تفصیل نہیں چاہئے بلکہ علاج چاہئے اور شفا چاہئے، چونکہ ہمیں شفا چاہئے لہٰذا طبیب کی طرف رجوع کرتے ہیں ورنہ اگر ہمیں بیماری کا علم، دوا کا بھی علم اور بیماری کی علامات و اسباب کا علم بھی چاہئے ہوتا تو پھر ہم اسپتال میں جانے کے بجائے میڈیکل کالج جاتے اور طبیب کی طرح خود پڑھتے اور سیکھتے، اسی لئے اعتقادات میں، جہان شناسی میں، ہستی شناسی میں انسان کو خود عالم بننا ہے، یہاں تقلید نہیں کرنی ہے، اگر تقلیداً کسی سے کوئی مطلب قبول کر لیا تو باطل ہے، حتیٰ یہاں پر رجوعِ جاہل بہ عالم بھی جائز نہیں ہے بلکہ عالم بننا جائز ہے، نہ یہ کہ آپ اپنی حالت پر باقی رہیں اور اپنی وقتی مشکل عالم کی طرف رجوع کر کے حل کر لیں، یہ عملی مسائل میں ہو سکتا ہے لیکن اعتقادی مسائل میں ممکن نہیں ہے۔

☆ تقلید کی مزید وضاحت

☆ مذموم تقلید

مذموم تقلید وہ ہے کہ جس کی قرآن نے بھی مذمت کی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام لوگوں کے سامنے دین پیش کرتے تھے تو وہ جواب دیتے تھے کہ ہم تو آباء کے مقلد ہیں،

اِنَّا وَجَدْنَا آبَائَنَا عَلٰى اُمَّةٍ......(۶)

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے......

یہ مذموم تقلید ہے، اس کی قرآن نے مذمت کرتے ہوئے کہا کہ

اَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۝(۷)

یعنی کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں۔

اگر وہ آباء احمق، نادان و نافہم تھے تو کیا پھر بھی تم انہی کے پیچھے چلو گے؟ یہ جائز نہیں ہے اور شانِ انسان بھی نہیں ہے کہ اس طرح کوئی کسی کے پیچھے چلے بلکہ انسان سمجھ کر چلے کیونکہ انسان کو خدا نے عقل دی ہے۔

مزید وضاحت کیلئے کہیں گے کہ تقلید یعنی دیکھا دیکھی کہ جو گزشتگان نے کر دیا ہے ہم نے وہی کرنا ہے، جیسے آباء کی تقلید ہے، آبائے علمی کی تقلید ہے، آبائے نسبی کی تقلید ہے، آبائے ثقافتی کی تقلید ہے، آبائے سیاسی کی تقلید ہے۔ انسان طبیعتاً مقلد ہے، پیچھے چلتا ہے، جس راہ پر دوسرے چل کر گئے ہیں بس اسی پہ چلنا ہے اور جو راہ انہوں نے طے نہیں کی ہے تو وہ ہم نے بھی طے نہیں کرنی

ہے، اسی طرح یہ قرآن کی طرف آیا ہے لیکن مقلدِ محض بن کر آیا ہے، کن لوگوں کا؟ ان سابقہ مفسرین کا کہ جو گزرے ہیں اور انہوں نے آ کر تفسیرِ قرآن کی ہے، یہ ان کا مقلدِ محض ہے، قرآن سمجھنے آیا ہے لیکن قرآن نہیں سمجھ رہا ہے، یہ فقط یہ سمجھ رہا ہے کہ سابقہ مفسرین نے قرآن کے بارے میں کیا کہا ہے، صرف یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور خود جرأت نہیں کرتا ہے کہ قرآن سے کسی نکتے کا استفادہ کرے، جو کچھ سابقہ مفسرین نے کہہ دیا ہے اسی پر جمود اور سکوت ہے۔

☆طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں

حافظ شیرازی جو فارسی کے بڑے شہرت یافتہ اور مشہور شاعر ہیں اور تقریباً ساری دنیا میں شناختہ شدہ ہیں ان کے دیوان کے بارے میں کسی نے لکھا ہے کہ حافظ کی غزلیں بہت دشوار ہیں یعنی فارسی ادیبوں کے لئے بھی بہت سخت ہے، سعدی کا شعر آسانی سے سمجھ میں آتا ہے، مولانا کا شعر زور لگا کر سمجھ میں آتا ہے لیکن حافظ کا شعر سمجھنا بہت دشوار کام ہے اور جو حافظ کا شعر سمجھنا شروع کر دے تو سمجھے کہ وہ ادیب ہے۔

ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ حافظ کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ شارحین ہیں کہ جنہوں نے حافظ کے کلام کی شرح کی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ پہلے آئے ہیں اور حافظ کے کسی شعر کا معنیٰ انہوں نے پہلے کیا ہے، بعد میں آنے والا انسان جب شعر پڑھتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ میں شارح کے کلام کے تناظر میں شعر کو سمجھوں لیکن اس نے حافظ کے شعر کا رخ کسی خاص سمت میں موڑا

☆طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں

ہوا ہے اور آنے والا بھی مقلدِ محض ہے، وہ تو لکیر کا فقیر ہے، لکیر کسی نے پہلے لگا دی ہے کہ حافظ یہ کہنا چاہتے ہیں اور بعد میں آنے والے سب اسی طرف مڑتے جاتے ہیں کہ حافظ یہ کہنا چاہتے ہیں، اگر یہ شارحین کلامِ حافظ نہ ہوتے تو آج بہت سارے لوگ حافظ کو آسانی سے سمجھ سکتے، اگر شروحات نہ ہوتیں تو مشکلات بھی نہ ہوتیں۔

بعض علمی کتابوں کی شروحات لکھی گئی ہیں لیکن درسی کتابوں، سلیبس (Syllabus) کی کتابوں کی شرح نہیں ہونی چاہیئے، جو کتابِ درس ہے اس کی شرح نہیں ہونی چاہیئے، اگر ہے بھی تو طالب علم کو خریدنی نہیں چاہیئے، خرید بھی لے تو اسے پڑھنا نہیں چاہیئے، صرف تبرک کے طور پر گھر میں ثواب کے لئے رکھیں ورنہ اگر طالب علم جس کتاب کو پڑھ رہا ہے اور اس نے اس کی شرح کی مدد لینا شروع کر دی ہے تو یہ آخر تک آخوند بی سواد رہے گا، یہ قادر نہیں رہے گا اور اس کے اندر کبھی بھی ملکہ پیدا نہیں ہوگا۔ کتاب ہو، استاد ہو اور شاگرد ہو، چوتھی کوئی بھی چیز بیچ میں نہ ہو، استاد کی راہنمائی سے انسان خود کتاب حل کرے، پھر انسان کسی نقطے تک پہنچ جاتا ہے ورنہ شروحات، خلاصے، جزوے اور نہ جانے کیا کیا پڑھ کے انسان کہیں نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اگر عادی ہو چکے ہیں تو اجتناب کریں، آہستہ آہستہ ان چیزوں سے جان چھڑائیں کہ جب تک طلبہ ہیں البتہ جب استاد بن جائیں تو پھر بے شک شروحات کا مطالعہ کریں، گویا استاد کے لئے واجب ہے کہ جو کتاب پڑھا رہا ہے اس میں ساری شروحات کا مطالعہ کر کے آئے اور طالب علم کے لئے حرام ہے کہ کسی شرح کا مطالعہ کرے، وہ فقط درس پر اکتفا کرے۔

☆ طلبہ شروحات کا سہارا نہ لیں

☆درس پڑھنے کا نسخہ

پہلے طالبِ علم اپنے اس کام پر غور وفکر کرے کہ جو اس نے درس سے پہلے، درس کے دوران اور درس کے بعد کرنا ہے، اس سے انسان کے اندر ملکہ پیدا ہوتا ہے، تجربہ کر کے دیکھ لیں، تین مہینے اس طرح سے درس پڑھیں کہ جیسے عرض کررہا ہوں، تین مہینے ضائع ہو گئے تو اتنی مشکل نہیں ہے، مجھے معاف کر دینا، تین مہینے اس طرح سے درس پڑھیں کہ پہلے اس کتاب کا خود مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ آپ کو کتاب سے کیا سمجھ میں آتا ہے پھر حاضر دماغ ہو کر، حاضر ذہن ہو کر استاد کا درس سننے جائیں اور سنیں کہ استاد کیا کہتا ہے بشرطیکہ استاد ہو نہ کہ آپ پر ٹریننگ (Training) کر رہا ہو، استادی کے ساتھ اس کو پتہ چلے کہ استاد ہے، بالآخر جس فن کا کوئی استاد ہو اس کا خود پتہ چل جاتا ہے، پھر اسے دیکھیں کہ استاد نے کیا بتایا ہے، پھر اس کے بعد استاد کی بتائی ہوئی راہنمائی کی روشنی میں خود دوبارہ مطالعہ کریں اور نوٹ تیار کریں، پھر اس کا مباحثہ کریں۔

تین مہینے اس طرح سے درس پڑھ کر دیکھیں کہ آپ کو کوئی فرق محسوس ہوتا ہے یا نہیں۔ جو دروس آپ شروحات ہی کی وجہ سے پڑھتے ہیں اگر چھ مہینے بعد اسی کتاب کو کھول کر دیکھیں تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ ابھی تک میں نے یہ کتاب پڑھی بھی نہیں ہے کیونکہ شارح نے ساری کتاب حل کی ہوئی ہے نہ کہ میں نے حل کی ہے، یہ شارح کی حل شدہ ہے میرے لئے تو حل نہیں ہوئی بلکہ مجھے یہ کتاب خود حل کرنی ہے، شارحین نے حل کر کے کتابیں لکھ کر اپنے پیسے کما لیے، میں محروم ہوں، آپ نے بھی حل کرنی ہے لیکن ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، جس نے جو زحمت کی ہے اس کی قدردانی

☆درس پڑھنے کا نسخہ

کرنی چاہئے، جن لوگوں نے آکر قرآن کی تفاسیر لکھی ہیں، ان کا ہم سب پر حقِ عظیم ہے، خصوصاً طلاب پر اور تمام مسلمین پر کہ جنہوں نے آکر قرآن کے بارے میں کوئی بھی خدمت کی ہے، ترجمہ کیا ہے، قرآن چھاپا ہے، قرآن پڑھایا ہے یا جو کچھ بھی سکھایا ہے بالآخر بہترین کام، بہترین عبادت و افضل عبادت قرآن پڑھانا ہے، اس کے برابر کوئی اور عبادت نہیں ہے لیکن ساتھ یہ بھی توجہ رکھیں کہ قرآن فہمی میں بھی ایک لحاظ سے سب سے بڑی مشکل یہی مسائل ہیں۔

قرآن فہمی کیلئے اسی لئے آداب کی ضرورت ہے، نہ کہ ہر کس و ناکس آئے اور جس حالت میں ہے اسی طرح آکر قرآن پڑھنا اور سمجھنا شروع کردے، اور نہ انسان یہ سمجھے کہ اصلاً قرآن ہمیں سمجھ ہی نہیں آسکتا، افراط و تفریط کا شکار نہ ہو، قرآن کو پڑھے لیکن اس کو آداب کے ساتھ پڑھے، قاعدوں وضابطوں کے ساتھ پڑھے اور ان موانع سے جان چھڑائے۔

☆ جمود، باعثِ تعصب

☆جمود، باعثِ تعصب

☆ التقلید لمذھب......

صدر المتألھینؒ فرما رہے ہیں کہ کسی ایک مسلک کا مذہب، مذہب سے مراد مذہبِ مُصْطَلَح نہیں ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے اندر یا کسی بھی مطلب کے بارے میں

☆ سمعه من الشیوخ......

یا اپنے بزرگوں اور اساتید سے اس نے جو کچھ سنا ہے،

☆وجمد عليه......

اس پر جمود اختیار کر لے،

☆ و ثبت فی نفسه التعصب له بمجرد الا تباع......

یعنی اس انسانِ مقلد کے نفس کے اندر تعصب پیدا ہو جاتا ہے، اس شخص کی پیروی کرنے سے کہ

☆ لمن وقع منه الاسماع......

جس سے یہ مطلب سنتا ہے اور سن کر پلے باندھ لیتا ہے اور اسی پر اس کے دل میں تعصب پیدا ہوتا ہے۔

☆ من غير وصول اليه ببصيرة......

یعنی سننے سے جس مطلب تک پہنچتا ہے نہ کہ بصیرت سے، نہ تجزیے و تحلیل سے، نہ غور و فکر سے بلکہ شخصیت سے متاثر ہو کر جس مطلب تک پہنچتا ہے۔

پس انسان جوں ہی کسی سے سنتا ہے اس کے اوپر جمود اختیار کر لیتا ہے، جمود کے بعد انسان کے اندر تعصب پیدا ہو جاتا ہے، تعصب یعنی جو کچھ اس نے کہا ہے اس کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور نکتے کی طرف یا کسی اور بات کی طرف توجہ نہیں کرنی ہے۔

☆جمود، باعثِ تعصب

☆کمزور نفوس کی مشکل

عموماً ضعیف نفوس کی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے سے قوی تر انسانوں میں سے کسی نہ کسی کے اسیر ہوجاتے ہیں یا یہ روحانی اور نفسیاتی مسائل ہیں، بعض اوقات کسی شخصیت کا کمال، کسی کی اچھی صفات ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور بعض اوقات ہمیں اپنا ضعف کسی کا اسیر بنا دیتا ہے یعنی چونکہ ہم اس سے کمزور ہیں اور وہ ہم سے قوی تر ہے اس وجہ سے اپنے ضعف کی وجہ سے انسان اس کا اسیر ہوجاتا ہے۔ پھر یہ شخصیات ان موانع میں سے ہیں کہ انسان اس طرح سے کسی کا اسیر ہوجائے کہ جو کچھ کسی نے کہا ہے وہ درست ہے اور جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں غور وفکر کی بھی ضرورت نہیں ہے، یہ شخص کبھی بھی اس کو ترقی نہیں کرنے دے گا، بعض دیگر مباحثات میں کہ جو اسی سے ملتے جلتے مباحثات ہیں ان میں عرض کیا ہے کہ طلابِ علوم کے لئے خصوصاً یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے کہ کبھی بھی اساتید کو پیر نہ بنائیں، حوزے میں یہ ایک مشکل ہے کہ فوراً استاد وشاگرد کا رابطہ تبدیل ہوجاتا ہے اور پیر مرید کا رابطہ بن جاتا ہے اور جب پیر مرید بن جاتے ہیں تو پھر انسان استفادہ نہیں کرسکتا ہے چونکہ پیر سے کوئی استفادہ نہیں کرتا ہے بلکہ پیر کی فقط تقدیس ہوتی ہے اور مرید کو پیر کچھ دیتا نہیں ہے بلکہ وہ فقط اس سے آداب واحترامات وتقدیسات وغیرہ طلب کرتا ہے، نہ پیر سے اس کو کچھ ملتا ہے نہ مرید کچھ لینے کے لئے پیر کے پاس جاتا ہے۔

☆استاد اور شاگرد کا رابطہ

استاد اور شاگرد کا رابطہ استفادہ اور افادہ کا رابطہ ہے، شاگرد یعنی کچھ لینے والا اور استاد یعنی کچھ دینے والا، استاد اور شاگرد کے بقدرِ کافی آداب ہیں کہ کیا رابطہ ہونا چاہئے، شاید انسانی رابطوں میں سے مقدس ترین رابطہ استاد و شاگرد کا ہے حتیٰ یہاں تک ہے کہ اس دین میں یا دینی نصوص کے اندر جو تین والد متعارف کروائے گئے ہیں کہ آپ کے تین والد ہیں، اول وہ کہ جس سے آپ پیدا ہوتے ہیں، دوم وہ کہ جو آپ کو بیٹی دیتا ہے اور سوم وہ کہ جس سے آپ پڑھتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس والد کی ہے کہ جس نے آپ کو تعلیم دی ہے، اب انسان کے اس اعتبار سے کتنے آباء بن جاتے ہیں، جن جن سے ہم نے ایک حرف سیکھا ہے، امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفاً فَقَدْ صَیَّرَنِیْ عَبْدًا......(۸)

جس نے مجھے ایک حرف سکھایا اس نے مجھے اپنا غلام بنایا......

یہ سب سے اہم اور مقدس ترین رابطہ ہے، لیکن پیری مریدی جیسا رشتہ عموماً حوزوں اور مدارس میں ہوتا ہے اور یہ ضعفِ مرید کی وجہ سے ہوتا ہے، کمالِ پیر کی وجہ سے یہ رابطہ نہیں بنتا ہے چونکہ مرید بہت ضعیف ہوتا ہے، کنویں کا مینڈک ہوتا ہے، اس نے اور کسی کو دیکھا ہی نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے وہ فوراً اپنے استاد کو مرشد و پیر مان لیتا ہے اور پھر اس کی آنکھوں میں محبت کی پٹی بندھ جاتی ہے اور وہ کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتا ہے، اس سے جان چھڑائیں کہ یہ ہمارے لئے اسارت ہے۔

اب یہاں ضمنی بات آ گئی ہے تو بد نہیں ہے کہ یہاں میں اس کا اظہار کروں کہ مثلاً ہمارے پاکستانی کلچر میں یہ بات زیادہ نمایاں ہے، دوسری قومیتوں کی نسبت پاکستانیوں کے اندر یہ عنصر زیادہ ہے اور پیر بھی بن جاتے ہیں، لوگ پرائمری کے استاد کو ہی پیر بنا لیتے ہیں نہ کہ کسی ہائی کلاس کے استاد کو پیر بنائیں، مثلاً پاکستان میں پہلی دفعہ جس مدرسے میں جا کر داخلہ لیا ہے اس کے پرائمری استاد کو حوزے میں آنے کے بعد اپ ڈیٹ (Update) نہیں کرتے ہیں، اگر پیر ہی ماننا ہے تو کسی بڑی سطح کے استاد کو پیر مان لیں، اول تو نہ مانے، نہ مرجعِ تقلید کو پیر مانے، نہ کسی بڑے استاد کو اور نہ کسی چھوٹے استاد کو، انہیں پیر نہیں ماننا بلکہ استاد ماننا ہے، ثانیاً یہ کہ بالفرض اگر پیر بھی ماننا ہے تو کسی بڑے کو پیر مان لو، بڑے بڑے مجتہدین اور مراجع موجود ہیں ان میں سے جو درسِ خارج پڑھاتے ہیں اسی کو پیر مان لو لیکن اس پرائمری کے استاد کو پیر کیوں بناتے ہو؟ حوزے میں رہ کر بھی آخر تک اسی سے راہنمائی لیتے ہیں، ہمارے طلبہ کے اندر علمی رشد نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہی حجاب ان کو درپیش ہے، اپنے پرائمری استادوں کی اسارت میں گرفتار ہیں، پرائمری استاد پرائمری استاد ہی ہوتا ہے اس کی ذہنی اپروج (Approach) اتنی نہیں ہوتی ہے، اس کی سوچ اتنی بڑی نہیں ہوتی ہے، اس کی آگاہی اتنی زیادہ نہیں ہوتی ہے، اس کا ہم پر سارا لطف و کرم و کمال یہی ہوتا ہے کہ اس نے ہمیں حوزے تک پہنچا دیا ہے۔

یونیورسٹی کے طلبہ کبھی بھی پرائمری استاد کے اسیر نہیں ہوتے ہیں، اگر ہوں تو بھی تو اس آخری بڑے درجے کے استاد کے اسیر ہو جاتے ہیں کہ جو انہیں یونیورسٹی میں میسر آتا ہے یا کسی بڑی

☆ استاد اور شاگرد کا رابطہ

اور با کمال شخصیت کے اسیر ہو جاتے ہیں لیکن دینی طلبہ پرائمری استاد کے اسیر ہو جاتے ہیں، حوزے میں آ کر اگر کوئی شرعی مسئلہ پوچھنا ہو تو مراجع قم میں رہتے ہیں اور یہ توضیح المسائل کا مسئلہ ٹیلیفون کر کے پاکستان میں پوچھتے ہیں کہ مثلاً نماز میں دو اور تین میں شک ہو جائے تو کیا کریں؟ یا اگر کوئی درس انتخاب کرنا ہے کہ یہاں پر کس کے پاس پڑھیں؟ کس کے پاس نہ پڑھیں؟ وہاں سے راہنمائی لیتے ہیں۔ یہاں اب آپ بڑی کلاس میں آ گئے ہیں، بڑی سطح پر آ گئے ہیں، حوزے کی سطح پر آ گئے ہیں، حوزے کی سطح پر آنے کے لئے صرف ایک زمینی سفر کافی نہیں ہے بلکہ حوزے کی سطح پر آنے کے لئے بہت سارے نالین اتارنے پڑیں گے،

فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ......(۹)

پس اپنی جوتیاں اتار دیں......

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے فرمایا کہ آپ وادیِ مقدس میں آ گئے ہیں لہٰذا یہ نالین جو پہنے ہوئے ہیں اتار کے آئیں۔ پس یہ رابطے، یہ اسارتیں، یہ قید، یہ زنجیریں اپنے پاؤں سے اتار کر آئیں تو آپ ترقی و رشد حاصل کر سکیں گے۔

☆رشد حاصل نہ ہونے کی وجہ

ہمارے رشد نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اسیر ہیں، اسیر بھی بہت نچلی سطح پر ہیں، یہ ضمنی نکتہ تھا، قرآن فہمی میں بھی انسان کے لئے یہ نکتہ مانع بن جاتا ہے، قرآن شناسوں کو بھی دیکھیں تو

☆رشد حاصل نہ ہونے کی وجہ

وہ کسی نہ کسی کے اسیر ضرور ہیں اور فقط اسی کے قول کو ترجیح دیتے ہیں مثلاً کوئی اسیرِ امام رازی ہے، کوئی اسیرِ زمخشری ہے، کوئی اسیرِ طبرسیؒ ہے، کوئی اسیرِ شیخ طوسیؒ ہے، کوئی اسیرِ فلاں ہے حتیٰ ممکن ہے کہ کوئی مرحوم علامہ طباطبائیؒ کا اسیر ہو جائے کہ جو کچھ مرحومِ علامہؒ نے کہا ہے بس اس کے علاوہ نہ سوچنا ہے اور نہ دیکھنا ہے، آپ آزاد ہیں حتیٰ حضرت آیت اللہ جوادی آملی مدظلہ جو علامہ طباطبائیؒ کے شاگرد ہیں آپ ان کی کتابِ تسنیم پڑھیں جو حضرت آیت اللہ جوادی آملی مدظلہ کی تفسیرِ قرآن ہے، حضرتِ استاد اس میں بہت سارے مقامات پر علامہ طباطبائیؒ پر نقد وارد کرتے ہیں، ان کے نظریے کو نقد کرتے ہیں باوجود اینکہ شاگرد ہیں اور جتنا احترام ان کے دل میں علامہؒ کا ہے شاید کسی کے دل میں اتنا احترام نہ ہو لیکن درعین حال کیوں انتارشد کیا، حضرت استاد جوادی آملی اس وقت عالمِ اسلام کی ایک منحصر شخصیت ہیں چونکہ کسی شخصیت کے اسیر نہیں ہوئے ورنہ اگر کسی کے اسیر ہو جاتے تو پھر ترقی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے فرماتے ہیں کہ کسی مذہب کے اوپر تقلید، کسی استاد کے اقوال، کسی بزرگ یا کسی اور شخص کی تقلید اور اس پر تعصب کی حد تک اتر آنا انسان کے لئے حجاب ہے۔

☆ رشد حاصل نہ ہونے کی وجہ

☆ فهذا شخص قد قيده معتقده......

اپنے اعتقاد نے اس کو زنجیر میں باندھ لیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تعصب، یہ زنجیر بھی خود انسان نے اپنے اندر ہی ڈالی ہوئی ہے، باہر سے کسی نے ہمیں نہیں روکا ہوا ہے بلکہ اندر ہمارے عقیدے نے، ہمارے اپنے نظریئے نے ہمیں ترقی اور ارتقاء سے روکا ہوا ہے،

☆ فصار نظره موقوفا على مسموعه، لايمكنه ان يتجاوز عن مقامه......

جب انسان کسی کی سنی ہوئی بات، اپنے ہی بنائے ہوئے عقیدے اور تعصب کی زنجیر میں جکڑا جاتا ہے تو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اپنے مقام سے آگے بڑھ سکے یا ترقی کر سکے چونکہ زنجیر کھلے گی تو یہ آگے بڑھے گا لیکن زنجیر نہیں کھلے گی تو اگر یہ سالہا سال بھی قرآن پڑھتا رہے اور حوزے میں بیٹھا رہے تو بھی کسی اعلیٰ علمی مقام تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

☆شیطانِ تقلید کا حملہ

☆ **فان لمع برق علی بعد......**

بعد میں اگر کوئی ایسی تجلی، کوئی ایسی برقِ معنوی یعنی کوئی نورِ علم دور سے اس کی طرف آجائے، بسا اوقات ہوتا ہے کہ انسان کے پیشِ نظر ایسی چیزیں آجاتی ہیں، مثلاً کسی مجلس میں، کسی محفل میں، کسی کتاب کے مطالعے سے، کسی تذکرے میں کوئی ایسا نایاب نظریہ یا کوئی معنوی مطلب انسان کے سامنے آگیا ہے،

☆ **وبداله معنی من المعانی......**

یا کوئی ایسا معنیٰ خالص معانی میں سے اس کیلئے ظاہر اور نمایاں ہو،

☆ **التی تباین مسموعه......**

جو اس کی سنی ہوئی باتوں کے خلاف ہے،

☆ **حمل علیه شیطان التقلید حملة......**

☆ شیطانِ تقلید کا حملہ

تو فوراً شیطانِ تقلید آ کر اس پر حملہ کرتا ہے۔ایک نکتہ جو انہوں نے یہاں پر بیان فرمایا ہے کہ متعصب مقلد جو زنجیرِ تقلید میں، مسموعات کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں وہ لوگ جب بھی کوئی بات سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہم نے پہلے نہیں سنی ہوئی تھا یعنی ہم نے پہلے ایسا تو نہیں سنا تھا، یہ وہی لوگ ہیں کہ جو مقلدِ محض ہیں۔کیا آپ نے سن سن کر ہی ساری حقیقت تک پہنچنا ہے؟ آپ کبھی یہ نہیں کہتے کہ اس پر میں نے غور نہیں کیا تھا، اس پر میں نے فکر نہیں کی تھی بلکہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہم نے پہلے نہیں سنا ہوا تھا یعنی سننے پر ہی سارا اکتفا کیا ہوا ہے لہٰذا فوراً شیطانِ تقلید آ کر حملہ کرتا ہے کہ یہ بات تو تیری سنی ہوئی باتوں کے خلاف ہے، یہ غلط بات ہے، کیوں غلط ہے؟ چونکہ تو نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی، تیرے شیخ نے یہ بات بیان نہیں کی تھی، تو نے یہ مطلب تو اپنے پیرومرشد سے نہیں سنا تھا اس لئے غلط ہے۔

☆ شیطانِ تقلید کا حملہ

اگر پرائمری ٹیچر نے یہ بات نہیں کی تو کر بھی نہیں سکتا ہے چونکہ اس کو معلوم نہیں ہے، وہ پرائمری ٹیچر ہے۔آپ اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ خدا نے میرے لئے وسیلۂ دیگر پیدا کیا ہے، کسی اور کو میرے لئے مقرر کیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے یہ تعلیم حاصل کروں لہٰذا ہر دم انسان نئے مطلب کے درپے رہے، اگر نئے معانی استنباط کرنے کے لئے دوسرے کوشش نہیں کر رہے ہیں تو خود کوشش کرے مثلاً وہی تکراری چیزیں جو ایک بیان کرتا ہے وہی دوسرے نے بیان کی ہوتی ہیں۔

اگر آپ قرآن کی لائبریری میں جا کر ساری تفسیروں کا خلاصہ نکالیں تو شاید دس جلدی کتاب بھی نہیں بنتی ہے، ہزاروں جلدوں کا خلاصہ دس جلدی کتابوں میں سما جائے گا، کیوں؟ چونکہ

ایک تفسیر میں جو بات لکھی ہے، اسی کے ذیل میں بھی وہی بات لکھی ہوئی ہے جو دوسرے نے تفسیر لکھی ہے پھر وہی بات تیسرے نے بھی لکھی ہے، اس طرح ایک تفسیر دوسری میں منتقل ہے وہی تیسری اور چوتھی میں منتقل ہے، فقط کاغذ کا ڈھیر لگا ہوا ہے لیکن مطلب کا اضافہ نہیں ہوا ہے، سو تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن بیچ میں دو مطلب بھی نہیں ہیں، کس وجہ سے؟ یہ اسی تقلید کی وجہ سے ہے۔

ورنہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نئی تفسیر جب لکھی جا رہی ہے تو انسان نئے مطالب سے آشنا ہو جیسے المیزان ایک نئی تفسیر تھی، اس میں انسان کو نئے مطالب ملتے ہیں جو المیزان سے پہلی والی تفاسیر میں موجود نہیں ہیں، یہ تفسیر لکھنے کا جواز ہے، اگر کوئی یہ کام نہیں کر سکتا ہے تو خوامخواہ لوگوں پر بوجھ ڈالنا، پریس (Press) کو مشغول کرنا، اتنا کاغذ مصرف کرنا اور لوگوں کے پیسے اور وقت کو ضائع کروانا آسان ہے بلکہ انسان ایڈریس دے دے کہ فلاں تفسیر بہت اچھی ہے، جس سے میں نقلِ مطالب کرنے والا ہوں وہ تفسیر بہت اچھی ہے۔ بجائے اس کے میں پچھے تفاسیر کے مطالب اپنی ایک کتاب میں منتقل کروں تو مجھے ایک نیا کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس میں کیا تحقیق ہے؟ کیا محقق ہے؟ کیا علمیت ہے کہ میں کسی کے مطالب اپنے کتاب میں نقل کر دوں، اگر میرے پاس کوئی نیا مطلب نہیں ہے تو رہنے دوں اور فقط گزشتہ لوگوں کی کتابوں کا احیاء کروں، لوگوں کی راہنمائی کروں کہ ان کی کتابوں کی طرف رجوع کریں،

☆ وقال: کیف مخالف معتقد ابائک......

شیطانِ تقلید آکر اس کو یہ کہتا ہے کہ تو نے تو یہ بات نہیں سنی ہوئی تھی، پہلے تیرے پیر و مرشد

☆ شیطانِ تقلید کا حملہ

نے تو یہ بیان نہیں کیا تھا، تو کس طرح سے اپنے بزرگ یعنی بزرگِ علمی، آباءِ علمی کے خلاف سوچ رہا ہے؟ ایسی زنجیر میں جکڑا ہوا انسان فوراً شیطان کے حملے کی زد میں ہوتا ہے، تعصّبات کی دنیا یہی ہے۔

☆تعصبات،مذہبی دنیا کا بڑا مسئلہ

مذہبی دنیا کی ایک بڑی مشکل یہی ہے کہ تعصّبات کی دنیا ہے، مذہب اور تعصب ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ہیں، جس دن انسان تعصب چھوڑے گا تو اسے مذہب بھی چھوڑنا پڑے گا لیکن مشکل یہ ہے کہ مذہبی تعصب رکھتے ہوئے انسان درست عمل کیسے کرسکتا ہے؟ یہ حل طلب مسئلہ ہے، یہ تمام مذہبیوں کے لئے ایک چیلنج (Challenge) ہے، چیلنج اس طرح ہے کہ مذہبی دنیا متعصب دنیا ہے اور تعصب چھوڑ دیں گے تو آپ کا مذہب بھی ساتھ جائے گا مثلاً درست ہے کہ فلاں ہمارے مذہب کا نہیں ہے لیکن آیا اس نے کوئی صحیح بات نہیں کی ہے؟ اس کے پاس کوئی درست بات نہیں ہے ؟ تعصب کہتا ہے کہ ان کی صحیح باتیں بھی غلط ہیں چونکہ یہ آپ کے مذہب کے نہیں ہیں، یہاں انسان کو مشکل پیش آجاتی ہے اور اپنی ہر بات درست ہے اگرچہ وہ غلط ہی ہو مثلاً میرے مذہبی آدمی نے، میرے ہم آہنگِ مذہب نے جو بات کی ہے وہ درست ہے اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، اشتباہ ہی کیوں نہ ہو، انسان کہتا ہے کہ وہی درست ہیں، تو کس طرح سے انسان مذہبی بھی ہو اور درعینِ حال متعصب بھی نہ ہو یعنی مذہب بھی باقی رہے اور تعصب بھی ختم ہو جائے ؟ وہ انسان حق تک پہنچ سکتا ہے کہ جس کے اندر تعصب نہ ہو، خصوصاً اس جہت سے تعصب نہ ہو کہ جہاں

سے حق ملتا ہے انسان وہاں سے حق نہ لے۔ ہماری دینی تعلیمات کا حصہ یہ ہے کہ

اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤمِنِ......(۱۰)

حکمت و دانائی مومن کا گمشدہ مال ہے......

حکمت آپ کی گمشدہ چیز ہے، کہیں بھی ملے حتیٰ اگر منافق کے پاس بھی حکمت ہے تو لے لو، یہاں پر تعصب نہ کرو کہ چونکہ منافق یہ بات کر رہا ہے لہٰذا ہم نہیں کہیں گے، ممکن ہے کسی عالم کی زبان پر یہ مطلب جاری ہوا ہو کہ جو آپ کا ہم مسلک نہیں ہے، ممکن ہے غیر مسلم ہو کہ اس کی زبان پر خدا نے یہ بات ڈال دی ہے کہ جو آپ کا ہم مسلک نہیں ہے، حق جہاں بھی ہے وہاں سے لے لو اگرچہ آپ کے دشمن کے پاس ہی کیوں نہ ہو۔

☆ تضاربِ آراء کو تحمل کریں

☆تضاربِ آراء کو تحمل کریں

☆ فیز عم ان ذلک غرور من الشیطان......

اس وقت انسان اس غرورِ شیطانی میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ یہ گمان کرتا ہے کہ جو بات بھی میرے مرشد، میرے شیخ، میرے بزرگ، میرے آباءِ علمی یا میرے استاد کی رائے کے خلاف ہے وہ مطلب درست نہیں ہے، انسان نئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہے، بعض علماء اسی موئثر زمانے میں ابھی موجود ہیں کہ جنہوں نے بعض مسائل میں کچھ اختلافی آراء پیش کی ہیں، اختلافی آراء سے مراد یعنی وہ جو پہلے سے پیری مرشدی کے ماحول کے اندر طے شدہ مسائل ہیں ان سے ہٹ کر اگر کوئی

بات کرے تو شور و غوغا، تفضیح، تضحیک، تذلیل اور فسق و فجور و تکفیر کے فتوے جاری ہونا شروع ہو جاتے ہیں، قبول کرنا ضروری نہیں ہے، آپ تحمل کریں، اگر کوئی اختلافی رائے ظاہر کرتا ہے تو غور کرو شاید ممکن ہو کہ درست کہہ رہا ہو، اگر درست کہہ رہا ہے تو بھی آپ کو شور نہیں مچانا چاہئے، اگر نادرست ہے تو آپ اس کو رد کر دیں، درست ہے تو اس کو قبول کر لیں۔

☆ تضاربِ آراء کو تحمل کریں

حوزے کے اندر علماء اور طلاب کے یہ شایانِ شان نہیں ہے اور یہ ان کیلئے سزاوار نہیں ہے کہ آرائے اختلافی کو اس طرح سے دیکھیں کہ جس طرح سے جہلاء دیکھتے ہیں، عوام الناس دیکھتے ہیں، عوام الناس تحمل نہیں کر سکتے ہیں، وہ اصلاً سرے سے اہل آراء نہیں ہیں، امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ انسان حق تک پہنچتا ہی تضاربِ آراء سے ہے، تضارب آراء یعنی ایک دوسرے سے ٹکراتی آراء، اختلافی آراء۔ مشورے لیں مشورے مختلف آئیں گے اور اختلافی مشورے آئیں گے، ان ہی میں سے انسان بہترین راہ تک پہنچتا ہے، مشاورت کی حکمت بھی یہی ہے کہ اختلافی باتیں سنو تا کہ درست راستہ اپنا سکو اور کہا گیا ہے کہ چاپلوسوں سے کبھی مشورہ نہ لو چونکہ وہ اختلافی رائے کبھی بھی ظاہر نہیں کرتا۔

درباروں اور سرکاروں میں زیادہ چاپلوس ہوتے ہیں، ایک بادشاہ نے پوچھا ٹائم کیا ہوا ہے تو چاپلوس نے جواب دیا کہ جو اعلیٰ حضرت کی مرضی ہو یعنی اعلیٰ حضرت جو ٹائم اس وقت پسند فرماتے ہیں وہی ہوا ہے، یہ لوگ تو کبھی بھی آپ کو حق نہیں بتا سکتے ہیں لہٰذا کہا گیا ہے کہ چاپلوس سے مشورہ اور رائے نہ لو، ناقص انسان سے رائے نہ لو، خسیس سے، بخیل سے، کنجوس سے کبھی بھی مشورہ نہ

کرو چونکہ یہ کبھی بھی صحیح رائے نہیں دیں گے، جو شخص ہمیشہ اختلافی رائے دیتا ہے اس سے حتماً رائے اور مشورہ لو شاید وہ کسی نکتے کی طرف آپ کو متوجہ کردے۔

☆علم کے ساتھ حلم کی ضرورت

☆علم کے ساتھ حلم کی ضرورت

علم کے ساتھ حلم ضروری ہے، اس وقت علم موجود ہے لیکن حلم نہیں ہے، اس مطلب کو علماء نے اپنی کتب میں مختلف منابع سے نقل کیا ہے، امامِ زمانہ علیہ السلام دعائے افتتاح میں اللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى حِلْمِهٖ بَعْدَ عِلْمِهٖ...... (۱۱)

اللہ کی حمد وثنا ہے اس کے علم کے بعد اس کے حلم پر......

یعنی الحمد للہ تو علم رکھتے ہوئے بھی اتنا حلیم ہے کہ ہم جیسوں کو تحمل و برداشت کیا ہوا ہے۔ کیا ہم واقعاً قابلِ تحمل ہیں؟ اپنے نفس میں جھانک کر دیکھیں، ضمیر کو دیکھیں، اپنے وجدان اور باطن کو دیکھیں کہ آیا ہم واقعی قابلِ برداشت و قابلِ تحمل ہیں؟ حوصلۂ خدا دیکھیں کہ ہم جیسوں کو بھی تحمل کیا ہوا ہے، درحالیکہ علم ہے، خدا کو ہماری ہر چیز کا علم ہے، یہ حلمِ خدا ہے کہ ہمیں برداشت کیا ہے ورنہ کب کا عذاب نازل کردیا ہوتا اور سب ضائع و تلف ہو چکے ہوتے، ہلاک ہو چکے ہوتے۔ علم کے ساتھ حلم بہت ضروری ہے ورنہ فقط علم کے ساتھ تعصب آجائے گا، اگر حلم نہیں آئے گا تو تعصب آجائے گا، ہمیشہ علم و حلم دونوں حاصل کرو، حوزۂ علمیہ اور حوزۂ حلمیہ دونوں ہونے چاہئیں وَاِلّا اگر حوزہ میں صرف

علوم ہوں تو حوزۂ علمیہ تعصبی ہو جائے گا۔

اگر علمی ماحول میں آراء تحمل نہ ہوئیں تو پھر کسی اور عوامی ماحول میں تو ممکن ہی نہیں ہے کہ آراء تحمل ہوں، تضاربِ آراء سے علوم ترقی کرتے ہیں، افراد اس طرح سے بنتے ہیں، افراد کی ترقی اور رشد کا راز یہ ہے کہ وہ تضاربِ آراء سے آگے بڑھتے ہیں اور حق تضاربِ آراء سے سامنے آتا ہے۔ اس کے لئے مشق کیا کریں، اپنے اندر تحمل ایجاد کریں، اپنے بارے میں، اپنی آراء اور اپنے اعتقادات کے بارے میں سننے کا حوصلہ پیدا کریں چونکہ کتاب پڑھنے سے علم آجاتا ہے لیکن حلم نہیں آتا ہے، حلم عملی تمرین اور عملی مشق سے آتا ہے کہ انسان برداشت کا مادہ پیدا کرے۔ مذہبی مشکل، مذہبی طبقے کی مشکل یہ ہے کہ ان کو علم ہوتا ہے حلم نہیں ہوتا ہے اس لئے ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں، یہ غیر مذہبی کو برداشت کر لیتے ہیں لیکن مذہبی مذہبی کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ جیسے وہ سوتنیں ہوتی ہیں، ایک مرد کی بیویاں کہ وہ پڑوسن کو تو برداشت کر لیتی ہیں لیکن اپنی سوتن کو برداشت نہیں کر سکتی ہیں، مذہبی بھی ایک دوسرے کے ساتھ یہی رشتہ روا رکھتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے سوت ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے حلم ہونا چاہئے۔

☆ علم کے ساتھ حلم کی ضرورت

☆ فیتباعد منه و یحترز عن مثله......

وہ گمان کرتا ہے کہ یہ میرے پیشوا اور مرشد کی بات کے خلاف ہے لہٰذا انسان اس سے اجتناب کرتا ہے اور دوری اختیار کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ اسے قبول نہیں کرتا بلکہ ٹھکرا دیتا ہے اور رد کر دیتا ہے۔

☆صوفیاء کی حقیقت

☆ ولمثل هذا قالت المتصوفة:......

صوفیاء یعنی عرفاء واہلِ معرفت لوگ،صوفی کا لفظ بدنام لفظ ہے،جس طرح سے بہت سارے الفاظ ہیں جو اپنی ذات میں اچھے ہیں لیکن غلط لوگوں نے اپنے اوپر استعمال کر کر کے ان کو برا بنا دیا ہے،جیسے علامہ ہے،پاکستان اور ہندوستان میں عالم کو عالمِ دین کہتے ہیں اور جاہل کو علامہ کہتے ہیں،یہ بھی ایک لطافت ہے اور برصغیر کا ادبی ذوق ہے کہ جاہل کو علامہ کہتے ہیں اور دوسرے کو عالم کہتے ہیں۔کوئی فون پر کہہ رہا تھا کہ لوگ ہم سے اب تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ہمیشہ علامہ بلاتے ہیں اس دفعہ آپ کوئی عالم بلائیں لہٰذا آپ ہمیں کوئی عالم دے دیں اس دفعہ ہم علاموں سے تنگ آگئے ہیں،لفظِ علاّمہ بدنام ہوگیا ہے،اس وجہ سے کہ جہلاء نے اسے اپنے لئے استعمال کیا ہے یا جہلاء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح سے لفظِ تصوّف وصوفی بھی ہے،یہ لفظِ صوفی شعبدہ بازوں کے لئے،ٹھگوں کے لئے،چوروں کے لئے اور مرید بازوں کے لئے اتنا استعمال ہوا ہے کہ لفظِ صوفی آتے ہی انسان کے ذہن میں زلفیں،پھٹے پرانے کپڑے،کشکول اور دیگر چیزیں آنا شروع ہو جاتی ہیں،صوفی،س اور ص دونوں سے لکھا جاتا ہے،الگ الگ نہیں ہیں،س کا سوفی اور ص کا صوفی دونوں ایک ہی لفظ ہیں،اس کا مطلب علم ودانش ہوتا ہے،صوفی یعنی جیسے آج کل لفظِ ڈاکٹر ہے،صوفی کا معنیٰ وہی ہے کہ جو آج کل ڈاکٹر کے نام سے موسوم ہے،ڈاکٹر بھی طبیب کو نہیں کہتے ہیں،معالج کو ڈاکٹر نہیں کہتے ہیں بلکہ

لغت میں ڈاکٹر اسکالر(Scholar) کو کہتے ہیں یعنی دانشور، دانشمند آدمی، جس کے اندر دانش ہو، یہ لفظ طبیبوں نے اپنے لئے چن لیا ہے اسی لئے ان کو بھی اب ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر یعنی دانشمند، صوفی اور اسکالر، صوفی اصل میں یونانی لفظ ہے عربی لفظ بھی نہیں ہے، بعض نے اس کو جان بوجھ کر عربی لفظ بنایا ہے، زبردستی عربی بنا کر کہا کہ صوفی اس کو کہتے ہیں کہ جو صوف پہنتا ہے، صوف سے مراد اون، جو لباس جانوروں کے بالوں سے بنایا جاتا ہے، اس سے جو خرقہ بنتا ہے اور وہ ایسا لبادہ پہنتا ہو تو اس کو صوفی کہتے ہیں۔ پھر تو جو جیسا لباس پہنتا ہے اسی کے نام سے اس کو یاد کرنا چاہئے مثلاً جو اون کا لباس پہنتا ہے وہ صوفی ہو جائے اور جو ریشم کا لباس پہنتا ہے وہ ریشمی ہو جائے، لباس سے تو کسی کا نام نہیں پڑتا ہے کہ اس نے کونسا فیبرک (Fabric) پہنا ہوا ہے، یہ لفظ اصل میں یونانی لفظ تھا اور بمعنیٰ اسکالر ہے، فیلسوف میں جو سوف استعمال ہوتا ہے فیلسوف لفظ مُعرّب از فیلوسوفا ہے، یونانی لفظ فیلوسوفا ہے، سوفا یونانی تلفظ ہے اس کا عربی تلفظ سوف ہے، فیلوسوفا یعنی محبّ دانش، سوفی یعنی دانشور لیکن بعد میں ٹھگوں نے اس کو اپنے لئے اتنا استعمال کیا کہ اب صوفی کا لفظ سنتے ہی ہمارے ذہن میں عجیب و غریب حلیے کے لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں مثلاً یہ دھمالی و خانقاہی طبقہ اور جو درباروں میں ادھر اُدھر بیٹھا ہوتا ہے۔

عرفاء بھی انہی کو کہتے ہیں یعنی اہلِ معرفت لوگ، عرفان بھی ان چیزوں کا نام نہیں ہے کہ جو آج کل متعارف ہیں، جس کی طرف لوگ زیادہ راغب ہیں، دیواریں دوڑانا، راز بتانا اور پیش گوئیاں کرنا وغیرہ عرفان نہیں ہے، ان چکروں میں انسان کبھی بھی نہ پڑے، اس وقت ایک لہر دوڑی

ہوئی ہے بلکہ جمہوری اسلامی کی رسمی مشکلات کا تجزیہ کرتے ہیں، اینالائز (Analize) کرتے ہیں کہ اس وقت ہم کو سب سے بڑے چیلنجز کیا درپیش ہیں، سیاسی، اجتماعی، مذہبی، دینی اور دوسرے مسائل تو ان میں اس وقت ایران کو ایک بڑا چیلنج یہی منحرف صوفیانہ اور عارفانہ افکار ہیں اور اتفاق سے یہ حوزے میں زیادہ ہیں، اس وقت یہ حوزے سے زیادہ پھوٹ رہے ہیں، ایک سال لیلۃ القدر میں خطیبِ حرم کا موضوع یہی تھا، انہوں نے اسی بات پر تقریر کی اور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ قم سے ایسی باتیں نہیں ہونی چاہئیں، قم سے ملک کے اندر ایسی بدعتیں نہیں پھیلنی چاہئیں اور مقامِ معظمِ رہبری مدظلہ بھی ہمیشہ اپنے ہر خطبے میں اس خطرے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جوانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔ اس کی بہت ساری داستانیں اور قصے ہیں، شاید بہت حد تک آپ آگاہ ہوں گے، یہاں پر متصوفہ سے مراد اہلِ معرفت ہیں یعنی جو اہلِ سیر و سلوک ہیں، جو اولیائے خدا اور مقربینِ الٰہی میں سے ہیں۔

☆ عرفاء کے نزدیک علم حجاب ہے

☆عرفاء کے نزدیک علم حجاب ہے

بعض اہلِ معرفت نے یہ کہا ہے کہ

☆ ان العلم حجاب......

عرفاء کہتے ہیں کہ علم حجاب ہے، اس علم سے کونسا علم مراد ہے؟ فرماتے ہیں کہ یہی مسموعی علم جو زنجیر بن جاتا ہے، جو انسان کو کسی کا قیدی بنا دیتا ہے، جس کے ہمراہ تعصب ہوتا ہے تو یہ علم حجاب

ہے، مثلاً انسان نے ایک مطلب کسی سے سن لیا ہے، سن کر اس کو زنجیر بنالیا اور تعصب کی پٹی بنا کر اپنے دماغ پہ چسپاں کر دیا لہٰذا اب کسی اور طرف نہیں جاتا ہے، حجاب اسی کو کہتے ہیں کہ جو انسان کو کہیں اور نہ جانے دے۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ معرفت نے کہا ہے کہ

☆ ان العلم حجاب، وهذا القول ان صدر عن محققيهم......

بے شک علم حجاب ہے اور اگر یہ قول محققین صوفیاء نے کہا ہے، کیونکہ کچھ جہلائے صوفیا بھی ہیں۔

☆ٹھگ صوفیاء و عرفاء

صدر المتالہین ؒ نے جہلاءِ صوفیا ء کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے یعنی جو ٹھگ طبقہ، مرید باز طبقہ ہے کہ جو خود مرید بناتے ہیں، بیعت کراتے ہیں اور خرقے پہنتے ہیں ان کے بارے میں سب سے بہترین کتاب صدر المتالہین ؒ کی ہے کسرُ اصنامِ الجاہلیہ کے نام سے رسالہ ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے، اس میں انہوں نے رد کیا ہے کہ یہ لوگ اصلِ تصوف یا عرفان نہیں ہیں، یہ سارے ٹھگ ہیں اور پھر فرمایا کہ ان میں سے محققین ہیں، البتہ ہر شعبے میں ہیں، فقہا میں بھی ایسے ہی ہیں، فقہا کے اندر تھوڑے لوگ ٹھگ ہیں کہ جو فقیہ نہیں ہیں لیکن فقیہ بن جاتے ہیں، خطیبوں میں اچھے یا درست خطیب ہیں لیکن اکثر ٹھگ ہیں، ڈاکٹروں میں بھی ٹھگ ہیں، اتائی ڈاکٹر کہ جو دوادارو کرنے والے ہیں اور انگلش میں جتنے حروف کی ترکیبیں یاد ہوتی ہیں ان سے ڈگریاں لکھ کر بورڈ لگا لیتے ہیں یہ ٹھگ ہیں، اسی طرح سے اس عرفاء کے طبقے کے اندر بھی اور اس لبادۂ عرفان میں بھی ٹھگ موجود

ہیں لیکن محققین بھی ہیں، جس طرح سے فقہا میں محققین بھی ہیں اور ٹھگ فقہا بھی ہیں یعنی وہ فقہا جو کسی اور کے رسالۂ عملیہ پر اپنا ٹائٹل چڑھا لیں، خود میں تو اتنا علم نہیں ہے کہ حتیٰ اپنی توضیح المسائل بھی لکھ سکیں پس کسی اور کی توضیح المسائل میں اپنا ٹائٹل چھاپ کر اس کے اوپر چسپاں کر دیا کہ آیت اللہ العظمیٰ فی العالمین مثلاً فی الملک والملکوت والعرش والکرسی والکہکشاں، لوگوں کو فریب دینے کے لئے یہ آیت اللہ عظمیٰ ہو جاتے ہیں۔

آپ دیکھیں کہ ایسے بہت ہیں اور لوگ ان کے اسیر ہیں، ذرا باہر جا کر عام لوگوں کے اندر جائیں تو بہت سے لوگ انہی ٹھگوں کے اسیر نظر آئیں گے، عموماً ضعیف نفوس اس مشکل سے دوچار ہو جاتے ہیں، مذہب کے بھیس میں ٹھگ بہت ہیں، وہ لوگوں کی امام زمانہ علیہ السلام سے ملاقات کراتے ہیں، خواب کی تعبیر بتاتے ہیں، کوئی غیب گوئی کرتے ہیں، کوئی مستقبل کے حالات بتاتے ہیں، کوئی انہیں امیر بننے کا راستہ بتاتے ہیں، یہ ساری ٹھگوں کی دنیا ہے، یہ ٹھگی سیکھتے ہیں اور پھر مذہب کے اندر آ کر ڈیرا ڈالتے ہیں چونکہ مذہبی لوگ بہت آسانی سے ٹھگے جا سکتے ہیں، ان کو بہت آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے لہٰذا اکثر ٹھگ لوگ منبروں پر ہیں یا پیر و عامل بنے ہوئے ہیں اور عورتوں یا دوسروں کو خرافات کا نشانہ بناتے ہیں۔ نالائق ترین انسان ٹھگ ہوتا ہے، جس کو نہ کچھ پڑھنا آتا ہے نہ لکھنا آتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضعیف تر اور بھولا بھالا وہ شخص ہے جو اس ٹھگ کا اسیر ہو جاتا ہے اور اس کو اپنا مرشد مان لیتا ہے، ٹھگ آتا ہے اور چند دن تک پیر بن کر کسی کے گھر میں رہتا ہے اور جاتے ہوئے ان کی لڑکی بھی ساتھ لے جاتا ہے، پھر پولیس کی طرف دوڑتے ہیں کہ پیر صاحب ہماری لڑکی

☆ ٹھگ صوفیا و عرفاء

لے گئے، یہ ضعیف ہیں یہ لوگ نہیں پہچان سکتے ہیں کہ یہ ٹھگ ہے، چور ہے اور شعبدہ باز ہے۔

بعض مریض کسی ٹھگ ڈاکٹر کے پاس پھنسے ہوئے ہیں، بعض کسی ٹھگ صوفی کے آگے پھنسے ہوئے ہیں، بعض کسی ٹھگ فقیہ کے ہاتھ پھنسے ہوئے ہیں اور بعض کسی اور ٹھگ کے ہاتھ پھنسے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے اندر معرفت وشعور آئے تو انہیں پتہ چلے کہ اسی میدان کے اند محققین بھی موجود ہیں۔ انسان محقق طبیب کے پاس جائے، محقق فقیہ کے پاس جائے اور محقق عارف کے پاس جائے۔

☆ محقق عرفاء کی بات کا صحیح معنیٰ مراد لیں

اگر محققین عرفاء کوئی بات کہیں تو اس کا صحیح معنیٰ کرنا چاہئے، جب بھی کسی محقق سے کوئی بات وارد ہو تو کوشش کریں کہ اس کا صحیح معنیٰ کریں، یہ روشِ علماء ہے، مثلاً ہر کلام میں کچھ پہلو غلطی کے بھی نکالے جا سکتے ہیں کچھ پہلو درست معنیٰ کے بھی نکالے جا سکتے ہیں لیکن انسان کوشش کرے اور دیکھے کہ کس کی زبان سے یہ مطلب ادا ہوا ہے، اگر ایک عالمِ محقق اور دانا و دانشور انسان سے یہ بات صادر ہوئی ہے تو آپ اس کا صحیح معنیٰ نکالیں اگر چہ غلط بھی نکل سکتا ہے لیکن آپ صحیح معنیٰ لیں اور اگر ایک صحیح بات ظاہراً غلط آدمی کر رہا ہے کہ جیسے خوارج کہتے تھے کہ

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ...... (۱۲)

حکم صرف اللہ کے اختیار میں ہے......

تو امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا

كَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا الْبَاطِلُ......(۱۳)

(خوارج کی زبان پر) جو الفاظ ہیں وہ حق ہیں لیکن اس سے باطل معنیٰ کا ارادہ کیا گیا ہے......

یہ آیتِ قرآن سے بھی غلط معنیٰ نکال رہے ہیں، یعنی قرآنی آیات سے بھی غلط معنیٰ نکالا جا سکتا ہے، روایت میں ہے کہ اگر ایک شخص قرآن کی آیات میں سے کسی ایک آیت پر عمل کر لے، عمر بھر درست عمل کر لے تو یہ اس کی نجات کے لئے کافی ہے، ایک نے کہا کہ میں تو اول سے ہی ایک آیت پر عمل کر رہا ہوں کہ

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ......(۱۴)

اس آیت پر عمل کیا ہے اور پابندی کے ساتھ آج تک کبھی بھی نماز کے قریب نہیں گیا ہوں، لہٰذا آیاتِ قرآن اور حدیث سے غلط معنیٰ نکالا جا سکتا ہے چونکہ یہ محققین صوفیاء یا محققینِ عرفاء کی بات ہے تو ان کی مراد کا صحیح معنیٰ کرنا چاہیئے، اس سلسلے میں انسان جدلی مزاج نہ اپنائے۔

☆جدلی مزاج، مذہبی دنیا کی ایک اور مشکل

ایک اور بڑی مشکل مذہبی طبقے کے اندر یہی جدلی مذہب ہے، یعنی مذہبیوں کا مزاج ہی جدلیاتی ہو جاتا ہے، جس کے اندر ٹکراؤ ہو، جس کے اندر حقیقت تک پہنچنا مقصود نہیں ہوتا ہے لہٰذا وہ علوم جو جدلی فضا بناتے ہیں وہ زیادہ رائج ہیں اور پر رونق تر ہیں، علمِ کلام یہی کام کرتا ہے، لوگ فلسفہ

کی طرف نہیں آتے ہیں چونکہ فلسفہ یہ لڑائی، مار پٹائی نہیں سکھاتا ہے لیکن علمِ کلام یہی سکھاتا ہے کہ آپ نے کیا کرنا ہے، علم کلام خدا پر بھی جھگڑا کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے، اللہ پہ لڑائی کیسے ہوسکتی ہے؟ معاد پہ لڑائی کیسے ہوسکتی ہے؟ نبوت وامامت پہ لڑائی کیسے ہوسکتی ہے؟ علمِ کلام کا ایک مثبت پہلو دفاع از مذہب ہے جو درست ہے لیکن وہ بھی البتہ جھگڑا ہی ہے کہ کسی نے حملہ کیا تو آپ دفاع کرسکیں لیکن علمِ کلام ایک اور چیز بھی بتاتا ہے کہ آپ دوسرے پر حملہ کیسے کرسکتے ہیں؟ یہ جدلی علم ہے، یہ محض جدلیاتی مزاج بھی بنا دیتا ہے، ہم جو عقائد پڑھتے ہیں وہ بھی اکثر جدلی کتب سے پڑھتے ہیں، جوں ہی عقائد کی دنیا میں وارد ہوتے ہیں تو اس سے پہلے کہ اپنا عقیدہ پڑھیں پہلے دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔

☆ جدلی مزاج، مذہبی دنیا کی ایک اور مشکل

جس طرح سے ہمارے منبروں پر رائج ہے کہ اہلبیت علیہم السلام کے فضائل سے مراد دوسروں پر حملہ کرنا لیتے ہیں، اس کو فضیلت سمجھتے ہیں، فلاں کی ایسی تیسی، یہ اہلبیت علیہم السلام کی فضیلت ہے؟ کس نے کہا کہ یہ فضیلت ہے؟ یہ جدلی ماحول اور جدلی ذہنیت ہے مثلاً ہم اگر قرآن کے فضائل بیان کریں تو کیا پہلے تورات وانجیل پر حملہ کریں گے اور پھر کہیں گے کہ قرآن یہ ہے؟ اور اب تو اہلبیت علیہم السلام کے فضائل کیلئے دوسری راہیں ایجاد کرلی ہیں اور اہلبیت علیہم السلام کے مخالفین یا منکرین کی سرکوبی کر کر کے نکتے پرانے ہوچکے ہیں، اب کوئی نئی بات بھی نہیں رہی، ان پر جتنے حملے کرسکتے تھے کئے۔

حتیٰ اب یہاں تک نوبت پہنچ آئی ہے کہ جو بہت ہی تعصب آور بات ہے، جدلیاتی ذہن اس طرح سے کام کرتا ہے کہ نئے نئے نکتے نکالو، یہ اس میں انبیاء علیہم السلام کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے

ہیں تا کہ اہلبیت علیہم السلام کی فضیلت ثابت ہو، بعض یہ کام کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بارے میں گستاخانہ اور انتہائی نازیبا تعبیریں استعمال کریں گے اور پھر اہلبیت علیہم السلام کی فضیلت ثابت کریں گے اور بعض تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، بعض شرک وکفر کی حد تک آگے بڑھ گئے ہیں، مثلاً امیر المومنین علیہ السلام کو امیر المومنین علیہ السلام ثابت کرنے کے لئے پہلے خدا کو مومن ثابت کرتے ہیں پھر کہتے ہیں خدا مومن ہے اور یہ امیر المومنین علیہ السلام ہیں، معاذ اللہ یہ فضیلت ہے؟ جدلی ذہنیت خطرناک ذہنیت ہے، آپ ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ مذہبی دنیا کی مشکلات ہیں یعنی مذہبی دنیا کی جدلی ذہنیت و جدلی مزاج ان کو ایک دوسرے سے ٹکرواتا ہے، اسی سے فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے، اسی سے جھگڑے دشمنیاں اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں، اسی سے ایک دوسرے سے دوریاں پیدا ہوتی ہیں، اسی سے مذہبی مذہبی کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

جن دنوں افغانستان کے اندر طالبان چھائے ہوئے تھے تو ایک صاحب نے طالبان کے بارے میں ایک خوبصورت تبصرہ کیا اور کہا کہ میں سوچتا رہا کہ یہ طالبان یعنی یہ مذہبی طبقہ، یہ مدرسوں کے لوگ، ہمیشہ انکے ذہنوں میں یہ لڑائی جھگڑا اور مار پٹائی کیوں رہتی ہے؟ یہ مارنے کے علاوہ اور کوئی بات سوچتے ہی نہیں ہیں، کہا کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جب یہ مدرسے میں داخل ہوتے ہیں تو پہلی کتاب یا پہلا علم ان کو صَرف پڑھایا جاتا ہے اور علمِ صرف میں ان کو جو پہلی گردان پڑھائی جاتی ہے وہ ضَرَبَ سے شروع ہوتی ہے، ضرب، ضربا، ضربو، ضربت، ضربتا، ضربن اور اس میں اتنے صیغے ہیں کہ سب کچھ شامل ہے یعنی، ایک مرد نے مارا، دو مردوں نے مارا، سب نے مارا، عورتوں نے مارا،

اس نے مارا، سب نے مارا، اِس کو مارو، اُس کو مارو، مارا گیا، انہوں نے کہا کہ یہ لوگ مارا ماری سے اپنا درسِ دین آغاز کرتے ہیں، اس وجہ سے جب فارغ التحصیل ہوتے ہیں تو ان کا وہی مزاج بنا ہوتا ہے۔

اپنی ذہنیت کو جدلی ذہنیت نہ بنائیں ورنہ آپ کبھی بھی حق تک نہیں پہنچ سکیں گے، آپ یہ طے کرلیں کہ تعصب کے ساتھ کبھی بھی حق تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ ہاں اپنے دفاع کے لئے حق تلاش کرلیں، حق کے دفاع کے لئے دلیل ہونی چاہئے، اس حد تک کہ اگر کوئی حملہ کرتا ہے تو ہم دفاع کرسکیں اور اس حد تک کہ اگر کوئی حق کا جستجو گر ہے تو ہم اس کو قانع کرسکیں، ہمارے پاس دلیل ہونی چاہئے لیکن جدلی ذہنیت نہ ہو۔

☆تقلیدی و جدلی علم حجاب ہے

☆تقلیدی و جدلی علم حجاب ھے

☆ فالمراد بالعلم العقاید التی استمر علیھا اکثر الناس بمجرد التقلید او مجرد کلمات جدلیة......

محققین کے نزدیک کون سا علم حجاب ہے؟ وہ علم جو انسان نے تقلیداً لیا ہوا ہے یا وہ علم جو جدلی مناظروں سے لیا ہوا ہے، مناظروں میں حق تک پہنچنا مقصود نہیں ہوتا ہے فقط اپنے طرفِ مقابل حریف کو شکست دینا مقصود ہوتا ہے لہٰذا جدل میں کبھی بھی لوگ درپے حق نہیں ہوتے ہیں، سوچ یہی ہوتی ہے کہ میں یہاں شکست نہ کھاؤں اور دوسرے کا منہ بند کرانا مقصود ہوتا ہے لہٰذا

کوئی جدلی مزاج انسان یا جدلی کتب یا جدلی علماء کے ذریعے حق تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ پس تقلیدی علوم یا محض جدلی کلمات حجاب ہیں۔

☆ حررها المتعصبون للمذاهب و القوها اليهم......

مذہب کے متعصب لوگوں نے جن علوم کو تحریر کیا ہے اور انہیں تعلیم دی ہے۔ بعض نے جدلی نظریے، نئے طریقے گھڑنے اور ان کی ترویج کرنے کی فیکٹریاں لگائی ہوئی ہیں کہ اس طرح سے جواب دو، اس طرح سے گھیرو۔ فخرِ رازی، امام رازی اہل سنت کی بہت معروف شخصیت اور ذوالفنون ہیں، ہر علم میں امام رازی کا ایک کارنامہ موجود ہے، ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ فخر رازی نے اپنی خلوت میں گریہ کیا، پھر رونے کا سبب یہ بتایا کہ چالیس سال تک میں ایک غلط مطلب پر معتقد تھا اور چالیس سال بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ بات غلط ہے، بعد میں بعض اہل معرفت، بعض عرفاء جو ان کے معاصر تھے ان تک یہ ماجرا پہنچا کہ اس بات پر امام رازی چالیس سال روئے ہیں کہ ایک مطلب پر عقیدہ تھا اور بعد میں خود ہی معلوم ہو گیا کہ یہ غلط ہے، چالیس سالہ جہالت پر گریہ کیا ہے تو انہوں نے ان کو خط لکھا کہ کیوں اس راستے پہ نہیں آجاتے ہیں کہ جہاں تمہیں ہر چالیس سال بعد رونا نہ پڑے؟ کیوں عروۃ الوثقیٰ اور وہ راستہ اختیار نہیں کرتے کہ جس میں یہ نوبت ہی نہ آئے کہ انسان ہر چالیس سال بعد گریہ کرے؟ یا ہر چند دن بعد پتہ چلے کہ چالیس سال سے جہالت میں مبتلا ہوں یعنی انہیں کہا کہ ان علوم سے، ان جدلی علوم سے نکلو اور حقیقی علوم کی طرف آؤ، قرآن کی طرف آؤ، دین کی طرف آؤ، حقائق کی طرف آؤ، علوم جدلی کو چھوڑ کر علوم حضوری اور علومِ

☆ تقلیدی و جدلی علم حجاب ہے

شہودی کی طرف آؤ کہ جو نورانیتِ محض ہیں،

☆ و اما العلم الحقیقی الحاصل بالکشف والمشاھدۃ بنور البصیرۃ......

☆ تقلیدی و جدلی علم حجاب ہے

لیکن وہ علمِ حقیقی تو حجاب نہیں ہے، وہ علمِ حقیقی جو مشاہدہ وحضور وکشف وشہود سے انسان کو حاصل ہوا ہو وہ حجاب نہیں ہے، البتہ ایک معنیٰ میں وہ بھی حجاب بن سکتا ہے، اس طرح کہ جب انسان کو پنا علم نظر آنا شروع ہو جائے یعنی انسان جب اپنے آپ کو عالم سمجھنا شروع کر دے تو اس وقت وہ علمِ حقیقی بھی حجاب ہو جاتا ہے، فرض کریں کہ کسی نے یہ جدلی علم حاصل نہیں کیا۔ اہل عرفان میں ہی کوئی اپنے آپ کو بڑا عارف سمجھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے پاس جو علم ہے وہ کسی کے پاس نہیں ہے، انسان کو اگر اپنا علم نظر آنے لگے تو یہ بھی حجاب ہے، حجاب کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جو نظر آنا شروع ہو جائے، اگر انسان کو اپنی انا نظر آنا شروع ہو جائے تو یہ انا حجاب ہے، اگر انسان کو اپنا نفس نظر آنا شروع ہو جائے، میں میں کرنا شروع کر دے تو یہ حجاب ہے، اگر انسان کو اپنے اندر کوئی کمال نظر آنا شروع ہو جائے تو یہ کمال حجاب ہے، جو چیز ہماری توجہ اپنی طرف جذب کر لے وہی حجاب ہے۔

علم نور ہے، نور اپنی طرف توجہ جذب نہیں کرتا ہے بلکہ انسانوں کی توجہ دوسری طرف لیکر جاتا ہے مثلاً اگر یہی نور جو اس کمرے میں موجود ہے کہ جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں لیکن اگر ہم ایک دوسرے کو دیکھنا چھوڑ کر نور کو دیکھنا شروع کر دیں تو یہ نور اس صورت میں حجاب ہے، اگر چہ یہ نورِ حقیقی ہے،

☆ فکیف یکون حجابا؟، وھو عین المقصد و منتھی المطلب.......

یہ کیسے حجاب ہوسکتا ہے؟ جبکہ یہ تو عینِ مقصد اور منتہائے مطلب ہے۔

۳)عربی علوم

☆ و ثالثھا: ان یکون مستغرقا بعلم العربیة و دقایق الالفاظ، مصروف العمر فی تحقیقھا......

اور تیسرا مانع بیرونی جو انسان کی راہ میں آجاتا ہے وہ طلاب کے لئے مانع ہے کہ آئے تھے قرآن سیکھنے کے لئے اور قرآن سیکھنے کے لئے عربی ضروری ہے لیکن جب عربی سیکھنا شروع کی تو قرآن بھول گئے اور عربی ہی کے ہوکر رہ گئے، اپنی ساری عمر انہوں نے اسی عربیت کے اندر صرف کردی اور عربی میں اجتہاد شروع کر دیا، مجتہد در عربی بن گئے اور بعض ایسے ہیں جو مجتہد در نحو ہیں، بعض مجتہد در صَرف ہیں، یہ فقط ایک علم کے مجتہد ہیں، دین و قرآن کی تو نوبت ہی نہیں آتی ہے، تیسرا مانع یہی علومِ عربی ہیں کہ انسان علومِ عربی و ادبی میں ہی اپنی ساری عمر خرچ کر دے، پوری عمر صرف صَرف و نحو اور قرآن کے قواعد و لغات میں صرف کر دے در عینِ حال معانیٔ قرآن سے غافل رہے، یہ بہت بڑا مانع ہے۔

آپؒ مثال بھی دیتے ہیں کہ جیسے زمخشری ہیں، زمخشری واقعاً شاہکار ہیں، تفسیرِ زمخشری قرآن کے اندر اپنی جگہ ادبی شاہکار ہے لیکن یہی تفسیر باعث بنی کہ زمخشری کو قرآن سمجھ میں نہیں آیا

اور یہ امام رازی کو بھی پتہ تھا کہ زمخشری کو قرآن سمجھ میں نہیں آیا۔ قرآن پڑھنا آتا تھا، قرآن کا تجزیہ و تحلیل خوب آتا تھا، عربی عبارت کی مبتدا و خبر زمخشری کو بہت دقیق معلوم تھی، زمخشری قرآنی ادبیات یعنی صرف ونحو میں امام بن گئے لیکن ایک آیہ آتی ہے تو زمخشری فوراً جبری ہو جاتے ہیں، ایک آیہ آتی ہے تو زمخشری فوراً معتزلی بن جاتے ہیں، جب معنیٰ آیت کا وقت آتا ہے تو زمخشری گونگوں کی طرح ہیں اور زمخشری وہ مطالب کہتے ہیں کہ جو واقعاً ایک بچہ بھی نہیں کہتا، یہی امامِ ادب، امامِ صرف ونحو کہ جس نے وہ نقابِ دقیقِ نحوی وصرفی قرآن کے اندر بیان کئے ہیں کہ لوگ حیران ہیں، ابھی تک زمخشری کی امامت ادبیات کے اندر مسلم ہے، اس سے موافق کوئی کام نہیں ہوا ہے اگر چہ دوسروں نے کرنا چاہا لیکن نہیں کر سکے اور اسی لئے امامتِ زمخشری اس مسئلے میں محفوظ ہے لیکن زمخشری قرآن شناس نہیں ہیں، آپ کبھی بھی زمخشری سے معانی نہ لیں، یہ دیکھنا کہ یہ آیت مبتدا ہے، یہ خبر ہے، تمیز ہے، حال ہے، یہ زمخشری سے پوچھ لیں لیکن اس آیہ کا معنیٰ کبھی بھی زمخشری سے نہ پوچھیں چونکہ زمخشری کو اس کام کے لئے خود فرصت نہیں ملی ہے۔

قرآن شناسوں اور قرآن فہموں کے لئے بھی یہ ایک مانع ہے، چونکہ قرآن ہدایت و نور ہے، قرآن کے اندر اسرار و حکمت موجود ہے اور اگر انسان انہی مخارج اور زیر و زبر میں لگا رہے اور وہ بھی تخصصی بحثِ زیر و زبر میں یعنی ایک زیر و زبر یہ ہے کہ ہم صحیح پڑھیں اور جو درست زیر و زبر پڑھ لیتا ہے تو کافی ہے لیکن یہ زیر کیوں ہے؟ اس کی بیس وجوہ ہیں، جب تک وہ بیس وجوہ بھی معلوم نہ ہوں تو کہتے ہیں کہ یہ جنت میں نہیں جائے گا۔ زیر پڑھ دی ہے تو کافی ہے اور اب اس کے معنیٰ کی

عرفانِ علوم

طرف آؤ، یعنی اس انسان کے اندر رغبتِ محرک ہے، شوق قرآن تک لے آیا ہے مثلاً ابھی قرآن کے بارے میں حوزۂ علمیہ کا شعبۂ تخصصی موجود ہے، وہاں پر یہی بتا دیتے ہیں مثلاً زمخشری اور فلاں و فلاں کی یہ کتاب سلیس ہے، یہ کتابیں پڑھ کر انسان متخصصِ قرآن ہو جاتا ہے لیکن اس متخصصِ قرآن سے کہو کہ اقتصادِ اسلامی پر قرآن سے ایک مقالہ لکھو تو وہ کہتا ہے کہ نحوِ اسلامی تو لکھ سکتا ہوں لیکن اقتصادِ اسلامی نہیں لکھ سکتا، اس سے کہو کہ سیاستِ اسلامی، حکومتِ اسلامی اور عدالتِ دینی پر قرآن سے ایک مقالہ لکھو تو وہ نہیں لکھ سکتا ہے۔ اصل ہدایاتِ قرآنی انہی فرعی کاموں کے آگے پیچھے ہو کر چھپ جاتی ہیں، قرآن فہمی کی راہ میں یہ سب سے بڑے موانع ہیں۔

☆معانی فقط الفاظ میں منحصر نہیں ہوتے

علومِ عربی و ادبی مقدمۂ فہمِ قرآن ہیں البتہ ضرورت کی حد تک کہ ان کے بغیر چارہ نہیں ہے چونکہ قرآن عربی میں ہے اور عربی قواعد و عربی آداب قرآن فہمی اور قرآن شناسی کے لئے ضروری ہیں لیکن ضرورت کی حد تک ہیں، بعض لوگ ترجموں کی مدد سے قرآن کو سمجھتے ہیں، ترجمے کے ذریعے بھی قرآن سمجھ میں آتا ہے لیکن حقِ قرآن ترجموں سے ادا نہیں ہوتا ہے، چونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن قابلِ ترجمہ نہیں ہے مثلاً ممکن نہیں ہے کہ کوئی قرآن کا ترجمہ کر سکے اس لئے کہ معانی فقط الفاظ میں نہیں ہوتے ہیں کہ ہم الفاظ کو دوسرے الفاظ میں بدل لیں، سیاق کے اندر بھی معانی ہوتے ہیں، ترکیب کے اندر بھی معانی ہوتے ہیں، تنظیم کے اندر بھی معانی ہوتے ہیں اور ربط کے اندر بھی

معانی ہوتے ہیں۔

جس طرح سے آپ ایک تقریر کو تحریر میں لائیں تو اس کے اندر نصف معانی فوت ہو جاتے ہیں، تقریر سے مراد یعنی اگر انسان شفاہی طور پر کچھ مطالب بیان کر رہا ہو تو اس وقت نصف معانی قلم میں لانے سے فوت ہو جاتے ہیں اس لئے کہ جب انسان بول رہا ہوتا ہے تو فقط زبان سے الفاظ ادا نہیں ہوتے ہیں بلکہ انسان کئی زبانوں سے بول رہا ہوتا ہے، ایک الفاظ کی زبان بول رہا ہوتا ہے، ایک اشارے کی زبان بول رہا ہوتا ہے، ایک اعضاء و جوارح کی زبان بول رہا ہوتا ہے، کئی زبانیں آنِ واحد میں بول کر وہ اپنے مطالب و مفاہیم کو ادا کر رہا ہوتا ہے، یہ چیز آج کل دنیا میں بھی رائج ہے اور اس پر بعض دنیاوی امور کے حصول کے لئے تاکید بھی کی جاتی ہے مثلاً جن کا کام مارکیٹنگ (Marketing) ہے ان کو ایک زبان سکھائی جاتی ہے کہ جو باڈی لینگویج (Body language) کہلاتی ہے، ہمارا دینی ادب یہ ہے کہ بالکل آرام سے، سکوت کے ساتھ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاؤ، اگر عورت کے ساتھ بات کر رہے ہو تو نیچے دیکھو لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ گفتگو کا نامعقول ترین طریقہ ہے، مارکیٹنگ کی دنیا میں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو چونکہ انسان آنکھوں سے بھی گفتگو کر رہا ہوتا ہے، جب آپ کسی کی نگاہ میں نگاہ ملا کر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو اس کا اور اثر ہوتا ہے، جب نگاہ جھکا کر بات کرتے ہیں تو اس کا اثر کچھ اور ہوتا ہے اور پھر آپ تبسم کے ساتھ گفتگو کریں، تبسم کا خود ادائیگی میں ایک دخل ہوتا ہے، انسان کا تبسم ایک معنیٰ ادا کر رہا ہوتا ہے اور جب آپ بول رہے ہوتے ہیں تو پورے وجود کے ساتھ بولیں، پورے جسم کے

☆ معانی فقط الفاظ میں منحصر نہیں ہوتے

ساتھ بولیں لہٰذا آپ مغربی طرزِ تخاطب دیکھیں تو وہ بولتے ہوئے پورے وجود سے بول رہے ہوتے ہیں لیکن مشرقی طریقۂ گفتگو محجوب اور شرمیلا طریقہ ہے، حتیٰ مرد اگر مرد کے ساتھ بھی گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو ایسے جیسے کسی عورت کے ساتھ بات کر رہا ہے۔

چنانچہ مشرقی طریقہ ہو یا مغربی طریقہ، محجوب طریقے سے بولیں یا غیر محجوب طریقے سے لیکن انسان کا لہجہ اور اعضاء و جورح بھی معانی ادا کر رہے ہوتے ہیں مثلاً آپ ایک شخص کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھیں، اس کے چہرے کی بناوٹ، اس کے چہرے کی رنگت، اس کی حرکات وسکنات، اس کی آنکھوں کی حرکت، اس کی نگاہ کا انداز، اس کے ہاتھوں کا انداز، یہ سب کچھ معانی ادا کر رہا ہوتا ہے اور جب اسی گفتگو کو قلم میں لاتے ہیں تو یہ سارے معانی وہاں فوت ہو جاتے ہیں چونکہ یہ اندازِ گفتگو ضبطِ تحریر میں نہیں آتا مثلاً نہج البلاغہ کے خطبے جو امیر المومنین علیہ السلام نے بیان کئے ہیں اگر یہ خطبۂ شقشقیہ انسان وہاں سامنے بیٹھ کر سن رہا ہوتا یا کمیلؒ جس طرح سے مطالب نقل کرتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام نے میرا بازو پکڑا اور پھر اپنے سینے پہ ہاتھ مارا اور پھر فرمایا کہ

اِنَّ هَاهُنَا لَعِلْماً جَمّاً......(۱۵)

بتحقیق یہاں اس جگہ علم کا ٹھاٹھے مارتا سمندر ہے......

امیر المومنین علیہ السلام کا انداز اور چہرے کے تاثرات معانی ادا کر رہے ہوتے ہیں مثلاً انسان کبھی سنجیدگی سے بول رہا ہوتا ہے، کبھی شوخی میں بول رہا ہوتا ہے، کبھی غصے میں بول رہا ہوتا ہے، کبھی حیرت میں بول رہا ہوتا ہے، یہ سب انسان کے چہرے کا انداز بتاتا ہے، اسی طرح سے قرآن کی عربی

☆ معانی فقط الفاظ میں منحصر نہیں ہوتے

زبان میں ایک خاص ترکیب یا خاص ادائیگی ہے، قرآن کچھ معانی ومطالب الفاظ کے ذریعے سے ادا کرتا ہے، کچھ مطالب اپنی بندش، ترتیب، تنظیمِ الفاظ وسیاق کے ذریعے سے ادا کر رہا ہوتا ہے اور جب ہم اس کو دوسری زبان کے قالب میں تبدیل کرتے ہیں تو وہ ساری حقیقت فوت ہو جاتی ہے لہٰذا قرآن پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ عربی سیکھ لیں۔

☆عربی ضرور سیکھیں لیکن افراط و تفریط کے بغیر

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے کہ جو ہمارے لئے ہدایت کی کتاب ہے اور ہماری دنیوی واخروی فلاح کی ضامن ہے لیکن قرآن سے ہدایت صحیح معنوں میں اسی وقت لیں سکتے ہیں کہ جب عربی سے آشنا ہوں لہٰذا عربی زبان ضرور سیکھیں۔ کیا حرج ہے عربی سیکھنے میں؟ انگریزی سیکھ لیتے ہیں کہ جس کے اندر فقط ملازمت ہے۔ آیا ملازمت کے لئے بچہ پیدا ہوتا ہے؟ بلکہ ابھی تو انگریزی اسکولوں میں بچے کی پیدائش سے پہلے داخلے شروع ہو گئے ہیں، بعض ایسے اسکول ہیں کہ جوں ہی نطفہ منعقد ہوتا ہے اسی وقت جا کر ایڈمیشن (Admission) کروائیں تو ٹھیک ہے ورنہ پیدا ہو کر داخلہ نہیں ملے گا، بچے کو پانچ سال بعد اسکول جانا ہے لیکن داخلہ ابھی جا کر کروائیں۔

انگریزی کے لئے اتنا اہتمام کرتے ہیں، ایسی زبان کہ جس کے اندر کوئی مطالب، کوئی معانی کچھ بھی نہیں ہیں، معارف وہدایت نہیں ہے بلکہ اس کے اندر صرف ملازمت ہے اور اپنے تئیں اسٹیٹس (Status) ہے، متدین ترین مسلمان کی کوشش اور آخری آرزو یہی ہوتی ہے کہ میرا

بچہ انگریزی سیکھ جائے اور جس دن انگریزی میں ماں باپ کو یاد کرتا ہے، مما، پپا کہتا ہے تو وہ اس دن پھولے نہیں سماتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کم از کم اس بچے کے بارے میں تو کامیاب ہو گئے ہیں، فزت و ربّ الکعبة، جب وہ انگریزی بولتا ہے، اس دن وہ کہتے ہیں کہ ہم کامیاب ہو گئے، موفق ہو گئے، بچہ انگریزی بولنا شروع ہو گیا ہے لیکن جو آپ کی ہدایت کی زبان ہے، جو آپ کی سعادت کی زبان ہے، جس کے اندر قرآن ہے اس کی سرے سے کوئی فکر ہی نہیں ہے۔

عربی سیکھنے کے لئے یہی ایک محرک کافی ہے کہ اس کے اندر قرآن ہے۔ یہ کلامِ خدا کی زبان ہے پھر زبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، زبانِ ائمہ علیہم السلام ہے، ایک طرف سے ہم ائمہ اہل البیت علیہم السلام کے ساتھ اتنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف سے ائمہ علیہم السلام کی زبان سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، قرآن کی زبان سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ضروری ہے کہ انسان ان ادبی علوم سے آشنا ہو اور دیگر علوم بھی جو ابھی ذیل میں اشارہ ہوں گے لیکن افراط نہ کرے، اس طرح سے نہ ہو کہ اگر میں نے قرآن کی عربی کی مشکل حل کر لی تو بس کلِ قرآن میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ بسا اوقات یہی قواعدِ عربی فہمِ قرآن میں مانع بن جاتے ہیں کہ جیسے مثال بھی دی تھی کہ جو کام زمخشری نے انجام دیا ہے، مشکلِ عربی حل کر کے، قرآن کی عبارتوں کی تصحیح و اعراب و بنا و مبتدا و خبر بیان کر کے چھوڑ دیا کہ بس قرآن حل ہو گیا، اب پیچھے کیا کام رہ گیا کہ میں بیان کروں مثلاً

☆ عربی ضرور سیکھیں لیکن افراط و تفریط کے بغیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کی کئی ترکیبیں اور کئی تجزیئے بیان کر کے چھوڑ دیئے کہ بس بسم اللہ حل ہو گئی، بسم اللہ میں

اور کیا رہ گیا؟ اب کیا بیان کریں گے؟ یہ خود فہمِ قرآن میں ایک مانع بن جاتا ہے، البتہ یہ مسئلہ عوام کو درپیش نہیں ہے، عوام کو برعکس معنیٰ درپیش ہیں کہ انہیں سرے سے اصلاً قواعدِ عربی ہی معلوم نہیں ہوتے ہیں، یہ مانع اہلِ علم کو، مدرسے والوں کو درپیش ہیں کہ عربی پڑھ کر وہیں فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں، یہ قواعدِ عربی اور صرف ونحو دین کی راہ میں بھی مانع ہیں اور قرآن کی راہ میں بھی اس لحاظ سے مانع ہیں کہ بعض علومِ عربی پڑھ کر وہیں پر حجۃ الاسلام ہو جاتے ہیں کہ بس ہم دین سیکھ گئے، سیوطی تک تو دین نہیں ہے، سیوطی تک تو فقط مبتدا و خبر اور کچھ چیزیں ہیں، کتنے سارے لوگ ہیں کہ جو سیوطی پڑھ کر فارغ التحصیل ہو گئے ہیں؟ سیوطی سے آگے نہیں پڑھا لیکن حجۃ الاسلام ہیں، ان کو حجت الادب کہہ دیں، ان کو حجۃ العرب کہہ دیں، ان کو کوئی اور نام دے دیں تو ان پر جچتا ہے لیکن عربی پڑھ کر یہ اسلام کی حجت کیسے بن گیا؟

☆ عربی ضرور سیکھیں لیکن افراط و تفریط سے گریز

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس کو نحو نہیں آتی، صَرف نہیں آتا تو وہ جنتی ہو ہی نہیں سکتا ہے، مولانا روم نے ایک نحوی کا قضیہ ذکر کیا ہے کہ ایک نحوی سمندری سفر کر رہا تھا، یہ مجتہد درنحو اصالتِ نحو کا قائل تھا یعنی دین و ایمان و توحید و معاد سب اس کی نحو تھی، راستے میں اس نے کشتی میں ملّاح سے پوچھا کہ اے ناخدا تجھے نحو آتی ہے؟ اس نے کہا نہیں مجھے نحو نہیں آتی ہے، میں تو ساری عمر بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کشتی چلاتا رہا ہوں تو اس نحوی نے کہا کہ تیری آدھی عمر ضائع ہو گئی ہے، تباہ ہو گئی ہے، تو وہ پریشان ہوا کہ سمندر میں ہی میری آدھی عمر تباہ ہو گئی اور نحو نہیں پڑھ سکا، تھوڑا سا آگے چلے تو طوفان آ گیا اور موجیں اٹھنا شروع ہو گئیں تو اب ناخدا نے نحوی سے پوچھا کہ جنابِ نحوی تیرنا آتا ہے؟

انہوں نے کہا کہ یہ تو نہیں آتا ہے، ملاّح نے کہا کہ تمہاری ساری عمر تباہ ہوگئی۔اب یوں نہیں ہے کہ انسان انہی علوم کا ہو کر رہ جائے، بقدرِ ضرورت لازمی ہے، عربی کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا لہذا بقدرِ ضرورت سیکھے۔

☆مقصودِ اصلئ قرآن

☆فان المقصود الاصلی من انزال القرآن لیس الا سیاقة الخلق الی جوار اللّٰہ بتکمیل ذواتھم و تنویر قلوبھم بنور معرفة اللّٰہ و ایاته......

نزولِ قرآن سے مقصود یہ تھا کہ یہ خلق کو جوارِ خدا میں لے جائے، تکمیلِ ذاتِ انسان مقصود تھا، معرفتِ خدا سے اور آیاتِ کریمہ کے نور سے انسانی نفوس اور دلوں کو نورانی کر کے قربِ خدا عطا کرنا مقصودِ اصلی قرآن ہے،

☆ دون صرف الاوقات فی نحو الکلام و تحسین الالفاظ و علم البلاغة و فن البدیع،

اسلیئے نازل نہیں ہوا تھا کہ ہم قرآن کے بہانے سے الفاظ سے متعلقہ دیگر علوم کو حاصل کرنا شروع ہو جائیں مثلاً حسنِ الفاظ و علمِ بلاغت و فنِ بدیع وغیرہ، کہتے ہیں کہ ادبیات کے چودہ علم ہیں پھر بعض نے اس میں عروض و دیگر علوم بھی بیچ میں شامل کر لئے ہیں کہ اگر ایک انسان انہی میں ساری عمر صرف کر دے تو وہ کہیں نہیں پہنچ سکتا ہے،

☆مقصودِ اصلئ قرآن

☆ فان ذلک من التوابع التی بها یقع الاحتجاج علی المنکرین......

یہ علوم توابع یعنی لوازم ہیں اور ضمنی چیزیں ہیں کہ ان کو از بر رکھو تا کہ اگر کسی دن کسی کو قرآن سمجھ نہ آیا تو آپ قاعدۂ ادبی کے ذریعے سے اس کو سمجھا سکو اور قائل کرسکو، فقط اتنی حد تک،

☆ واما الاستبصار لمعانی ایات القرآن فیکفی لها دون ما بلغ الیه الزمخشری و اترابه......

لیکن آیاتِ قرآن میں لفظی بحثیں کرنا اور ادبی علوم میں تدقیق کرنا جیسے زمخشری، پیروانِ زمخشری وہم فکرانِ زمخشری نے کیا ہے یہ درست نہیں ہے،

☆ واستفرغوا اوقاتهم......

اور انہوں نے اپنا سارا وقت اسی میں صرف کردیا،

☆ وبذلوا غاية سعيهم و جهدهم فيه......

اور انہوں نے اپنی ساری غایت، کلِ کوشش ونہایتِ جہد انہی الفاظ میں صرف کردی مثلاً زیر، زبر میں، مبتدا وخبر میں اور نحوی وصرفی مسائل میں،

☆ فلاجرم حجروا المعانی الاصلية و حرموا عن جدوی الكلام.

نتیجہ یہ ہوا کہ زمخشری کے کلام میں آپ کو آیت کا معنیٰ کہیں بھی نہیں ملے گا، جیسے آپ کسی بیوٹی پارلر میں چلے جائیں کہ جہاں آرائش وتزئین ہوتی ہے یا ایسی دکان کہ جہاں آرائش کا سامان بکتا ہے تو وہاں پر آپ کو کوئی چیز کھانے کی نہیں ملے گی مثلاً بیوٹی پارلر میں آپ آئسکریم مانگیں تو وہاں

نہیں ہوگی، کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے چونکہ سب آرائش کا سامان ہے، اسی طرح سے زمخشری نے قرآن کی آرائش وزیبائش الفاظ کی چیزیں پیش کی ہیں لیکن آپ کو وہاں پر معانی نہیں ملیں گے۔

٤)تفاسیر پر جمود

☆ورابعها: الجمود والوقوف علی ما قرأہ من التفاسیر......

قرآن فہمی میں ایک بہت بڑا مانع تفاسیر بھی ہیں البتہ اس سے کوئی یہ مطلب نہ نکالے کہ اب ہم نے کوئی تفسیر نہیں پڑھنی ہے۔ تفسیر پڑھنی ہے، تفسیر کو راہنمائی کے لئے پڑھیں، معلم کے طور پر پڑھیں، جس طرح سے آپ نے دوسری کتابیں پڑھی ہیں تو وہ اس لئے تو نہیں پڑھی ہیں کہ ہم انہی کتابوں کے اسیر ہو کر رہ جائیں گے کہ جو ان کتابوں میں ہے وہ حق ہے اور جو ان کتابوں میں ہے وہ کچھ نہیں ہے اور اس میں کسی کو اظہار کا حق نہیں ہے مثلاً فرض کرلیں کہ ہم نے تاریخ کی کتاب پڑھی ہے تو اس تاریخ کی کتاب میں جو بات لکھی ہے وہ درست ہے اور اس کے علاوہ کوئی چیز درست نہیں ہے یا ریاضی کی لیٹسٹ (Latest) کتاب پڑھی ہے تو کوئی یہ نہیں کہتا ہے کہ پہلے ریاضی کی کتاب میں یوں لکھا ہوا تھا تو بعد میں اس طرح کیوں لکھا ہوا ہے؟ یہ کوئی نہیں کہتا ہے کہ جو اس میں لکھا ہوا تھا میں وہ مانوں گا اور اس کے علاوہ دوسری چیز نہیں مانوں گا۔ کچھ لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے ہیں مثلاً ایک رسم الخط میں قرآن ہے تو فقط اسی رسم الخط میں پڑھ سکتے ہیں اور دوسرے رسم الخط سے ان سے قرآن قرأت بھی نہیں ہوتا ہے، تفاسیر سے راہنمائی ضرور لیں اور یہ دیکھیں کہ اس مفسر کو کیا

سمجھ آیا ہے، اس نے آیات سے کیا استنباط کیا ہے؟ لیکن راہنمائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خود غور نہ کروں۔

بعض سابقہ بزرگان نے تفاسیر لکھیں ہیں اوران کو یہ کام کرنا بھی چاہئے تھا لیکن یہی تفاسیرِ اب قرآن فہمی میں ایک مانع کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ ایک رکاوٹ ہیں، کونسی تفاسیر؟ جن کو انسان پڑھتا تو ہے لیکن خود تدبر نہیں کرتا، اس میں قصور تفاسیر کا نہیں ہے بلکہ خود انسانِ مقلد کا قصور ہے، تفاسیر راہنمائی لینے کے لئے ہیں، یہ اسلئے ہیں کہ بالآخر دیکھیں کہ دوسروں نے اس بارے میں کیا کہا ہے؟ لیکن جو انسان تفاسیر کا مطالعہ اس لئے کرے کہ مجھے کچھ نہیں کرنا ہے تو یہ رکاوٹ ہے لیکن اگر انسان ساری تفاسیر دیکھے کہ یہ دوسروں نے کہا ہے اوراب میں قرآن سمجھتا ہوں، میں اس آیت میں غور کرتا ہوں، میں دیکھوں کہ مجھے کیا بات سمجھ میں آتی ہے یا انہی لوگوں نے جو کچھ راہنمائی کی ہے اس راہنمائی کے روشنی میں اب میں قرآن سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس لحاظ سے تفاسیر خوب ہیں یعنی اگر فہم میں مدد دیں اور معاونِ فہم بنیں۔

تفاسیر پر جمود

لیکن اگر تفاسیر ہمیں روک لیں اور ایک جگہ پر جمود اختیار کرلیں مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص نے آکر آیت کا معنیٰ کیا ہے تو اس سے سب سے پہلے دوسرے بھی یہ سوال پوچھتے ہیں یا اس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے مفسرین سے نقلِ قول کرے کہ انہوں نے اس بارے میں کیا کہا ہے؟ اورخصوصاً قدماء حرام سمجھتے ہیں کہ ابنِ عباس، مجاہد، قطادہ، مقاتل اور چند افراد کے علاوہ کسی اور کا نقلِ قول بھی کریں، کہتے ہیں کہ آپ نے قرآن میں بدعت کی ہے کیونکہ ابنِ عباس اوران چند افراد کے

علاوہ کسی کا نقلِ قول بھی نہیں کر سکتے ہیں، یہ جمود اور تقلید انسان کو قرآن سمجھنے سے روکتے ہیں درعینِ حال تفسیر بالرائے نہیں کرنی ہے، تفسیر بالرائے ایک لغزش گاہ ہے لیکن تفسیر بالرائے کی بھی وضاحت کی ضرورت ہے، صدر المتالھینؒ نے اسی کتابِ مفاتیح الغیب میں فصلِ ''الفاتحة الثالثة'' کے اندر تفسیر بالرائے کی وضاحت بھی کی ہے لہٰذا قارعین وہاں رجوع کر سکتے ہیں۔

مفسرین قرآن میں غور کرنے کے اعتبار سے ہمارے نائب نہیں ہے، یہ نیابت اگر کسی نے دی ہوئی ہے تو غلط ہے، بارہا یہ عرض کیا ہے کہ دین میں نیابت درست نہیں ہے کہ مثلاً ہم لوگ حوزوں میں بیٹھے ہوئے ہیں تو عوام کے نائب بن کر دین سمجھ رہے ہیں اور عوام ہماری نیابت میں دنیا کما رہی ہے۔ نہ وہ نیابت درست ہے اور نہ یہ نیابت درست ہے بلکہ یہ واجبات ہیں، یہ واجبات آپ نے خود ادا کرنے ہیں، جس طرح سے اپنی نماز خود پڑھنی ہے اس میں اپنا نائب نہیں بنا سکتے ہیں اسی طرح سے دین سیکھنا، قرآن سیکھنا ہر ایک کا فریضہ ہے، یہ فریضۂ عینی ہے نہ کہ کفائی کہ ایک نے قرآن پڑھ لیا تو سب کیلئے کافی ہے، اگر ایک بچہ ایران میں الٹا حافظ بن گیا تو بس وہ پوری شیعہ قوم کے لئے کافی ہے۔ بلکہ فرد فردِ مسلم کو، عورت، مرد، بچے اور بوڑھے ہر ایک کے لئے واجب ہے کہ قرآن سمجھتا ہو، یہ نیابت نہیں دی جاسکتی ہے کہ طلباء بیٹھے ہوئے ہیں، علماء بیٹھے ہوئے ہیں، ہم ان کیلئے دعا کرتے ہیں اور وہ ہماری نیابت میں قرآن پڑھ رہے ہیں اور انہی سے شب قدر کو ٹیلیفون اور ایس ایم ایس (SMS) پر التماسِ دعا کہتے ہیں،

☆ الجمود والوقوف علیٰ ما قرأه من التفاسیر......

یعنی تفاسیر میں جو پڑھا ہے اسی پر رک جائے اور وقوف کرے،

☆ و ان یعتقد ان لا معنی لکلمات القرآن الا ما یتنا وله علی النقل عن ابن عباس و قتاده و مجاهد و مقاتل و غیرهم......

یعنی ابن عباس نے جو کہا ہے بس وہی درست ہے، اگر ابنِ عباس، قتادہ، مجاہد، مقاتل اور چند افراد سے ہٹ کر کسی نے کچھ کہا تو یہ درست نہیں ہے، ایک مدت تک تشیع میں یہ مشکل تھی، شیخ طوسیؒ نے جو کچھ کہا ہوا تھا سو سال تک اس کے خلاف کسی کو اظہار کی جرأت نہیں تھی تا اینکہ خود شیخِ طوسیؒ کے خاندان سے ہی ابن ادریس نامی دلیر آدمی پیدا ہوا اور انہوں نے آ کر اپنے ہی جد کے نظریات کو نقد کیا اور لوگوں سے کہا کہ یہ کر سکتے ہو، تشیع کے اندر شیخ طوسیؒ ایک منفرد شخصیت ہیں، واقعاً منفرد شخصیت ہیں، آپ شیخ طوسیؒ کو تشیع کا محافظ کہہ سکتے ہیں لیکن یوں نہیں ہے کہ جو کچھ شیخ طوسیؒ نے کہا ہے بس ہم نے اسی پر جم جانا ہے اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔

☆تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء

☆ وان ماوراء ذلک تفسیر بالرأی......

تفسیر بالرائے بھی ایک کوڑا بن گئی ہے، تفسیر بالرائے کوڑا بنا کر برساتے ہیں، ہر وہ شخص جو قرآن پڑھنے کی طرف آتا ہے اور کوشش کرتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ تم تفسیر بالرائے کرتے ہو حالانکہ خود تفسیر بالرائے کا معنیٰ بھی نہیں پتہ ہے کہ یہ ہوتی کیا ہے؟ اور اگر کوئی اظہارِ نظر کرے، کوئی انسان

غور و فکر کرے تو کہتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کر رہے ہیں،

☆ و ان من تجاوز عن النقل منهم......

یعنی جو یہ نہ کہے کہ ابن عباس نے یہ کہا ہے، ابن مسعود نے یہ کہا ہے اور سابقہ تاریخی قدیم مفسرین نے یہ کہا ہے تو اس کو فوراً کہتے ہیں کہ یہ تفسیر بالرائے کر رہا ہے،

☆ فورد عليه مفاد: من فسر القرآن برأيه فقد تبوء مقعده من النار......

رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث ہے کہ جس نے بھی قرآن کو اپنی رائے سے تفسیر کیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ درست ہے، تفسیر بالرائے جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے، ممنوع ہے لیکن تفسیر بالرائے ہے کیا؟ تفسیر بالرائے کو تدبّر در قرآن کرنے والوں پر کوڑا بنا کر استعمال نہ کریں، لوگوں کی قرآن میں تدبر نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم سے تفسیر بالرائے نہ ہو جائے، آپ یہ نہ کہیں اور یہ کوڑا استعمال نہ کریں بلکہ لوگوں کو رغبت دلائیں اور تفسیر بالرائے کا معنیٰ اور معیار بیان کریں کہ یہ تفسیر بالرائے ہے اور فقط اس سے پرہیز کرنا ہے،

☆ فهذا ايضاً من الحجب العظيمة التى اوقعها الشيطان......

یہ بھی ایک حجاب ہے کہ انسان کہے کہ جو قدماء نے کہا ہے وہی درست ہے اور آج ہم نے غور و تدبر نہیں کرنا ہے اور اگر کسی نے قدماء سے ہٹ کر کچھ کہہ دیا تو یہ تفسیر بالرائے ہے، یہ بھی شیطانی القاء ہے،

☆ ليصرف قلوب الكثيرين عن فهم معانى التأويل و انوار التنزيل......

☆ تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء

چونکہ شیطان نہیں چاہتا ہے کہ بنی آدم قرآن سے آشنا ہو، قرآنی نور ان کے دلوں میں اترے، ہر اچھے برے بہانے سے قرآن سے روکتا ہے، کسی کو روک لیتا ہے کہ ابھی ڈرامہ ہو رہا ہے کیا ضرورت ہے قرآن پڑھنے کی؟ ابھی فلم لگی ہوئی ہے اس طرف جاؤ، پہلے مزاج دیکھتا ہے کہ اس کو قرآن سے روکنے کے لئے کونسا حربہ درست ہے اور بعض کو روکتا ہے کہ خوب ڈرامے چھوڑ کر آ گیا ہے تو اب فقط مخرج ٹھیک کر باقی سارا معاملہ حل ہے، فقط تمہاری مخرج کی مشکل ہے، بعض کو کہتا ہے کہ صرف ونحو کی حد تک رک جاؤ اور بعض کو کہتا ہے کہ اگر آپ نے قرآن میں غور کیا تو تفسیر بالرائے ہو جائے گی اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ تفسیر بالرائے تمہیں جہنم لے جائے گی،

☆ و عدم قبولهم اياها عن اهل المكاشفات القرآنية......

مکاشفات وحقائق اور اسرارِ قرآنی شیطان قبول نہیں کرنے دیتا ہے،

☆ وسيأتي اماطة، هذا الحجاب......

فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کا حجاب کس طرح سے مرتفع ہو؟ ہم انشاء اللہ بعد میں کسی مناسبت سے اس پر مفصل بحث کریں گے، البتہ آدابِ قرآن کے بعد، آدابِ قرآن میں یہ بحث نہیں آئے گی، آدابِ قرآن کی فصل کے بعد جو فصل اس کتاب میں شروع ہوتی ہے وہ اسی بارے میں ہے کہ تفسیر بالرائے کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ اور تفسیر بالرائے اور تدبر میں کیا فرق ہے؟

☆ وفک هذه العقدة ببيان المعنى المراد من التفسير بالرای......

ہم یہ عقداء کھولیں گے کہ تفسیر بالرائے سے مراد کیا ہے؟ اور ممنوعہ چیز کونسی ہے؟

☆ تفسیر بالرائے کے عنوان سے شیطانی القاء

☆ و ان ما فهموه يناقض قول امير المؤمنين عليه السلام:......

اور یہ جوانہوں نے سمجھا ہے کہ تفسیر بالرائے سے قرآن نہیں پڑھنا چاہئے اور قدماء کے علاوہ کوئی بات نہیں سوچنی چاہئے، تفکر نہیں کرنا چاہئے تو یہ امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کے صریح خلاف ہے، کلامِ امیر المومنین علیہ السلام میں اور ان لوگوں کی ذہنیت میں تضاد ہے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ قدماء کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرو، امیر المومنین علیہ السلام نے کیا فرمایا ہے؟

☆ الا ان يؤتى العبد فهماً فى القرآن......

امیر المومنین علیہ السلام نے علامت بتائی ہے یعنی انسان اس وقت موردِ لطفِ خدا واقع ہوتا ہے کہ جب اپنے اندر احساس کرے کہ خدا نے اس کو فہمِ قرآن عطا کر دی ہے،

☆ و انه لو كان المعنى مقصوراً على الظاهر المنقول، لما وقع فيه الاختلاف بين الناس.

اور یہی معنیٰ جو ظواہر میں ہے اگر یہی تھا تو پھر تو اختلاف کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک اِس طرح سے قرآن کا معنیٰ کرے ایک اُس طرح سے قرآن کا معنیٰ کرے، ہر ایک کا فریضہ ہے کہ قرآن کو خود ذاتاً سمجھے۔ اپنے باقی سارے کام خود کرتے ہیں، سانس ہم خود لیتے ہیں، آکسیجن خود سونگھتے ہیں، افطار خود کرتے ہیں، سحری خود کھاتے ہیں، یہاں نہیں کہتے کہ جب مدرسے میں بیٹھے ہوئے ہیں تو ہمیں خود سانس لینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ وہ واجبات ہیں کہ جو آپ کی بقا اور حیات کے لئے ضروری ہیں، فرد فرد کو قرآن کی طرف رجوع کرنا ہے، فرد فرد آئے اور اپنے آپ کو قابلِ قرآن، اہلِ

قرآن اور مخاطَبِ قرآن بنائے۔

ان موانع کے علاوہ بھی دیگر بہت سے موانعِ فہمِ قرآن کی راہ میں حائل ہیں اور انسان جب تک ان موانع سے اپنا پیچھا نہیں چھڑاتا ہے تو قرآن فہمی کے مراحل میں آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ ہم دیگر موانع کو اس فصل کے حصہ سوم سے فہرست وار بیان کریں گے اور ان کی مختصر سی تشریح بھی کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ طلاق، آیہ ۷)

(۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۸۶)

(۳)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیۃ اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)
(التفسیر الصافی - الفیض الکاشانیؒ، الجزء ۱، صفحی ۱۳۴)
(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، المعروف تفسیر الألوسی - شہاب الدین محمود بن عبد اللّٰہ الحسینی الألوسیؒ)
(پرتوی ازاسرار نماز)(بحار الأنوار - العلامۃ الحجۃ فخر الامۃ المولی الشیخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۰، صفحہ ۱۶)(سنن النبی ﷺ - السید الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحہ ۲۳۵)

(۴)......(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی، الجزء ۱۶، صفحہ ۳۷۰)(تفسیر القمی - ابی الحسن علی بن ابراهیم القمیؒ)(وسائل الشیعۃ - الفقیہ المُحدّثِ الشیخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ، الجزء ۱۷، صفحہ ۳۱۰)(معجم أحادیث المهدیؑ)(بحار الأنوار - العلم العلامۃ الحجۃ فخر الامۃ المولی الشیخ محمد باقر المجلسی "قدس اللّٰہ سرہ". الجزء ۶، صفحہ ۳۰۸)
(مستدرک سفینۃ البحار - العلامۃ آیۃ اللّٰہ الشیخ علی النمازی، الجزء ۸، صفحہ ۴۸۹)

(۵)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ ۴۳)(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ ۷)

(۶)......(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ ۲۲)(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ ۲۳)

(۷)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۷۰)

(۸)......(تحریرات فی الأصول - السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء ۱، صفحه ۹۱)
(شبی در پایتخت بهشت، الجزء ۵، صفحه ۲۸)

(۹)......(سورۂ مبارکہ طٰہٰ، آیہ ۱۲)

(۱۰)......(باطن و تأویل قرآن، الجزء ۶، صفحه ۱)(علوم طبیعت در قرآن، الجزء ۲، صفحه ۷)(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانی، الجزء ۳، صفحه ۹۴)(نهج البلاغة - الشیخ محمد عبده، الجزء ۴، صفحه ۱۱)(الأمالی للطوسیؒ، الجزء ۲، صفحه ۲۱۳)
(میزان الحکمة - الریشهری، الجزء ۲، صفحه ۳۲۷)

(۱۱)......(تهذیب الاحکام فی شرح المقنعة للشیخ المفید رضوان اللّٰه علیه - الشیخ الطوسیؒ، الجزء ۳، صفحه ۱۰۹)(بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ۸۸، صفحه ۱۷۵)(علیؑ فی الکتاب والسنة والادب)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۵۷)(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ ۴۰)(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ ۶۷)

(۱۳)......(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء ۸، صفحه ۳۲۷)(ترجمه نهج البلاغه - انصاریان، الجزء ۱،

صفحہ ۱۵۲)(شرح نہج البلاغة - الحائری)(الگوهای رفتاری امام علی علیه السّلام)(مناقب أمیر المؤمنینؑ)(جاذبہ و دافعہ علیؑ - شهید مرتضی مطهریؒ، الجزء ۱، صفحہ ۱۵۶)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۴۳)

(۱۵)......(الانسان الکامل فی نهج البلاغة)(تصحیح القرائة فی نهج البلاغة)(شرح نهج البلاغة-الدخیل)(فی ظلال نهج البلاغة)

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ سوم)

۱)قلبی میلانات،لھوو لعب

۲)عدم تدبر در آیات

۳)قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا

☆استخارے کی حقیقت

٤)وھم وخیال

٥) زودباوری اورشکاکیت

٦)ظاھر بینی

۷)ھویٰ و ھوس

۸)دنیا پرستی

۹)غرور و تکبر

۱۰)تنگ نظری

۱۱)دنیوی افکارو نظریات سے متاثر ذھن

۱۲)سائنس زدہ ذھن

۱۳)عوام زدگی

جو موانع قرآن کی راہ میں اور فہمِ قرآن کی راہ میں موجود ہیں ان میں سے کچھ مفاتیح الغیب میں بیان کیے گئے ہیں اور بعض دوسرے منابع مثلاً روایات اور خود قرآن سے مستنبط ہیں، یہاں موانعِ فہمِ قرآن کی ایک فہرست درج کی جارہی ہے اور ان کی مختصر سی تشریح بھی ہوگی۔

۱)قلبی میلانات،لہو و لعب

قرآن فہمی کی راہ میں مانعِ دیگر جو انسان کے دل کے اندر موجود ہے وہ قلبی میلات ہیں، یہ سلبی و عدمی نہیں ہیں بلکہ وجودی اور ثبوتی چیزیں ہیں لیکن دل کے اندر موجود ہیں، جیسے دلِ لہوی ہے کہ جسے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہ دل کی ایک حالت ہے، یہ اندرونی مانع ہیں کہ دل کے اندر لہو ولعب، وقت گزارنے اور ضائع کرنے کی طرف رجحان ہے۔

پہلے بھی اشارہ ہوا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اصلی کام سے روک کے توجہ ہٹادے اور اپنی طرف مشغول کرلے اسے لہو کہتے ہیں اور ہر وہ چیز کہ جس میں مقصدیت نہ ہو اور عقلاء کے نزدیک قابلِ مذمت ہو تو وہ لعب ہے۔ بعض قلوب کیلئے قرآن نے فرمایا کہ ان کی مشکل یہ ہے کہ ان کے قلوب لہوی ہیں یعنی ان کے دل کے اندر لہو رچ بس گئی ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کا ایک اصلی کام ہے کہ جو خدا نے ان کے سپرد کیا ہے یعنی جس کام کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے وہ ان کا اصلی کام ہے لیکن ان کی مصروفیات اتنی ہیں کہ ان کو اصلی کام کے لئے فرصت نہیں ملتی ہے، جیسے کسی نے پوچھا کہ آپ درس پڑھتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ مجھے درس کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے؟ میرے اپنے مباحثے ہیں کہ درس کی فرصت نہیں ملتی ہے، بعض ہوتے ہیں کہ جو مباحثوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ان کو درس

کی فرصت نہیں ہوتی ہے، بعض ایسے مشغول ہیں کہ انہیں حتیٰ مباحثے کی بھی فرصت نہیں ہوتی ہے، امتحان کے وقت عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم بہت مصروف تھے، ہمیں کوئی کام درپیش تھا یہی قلوبِ لہوی ہیں، حضورِ قلب کی فصل میں آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ دل کیوں حاضر نہیں ہوتا ہے؟ چونکہ قلب لہوی ہے، لہو مانعِ از فہمِ قرآن ہے مثلاً نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو تجارت، بچے، گھر، دل، سفر یہ ساری چیزیں ہمیں نماز میں یاد آتی ہیں یہی علامت ہے کہ ہمارا قلب لہو میں مشغول ہے یعنی ان چیزوں نے ہماری توجہ اصلی کام سے ہٹا کر اپنی طرف لگائی ہوئی ہے، عبادتوں سے باہر جیسا دل ہوتا ہے تو عبادت میں بھی تو وہی دل ہوتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا دل اس طرح سے ہو کہ عبادت سے باہر، مسجد سے باہر یہ دل دنیوی ہو اور جوں ہی ہم مسجد کی دہلیز پر قدم رکھیں تو یہ دل خدائی بن جائے، اصلاً یہ شعبدہ تو نہیں ہے بلکہ دل ہے، جو دل مسجد سے باہر ہے وہی دل مسجد کے اندر ہے، مسجد سے باہر یہ دل کہاں مشغول ہے؟ مسجد کے اندر بھی یہ دل وہیں مشغول ہے۔ بقول اقبالؒ

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں......(۱)

یہ صنم پرست دل کہ جس کے اندر ہزاروں صنم بیٹھے ہوئے ہیں، یہ خدا کی بارگاہ میں جھک رہا ہے اور اس پر فرشتے بھی ہنستے ہیں کہ یہ بت کدہ اپنے سارے بت لے کر مسجد میں لوگوں کو کیا دھوکہ دینا چاہتا ہے؟

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ٥(۲)

یہ خدا اور صاحبانِ ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ خود ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور سمجھتے بھی نہیں ہیں۔

اس نماز میں اسے کیا ملے گا جبکہ اس کا دل صنم آشنا ہے؟ دل خدا آشنا ہونا چاہئے۔ کہا گیا ہے کہ رمضان میں انسان روزہ رکھ کر سو بھی جائے تو یہ عبادت ہے، کیوں؟ اس لئے کہ دلِ لہوی عبادت میں ہو تو بھی کچھ نہیں ملے گا لیکن دلِ مشغول در خدا، دلِ الٰہی اگر عبادت نہ بھی کر رہا ہو اور سو رہا ہو تو بھی وہ اس کی عبادت ہے، واقعاً یہ معاملۂ دل ہے، اگر دل واقعاً خدا کے لئے ہو اور سو جائیں تو بھی عبادت ہے، اگر نہ سوئے اور ہزار سجدے کرے تو ان سجدوں میں بھی انسان کو کچھ نہیں ملتا ہے کیونکہ دل مشغول ہے، دل لہوی ہے یعنی وہ دل جو ہماری توجہ اصلی کام سے ہٹا دے، کتنے ایسے کام ہیں؟ فارسی اور عربی ملا کر ایک مخلوط طنزیہ شعر ہے، یہ شعر استادِ بزرگوار مرحوم حضرت آیت اللہ صالحیؒ اپنے درس میں اور اپنی سخنرانیوں میں کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے چند بیت ذکر کیے تھے، آخر میں انہوں نے یہ پڑھا کہ

شغلتنا عن ربّنا کثرت کارنا

یعنی کام اتنے زیادہ ہیں کہ ہمیں خدا کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہیں ملتی ہے،

ومالنا وقت لپروردگارنا

کہ ہمارے پاس اپنے پروردگار کے لئے وقت ہی نہیں ہے،

حقیقتاً ایسے ہی ہے دل مشغول ہے اور کبھی دیکھا دیکھی میں آ بھی جاتے ہیں، جب لیلۃ

فی میلانات لہو و لعب

القدر میں کسی محفل میں جا بھی بیٹھتے ہیں تو وہاں بھی ذہن انہی چیزوں میں مشغول ہوتا ہے، پہلے تو دلِ لہوی کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن اب ٹیکنالوجی (Technology) نے یہ مشکل بھی حل کر دی ہے بلکہ مشکل زیادہ کھڑی کر دی ہے کہ دلِ لہوی پہلے چھپا ہوا تھا، پہلے اس پر خدائے ستار العیوب نے پردہ ڈالا ہوا تھا، کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ ساتھ میں بیٹھا ہوا لہوی ہے یا نہیں ہے لیکن جب سے موبائل فون آ گئے ہیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ لہوی ہے، لیلۃ القدر میں بیٹھ کر ایس ایم ایس (SMS) کر رہا ہوتا ہے، یہ یہاں آیا کیوں ہے؟ دعائے جوشن سننے کے لئے، اُدھر یا رب، یا عظیم یا خالق کہہ رہا ہے اور اِدھر ایس ایم ایس میں لگا ہوا ہے، اسے لیلۃ القدر میں کیا ملے گا؟ ہمارا ذہن ایسے ہی ہے، ہمارا ذہن مسلسل ایس ایم ایس کر رہا ہوتا ہے، قرآن کی بارگاہ میں جب ہم دلِ لہوی لے کر جائیں تو قرآن میں ٹکتا نہیں ہے، قرآن میں فوراً توجہ کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے، ہزاروں چیزوں نے ہمارا دل مشغول کیا ہوا ہے، درحالیکہ دل کا ایک مشغلہ ہونا چاہئے یعنی ذکرِ خدا۔

اسی طرح فرض کریں کہ ایک شخص کو منبر دے دیا گیا ہے کہ آپ ایک گھنٹے کے لئے پڑھیں اور یہ ہزار افراد کا مجمع آپ کے سامنے ہے، ہزار آدمیوں کا ایک ایک گھنٹہ ملا کر کتنے ہو گئے؟ اور فرض کریں عشرہ پڑھ رہا ہے یعنی دس دن، دس دن ہزار آدمیوں کا مجمع آپ کے پاس ہے یعنی ہزار گھنٹے روز کے حساب سے کُل دس ہزار گھنٹے آپ کے پاس ہیں، یہ دس ہزار گھنٹے اس نے کیا کیے؟ ان دس ہزار گھنٹوں میں کیا کیا؟ مثلاً آپ بڑے بڑے اداروں میں جائیں کہ دس ہزار گھنٹے جن کے لئے بڑا سرمایہ ہیں، عموماً بڑی بڑی جائیدادوں کے بارے میں خبروں میں اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اتنے

گھنٹے کام ہوا ہے، مثلاً ایران دس ہزار گھنٹے لگا کر ایٹمی ٹیکنالوجی تک پہنچ گیا ہے، دس ہزار گھنٹے کام کر کے انہوں نے کیا کر لیا؟ ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کر لی اور ہمارا خطیب دس ہزار گھنٹے لوگوں کے لطیفوں میں گزار دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی چیز لہو بھی ہو چونکہ مشغول کر کے اصلی کام سے توجہ ہٹا دیتی ہے، اصلی کام سے توجہ ہٹانے کے اعتبار سے یہ لہو ہے اور مقصد نہ ہونے کی وجہ سے لعب ہے، اگر انسان لعب میں مشغول ہو تو بھی قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے، کھیل کو لعب اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ چونکہ اس میں کوئی مقصد موجود نہیں ہوتا ہے لیکن انسان ورزش کیلئے، صحت کیلئے، تندرستی کیلئے جو اکسر سائز (Exercise) کرتا ہے وہ الگ چیز ہے، جو کام ویسے ہی سرگرمی کے طور پر، ٹائم پاس کرنے کیلئے کرتا ہے یہ لعب ہے چونکہ اس کے اندر کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے۔ شیطانی وساوس اس کام میں زیادہ آسانی سے اثر کرتے ہیں۔ کتاب کے اندر متن میں روایت بھی ہے، غالباً رسول اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ اگر شیاطین نے انسان کے دل کا احاطہ نہ کیا ہوتا تو انسان کو قرآن سمجھ میں آنا شروع ہو جاتا، شیاطین نے احاطہ کیا ہوا ہے، دلوں کو محاصرے میں لیا ہوا ہے، جس طرح سے امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ بعض دل تو آشیانۂ شیطان ہیں، شیطان کے لئے بہت آرام کی جگہ ہیں یعنی شیطان کو اپنا پورا دل کرائے پہ دیا ہوا ہے، اس نے وہاں انڈے بھی دیئے ہیں، بچے بھی نکالے ہیں، چوزے بھی نکالے ہیں، وہیں پر اس کا گھونسلا ہے یعنی اس نے دل کو شیطان کے لئے اتنا آمادہ کیا ہوا ہے۔ لہٰذا لہو لعب کی طرف مائل دل کبھی بھی قرآن کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔

۲) عدم تدبر در آیات

مانعِ دیگر عدم تدبر در آیات ہے کہ انسان قرآن کی طرف راغب تو ہے لیکن یہ رغبت ایسی ہے کہ جیسے انسان بہت رغبت سے افطار پہ آتے ہیں اور آ کر پکوڑوں اور سموسوں سے ہی پیٹ بھر لیتے ہیں اور اصلی کھانے کے لئے جگہ ہی نہیں چھوڑتے ہیں، چونکہ افطار میں جو پہلی چیز آتی ہے اس کو انسان شوق و رغبت اور حرص و یاس سے کھا جاتا ہے۔ اس کو کنٹرول (Control) سے کھائیں تا کہ بعد میں جو اصلی کھانا آنے والا ہے اسکے لئے جگہ باقی رہے۔

ایران میں زائرین کے ساتھ یہ اتفاق زیادہ رونما ہوتا ہے کہ پہلے وہ ایک غذا لاتے ہیں جس کو اپیٹائیزر (Appetizer) کہتے ہیں، یہ بھوک چمکانے کے لئے لائی جاتی ہے لیکن وہ اسی سے بھوک مار لیتے ہیں، سوپ پہلے پی لیتے ہیں، ساری سلاد پہلے کھا لیتے ہیں، جو چیز پہلے آتی ہیں اسی کو کھا پی کے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں اور جب بعد میں کھانا آتا ہے تو جگہ نہیں ہوتی ہے، کھانا ایسے ہی واپس چلا جاتا ہے، یہی حال قرآن کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ قرآن کی طرف شوق بڑھا مثلاً کسی عالم نے تقریر کی یا کتاب پڑھی تو رغبت و شوق پیدا ہوا کہ بھرپور طریقے سے قرآن کی طرف جانا ہے اور اب شروع کرنا ہے، تب شروع کرنا ہے یا شروع تو کر دیا ہے لیکن یہ سارا شوق کس میں پورا کر لیا؟ اسی ظاہری سلاد اور سوپ سے پورا کر لیا مثلاً یہی کہ تھوڑا حفظ کر لیا، ایک آدھ آیت حفظ کر لی یا فرض کریں کہ ناظرہ میں ہی، قرأت میں ہی، تجوید میں ہی یا عربی علوم میں ہی سارا شوقِ قرآن کا ذوق پورا کر لیا اور تدبر تک نوبت ہی نہیں پہنچی کہ جو اصل مقصود تھا، جو اصل دسترخوانِ خدا تھا۔ جو اصل غذا

خدانے اس پہ تیار کر کے رکھی ہوئی تھی اس کے لئے کہ اب جگہ ہی نہیں ہے، بھوک ہی نہیں ہے، اسلئے تدبر نہیں کرتے ہیں یعنی رغبت ہونے کے باوجود اس میں تدبر نہیں کرتے ہیں، یہ چیز فہمِ قرآن میں مانع ہے۔

۳) قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا

ایک اور مانع شناختِ نادرست از قرآن ہے، سب سے پہلا مطلب یہ ہے کہ خود قرآن کی شناخت ہونی چاہئے، اس سے پہلے کہ قرآن ہمیں شناخت کروائے یا قرآن ہمیں معرفت دے ہمیں پہلے خود قرآن کی معرفت ہونی چاہئے کہ قرآن ہے کس چیز کی کتاب؟ اور اس وقت جو اتفاق ہو رہا ہے یعنی ہمیشہ سے ہے نہ کہ صرف اس وقت ہے لیکن اس وقت ہم اس کو لمس کر رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں کہ قرآن کی طرف رغبت و رجحان ہے، سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب قرآن ہے، سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن ہے، سب سے زیادہ رجوع جس کتاب کی طرف ہوتا ہے وہ قرآن ہے لیکن درعینِ حال قرآن پھر بھی مہجور و متروک، غریب و اجنبی اور نامانوس ہے، اس لئے کہ قرآن کی جو شناخت ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اسے سمجھا جائے، اس سے ہدایت لی جائے اور اسے اپنی زندگی میں اتارا جائے بلکہ یہ ہے کہ یہ کتابِ ثواب ہے۔ یہ شناختِ نادرست از قرآن ہے۔

بے شک قرآن پڑھو تو ثواب ہوتا ہے لیکن یہ کتابِ ثواب نہیں ہے بلکہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، کتابِ انقلاب ہے، کتابِ انسان سازی ہے، کتابِ سعادت ونجاتِ انسان ہے۔ ہم

نے اس کو کتابِ ثواب بنا دیا ہے البتہ قرآن پڑھنے پر فراواں ثواب ہے، منکرِ ثواب نہیں ہیں، ثواب یقینی ہے، قطعی ہے اور فراواں ہے، شاید قرآن پڑھنے کا جتنا ثواب ہے اتنا کسی اور چیز کا ثواب نہیں ہے لیکن ثواب حکمتِ قرآن نہیں ہے یعنی ثواب عنوانِ قرآن نہیں ہے کہ اس کو ہم کتابِ ثواب کہہ دیں۔ عموماً مجالسِ ترحیم میں، میت کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن کو پڑھتے ہیں یا اگر کوئی حالتِ احتضار میں پہنچا ہوا ہے تو اس کے لئے سورۂ یاسین پڑھ دیتے ہیں یا پھر کاروبار میں برکت کیلئے قرآن کو پڑھتے ہیں چونکہ ذہن یہی بنا ہوا ہے، شناخت یہی ہے، قرآن ہمیں متعارف ہی یوں کروایا ہوا ہے کہ اگر ثواب کمانا ہے تو ثواب حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑا منبع وذخیرہ قرآن ہے۔

ثواب قرآن کی طرف رغبت بڑھانے کے لئے ہے یہ فلسفۂ قرآن اور حکمتِ قرآن نہیں ہے، ثواب اس لئے رکھا ہے چونکہ بعض لوگ معرفتِ قرآن نہیں رکھتے ہیں، ان کا ذہنی بلوغ اتنا نہیں ہے کہ ثواب کے بغیر یا سود وزیاں سے ماوراء ہو کر قرآن کی طرف آئیں اس لئے ان میں رغبت پیدا کرنے کے لئے کثرت سے ثواب نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیہ یا سورہ پڑھو تو اس پہ اتنا ثواب ہے، وہ سورہ پڑھو تو اس میں اتنا ثواب ہے اور ہم وہی سورہ پڑھتے ہیں اور فقط اسی ثواب کے لئے پڑھتے ہیں۔

ثواب فقط ہمیں قرآن کی بارگاہ میں لانے کا ذریعہ ہے کہ ثواب کی خاطر قرآن کی بارگاہ میں آجائیں، پھر دیکھیں کہ قرآن ہمیں عطا کیا کرتا ہے؟ قرآن سے لینا کچھ اور ہے، قرآن سے ثواب نہیں لینا ہے، ثواب ذریعۂ رجوع با قرآن ہے، پس قرآن کے بارے میں ہماری یہ ایک

شناختِ نادرست ہے کہ ہم نے اسے محض ایک کتابِ ثواب بنالیا ہے مثلاً ایک طبقہ ہے کہ جس نے قرآن کو تعویزوں کی کتاب کی حد تک گرا دیا ہے، جس طرح بعض ہوتے ہیں کہ جو تعویز لکھتے ہیں، بعض یہ کام کرتے ہیں کہ قرآن کی آیات کیلئے کہتے ہیں یہ آیاتِ خدا ہیں، نورانی کلمات ہیں یہ آیہ پڑھو تو یہ اثر ہوتا ہے اور یہ آیہ پڑھو تو وہ اثر ہوتا ہے، یہ شناختِ نادرست از قرآن ہے۔

قرآن تعویذوں کی کتاب نہیں ہے، اعوذ بمعنیٰ پناہ ہے، چہ بسا قرآن پناگاہ ہے، قرآن بچاتا ہے لیکن عذاب سے، ہلاکت سے، خسارے سے، نقص سے، انحطاط اور زوال سے بچاتا ہے نہ یہ کہ معمولی معمولی چیزوں کے لئے اس کو تعویذ بنا کر وردِ قرآن شروع کر دیں، تعویذ کئی طرح کے ہوتے ہیں، بعض وردی تعویذ ہیں، بعض باندھنے کے تعویذ ہیں، بعض لٹکانے کے تعویذ ہیں، بعض پینے کے تعویذ ہیں اور بعض چاٹنے کے تعویذ ہوتے ہیں، قرآن نہ کتابِ ثواب ہے اور نہ ہی کتابِ تعویذ ہے، اسی وجہ سے مہجوریت ہے، باوجود اس کے کہ قرآن کی طرف رجوع زیادہ ہے درعینِ حال قرآن متروک و مہجور ہے۔

قرآن کی صحیح معرفت کا نہ ہونا

یہ بہت اہم مانعِ فہمِ قرآن ہے کہ قرآن کے بارے میں شناختِ نادرست ہے، صحیح تصویر پیش نہیں کی گئی ہے، ہم نے سمجھا کہ یہ تعویذوں کی کتاب ہے، ہدایت کے نسخے تعویذ بنا دیئے ہیں، اس موقع پر میں ہمیشہ وہ مثال عرض کرتا ہوں کہ یہ کہانی ہے ایک انگریز ڈاکٹر کی کہ جو افریقہ میں مریضوں کا علاج کرنے کے لئے گیا تھا، افریقی دیہاتی یا اس جنگلی زمانے کے لوگوں کے پاس، البتہ اتنا قدیم قصہ بھی نہیں ہے بلکہ تقریباً چالیس، پچاس سال پہلے کا اصلی قصہ ہے، یہ داستان یا افسانہ

نہیں ہے بلکہ حقیقی واقعہ ہے۔

ڈاکٹر بنام البریٹ شوئٹزر نے افریقہ میں جا کر مریضوں کا علاج کرنا شروع کیا، پھر واپس آ کر انہوں نے آپ بیتی لکھی کہ وہاں میرے ساتھ کیا اتفاقات ہوئے، ایک یہ لکھا کہ جب میں انہیں علاج معالجے کے لیے دوا لکھ کر دیتا تھا کہ یہ جا کر میڈیکل اسٹور سے خریدنی ہے تو وہ اسی نسخے کو کھا جاتے تھے، اس کاغذ کو کھا جاتے تھے مثلاً میں جو زخم پر پٹی باندھنے کے لئے دیتا تھا تو پٹی کھا لیتے تھے، مرہم زخم پہ لگانے کے لئے دیتا تھا اور وہ اس کو نگل لیتے تھے، اس وقت جب یہ داستان پڑھ رہے تھے تو لگ رہا تھا کہ صرف محظوظ ہونے کے لئے پڑھ رہے لیکن بعد میں اس داستان نے بہت ساری حقیقتیں کھولیں کہ قرآن کے ساتھ ہم بھی یہی کر رہے ہیں کہ جو افریقیوں نے اس طبیب کے نسخوں کے ساتھ کیا ہے، ہم بھی تو یہی کام کر رہے ہیں، خداوند تبارک وتعالیٰ نے یہ قرآن ہمارے لئے نازل کیا ہے یعنی قابلِ فہم بنایا ہے اور اس کو لفظی شکل میں اتارا ہے لیکن ہم اسی کو گھول گھول کر پی رہے ہیں، کسی کو بازو کے ساتھ باندھا ہوا ہے، کسی کو گردن میں لٹکایا ہوا ہے، کسی کو اِدھر اور کسی کو اُدھر باندھا ہوا ہے، یہ قرآن کے ساتھ نادرست رویہ ہے، یہ بعض مقامات پر توہینِ قرآن ہے، قرآن ان مقاصد کے لئے نہیں تھا، یہ شناختِ نادرست ہے، یہ مانع از فہمِ قرآن ہے، قرآن کی طرف رغبت ہے لیکن شناخت درست نہیں ہے۔

☆استخارے کی حقیقت

قرآن کی طرف ایک اور رجوعِ شدید کہ جو صبح و شام ہوتا ہے وہ استخارہ ہے مثلاً آپ اگر حرم میں جائیں تو کوئی آپ کو قرآن پڑھتا ہوا نہیں ملے گا بلکہ وہ سب مفاتیح پڑھ رہے ہوتے ہیں لیکن استخارے کے لئے قرآن کی طرف رجوع ہوتا ہے، مثلاً قم میں بھی ٹیلیفون پر استخاروں کے لئے اس وقت پوری دنیا کی طرف سے رجوع ہوتا ہے، بعض ماہرین ہیں کہ جو استخارے کے ایکسپرٹ (Expert) ہیں ان کی طرف رجوع ہوتا ہے، وہ ساری داستان بتاتے ہیں کہ یہ کام ہونا ہے، یہ کام نہیں ہونا ہے، اول یہ فال ہے، توجہ فرمائیں میں یہ فقط اس لئے آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ مانعِ فہمِ قرآن ہے، کسی چیز پر تنقید کرنا یا محض کسی چیز کو ہدف بنانا مقصود نہیں ہے، ہم موانع شناخت کر رہے ہیں کہ یہ ہماری راہ میں رکاوٹ ہیں، قرآن سے استخارہ نکالنا بھی مانعِ فہمِ قرآن ہے، وہ لوگ استخارے کے ساتھ پھر ساری داستان بتاتے ہیں کہ یوں کرنا ہے، یوں نہیں کرنا ہے، فلاں کام کرنا ہے، فلاں نہیں کرنا ہے، یہ استخارہ نہیں بلکہ فال ہے، یہ جو قرآن کھول کر دیکھتے ہیں، دائیں بائیں، دائیں جو آیت ہو وہ خوب ہے اور بائیں جو ہے وہ خوب نہیں ہے، دائیں طرف صفحے پر جو آیت ہو اور اس میں فلاں کا تذکرہ ہو تو خوب تذکرہ ہے اور فلاں کا تذکرہ ہو تو بد ہے، یہ خوب و بد میں آیاتِ قرآن کو جو تقسیم کیا ہوا ہے اس کو تفاؤل کہتے ہیں اور روایت موجود ہے کہ تفاؤل بالقرآن درست نہیں ہے، فال گیری نہ کرو، قرآن کتابِ فال نہیں ہے۔

فال کا یہ مسلک ظاہراً ہندوستان سے شروع ہوا ہے، زیادہ تر یہی لگتا ہے کیونکہ ہندوستان

☆استخارے کی حقیقت

میں اس کی جڑیں زیادہ ہیں، ابھی بھی وہاں پر یہ مطلب زیادہ پُر رونق ہے لیکن فال گیری پوری دنیا میں ہے، ہر چیز سے فال نکالتے ہیں مثلاً ابھی ایران میں ایک چیز رائج ہے کہ دیوانِ حافظ سے فال نکالتے ہیں، حافظ کی دیوان میں پہلے تفاؤل کا طریقہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ حافظ کے دیوان سے فال کیسے نکالنی ہے، فال کا مطلب نیک و بد تشخیص دینا ہے، استخارہ دعا ہے، اصلاً وہ اور چیز ہے اور یہ اور چیز ہے، یہ کس طرح مخلوط ہو گئے؟ کہاں مخلوط ہو گئے؟ کس نے مخلوط کر دیا؟ جن دو چیزوں کا آپس میں کوئی ربط بھی نہیں تھا وہ دونوں مل کر ایک ہو گئی ہیں۔

فال یعنی ایسا عمل کرنا کہ جس سے انسان یہ تشخیص دے کہ یہ اچھی چیز ہے، یہ بری چیز ہے، کروں یا نہ کروں، خوب ہے یا بد ہے۔ استخارہ یہ ہے کہ میں خدا سے خیر کی دعا مانگتا ہوں، استخارہ کا معنیٰ لغوی بھی یہی ہے کہ خدا سے خیر کی دعا مانگنا، صحیفۂ سجادیہ میں حضرت امام سید الساجدین علیہ السلام کی ایک دُعا بنامِ دعائے استخارہ ہے، یہ استخارہ ہے، خدا سے خیر مانگو اور یہ واجب ہے، لازم ہے کہ انسان خدا سے خیر مانگے اور پھر خدا پہ توکل کرے، توکل کا معنیٰ بھی یہی ہے کہ اللہ سے خیر مانگے کہ اے اللہ میں نے یہ نیت کی ہے، میں نے یہ ارادہ کیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ اس میں خیر ہے یا نہیں ہے، میں تجھ سے اس کام میں خیر طلب کرتا ہوں۔ خوب و بد فال ہے اور یہ اب عادت ہو چکی ہے، فال نفسیاتی مسئلہ ہے دینی مسئلہ نہیں ہے، فال نفسیاتی الجھن دور کرتا ہے نہ کہ دینی مسئلہ دور کرتا ہے لہٰذا سب فال نکالتے ہیں، ہندو بھی فال نکالتا ہے، سکھ بھی فال نکالتا ہے، انگریز بھی فال نکالتا ہے، سنی و شیعہ بھی فال نکالتا ہے، سب لوگ فال نکالتے ہیں۔

کسی نہ کسی شکل میں یہ فال گیری ہر جگہ ہے، جنتریوں میں فال ہے، مثلاً یہ جو خرافات ہیں کہ صبح اٹھ کر کالی بلی دیکھی تو بد ہے، سفید بلی دیکھی تو خوب ہے یہ بھی فال ہے، یہ بھی تفاؤل ہے، تفاؤل وتطاؤل یا تفیل وتطیر اسی کو کہتے ہیں، بدقدم ہونا یا خوش قدم ہونا مثلاً عموماً شادی کے دن جب گھر میں دلہن آئی تو اتفاقاً اسی دن ساس گٹر یا کسی اور جگہ گر گئی تو وہ ساس بہو کو کہتی ہے کہ یہ بدقدم ہے، اس کی وجہ سے میں گر گئی ہوں، بڑھیا کو پتہ نہیں ہے کہ خود گر گئی ہے، عینک نہیں تھی یا کسی اور وجہ سے گر گئی ہے، یہ بیچاری دلہن کو کہتی ہے کہ یہ بدقدم ہے یہ بھی فال ہے، تطاؤل وتطیر ہے یا اگر منڈیر پر کوا آ کر بیٹھ جائے اور کائیں کائیں کرے تو بعض کوے کے بولنے کو خوب سمجھتے ہیں کہ آج مہمان آئیں گے، بعض جگہ کہتے ہیں کہ نہیں بیماری آئے گی، کوا ہر جگہ الگ الگ چیزوں کی علامت ہے، یہ سب تطاؤل وتفاؤل ہے، تطیر وتفال ہے، یہ سب غلط ہے، حرام ہے، یہ درست نہیں ہے، قرآن ہمیں انہی چیزوں سے نجات دینے کے لئے آیا تھا اور ہم نے قرآن کو انہی چیزوں کا ذریعہ بنالیا۔

یہ ہمارے اسکول کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ہمارے جاننے والوں میں سے ایک بندۂ خدا منشیات کا عادی ہو گیا تھا، وہ چرس پیتا تھا، پھر اس نے جب شادی کی تو بیوی اس پر بہت اعتراض کرتی تھی کہ تم یہ چرس چھوڑ دو تو اس نے چرس چھوڑنے کے بجائے بیوی کو بھی چرس پہ لگا دیا، پھر دونوں ملکر پیتے تھے، یہی کام ہم نے قرآن کے ساتھ کیا ہے، قرآن نے کہا کہ یہ تطیر نہ کرو، بنی اسرائیل موسیٰؑ کے ساتھ تطیر کرتے تھے، موسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے کہ یہ بدقدم ہیں، جب سے موسیٰ علیہ السلام آئے ہیں ہمارے لئے ناگوار اتفاقات رونما ہوتے ہیں، تطاؤل وتطیر کرتے تھے یعنی اس سے بدفال نکالتے

☆استخارے کی حقیقت

تھے، موسیٰ علیہ السلام کو سختیوں کی علامت سمجھتے تھے، جن کو خدا نے ہدایت کے لئے اور نجات کے لئے بھیجا تھا یہ ان کیلئے کہتے تھے کہ ان کی وجہ سے یہ سارے اتفاقات رونما ہوتے ہیں۔

یہ تطیر ہر گھر میں ہے مثلاً آپ دیکھیں کہ جب سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے ہمارے حالات سنورنا شروع ہو گئے ہیں، جب سے وہ بچہ پیدا ہوا ہے ہم مقروض ہونا شروع ہو گئے ہیں، مثلاً تجارت خوب ہونے لگے تو کہتے ہیں کہ جب سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے ہماری تجارت اچھی ہو گئی ہے یہ تفاؤل ہے، یہ غلط ہے اور اسی وجہ سے بچوں میں تفریق کرتے ہیں، جب یہ پیدا ہوا تھا تو فوراً بچے کا ماموں مر گیا تھا، ماموں اس وجہ سے مرے کہ گاڑی غلط چلا رہے تھے بچے کا اس میں کیا قصور ہے؟ بچہ خرافاتی خاندانوں میں کتنی چیزوں کا ذمہ دار پیدا ہوتا ہے، بیچارہ ناکردہ گناہوں میں پکڑا جاتا ہے، یہ پیدائشی طور پر ہی منحوس ہے، یہ نحوست جب پیدا ہوئی تھی تو اسی دن دادا مر گئے تھے اور پھر آخر تک جتنے بھی ناگوار اتفاقات ہوتے ہیں سب کچھ اسی معصوم اور بے گناہ کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح سے جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ قرآن کے گلے میں کیوں ڈالتے ہیں؟ یعنی قرآن نے کہا ہے کہ یہ خوب ہے اور یہ بد ہے، قرآن نے کہا ہے کہ یہ کام نہ کرو، کیا قرآن اس لئے آیا تھا؟ قرآن کے بارے میں یہ شناختِ نادرست ہے، قرآن کی طرف کتنا رجوع ہے؟ لیکن رغبتِ فراواں قرآن سے استخارہ نکالنے میں ہے، رجوعِ فراواں درعینِ حال نادرست ہے، استخارہ کا مطلب ہے خدا سے خیر مانگو، دعا مانگو، اللہ پر بھروسہ کرو، توکل کرو اور ظاہر ہے کہ خدا نے ہی خیر قرار دینی ہے، کُل خیر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن کے بارے میں ہمارے جو نادرست تفکرات اور اعتقادات ہیں اس کی وجہ

شناختِ نادرست ہے، یہ قرآن میں نافہمی کا بہت بڑا سبب ہے اور بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

٤)وہم وخیال

ایک بڑا مانع وَہُم وخیال ہے، قرآن فہمی میں وہم وخیال کی دخالت ہے کہ جب انسانِ مشتاق کہ جو قرآن سے رغبت رکھتا ہے اورفہمِ قرآن میں آتا ہے تو تخیل وخیال کی قید سے آزاد نہیں ہوتا ہے اور یوں سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ میری عقل ہے درحالیکہ یہ وَہُم ہے نہ کہ آپ کی عقل ہے، تو ہم انسان کو کبھی ایسی ایسی چیزیں دکھاتا ہے کہ جو کسی اور کو نظر نہیں آتی ہیں۔

مولانا روم نے چاند دیکھنے کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، کہا کہ سب چاند دیکھ رہے تھے، پہلے زمانوں میں چاند دیکھا کرتے تھے، آج کل ٹی وی پر سنتے ہیں، چاند دیکھنے کی چیز ہے سننے کی چیز نہیں ہے، ہم آدھی رات تک بیٹھے رہتے ہیں کہ سنیں چاند آیا ہے یا نہیں آیا ہے، مغرب کے وقت باہر نکل کر دیکھ لو معلوم ہو جائے گا، چاند دیکھنا چاہیے، بہرکیف لوگ چاند دیکھ رہے تھے اور ایک آدمی کو نظر آرہا تھا باقی کسی کو نظر نہیں آرہا تھا اور وہ بڑا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ چاند سامنے ہے، یہ آپ لوگوں کو کیوں نظر نہیں آرہا ہے؟ اور انگلی کے اشارے سے سب کو چاند دکھاتا بھی تھا، ایک دانا آدمی نے اس نے کہا کہ دیکھوں یہ مسئلہ کیا ہے کہ کسی اور کو نظر نہیں آرہا ہے اور صرف اس کو نظر آرہا ہے تو اس نے آکر غور سے اس کی آنکھ کی طرف دیکھا تو یہ آنکھ کی ابرو کا ایک بال تھا کہ جو نیچے اس کی آنکھ کے سامنے لٹکا ہوا تھا، کیونکہ شمشیری شکل ہوتی ہے، ہلالی شکل ہوتی ہے، اس کو وہ بال نظر آرہا تھا اور سمجھتا

وہم وخیال

تھا کہ آسمان پہ چاند نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح بعض قرآن کی طرف آتے ہیں اور ان کے وہم و تخیل میں یہ بال لٹکا ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ آپ کا وہم و خیال یہ کہہ رہا ہے نہ کہ قرآن کہہ رہا ہے، یہ پہلے ذکر کیا تھا کہ انسان اس شیطان سے پناہ مانگے کہ

فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ٥ (۳)

لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطانِ رجیم کے مقابلے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں۔

لہٰذا انسان اس شیطان سے کہ جو انسان کی فہم میں مداخلت کرتا ہے پرہیز کرے کہ وہم و خیال اس کے دریچے ہیں، وہم و خیال کے راستے بند کرے اور عقل کے مطابق آئے، عقل کو قرآن کے اختیار میں قرار دے نہ کہ توہم اور تخیل کی زبان سے قرآن کو سمجھنا شروع کرے۔

زود باوری اور شکاکیت

٥) زودباوری اورشکاکیت

مانعِ دیگر زود باوری اور شکاکیت ہے، کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی نفسیاتی مشکل شکاکیت ہوتی ہے یعنی شکاک ذہن لوگ۔ اسی طرح بعض زود باور ہوتے ہیں یعنی ایک دم یقین کر لینے والے، جلدی یقین کرنا بھی ایک مرضِ نفسانی ہے، بعض لوگوں کو ایک دم یقین ہو جاتا ہے، افواہوں سے بھی یقین پیدا ہو جاتا ہے، خواب دیکھتے ہیں تو یقین پیدا ہو جاتا ہے، چڑیا اڑتی ہے تو ان کو یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات انسان کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جو سستی کی وجہ سے یا ان کا

اپنا کوئی اور فزیکل مسئلہ (Physical problem) ہوتا ہے کہ جو ڈاکٹر یا دوسرے لوگ بتا سکتے ہیں کہ ان کی کبھی آنکھ پھڑکنے لگتی ہے، کبھی کان پھڑکنے لگتا ہے، کبھی جسم کا کوئی اور حصہ پھڑکنے لگتا ہے، ان کو اسی پھڑکنے سے یقین ہو جاتا ہے کہ آج یہ کام ہونے والا ہے، یہ خرافات ہیں یہی وہ تفاؤل ہے، دائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو سسرال والے آئیں گے، بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو میکے والے آئیں گے، یہ خرافات ہیں، یہ انسان کا توہم ہے، یہ روانی ونفسیاتی مسئلہ ہے کہ جس میں انسان کو یقین حاصل ہو جاتا ہے، انسان زود باور ہو جاتا ہے، بچہ بات کرے تو یقین ہو جاتا ہے، کوئی عورت بات کرے تو یقین ہو جاتا ہے کہ عورتیں عموماً ایسی ہوتی ہیں، نفسیاتی طور پر زود باور ہوتی ہیں، بعض زنانہ صفات مرد میں بھی ہوتی ہیں اور ان کی بھی یہی عادت ہوتی ہے کہ انہیں ایک دم یقین ہو جاتا ہے۔

زود باوری اور شکاکیت

اسی طرح سے شکاکیت بھی ایک بیماری ہے، جو کبھی وسوسے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جن کا وضو نہیں ہوتا ہے، پانی کی ٹنکی ختم ہو جاتی ہے لیکن ان کا وضو نہیں ہوتا ہے، کئی کئی گھنٹے حمام میں لگا کے آجاتے ہیں اور ان کا غسل نہیں ہوتا ہے، حمام میں ٹائلوں کے نیچے پانی چلا جاتا ہے لیکن ان کے بالوں کے نیچے ابھی تک نہیں گیا ہوتا ہے، یہ انسان شکاکیت مزاج بن جاتا ہے، ذہن نہیں ہے، عقل نہیں ہے بلکہ نفسیات ہے، اس نفسیاتی بیماری میں پھنسا ہوا انسان اگر شکاکیت کے ذہن کے ساتھ قرآن کی طرف آئے تو اس کو قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے،، یہ پہلے اس بیماری کا علاج کرائے اور شکاکیت برطرف کر کے قرآن کی خدمت میں آئے تاکہ اس کے دل میں یقین آسکے۔

٦)ظاہر بینی

مانعِ دیگر ظاہر بینی ہے یعنی بہت سطحی نگاہ رکھنا، سرسری عبور کرنا، فقط ظواہر پر اکتفا کر کے گزر جانا کہ بس یہی ہے اور ان ظواہر کے پیچھے کچھ بھی نہیں ہے، کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ ان کی عقل ان کی آنکھوں میں ہے یعنی اس کا یہی دقیق معنیٰ بنتا ہے کہ یہ ظاہر بین ہیں چونکہ آنکھوں سے فقط ظاہر نظر آتا ہے اور اس ظاہر کے ماوراٗ جو باطن ہے، جو اس کی حقیقت ہے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں، یہ فقط ظواہر پر اکتفا کر لیتے ہیں، اول تو یہ تشخیص دینا بھی اہم ہے کہ خود ظواہرِ قرآن کیا ہیں؟ اس کے لئے بھی آداب اور فہم کی ضرورت ہے اور بعد از تشخیصِ ظاہر انسان فقط ظاہر ہی پر اکتفا نہ کرلے بلکہ اس ظاہر کے آگے بھی دیکھے، اس ظاہر کے پیچھے اسرار ہیں، حکمتیں ہیں، ان حکمتوں کی طرف بھی انسان توجہ کرے، اس ظاہر کے پیچھے ایک روحِ باطن بھی ہوتی ہے، ظاہر و باطن کے پیچھے سے ہماری مراد سامنے اور پیچھے کا حصہ نہیں ہے کہ اوجھل حصہ باطن اور سامنے کا حصہ جو نظر آرہا ہے وہ ظاہر نہیں، بلکہ ظاہر و باطن سے ظاہر و روح، جسد و روح مراد ہے، جس طرح پہلے بھی ایک بحث کے ضمن میں اشارہ ہو چکا تھا۔

مثلاً انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے، باطنِ انسان سے مراد انسان کا معدہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی ظاہر ہے یعنی یہ جلد جس طرح سے ظاہر ہے اسی طرح اس جلد کے نیچے کا حصہ بھی عالمِ ظاہر ہے، یہ بھی عالمِ شہادت ہے، باطن سے مراد روحِ انسان، دلِ انسان، قلبِ انسان، نفسِ انسان، حقیقتِ انسان اور باطنِ انسان ہے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ظاہر و باطن ہے

بلکہ کل عالمِ ہستی اس طرح سے ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس عالم کو دو حصوں میں یعنی مُلکُ وملکوت بنایا ہے، ملکوت روح ہے اور ملک جسم ہے، جس طرح سے انسان میں جسم و روح ہے اسی طرح قرآن بھی جسم و روح ہے اور عبادات میں بھی جسم و روح ہے، یعنی عبادات کا بھی ظاہر و باطن ہے۔ فقہ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ظاہر و جسمِ عبادات ہے مثلاً وضو کا ایک ظاہر ہے کہ جو احکامِ فقہ سے عبارت ہے، جس کو ہم احکامِ شریعہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر بھی دین ہے، اب کوئی ایسا عرفان نکال کر نہ لے آئے کہ جو کہے کہ اصلاً ان ظواہر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ظواہر بھی دین ہے کہ جس طرح سے یہ ظاہری جسم بھی انسان ہے، جس طرح سے یہ روح بھی انسان ہے اسی طرح سے عبادت کا ظاہر بھی عبادت ہے اور عبادت کا باطن بھی عبادت ہے لیکن یہ ظاہر اس وقت زندہ عبادت ہے کہ جب اس کے اندر باطن موجود ہو، روح موجود ہو۔

جب ہمارا کسی انسان سے پالا پڑے تو اس کے ظاہر پر نہ جائیں عموماً لوگ خطا اسی وجہ سے کرتے ہیں لہٰذا گھریلو مسائل پیش آتے ہیں، اکثر شادی بیاہ میں مشکل اس لئے پیش آتی ہے کہ لوگوں کا فقط ظاہر دیکھتے ہیں اور باطن نہیں دیکھتے ہیں یعنی صورت دیکھتے ہیں سیرت نہیں دیکھتے ہیں، ظاہر سے تو انسان کسی بات پر اعتماد نہیں کر سکتا ہے، کسی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا ہے، جس چیز کا بھی جسم و روح ہو تو آپ اس کے جسم سے اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کریں، عبادتوں کا جسم ہے تو کوشش کریں کہ آپ اس کی روح تک پہنچیں، قرآن کا بھی جسم ہے، جسد ہے اور آپ اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کریں، پس ظاہر بینی اور ظاہر پر اکتفا کرنا بھی مانع از فہمِ قرآن ہے کہ ہم روحِ

قرآن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔

۷)ہویٰ وہوس

ایک مانع ہویٰ و ہوس ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا تھا کہ مجھے اپنی امت کے بارے میں دو چیزوں کا خوف ہے کہ یہ دو چیزیں میری اُمت کو ڈبو سکتی ہیں،

اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيَ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْأَمَلِ......(۴)

میں اپنی اُمّت کے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف رکھتا ہوں وہ ہوائے نفس کی پیروی اور لمبی امیدیں رکھنا ہے......

دو چیزوں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمت کے بارے میں نہایت خوف زدہ ہیں، ان میں سے ایک یہی لمبی خواہشیں، لمبی آرزوئیں ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا حملہ بھی دل پر ہوتا ہے، ان کا مرکز بھی دل ہے، خواہشات بھی دل میں پیدا ہوتی ہیں اور آرزوئیں بھی دل میں پیدا ہوتی ہیں اور ان ہی آرزوؤں کے لئے لگے ہوئے ہیں، ان کی تکمیل کے لئے اپنی جان فنا کرنے میں اور خود کو ہلاک کرنے میں لگے ہوئے ہیں حتیٰ کہ انسان خواہش پرست بن جاتا ہے، قرآن نے فرمایا کہ

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ......(۵)

کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے۔

جو اپنی خواہشات کی پرستش کرتا ہے، پرستش کے معانی یہی ہیں کہ صبح وشام ان کی خدمت

میں رہنا، پرستشِ خدا بھی یہی ہے، پرستشِ خدا فقط باوضو ہو کر نماز میں کھڑے ہونا تو نہیں ہے، پرستشِ خدا یعنی صبح وشام یادِ خدا میں رہنا، فکرِ خدا میں رہنا، یہی پرستشِ خدا ہے، اگر ایک انسان صبح وشام یادِ شہوات میں رہے اور شہوات اس کو ستا رہی ہوں تو یہ انسان پرستش کر رہا ہے، اس نے خواہشات کو اپنا معبود قرار دیا ہے، اپنا رب قرار دیا ہے اور انہی خواہشات میں کہ جس کو قرآن نے بھی بہت مستثنیٰ کر کے بیان کیا اور نہج البلاغہ میں خصوصیت کے ساتھ قرآن کے اس مطلب کی تفسیر نمایاں طور پر موجود ہے یعنی دنیا پرستی۔

دنیا پرستی

۸)دنیا پرستی

موانعِ فہمِ قرآن میں ایک چیز دنیا پرستی ہے، حبِ دنیا ہے، دنیا سے مراد معاشرت نہیں ہے، دنیا سے مراد زندگی نہیں ہے یعنی اولاد، بچے، بیوی اور گاڑی دنیا نہیں ہے، بعض اوقات ہم دنیا کا غلط معنیٰ کرتے ہیں۔ دنیا یعنی ان چیزوں کی محبت، ان چیزوں کا تملک، ان چیزوں کا مالک بننا، ان چیزوں سے اپنی شخصیت بنانا، ان چیزوں کو اپنے وجود کا حصہ قرار دینا، ان پر اترانا اور ان پر فخر ومباہات کرنا، ورنہ اگر یہی ضروریاتِ زندگی ہوں تو یہ دنیا نہیں ہیں بلکہ عینِ دین ہیں، اگر ان کے ذریعے سے انسان زندہ رہتا ہے اور ان کے ذریعے سے انسان قوی ہوتا ہے کہ جس طرح سے علی علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہ دعا طلب کی کہ پروردگارا! میرے جوارح کو قوی فرما، کس لئے؟

عَلٰی خِدْمَتِکَ.....(۶)

اپنے دین کی خدمت کے لئے، لیکن ضروریاتِ زندگی جزوِ دنیا نہیں ہیں، یہ دنیا کے مضمون کا حصہ نہیں ہیں، یہ اس دنیا کا حصہ ہیں کہ جنہیں مزرعۃ الآخرہ کہا گیا ہے کہ آخرت مزرعہ ہے اور دنیا کھیتی ہے، وہ ایک الگ دنیا ہے کہ جسے آباد کرنا ہے، جس کی دنیا ویران ہے اس کی آخرت بھی ویران ہے، جس کا کھیت ویران ہے اس کی فصل بھی ویران ہے لیکن جو دنیا مذموم ہے اس کو قرآن نے بیان کیا ہے اور دنیا کی خوبصورت ترین تفسیر خود قرآن نے کی ہے کہ

اِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ...... (۷)

یہ زندگانیٔ دنیا تو صرف ایک کھیل تماشہ ہے......

یہ لہو ولعب، یہ سرگرمیاں، یہ مشغولیتیں جو انسان نے ذہنی طور پر بنائی ہوئی ہیں۔ انسان زمین کو آباد کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ زمین کا مالک بننے کے لئے آیا ہے لیکن اس وقت دوڑ ہی اس پر قبضہ جمانے کے لئے ہے یہی دنیا ہے، دنیا یعنی میرا حصہ زیادہ ہو یعنی تکاثر، میرا میرا کرنا یہ سب دنیا ہے۔ دنیا کی مزید وضاحت فصلِ ادبِ سوم کے حصۂ دوم میں کی جا چکی ہے۔

غرور و تکبر

۹) غرور و تکبر

مانعِ فہم دیگر بہت سے ہیں لیکن جو موانع پیش ہورہے ہیں یہ عمومی بھی ہیں یعنی تحصیل وتعلیم کے لئے بھی موانع ہیں۔ ان میں سے ایک غرور وتکبر ہے کہ انسان مغرور ہو کر اور تکبر کے ساتھ قرآن میں آئے، اپنے آپ کو کچھ سمجھ کر قرآن میں آئے، ایک مفسر، ایک مفکر، ایک فیلسوف اور فقیہ بن کر

قرآن میں نہ آئے۔انسان کو قرآن کی بارگاہ میں خشوع کے ساتھ اور عاجزی کے ساتھ آنا چاہیئے، اس انداز کے ساتھ آئے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں، ایک جاہل اور معترف بہ جہالت بن کر قرآن کی خدمت میں آئے، فہم میں اور علم کے حصول میں غرور وتکبر سب سے بڑا مانع ہے، عموماً کچھ لوگ ذہین ہوتے ہیں کہ جو پیدائشی طور پر یا طبعی طور پر دوسروں سے فہم کے لحاظ سے تھوڑا بالاتر ہوتے ہیں، ان کو ایک بیماری فوراً لگ جاتی ہے، ابتداء سے ان کو ایک بیماری لگ جاتی ہے اور وہ ہے غرور و تکبر، ایک دم مغرور ہوجاتے ہیں چونکہ ایک ہی دفعہ مطلب بیان کرنے سے ان کو سمجھ میں آجاتا ہے، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم تو بہت بالا ہیں، ہمارا فہم بہت بالا ہے اور اپنے آپ کو آہستہ آہستہ مستغنی سمجھنے لگتے ہیں یعنی غور وفکر وتدبر اور مطالعہ سے بھی آہستہ آہستہ خود کو مستغنی اور بے نیاز سمجھتے ہیں۔ نہایتاً یہی طبقہ سب سے زیادہ محروم رہ جاتا ہے۔

غرور وتکبر

آپ طلاب میں بھی غور کریں کہ متوسط استعداد والے محنت کرتے رہتے ہیں لیکن یہ ذہین مغرور ہوتے ہیں، کلاس میں بھی درست توجہ نہیں کرتے ہیں، مطالعہ بھی درست نہیں کرتے ہیں، غرور کی وجہ سے سوال بھی نہیں کرتے ہیں، تکبر کی وجہ سے کسی کے پاس جاتے بھی نہیں ہیں، گھمنڈ کی وجہ سے سیکھتے بھی نہیں ہیں چونکہ ان کے اندر غرور موجود ہے اور بالآخر یہ طبقہ محروم رہ جاتا ہے۔تکبر لے کر قرآن کے پاس نہ جائیں بلکہ خضوع وفروتنی لے کر قرآن کے پاس جائیں، قرآن متکبرین کو کبھی بھی کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے چونکہ تکبر فقط خدا کو جچتا ہے، غیرِ خدا کو راس نہیں آتا ہے، صرف ذاتِ خدا متکبر ہے۔تکبر یعنی بزرگی، اظہارِ کبریائی۔ جب انسان اظہارِ کبریائی کرے تو اس کو متکبر کہتے ہیں

یعنی ایک بڑا انسان ہو، جس کے اندر کوئی خوبی ہو اور اس خوبی کا اظہار بھی کرے، دوسروں کے سامنے جتلائے بھی تو اس کو تکبر ہے، یہ فقط خدا کو جچتا ہے چونکہ ماسواللہ کسی میں کوئی کبریائی نہیں ہے، ماسواللہ سب میں فقر، عجز، احتیاج اور ناداری ہے لیکن کبریائی خدا میں ہے اور اظہارِ کبریائی بھی فقط خدا کو جچتا ہے۔

تنگ نظری

۱۰)تنگ نظری

مانعِ دیگر تنگ نظری ہے، قرآن نے خود بھی ذکر کیا ہے کہ تنگ نظری مانعِ فہمِ دین بھی ہے، مانعِ علم بھی ہے اور مانعِ ہدایت و مانعِ فہمِ قرآن بھی ہے، قرآن کا صریح دستور اور فتویٰ ہے کہ

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ......(۸)

پس خدا جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے......

پہلے انسان اپنے اندر شرحِ صدر اور وسعتِ نظر پیدا کرے، وسعتِ دل پیدا کرے پھر قرآن اترتا ہے چونکہ قرآن بہت وسیع ہے، تنگ نظر، تنگ دل اور تنگ ذہن میں قرآن اترتا اور سماتا ہی نہیں ہے لہٰذا تنگ نظری کے جو باقی شعبے ہیں مثلاً تعصب ہے، حسد ہے، اگر یہ بیماریاں انسان کے اندر موجود ہوں تو انسان قرآن سے محروم ہے جیسا کہ علم سے بھی محروم ہے، کہتے ہیں کہ

اَلْحَسُوْدُ لَا يَسُوْدُ......(۹)

اس کے دو معانی کیے گئے ہیں یعنی حسود، حسد کرنے والا کبھی محترم نہیں بن سکتا ہے، یہ کبھی

بھی ایسی شخصیت نہیں بنے گی کہ لوگ اس کا احترام کریں، اسے سیادت حاصل نہیں ہوگی، ایک یہ مانع ہے۔ ممکن ہے حسود لا یسود کا معنیٰ یہ ہے کہ حسود کبھی باسواد نہیں ہوسکتا ہے، کبھی عالم و آگاہ نہیں بن سکتا ہے چونکہ تنگ نظر و تنگ دل ہے، اس میں شرحِ صدر چاہئے اور خدا اگر کسی کو گمراہ کرنا چاہے تو اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔

اسی آیہ کے ذیل میں ہے کہ

وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ......(۱۰)

اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار گزار بنا دیتا ہے جیسے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو......

تنگ نظری

پس اس کا سینہ ہدایت کے لئے تنگ ہو جاتا ہے، اس میں ہدایت اترتی ہی نہیں ہے۔ سِفال گر بہت سارے برتن بناتے ہیں، کچھ برتن ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا پیٹ چھوٹا ہوتا ہے اور منہ بہت بڑا ہوتا ہے جیسے گملے اور گلدان ہیں، آپ گملا دیکھیں تو اس کا پیٹ چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن منہ بہت بڑا ہوتا ہے اسی لئے اس میں کچھ اگتا ہے، اسی لئے اس میں پھول وغیرہ اگاتے ہیں لیکن بعض برتن ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا گلا بہت تنگ ہوتا ہے لیکن پیٹ بڑا ہوتا ہے، ان میں کوئی بڑی چیز نہیں ڈال سکتے ہیں فقط مائعات ڈال سکتے ہیں جیسے صراحی ہے، اس کے اندر کوئی اور چیز نہیں ڈال سکتے ہیں چونکہ نہ ڈالی جاسکتی ہے اور نہ اس سے نکل سکتی ہے، تنگ دل انسان کے اندر کوئی چیز جاتی بھی نہیں ہے اور کوئی چیز باہر بھی نہیں آتی ہے۔

تنگ نظر سے کوئی استفادہ بھی نہیں کر سکتا ہے اور تنگ دل آدمی کو کوئی افادہ بھی نہیں ہو سکتا ہے اسلیئے کہ اس کا منہ اور گلا ابھی اتنا تنگ ہے کہ معارف کا کوئی مطلب اس کے اندر اتر تا ہی نہیں ہے، قرآن کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ سے فرمایا کہ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ○ (۱۱)

کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کا سینہ کشادہ نہیں کیا؟

یعنی ہم نے آپ کا سینہ کھولا اور موسیٰ علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہی دعا مانگی کہ

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ○ (۱۲)

پروردگار میرے سینے کو کشادہ کردے۔

یعنی اگر مجھے یہ ماموریت دینی ہے، مجھے یہ کام کرنا ہے تو اس کے لئے شرحِ صدر چاہیے، بدونِ شرحِ صدر یہ کام ممکن نہیں ہے۔

پس تنگ نظری بھی قرآن فہمی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۱۱)دنیوی افکار و نظریات سے متاثر ذہن

ایک اور مانع جو اس وقت زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقے کو درپیش ہے چونکہ قرآن کی طرف اس وقت رجحان ورغبت ہے لیکن موانع کے ساتھ رغبت ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن سے باہر بالآخر بہت سارے نظریات وافکار اور مفروضے موجود ہیں، تجربے کے تحت، فلسفے، تاریخ یا دیگر علوم کی وجہ سے

بہت سارے نظریات موجود ہیں، یوں تو نہیں ہے کہ لوگوں نے فقط قرآن پہ اکتفا کیا ہوا ہے، لوگوں نے اپنے طور پر بھی کئی نظریات بنائے ہوئے ہیں مثلاً دینِ آبائی ہے، رسوم و رواج ہیں، کلچر (Culture) ہے، ثقافت ہے، تمدن ہے۔

قرآن سے باہر یہ بھی ایک حقیقت ہے، بہت سارے کلچر ایسے ہیں کہ جن کا قرآن سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے حتیٰ مسلمان کلچر بھی ایسے ہیں کہ جو قرآن سے دور اور ضدِ قرآن کلچر ہیں، غیر مسلمانوں کے اندر بھی اپنے کلچر ہیں جیسے مغربی کلچر ہے کہ جس کا قرآن سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ضدِ قرآن ہے، اسی طرح سے بہت سارے فلسفے ہیں، مادی فلسفہ ہے یا دیگر فلسفی نظریات ہیں۔ کچھ لوگ فلسفہ زدہ ہیں کہ جو کچھ کسی فیلسوف کے نام پر یا کسی نے فلسفے کے نام پر بتا دیا ہے تو ان کے دل پر وہ درست بیٹھ گیا ہے، یہ بھی مقلد ہیں یعنی فلسفی نہیں ہیں بلکہ افکارِ فلسفی کی طرف ان کی رغبت ہے، یہ مقلدِ محض اور فلسفہ زدہ ہیں، جیسے اس وقت یہ مشکل کثرت سے ہے حتیٰ آہستہ آہستہ ابھی علماء و روحانیوں کے اندر بھی سرائیت کرتی جا رہی ہے، آپ حوزے میں بھی دیکھیں کہ اب آپ کو حجۃ الاسلام کم اور ڈاکٹر زیادہ ملیں گے، وہی جو چند سال پہلے حجۃ الاسلام تھے اب کاٹ کر انہوں نے اپنے ساتھ ڈاکٹر لگا دیا ہے، کیوں ڈاکٹر ہو گئے ہیں؟ پہلے مثال پیش کر چکا ہوں کہ کسی فلسفے میں، کسی شعبے میں ایک ڈگری لے لی، چونکہ مدرک یا ڈگری کی طرف رجحان ہے، ڈگریوں کے ذریعے کاذب شخصیت بنانے کا یہ ایک ذریعہ ہے اور اس یونانی فیلسوف کا تذکرہ یہ ہے کہ وہ اسلام سیکھنے کے لئے آیا، مذہبِ تشیع دیکھنے کے لئے آیا اور اسے بڑی بڑی شخصیات سے ملایا گیا، سب

دنیوی افکار و نظریات سے متاثر ذہن

ڈاکٹروں سے ملایا تو اس نے کوئی نئی بات نہیں سنی، اس نے کہا کہ یہ تو وہی ہے جو ہم نے آپ کو سکھایا ہے، اب آپ کوئی ایسی بات بتائیں کہ جو آپ ہمیں سکھائیں، بعض اس طرح سے فلسفہ زدہ ہیں کہ بڑے بڑے فلسفیوں کے نام انہوں نے حفظ کئے ہوئے ہیں یا بعض کی آراء وافکار رٹ لئے ہیں اور ان کو ہر جگہ مناسبت سے یا بے موقع ٹھونستے ہیں مثلاً وضو کے مسئلے میں بھی جب تک یہ نہ کہیں کہ یاسپرس نے یہ کیا ہے اور ھائڈگر نے یہ کہا ہے تو ان کو تسلی نہیں ہوتی ہے، وضو کا ھائڈگر سے کیا تعلق ہے؟ یہ فلسفہ زدگی ہے کہ بے جا ونا جا اس کو فٹ کرتے جائیں۔ قرآن مادی اور من گھڑت فلسفوں کی تائید کے لئے نہیں آیا ہے۔

سائنس زدہ ذہن

۱۲)سائنس زدہ ذہن

سائنس زدہ ذہن بھی مانعِ فہمِ قرآن ہے چونکہ اس صورت میں قرآن اپنی کوئی مستقل بنیاد نہیں رکھتا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قرآن فلسفے کی تائید کے لئے یا سائنس کی تائید کے لئے آیا ہے یعنی قرآن کے پاس اپنی کوئی بنیادی چیز نہیں ہے، ان چیزوں کے اوپر بھی بحث کی ضرورت ہے، گنجائش ہے، ان مطالب پر بحث ہونی چاہئے جبکہ سائنس ناپائیدار علم ہے، خود سائنس کا یہ دعویٰ نہیں ہے، جتنے بھی علوم ہیں کہ جن کو ہم سائنس کہتے ہیں جیسے کیمسٹری، فزکس اور ان سے متعلقہ جو دیگر دوسرے شعبے ہیں ان میں بہت کم رنگ شعبۂ شناخت ومعرفتِ اشیاء کے بارے میں ہے، زیادہ تر ان کا شعبہ ساخت کے بارے میں ہے، سائنس ساختِ وسائل کا علم ہے نہ کہ شناختِ حقیقت کا علم

ہے، شناختِ حقیقت کے علم کو سائنس نہیں کہتے ہیں، سائنس یعنی تجربی علوم، تجربہ شناخت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ ساخت کا ذریعہ ہے، استفادے کا ذریعہ ہے یعنی آپ اس حقیقت سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں، یہ آپ کو سائنسی وسائل مہیا کر کے دے سکتے ہیں لیکن آیا اس شے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سائنس کا کام نہیں ہے، نہ وہ علم یہ کرتا ہے اور نہ مدعی ہے، یہ مدعی سست گواہ چست والی بات ہے۔

جیسے دو نمازی تھے ایک آدمی کسی اور مسجد میں نماز پڑھتا تھا دوسرا دوسری مسجد میں پڑھتا تھا، ایک نے دوسرے سے کہا کہ ہماری مسجد میں پڑھا کرو ہمارے مولانا مجتہد ہیں، دوسرے نے کہا کہ ہاں اچھے آدمی ہیں لیکن مجتہد نہیں ہیں، بہر کیف دونوں میں آپس میں بحث ہوگئی، جیسے ابھی ہوتا ہے کہ جس مدرسے میں میں پڑھتا ہوں اس مدرسے میں آجاؤ کہ یہ آغا بہت بڑے ہیں، جس درس میں میں جاتا ہوں اس درس میں آجاؤ کہ وہ درس بہت بہترین ہے، اسی طرح ان میں بھی ہوگیا کہ اس مسجد میں آؤ کہ یہ آغا مجتہد ہیں، بہر کیف یہ آپس میں الجھ پڑے، فیصلہ نہیں ہوا، انہوں نے کہا کہ جا کر خود ان سے پوچھ لیتے ہیں کہ مجتہد ہیں یا نہیں ہیں، جب ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں مجتہد نہیں ہوں۔ یا تو واقعاً منصف تھے کہ نہیں تھے اور انہوں نے اقرار کیا یا انکسار کیا کہ مجتہد تھے اور کہہ دیا کہ میں مجتہد نہیں ہوں، ہر دو صورتوں میں انہوں نے انکار کیا کہ میں مجتہد نہیں ہوں، دونوں باہر نکلے تو جو مدعی تھا کہ مجتہد نہیں ہے اس نے کہا کہ دیکھا میں تو کہتا تھا کہ مجتہد نہیں ہے لیکن دوسرا جو مرید تھا اس نے کہا کہ نہیں، یہ مجتہد ہے، یہ پاگل ہے اس کو پتہ نہیں ہے کہ یہ مجتہد ہے، کہا کہ اس کا دماغ خراب ہے، یہ مجتہد ہے اس کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اسی طرح خود سائنس

سائنس زدہ ذہن

مدعی نہیں ہے کہ ہمارا کام شناختِ حقائق ہے لیکن یہ کہتے ہیں کہ سائنسدانوں کا دماغ خراب ہے درحقیقت شناختِ حقائق کا یہی ذریعہ ہے۔

جو لوگ یہ کام کرتے ہیں انہیں درست سائنس بھی معلوم نہیں ہے، اتفاقاً جو اس وادی میں آگئے ہیں اور گمراہی پھیلا رہے ہیں انہیں نہ قرآن کا درست علم ہے اور نہ سائنس کا درست علم ہے، اگر سائنس کو مبانی کے ساتھ اور بنیاد کے ساتھ درست سمجھا ہوتا تو کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے، کبھی بھی کسی سائنسدان نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جنہوں نے سائنس کی دو کتابیں پڑھ لیں، چار فارمولے رٹ لئے اور پھر میدان میں آگئے پھر آکر لوگوں کو تنگ کرتے ہیں اور مسائل کھڑے کرتے ہیں، نیم حکیم خطرۂ جان ہوتا ہے تو نیم سائنسدان خطرۂ قرآن ہے اور اس طرح کے بعض مذہبی متعصبی بھی مانعِ فہم قرآن ہیں کہ ایسے لوگ خارج از قرآن خواب دیکھ دیکھ کر اور خواب سن سن کر فرقہ ای تعصبی ذہنیت بنا لیتے ہیں پھر اس کے بعد قرآن کی طرف آتے ہیں اور قرآن سے خواب کے سارے مضمون استخراج کرتے ہیں، یہ بھی مانع از فہمِ قرآن ہیں، یعنی خارج از قرآن کی بات ہو رہی ہے کہ انسان من گھڑت نظریات و تصورات بنا کر پھر ان کے تناظر میں قرآن کو سمجھے، سائنسی نظریات رٹے اور ان کو قرآن کے تناظر میں بیان کرنا شروع کر دے یا خارج از قرآن اپنے متعصّبانہ مذہبی افکار بنالے اور ان کی روشنی میں کلچرل مسائل، ثقافتی مسائل اور فرہنگی مسائل کو قرآن سے آکر استخراج کرے تو یہ مانع از فہمِ قرآن ہے۔

بعض لوگ تجربی علوم میں اتنے سائنس زدہ ہیں کہ ان کے نزدیک خارج از قرآن جو کچھ

سائنس نے کہا ہے وہ درست ہے اور جوان کے دل پہ بیٹھا ہوا ہے اسی کو مانتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ سائنس کے افکار کو قرآن سے نکالیں۔ آہستہ آہستہ باہر یہ کام شروع ہوا ہے اور یہ عوام پسند چیز ہے، قرآن کی سائنسی تفسیریں اس وقت زیادہ مقبولِ عام ہو رہی ہیں مثلاً چودہ سو سال بعد آج سائنس دانوں نے کشف کیا ہے لیکن یہ چودہ سو سال پہلے قرآن میں تھی، بعض نے سوال اٹھایا کہ اگر چودہ سو سال پہلے تھی تو پھر چودہ سو سال پہلے سے یہ سب کچھ کیوں نہیں تھا؟ کہتے ہیں یہ بجلی چودہ سو سال پہلے سے قرآن نے پیش کی ہوئی تھی اور دلیل دیتے ہیں کہ

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ...... (۱۳)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے......

یہ بجلی ہے؟ انسان قرآن سے کس قدر دور ہے کہ

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ......

سے بجلی استفادہ کرے، جس طرح ذاکر کرتے ہیں کہ قرآن سے ذوالجناح ثابت کر رہے ہیں، انہوں نے ثابت کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ آیتِ قرآن دلیل ہے،

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ٥ (۱۴)

اور جب وحشی جانور اکھٹے کر دیے جائیں گے۔

یعنی جب قیامت میں میدانِ محشر ہوگا اور بعض کو کہا جائے گا کہ ان وحشیوں کو جہنم کی طرف لے جاؤ لیکن یہ اس آیت سے ذوالجناح ثابت کر رہا ہے، چونکہ قرآن نہیں آتا تھا، پڑھا ہوا نہیں تھا

سائنس زدہ ذہن

حالانکہ گھوڑوں کا ذکر قرآن میں فراواں ہے لیکن اسے کہیں اور نظر نہیں آیا لہٰذا کہا کہ

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ٥

اور اس سے ذوالجناح ثابت کیا یا وہ دوسرا جس نے جلوس کا رُوٹ (Route) ثابت کیا، اس سے سوال اتنا ہوا تھا کہ ہم پر ماتم میں اشکال ہوتا ہے کہ شیعہ ماتم کرتے ہیں اس کی کیا دلیل ہے؟ قرآن سے کیا دلیل ہے؟ انہوں نے کہا کہ قرآن میں دلیل ہے، میں آج ثابت کرتا ہوں، ماتم ثابت کرتا ہوں، جلوس ثابت کرتا ہوں، قرآن سے جلوس کا روٹ بھی ثابت کرتا ہوں اور اس نے ثابت کیا کہ کراچی میں ایک جلوس نشتر پارک سے صدر جاتا ہے، انہوں نے ثابت کیا کہ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ٥

علم کا جلوس نشتر پارک سے صدر تک، یہ تمسخرِ قرآن، استہزائے قرآن ہے اور قرآن کے ساتھ مذاق اور تمسخر آیاتِ خدا ہے، اسی طرح سے یہ بھی اسی کی شبیہ ہے کہ جنہوں نے سائنسی بجلی

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ......

سے کشف کی ہے۔ دیگر آیاتِ کریمہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا،

بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا......(۱۵)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو ایسے ستونوں پر استوار کیا ہوا ہے کہ جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے، اس سے انہوں نے کیا کشف کیا؟ کششِ ثقلِ زمین ثابت کی، اس کے علاوہ بھی بہت ساری اس طرح کی چیزیں ہیں، یہ اشتباہ ہے، قرآن سائنسی تائید کے لئے نہیں آیا ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ طبقہ

زیادہ مبتلا ہے اور اس وقت زیادہ مفسر اسی طبقے سے پیدا ہو رہے ہیں مثلاً پاکستان میں اس وقت یہ کام ہو رہا ہے چونکہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے مولویوں سے اسلام کو نجات دینی ہے البتہ اپنی جگہ ٹھیک کام ہے کہ اگر اسلام کو ان مولویوں سے نجات مل جائے لیکن مولویوں سے نجات دے کر اسلام کو بدتر طبقے کے سپرد نہیں کرو، مولویوں سے نجات دے کر ان کو جہلاء کے سپرد نہ کرو کہ جن کو نہ اسلام کی خبر ہے، نہ دین کی خبر ہے، نہ دنیا کی خبر ہے اور وہ انٹیلیکچوئلز (Intellectuals) بن کر آئیں کہ جنہوں نے مثلاً قرآن کی الف ب بھی نہیں پڑھی ہے اور قرآن کی آیات کو اس طرح سے لوگوں کے سامنے پیش کریں، یہ بھی آیاتِ خدا کا مذاق ہے اور آیاتِ خدا کا تمسخر اڑانے والوں کیلئے قرآن نے صریح اعلان کیا ہے کہ

وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَاصِرِيْنَ ٥ ذٰلِكُمْ بِأَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ٥(١٦)

اور تم سب کا انجام جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ تم نے آیاتِ الٰہی کا مذاق بنایا تھا اور تمہیں زندگانیٔ دنیا نے دھوکے میں رکھا تھا تو آج یہ لوگ عذاب سے باہر نہیں نکالے جائیں گے اور انہیں معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا جائے گا۔

١٣)عوام زدگی

ان موانع میں سے ایک عوامانہ ذہنیت ہے یعنی عوام پسندی، عوام پرستی و عوام زدگی قرآن فہمی

کی راہ میں بہت بڑا مانع ہے، اگر انسان میں عوام زدگی کی خصلت پیدا ہوجائے تو اس کے کام خراب ہیں، اس کا دین و دنیا ویران ہے، جو عوام زدہ اور عوام پسند بن گیا اس کی دنیا و آخرت تباہ ہے، اگر اس انسان میں قرآن اور قرآن شناسی کا محرک موجود ہے، قرآن کی طرف رغبت بھی ہے اور دل آمادہ کر کے قرآن کی بارگاہ میں پہنچ بھی آیا ہے تو یہ مانع حائل ہوجاتا ہے لہٰذا یہ ہمیں مرادِ قرآن و حقیقتِ قرآن و مقصودِ قرآن تک پہنچنے نہیں دیتا ہے۔

عوام زدگی

عوام زدگی یعنی انسان کا ذوق و ذائقہ اور مزاج عامیانہ ہوجائے، عوام کو خوش کرنا، عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا، یہ صرف قرآن ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام علوم ایسے ہیں، علمِ دین میں خصوصاً یہ مانع بہت بڑا مانع ہے کہ جو اکثریت کو لاحق ہے، اکثریت کا دامن اس مانع میں آلودہ ہے اور بہت بڑی دیوار بن کر حائل ہے یعنی جو کچھ انسان پڑھتا ہے، جو کچھ کر رہا ہے تو ایک نیم نگاہ عوام پہ لگی ہوئی ہے کہ میں وہ تیاری کروں کہ جو عوام کو پسند آجائے، میں وہ مضمون اپناؤں کہ جو عوام کو پسند آئے، میں ایسا حلیہ اپناؤں کہ جو عوام کو پسند آئے یعنی عوام میں مقبول بننا اور عوام میں اپنے آپ کو موردِ قبولیت قرار دینے سے انسان قرآن سے محروم رہ جاتا ہے، نہ صرف قرآن سے بلکہ ہر چیز سے محروم رہ جاتا ہے، عوام زدہ انسان اور عوام پسند کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مقلدِ عوام ہے، اس انسان کا ذہن ہی عوامانہ اور عامیانہ ہوجاتا ہے، ایسے لوگ بہت سارے ہیں کہ جو مطلب اور حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن عوام پسندی اور عوام زدگی کی وجہ سے حقیقت کا اظہار نہیں کرتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ عوام کو جیسی بات پسند ہے ہم ویسی بات کریں۔

ہمارا معاشرہ اس آفت میں زیادہ مبتلا ہے، اہلِ علم کو متوجہ ہونا چاہیے، آفاتِ علماء اور آفاتِ طلابِ علومِ دینی میں سب سے بڑی ایک آفت اور بلا یہ ہے کہ ان کا مطمح نظر اور مقصود یہ بن جائے کہ ہم نے عوام کو خوش کرنا ہے، عوام میں مقبول واقع ہونا ہے، عوام کی توجہ ہماری طرف آئے، روایات میں جن اہلِ علم کی مذمت کی گئی ہے اور جس علم کی مذمت کی گئی ہے اس میں سے ایک مصداق یہ بھی ہے کہ وہ شخص جو علم فقط اس لئے حاصل کرے کہ اس علم کے ذریعے میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراؤں، زیادہ سے زیادہ میری طرف توجہ ہو، لوگوں میں ہمیشہ مرکزِ توجہ واقع رہوں، فراموش شدہ انسان نہ رہوں،

ایک وہ انسان ہے کہ جو علم کے ذریعے سے معیشت کماتا ہے،

يَأخُذُ بِهِ مِنَ الْأُمَرَاءِ. (۱۷)

یعنی علم کے ذریعے سے اپنا روزگار اور اپنا کھانا پینا بناتا ہے، علم فروشی کرتا ہے، دین فروشی کرتا ہے، ایک وہ انسان ہے جو مباہات وفخر فروشی کرتا ہے صرف دوسروں پر تکبر وغرور کرنے کے لئے کہ میں کتنا بڑا عالم ہوں؟ اور ایک انسان اس لئے علم حاصل کرتا ہے کہ

لِيُصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ......

جو علم حاصل کرتا ہے تاکہ لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرائے، یہ عوام زدگی اور عوام پسندی ہے، بہت اعلیٰ درجات تک پہنچ کر بھی نظریں عوام پر لگی ہوتی ہیں، جیسے وہ ایک طنزیہ نکتہ کسی نے علامہ اقبالؒ کے اس ماڈل (Model) پرندے یعنی شاہین کے بارے میں تنقید کے طور پر بیان کیا

عوام زدگی

ہے۔علامہ اقبالؒ نے یہ ماڈل انسان کے لئے، جوان کے لئے اور مسلمان کے لئے پیش کیا ہے اور شاہین کی خصوصیات بیان کی ہیں کہ شاہین کی مطلوبہ حالت معراجِ انسانیت پر پرواز ہے۔

کسی نے علامہ اقبالؒ پر طنزیا نقد کیا کہ آپ نے جو ماڈل پیش کیا ہے وہ اتنا اچھا بھی نہیں ہے کہ آپ اس کے ذریعے سے وجد میں آئے ہوئے ہیں، یہ شاہین بہت اونچا اڑتا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس میں شجاعت بھی ہے اور جھپٹتا بھی ہے، لپکتا بھی ہے، اس کے اندر بڑی خصوصیات ہیں لیکن بہت اونچی اڑان اڑ کر بھی اس کی نگاہیں زمین پر ہوتی ہیں اور زمین پر بھی چوہا ڈھونڈ رہا ہوتا ہے، یہ شکاری ہے کہ جب اس کو کوئی شکار نہیں ملتا ہے تو چوہے شکار کرتا ہے، پس انہوں نے کہا کہ یہ مناسب مثال نہیں ہے، پہلے بھی عرض کیا کہ علامہ اقبالؒ کا دفاع کیا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں جب کوئی مثال دی جاتی ہے تو اس کی ساری منفی یا مثبت خصوصیات مدِ نظر نہیں ہوتی ہیں بلکہ مثال کے اندر ایک جہت مدِ نظر ہوتی ہے۔

جب کسی کو کہا جاتا ہے کہ یہ شیر ہے تو دم، پنجے اور باقی چیزیں اس تشبیہ میں شامل نہیں ہوتی ہیں، یہ ادبیات کا ایک قاعدہ ہے لہٰذا علامہ اقبالؒ کے شاہین کا چوہا ڈھونڈنا علامہ اقبالؒ کی تشبیہ میں شامل نہیں ہے، صرف پرواز دخیل ہے، پرواز اور صرف پرواز، یعنی شاہینِ اقبال زمین کی طرف نگاہ نہیں کرتا ہے بلکہ فقط آسمان کی طرف دیکھتا ہے لیکن اپنی جگہ پر جس نے بھی نقد کیا ہے بہت ظریف و لطیف ہے، جو اقبالؒ پیش کرنا چاہتے ہیں اگر اس پہ نہ بھی فٹ (Fit) آتا ہو تو بہت سارے لوگوں پر فٹ ہے، بعض لوگ بڑی اونچی پرواز اڑتے ہیں، علم کے بہت اعلیٰ ترین درجے پر جا پہنچتے ہیں مگر

عوامِ زندگی

وہاں پہنچ کر بھی نظریں زمین پر، مال پر، مادیت پر، خمس پر اور دیگر وجوہات پر لگی ہوتی ہیں، اتنے اعلیٰ درجے پر پہنچ کر بھی نگاہیں مقلدین پر لگی ہوتی ہیں، عوام پسندی یہاں انسان کو نقصان دیتی ہے اور گرا دیتی ہے کہ اکثریت کے اندر یہ موجود ہے۔

اس رجحانِ عوام زدگی میں بڑی لذت ہے، جو اس لذت میں مبتلا ہیں ان کو جا کر دیکھیں کہ وہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں کہ صرف عوام میں مقبول رہیں، بعض ایسے لوگ ہیں کہ جو عوام میں مقبول بننے کے لئے مثلاً جہاں مجلس پڑھنی ہوتی ہے یا جہاں جلسہ جلوس کرنا ہوتا ہے وہاں خود اپنا اشتہار لکھتے ہیں اور پیسہ بھی اپنی جیب سے دیتے ہیں اور اشتہار کا سائز بھی خود بتاتے ہیں کہ ہمارے نام کا یہ اشتہار لگایا جائے یعنی بانیٔ مجلس کا کچھ بھی خرچہ نہیں ہوتا ہے، سب کچھ یہ خود کرتا ہے کیونکہ عوام پسندی کے اندر لذت ہے، جب آپ عوام کے نزدیک مقبول واقع ہو جائیں اور عوام آپ کو قبول کر لے تو انسان کو بہت فوق العادہ لذت محسوس ہوتی ہے، جو اس عارضے میں مبتلا ہیں ان کو پتہ ہو گا کہ کتنی لذت بخش چیز ہے، خدا بچائے اس لذت سے، عوام میں مقبول ہونا عیب نہیں ہے لیکن اس سے لذت اٹھانا عیب ہے کہ میں عوام میں بڑا مقبول انسان ہوں۔

حکیم ثنائی غزنوی فرماتے ہیں کہ

زینے ردو قبول عامہ خود را خرمساز
زان کار عامہ بنود جز خری یا خرخری
گاورہ دارند باور در خدائی عامیان

نوح را باور ندارند از پئے پیغمبری...... (۱۸)

یعنی عوام کا کام یہ ہے کہ یا تو خر بن جاتے ہیں کہ دوسرے ان پر سواری لیتے ہیں، جس طرح سے ابھی پاکستان میں ہے، دوتین پارٹیاں گدھے پر سوار ہونے کے لئے تیار ہیں، اب معلوم نہیں ہے کہ گدھا کس کو سواری دیتا ہے، گدھا یعنی یہی عوام۔ اس وقت بعض فوجی وغیر فوجی آپس میں مرج (Merge) ہوکر ایک ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار ہیں اور وہ گدھا اتنا مضبوط ہے کہ دونوں کو سواری دے سکتا ہے، پاکستانی عوام کا گدھا دونوں کو سواری دے سکتا ہے، یا خرخری ہے یعنی نافہمی، نابلدی، اگر یہ عوام ماننے پہ آجائیں تو گائے کو خدا مان لیتے ہیں اور اگر نہ ماننے پہ آئیں تو نوح علیہ السلام کو نبی بھی نہیں مانتے ہیں۔ آپ نے اگر ان کے پیچھے چلنا شروع کر دیا، ان کو خوش کرنا، ان کی خوشنوی حاصل کرنا اور ان کے اندر مقبول بننا شروع کر دیا تو محروم رہ جاؤ گے،

خَسِرَ الدُّنيَا وَالآخِرَةَ ......(۱۹)

یعنی دنیا بھی تباہ اور آخرت بھی تباہ ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جو سوچتے ہیں کہ ہمارے بارے میں لوگ کیا کہیں گے؟ لوگوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ عوام کی خاطر گدھے کو سواری دینا پڑتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ باپ اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہا تھا، گدھا بھی ساتھ تھا اور دونوں گدھے پر بیٹھے ہوئے تھے، ایک محلے کے عوام نے کہا کہ یہ کتنے ظالم ہیں کہ معصوم بے زبان جانور پر ظلم کر کے دونوں بیٹھے ہوئے ہیں، دونوں اتر گئے اور چلنا شروع کر دیا، اگلے محلے کے عوام نے کہا کہ کتنے بیوقوف ہیں؟ خالی سواری ساتھ جا رہی ہے اور یہ دونوں پیدل چل رہے ہیں، پھر باپ بیٹھ گیا اور

بیٹے نے چلنا شروع کر دیا، تیسرے محلے کے عوام نے کہا کہ زمانہ کتنا الٹا ہو گیا ہے کہ چھوٹا سا معصوم بچہ چل رہا ہے اور یہ گھبرو باپ سواری لے رہا ہے، پھر باپ اتر گیا اور بیٹے کو بٹھا دیا، اگلے چوتھے محلے کے عوام نے کہا کہ آج کل کے بچے دیکھو کہ بوڑھا باپ ساتھ چل رہا ہے اور بچہ سواری لے رہا ہے، عوام راضی نہیں ہوئے، آخر کاران دونوں نے مل کر گدھے کو سر پر اٹھالیا کہ شاید اس طرح سے عوام راضی ہو جائے اور جو شخص بھی عوام کو راضی کرتا ہے یہ مثال اسکے لئے ہے، جو شخص بھی عوام کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ میرے متعلق لوگ اچھی رائے رکھیں تو آخر کار اس کو گدھے کو سواری دینا پڑتی ہے، یہ طے ہے کہ آخر کار گدھا اٹھایا ہوتا ہے۔

واقعاً عوام زدگی قرآن کی فہم میں بہت بڑا مانع ہے، یہ عامیانہ طریقہ ہے کہ قرآن سے وہ نکتے ڈھونڈیں کہ جو عوام کو خوش کریں اور عوام کو قرآن سے ایسی راہیں بتائیں کہ جو دین خدا اور خود قرآن کے خلاف ہیں چونکہ مقصود نہ قرآن ہے، نہ خدا ہے، نہ دین ہے بلکہ فقط عوام مقصود ہیں اور عوام زدہ لوگ جب قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سمجھ نہیں پاتے ہیں چونکہ ذہنوں پہ غلبۂ عوام زدگی ہوتا ہے، یہ بہت خطرناک چیز ہے، اس سے زیادہ درج کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً اہل علم و طلابِ علوم کیلئے چونکہ یہ لوگ اس معرضِ خطر میں ہیں، طلابِ علومِ دینی عوام زدگی کے معرضِ خطر میں ہیں، دوسرے بھی ہیں لیکن اس خطرے میں سب سے زیادہ اہلِ علم اور علماء ہیں۔ دیگر موانع اس فصل کے حصۂ چہارم میں درج کیئے جائیں گے۔

حوالہ جات

(۱)......(بانگِ درا،حصۂ سوم،صفحہ ۲۸۱)

(۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ ۹)

(۳)......(سورۂ مبارکہ نحل،آیہ ۹۸)

(۴)......(وسائل الشیعة- الفقیه المُحدّثِ الشیخ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ،المتوفی سنَة ۱۱۰۴ ھ،الجزء ۲،صفحه ۴۳۸))(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰهِ المُنزَل- الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی،الجزء ۱۶،صفحه ۲۱۷) (تفسیر نور الثقلین،الجزء ۴،صفحه ۵۰۰)(تفسیر نمونه-جمعی از فضلا) (علوم طبیعت در قرآن)(الخصال،الجزء ۱،صفحه ۵۹)

(۵)......(سورۂ مبارکہ جاثیہ،آیہ ۲۳)

(۶)......(دعائے کمیلؒ)

(۷)......(سورۂ مبارکہ محمدؐ،آیہ ۳۶)

(۸)......(سورۂ مبارکہ انعام،آیہ ۱۲۵)

(۹)......(مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ- العلامة المجلسی، الجزء ۱۰، صفحه ۱۶۶) (مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل- المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسی، الجزء ۱۲، صفحه ۲۱) (بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسی "قدس اللّٰه سره"، الجزء ۷۰، صفحه ۲۴۸)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۱۲۵)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ شرح، آیہ۱)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ طہٰ، آیہ۲۵)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ نور، آیہ۳۵)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ تکویر، آیہ۵)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ رعد، آیہ۲)(سورۂ مبارکہ لقمان، آیہ۱۰)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ۳۵،۳۴)

(۱۷)......(بحار الانوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۳۸، حدیث ۶۱)

(۱۸)......(دیوان حکیم ثنائی غزنوی، قصیدہ شمارہ ۱۸۵)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ۱۱)

فصلِ ادبِ ششم

﴿رفعِ موانعِ فہم﴾

(حصّہ چہارم)

۱)ظن و گمان پر اکتفا کرنا

☆یقینِ حقیقی

☆جہلِ مرکب

☆تقلیدی یقین معرضِ زوال میں

☆یقینِ حقیقی کیلئے تین ارکان

☆اوائلِ قرآن میں مُخَاطَبِیْنِ قرآن کی تقسیم

الف)پہلا طبقہ

ب)دوسراطبقہ

ج)تیسراطبقہ

☆عُلَمَاء اور ظُنَنَاء

☆امانی،بنی اسرائیل کی مشکل

۲)قساوتِ قلبی

۳)ترکِ عمل

٤)قرآن کا آلائی استعمال

٥) کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

٦)جَلد بازی

٧)لکیر کا فقیر ہونا

٨)خود کو راهنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھنا

٩)ثانوی مطالب پہ توجہ دینا

١٠) اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجهی

١١)فقط انتخابی آیات پر توجہ دینا

آدابِ فہمِ قرآن میں ہماری بحث ادبِ ششم یعنی رفعِ موانعِ فہم میں جاری ہے کہ قرآن خوان اور قرآن شناس انسان اگر چاہتا ہے کہ قرآن کی بارگاہ سے استفادہ کرے اور اسرار و حکمتِ قرآن و معارفِ قرآن سے اپنے وجود کو منور کرے تو پہلے وہ اپنے دل کے اندر یا وجود سے باہر حائل موانع کو برطرف کرے اور موانع سمیت اگر اپنی پوری عمر بھی فہمِ قرآن میں صرف کر دے تو اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

۱) ظن و گمان پر اکتفا کرنا

ایک مانعِ دیگر ظن و گمان پر اکتفا کرنا ہے۔ فہمِ قرآن کے لئے اگر انسان ظن پرست اور تابعِ گمان زدہ ہو تو یہ مانع از فہمِ قرآن ہے۔ قرآن مجید نے بھی بعض کو اسی لئے محروم سمجھا ہے کہ

وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ο (۱)

اور انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ο (۲)

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور بس وہ اپنے خیالِ خام میں رہتے ہیں۔

ان کی مشکل یہ ہے کہ ان کے ظنون ہی ان کی کتابیں ہیں یعنی از نظرِ فہم و از نظرِ ادراک انہوں نے اتنا تکامل نہیں کیا ہے کہ اپنے ذہن کو درحدِ یقین لے آئیں، یہ یقین سے نیچے کم تر از یقین پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ اس مورد و مشکل میں اکثر انسان مبتلا ہیں۔ انسان کے بہت سارے

اعتقادی مسائل اور مشکلات کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان یقین سے نیچے نیچے کسی حالت پر اکتفا کرلیتا ہے، ایک تو حالتِ شکاکیت ہے یعنی تذبذب و تردید کی حالت ہے، گمان تردید سے ہٹ کر ایک حالتِ دیگر ہے، انسان کے دل میں ایک رجحان پیدا ہوتا ہے لیکن یقین نہیں ہوتا ہے اور بالفرض اگر یقین ہو بھی تو وہ بصورتِ جہلِ مرکب ہے یعنی بعض اوقات انسان جہلِ مرکب کو یقین سمجھ لیتا ہے۔

یقینِ حقیقی

☆یقینِ حقیقی

ایک حالت کو اصطلاح میں یقینِ حقیقی کہا جاتا ہے، اہلِ علم کی اصطلاح میں یہ یقین بمعنیٰ اخص ہے یعنی ایسا یقین کہ جس کے اندر مزید کئی اور یقین بھی موجود ہیں، یقینِ حقیقی دراصل کئی اور یقینوں کا مجموعہ ہوتا ہے، انسان اس وقت یقینِ حقیقی کی تعبیر کرسکتا ہے کہ اس کے اندر اعتقادِ جازم ہو یعنی ایسا اعتقاد کہ جس کے خلاف انسان کے ذہن میں کوئی احتمال موجود نہ ہو اور دوسری خصوصیت اس کے اندر یہ ہے کہ یہ مطابق بہ واقع بھی ہو یعنی یہ بھی یقین ہو کہ میرا یقین بمطابقِ واقع ہے یعنی حقیقت بھی ایسے ہی ہے کہ جیسے مجھے یقین ہے، چونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک شے کی نسبت یقین حاصل کرتا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے کہ جسے جہلِ مرکب کہا جاتا ہے، غالباً جو اپنے آپ کو عالم سمجھتے ہیں، حقائق کے بارے میں خود کو اہلِ علم سمجھتے ہیں وہ اغلب جہلِ مرکب کو علم کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ ہم اس کو روزمرہ کی مثالوں میں ہی تلاش کرسکتے ہیں یعنی ہم خود بھی بعض اوقات جہلِ مرکب کا شکار ہیں اور یہ ساری بحث اسی لئے ہے کہ ہم خود اپنے لئے ہی یہ سب کچھ

سمجھیں، اصلاح کریں اور یقین کی منزل تک پہنچیں۔

مثلاً انسان کسی اور کا جوتا اس اعتقاد کے ساتھ پہن لیتا ہے کہ یہ میرا اپنا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ میرا اپنا ہے لیکن یہ یقین مطابق بہ واقع نہیں ہے، حقیقت ایسے نہیں ہے، پس یہ یقین پر ہے لیکن یقین غیرِ واقعی ہے، یقینِ کاذب ہے، اکثریت کے یقین اسی قبیل کے ہیں یعنی ہمیں جو بہت ساری چیزوں کا یقین ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ چونکہ حقیقت کچھ ہے اور ہمیں اس کے لئے کسی اور طرح کا یقین ہے اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارا یقین حقیقت کے مطابق، واقعیت کے مطابق اور ہمارے ذہن سے باہر موجود واقعیت کے مطابق نہیں ہے، پس دوسری خصوصیت یہ ہو کہ انسان کا یقین مطابق بہ واقع بھی ہو یعنی انسان کے پاس حجت ہو، ایسا ذریعہ ہو کہ جس سے یہ کشف کر سکے کہ جیسا مجھے یقین ہے ویسا ہی حقیقت میں بھی موجود ہے، مثلاً اگر مجھے معلوم ہے کہ میرے سامنے یہ میز ہے تو واقع میں بھی یہ میز ہونی چاہئے نہ یہ کہ فقط میرے ذہن میں میز ہو یا مجھے یوں گمان ہو یا خیال ہو کہ یہ میز ہے درحالیکہ یہ کوئی اور چیز ہو اور اس کے اندر خصوصیتِ دیگر یہ ہے کہ یقین کہ جو مجھے حاصل ہے وہ جزم ہے، اعتقاد بہ واقع ہے۔ یہ معرضِ زوال میں بھی نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ میرا یہ یقین بعد میں زائل ہو جائے، یقین کیوں زائل ہو جاتا ہے؟ اس لئے کہ جن منابع سے، جن ذریعوں سے انسان کو یقین حاصل ہوتا ہے ان میں سے بعض پائیدار اور بعض ناپائیدار ذریعے ہوتے ہیں۔

اگر تقلید کے ذریعے سے انسان کو یقین حاصل ہوا ہو تو وہ بعد میں زائل ہو سکتا ہے، تقلید کے معانی یہ ہیں کہ کسی نے کچھ کہا اور مجھے بھی یقین ہو گیا، اس سے میں نے کوئی دلیل و حجت نہیں مانگی

یقین حقیقی ☆

اور نہ اس نے پیش کی ہے، اس نے بھی ساتھ میں برہان قائم نہیں کیا بلکہ صرف اس کے کہنے پر مجھے یقین ہو گیا ہے یا اس کے کہنے پر میرا یقین بھی ہے لیکن اگر کل کو وہ اپنی رائے سے منصرف ہو جاتا ہے کہ جس کے کہنے پر مجھے یقین ہوا تھا تو خوانخواہ میرا یقین بھی ختم ہو جائے گا۔ مثلاً فرض کریں کہ میں نے کسی سے پوچھا یہ آواز کس کی آئی ہے؟ وہ کہے کہ آپس میں گاڑیاں ٹکرائی ہیں، ایکسیڈنٹ (Accident) کی آواز آئی ہے، مجھے بھی یقین ہو گیا کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، بعد میں اس نے کہا کہ نہیں ایسے نہیں ہوا بلکہ مجھے اشتباہ ہوا تھا، درحقیقت کوئی چیز چھت سے گری تھی وہ اس کی آواز تھی، پس وہ انسان اپنی رائے سے پھر گیا، خوانخواہ اس اتفاق کا یا حادثے کا میرا یقین بھی متزلزل ہو گیا ہے لہٰذا یہ تقلیدی اور دیکھا دیکھی یقین ہے کہ جو انسان کو دوسروں کے کہنے پر بغیر دلیل و حجت کے حاصل ہوتا ہے۔ یہ یقین معرضِ زوال میں ہوتا ہے، اس کو یقین بمعنیٰ اخص یا یقینِ حقیقی نہیں کہتے ہیں بلکہ یہ یقینِ کاذب ہے۔ یقینِ متزلزل یعنی ناپائیدار یقین یا جہالت کہ جس کے اندر انسان کو احساسِ یقین ہوتا ہے لیکن وہ جہلِ مرکب ہے۔

☆جہلِ مرکب

☆جہلِ مرکب

جہلِ مرکب یقین نما ہوتا ہے، اس کی شکل اور حلیہ یقین جیسا ہے لیکن حقیقتاً یقین نہیں ہے، یہ حقیقتاً جہالت ہے کہ انسان ایک چیز کو نہیں جانتا ہے اور اپنے نہ جاننے کو بھی نہیں جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوں، اکثریت کو کہ جسے اپنے اندر احساسِ علم ہوتا ہے جہلِ مرکب کی وجہ سے یقین

ہوتا ہے چونکہ استثنائی لوگ ایسے ہیں کہ جن کا یقین واقعاً دلیل و مدرک و برہان کی وجہ سے ہے یعنی ان کو ایک معتبر اور قابلِ قبول منبع سے یقین حاصل ہوا ہے تو یہ یقینِ حقیقی ہے لیکن غیر قابلِ قبول منبع سے حاصل شدہ یقین جہلِ مرکب ہے جیسے خرافاتیوں کو یقین ہوتا ہے۔ جو لوگ خرافات کے قائل ہوتے ہیں یا مبتلا ہوتے ہیں تو انہیں یقین ہوتا ہے کہ فلاں چیز کی وجہ سے مجھے یہ حادثہ پیش آیا ہے جیسے عموماً رہتا ہے کہ اس پر جن آ گئے ہیں، اس پر جادو کر دیا گیا ہے، اس کے اوپر تعویذ کر دیا گیا ہے، اس کو کسی نے نفرین کر دی ہے، اس کی کسی نے روزی بند کر دی ہے، کسی نے اس کا رزق بند کر دیا ہے اور اسی طرح کی خرافاتی چیزیں لوگوں کے اندر موجود ہیں، ان کو یقینِ کامل ہوتا ہے لیکن ان کا یہی یقین جہلِ مرکب ہے، مثلاً ایک شخص بیمار ہوا ہے اور انہیں اس کی بیماری کا علم نہیں ہے لیکن انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ ہمیں اس کی بیماری کا علم نہیں ہے، وہ اپنی جہالت کو بھی نہیں جانتے ہیں،

لَا أَدْرِی نِصْفُ الْعِلْمِ...... (۳)

مجھے معلوم نہیں ہے کہنا، آدھا علم ہے......

قَوْلُ لَا أَعْلَمُ نِصْفُ الْعِلْمِ...... (۴)

یہ کہنا کہ میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے......

جہل بسیط نصف العلم ہے اور آدھی جہالت ہے لیکن جہلِ مرکب مکمل جہالت ہے، یہ جہالت علم بن کے انسان کے سامنے ظاہر ہوتی ہے اور قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ قرآن انسان کو یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ قرآنی مطالب و معارف بھی انسان کو اسی وقت درست سمجھ میں آتے

ہیں کہ جب ان معارف کے بارے میں انسان یقین کی حد تک پہنچ چکا ہو، مثلاً بہت سارے موضوعات ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا ہے کہ ان کے اندر ہماری نشانیاں ہیں لیکن

لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ٥(۵)

یعنی اس قوم کے لئے ہیں، ان لوگوں کے لئے ہیں کہ جو اہلِ یقین ہیں۔

اگر لوگ اہلِ یقین نہیں ہیں تو اہلِ جہلِ مرکب اور اہلِ تقلید ہیں، فصلِ ادبِ ششم کے حصہ دوم میں تقلید کی وضاحت کی جا چکی ہے لہٰذا کوئی اس تقلید سے وہ تقلید مراد نہ لے کہ جو عوام مجتہد کی کرتے ہیں چونکہ وہ تقلید اس وجہ سے ہے کہ جس کیلئے قرآن نے بھی کہا ہے کہ

فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥(۶)

ان سے کہئے کہ اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔

وہ مذموم تقلید کہ جس کی قرآن نے بھی مذمت کی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام لوگوں کے سامنے دین پیش کرتے تھے تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ ہم تو آباء کے مقلد ہیں،

اِنَّا وَجَدْنَا آبَائَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ......(۷)

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے......

یہ مذموم تقلید ہے، اس کی قرآن نے مذمت کی ہے کہ

اَوَلَوْ کَانَ آبَاؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ٥(۸)

یعنی کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ

نہ رہے ہوں۔

پس وہ تقلید مستثنیٰ ہے، جب تقلید کی بات کی جاتی ہے تو فوراً اس تقلید کی طرف ذہن نہ جائے۔

☆تقلیدی یقین معرضِ زوال میں

تقلیدی یقین معرضِ زوال میں ہوتا ہے، جیسے افواہیں ہیں مثلاً آپ نے ایک بات کی، آپ سے میں نے سنی، میں نے کسی اور کو بتائی، اس نے مجھ سے سنی، نہ میں نے آپ سے دلیل مانگی اور نہ آپ نے مجھے دلیل دی، نہ میں نے کسی کو دلیل دی، نہ کسی نے مجھ سے دلیل مانگی اور یہ مطلب نقل ہوتے ہوتے کئی لوگوں تک پہنچ گیا اور آخر میں پتہ چلا کہ یہ افواہ تھی، اول شخص کہ جس نے یہ افواہ پھیلائی اس کا اشتباہ تھا و غلط فہمی تھی، نتیجتاً یہاں پر سب کا یقین زائل ہو جاتا ہے۔

☆یقینِ حقیقی کیلئے تین ارکان

لہٰذا یقینِ صحیح و یقینِ حقیقی کیلئے ان تین ارکان کا ہونا ضروری ہے، ایک یہ کہ انسان کے پاس احتمالِ خلاف موجود نہ ہو، اعتقادِ انسان میں، فہم انسان میں یا باورِ انسان میں یہ احتمال موجود نہ ہو، مثلاً میں کہوں کہ یہ میز ہے تو پھر اس کے میز نہ ہونے کا ایک فیصد احتمال بھی نہ ہو، اگر ایک فیصد

احتمال ہوا کہ یہ میز نہیں ہے تو پھر یقین نہیں ہوگا، اگر اس کا احتمالِ خلاف موجود ہو تو یہ گمان کہلاتا ہے اور دوم یہ کہ یقین مطابق بہ واقع ہو، مجھے یہ بھی پتہ ہو کہ مجھے جس چیز کے میز ہونے کا یقین ہے تو وہ واقعی میز ہو یعنی میرے پاس تصدیق کا ذریعہ بھی موجود ہو اور سوم یہ کہ یہ یقین معرضِ زوال میں نہ ہو۔ اتنی زیادہ خصوصیات ملیں تو یقین بنتا ہے ورنہ بہت سارے یقین غفلت کی وجہ سے، نہ جاننے کی وجہ سے، جہلِ مرکب ہونے کی وجہ سے انسان کے لئے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

☆اوائلِ قرآن میں مُخَاطَبِیْنِ قرآن کی تقسیم

☆اوائلِ قرآن میں مُخَاطَبِیْنِ قرآن کی تقسیم

قرآن نے بہت سارے موضوعات بیان فرمائے ہیں کہ جو یقین سے تعلق رکھتے ہیں یعنی درحدِ یقین ان تک پہنچنے کی کوشش کرو مثلاً معاد ایک موضوع ہے، یقینی طور پر قرآن نے اپنے مخاطبین کو آغاز سے ہی تقسیم کردیا ہے کہ

هُدًى لِّلنَّاسِ......(۹)

یہ ناس کے لئے ہدایت ہے لیکن ناس کی تین قسمیں ہیں۔

الف) پہلا طبقہ

پہلا طبقہ وہ ہے کہ جس کیلئے فرمایا کہ

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ٥(۱۰)

قرآن متقین کیلئے ہدایت ہے، متقین یعنی جو ہدایتِ قرآن لینے کے لئے آمادہ ہیں،

انہوں نے اپنے دلوں کو آمادہ کیا ہوا ہے، تیار کیا ہوا ہے، ان کی صفات میں سے آخری صفت یہی ہے کہ جو قرآن نے ذکر کی ہے،

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ○ (١١)

یہ اہلِ یقین ہیں، البتہ پہلی صفت سے بھی ہم یقین استنباط کر سکتے تھے کہ متقین کون ہیں؟

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ...... (١٢)

یعنی جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، ایمان کے ضمن میں بھی یقین موجود ہے لیکن آخر میں آکر متقین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اہل یقین ہیں، جن کو نہ صرف آخرت پر یقین ہے بلکہ ہر وہ چیز کہ جس پر ان کو یقین ہونا چاہئے اس پر ان کو یقین ہے، انہیں یقینِ حقیقی ہے کہ جو صحیح اور اپنے خاص معنیٰ میں ہے۔

دوسرا طبقہ

ب) دوسرا طبقه

دوسرا وہ طبقہَ ناس ہے کہ جو

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ○ (١٣)

اے رسولؐ! جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا ہے ان کے لئے سب برابر ہے، آپؐ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر گویا مہر لگا دی

ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں، ان کے واسطے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

یعنی جو اپنی استعداد کھو بیٹھا ہے، قرآن ان کی ہدایت کے لئے بھی آیا ہے لیکن قرآن سے ہدایت لینے کی توفیق ان کے اندر ختم ہو چکی ہے۔

ج) تیسرا طبقہ

تیسرا طبقہ وہ ہے کہ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ...... (۱۴)

ابھی اس حد تک نہیں پہنچے کیونکہ یہ کمزور دل ہیں، ضعیف دل ہیں، ان کے اندر کھوٹ اور بیماری موجود ہے۔ان کا یقین متزلزل ہوتا ہے، عام طور پر ہمارا سروکار جن چیزوں سے ہے خصوصاً علوم میں کہ ان میں غیر یقینی علوم سے ہمارا زیادہ سروکار ہے، یہاں یقین کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر درحدِ اطمینان یا اطمینان سے بھی کم تر ایک گمانِ غالب بھی پیدا ہو تو لوگ عمل کر سکتے ہیں، اس سے انسان خوگرِ ظنون بن جاتا ہے اور اہلِ ظنون شمار ہونے لگتا ہے۔

☆عُلَمَاء اور ظُنَنَاء

صدرالمتالھینؒ فرماتے ہیں کہ علماء کو علماء اس لئے کہتے ہیں چونکہ صاحبِ علم ہیں یعنی جس کے پاس علم ہو وہ عالم ہے لیکن جس کے پاس ظن ہو، گمان ہو وہ تو عالم نہیں کہلاتا ہے بلکہ جس کے پاس ظن ہو اس کو ظان کہتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگر آپ لوگوں میں جا کر جستجو کریں، ٹٹولیں اور کریدیں کہ ان کے پاس واقعاً علم ہے یا نہیں ہے تو اکثر علوم اندر سے ظنون نکلیں گے اور جن کے پاس ظنون ہو ان کو عالم نہیں کہتے ہیں بلکہ ان کو تو ظان کہتے ہیں کہ جس کی جمع ظُنَنَاء ہے، لہٰذا فرماتے ہیں کہ تفتیش کریں، اگر اہلِ علم کے علم کی تفتیش کریں تو اندر سے ظنون نکلیں گے اور اکثر علماء کا علم جب ظنون ہے تو علماء بھی ظنناء ہو جائیں گے، یعنی علماء الدین کے بجائے انہیں ظنناء الدین کہنا پڑے گا یعنی دینی معارف کے بارے میں جن کو گمان ہے، اندازے ہیں اور تخمینے ہیں لیکن یہ یقین تک نہیں پہنچے۔

☆عُلَمَاء اور ظُنَنَاء

☆امانی، بنی اسرائیل کی مشکل

قرآن نے بنی اسرئیل کی جو مشکل ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدس و گمان و تخمینے اور انہی جیسی چیزوں پر اکتفا کرتے تھے،

وَمِنهُم أُمِّيُّونَ لَا يَعلَمُونَ الكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ......

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی

آرزوؤں کے......

امانی یعنی تخمینہ وحدس وظن وگمان کہ یوں ہوگا، سادہ مثال سے عرض کرتے ہیں کہ امانی کس کو کہتے ہیں؟ یہ حدس، گمان اور اندازہ لگانے کو کہتے ہیں مثلاً حوزۂ علمیہ میں جب ایک شخص آتا ہے تو کئی تخمینے ذہن میں لے کر آتا ہے، اس کے اندازے ہوتے ہیں مثلاً وہ شہر کہ جہاں پہلی دفعہ آرہا ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ شہر ایسا ہوگا، لوگ ایسے ہوں گے، دوست ایسے ہوں گے، مدرسے ایسے ہوں گے، حرم ایسا ہوگا، جوں جوں کر اس نے اپنے ذہن میں ایک نقشہ بنایا ہوتا ہے لیکن جب آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک سو اسی (180) درجے نقطۂ اختلاف ہے، وہ کچھ اور سوچ کر آیا تھا لیکن یہاں کچھ اور ہے، وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں ٹرمنل (Terminal) پہ اتروں گا تو سب سے پہلے میرے استقبال کے لئے مرکزِ جہانی کی طرف سے ایک ہیئت آئے گی، جو مجھے لے جائے گی کہ آغا یہاں پر پڑھنے کے لئے آئے ہیں، اسے کیا خبر تھی کہ یہاں نہ خوابگاہ ملے گی، نہ اقامہ ملے گا، نہ شہریہ ملے گا یعنی وہ جو اندازے لگا کر آیا تھا وہ سارے اندازے یہاں آکر غلط نکلتے ہیں۔

اسی طرح سے کچھ لوگوں نے دین کے بارے میں فقط اندازے لگائے ہوئے ہیں اور بسا اوقات شعر میں، تقریر میں اور نثر میں ان اندازوں کو بیان بھی کر دیتے ہیں کہ جب ہم جنت میں جائیں گے تو پھر یوں ہوگا، ایسے ہوگا، ویسے ہوگا اور جب یہ وہاں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ معاملہ بالکل برعکس ہوگا، کہتے ہیں کہ کسی شخص کو قیامت کے بارے میں شک تھا لیکن جب وہ مر گیا تو مرنے کے کچھ عرصہ بعد کسی نے اس کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اب بتاؤ کہ آپ جب زندہ تھے تو کہتے

تھے کہ قیامت کوئی چیز نہیں ہے، کوئی حساب و کتاب نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، اب بتاؤ کہ کچھ ہے یا نہیں ہے، اس نے کہا کہ نہیں اب بھی کچھ بھی نہیں ہے، کوئی حساب و کتاب نہیں ہے، پوچھا کیسے؟ کہا کہ جوں ہی ہم مرے فوراً بغیر حساب و کتاب کے جہنم لے گئے۔

اس نے جواندازہ لگایا ہوا تھا وہ وہاں غلط نکلا اور لوگ حقیقتاً ایسے ہی اندازے لگاتے ہیں کہ مثلاً جب ہم پکڑے جائیں گے تو فلاں بچانے آجائیں گے، ہم فلاں کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتے ہوئے سیٹیاں بجاتے ہوئے جنت چلے جائیں گے، یہ سارے اندازے ہیں، یہ ایسے ہی غلط ہیں کہ جیسے حوزے میں باطل ہو جاتے ہیں۔ قیامت میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ اندازے باطل ہو جائیں گے، یہاں پر اندازے لگاتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر عالم وفاضل بن کر جب واپس جائیں گے تو قوم استقبال کرنے اسٹیشن (Station) پر آئے گی لیکن انسان کو سیٹ (Seat) بھی نہیں ملتی ہے، ٹرین میں قلی بھی دوسروں کا سامان اُٹھا لیتا ہے لیکن اس کا نہیں اُٹھاتا ہے، اس نے جواندازہ لگایا ہوا تھا کہ قوم استقبال کرے گی اور ہار پہنائے گی تو وہ سارے اندازے باطل ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنا دین اندازوں پہ نہ بنائے کہ چونکہ ہم یہ نعرہ لگاتے ہیں، فلاں کام کرتے ہیں لہٰذا ہم بغیر حساب و کتاب کے پاس (Pass) ہو جائیں گے، بغیر حساب کتاب کے رَد ہو جائیں گے۔

دین خدا ایک نظام ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے اسی لئے اس کو کھول کر بیان کیا ہے کہ ان چیزوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اپنی طرف سے من گھڑت اندازے نہ لگاؤ، ہمیشہ دانشگاہوں اور یونیورسٹیوں میں پہلے سے ایک وضاحت نامہ لکھ دیا جاتا ہے تا کہ کوئی اپنی طرف سے من گھڑت

اندازے نہ لگائے کہ یہ ہوگا اور یہ نہیں ہوگا، سب پہلے ہی کھول کر بیان کر دیا جاتا ہے، جب قرآن نے سب کچھ کھول کر بیان کر دیا ہے تو اب اندازے لگانے کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا گمان، حدس اور تخمینے قرآن فہمی میں سب سے بڑا مانع ہے، ان اندازوں کی وجہ سے کہ جو ہم نے پہلے سے لگا کر رکھے ہوئے ہیں قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے، اپنے ذہن کو آزاد چھوڑیں، اس کو قرآن کی طرف جانے دیں اور دیکھیں کہ قرآن اس کو کیا بتاتا ہے پھر جو کچھ قرآن بتائے اسے تحویل میں لیتے جائیں۔

۲)قساوتِ قلبی

عاملِ دیگر کہ جو خود قرآن نے بھی ذکر کیا ہے کہ قرآن و دین کیوں سمجھ میں نہیں آتا ہے؟ موعظہ کیوں اثر نہیں کرتا ہے؟ وہ قساوتِ قلبی ہے کہ دل سخت ہو جاتا ہے، یہ بحث ہم نے مفصل کی ہے، ہم نے تفسیر کے ضمن میں، آیاتِ قرآن سے اور دیگر منابع سے قلب کے مختلف حالات اور اسی آیہ کے ذیل میں کی ہے کہ جس میں قساوت کا ذکر کیا گیا ہے،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً...... (۱۵)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت......

انسان کا دل بسا اوقات اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے، دل کی سختی سے مراد یہ ہے کہ اب یہ دل اثر قبول کرنا چھوڑ دیتا ہے، سخت دل یعنی متاثر نہیں ہوتا ہے، نہ موعظہ اس پر اثر کرتا ہے، نہ کلامِ خدا اس پر اثر کرتا ہے، نہ کوئی اور چیز اس پر اثر کرتی ہے، انسان کا

دل اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ عبرتناک مناظر اس پر اثر نہیں کرتے ہیں، ایسے مناظر کہ جس سے لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، موم ہو جاتے ہیں لیکن اس کا دل وہاں بھی نرم نہیں ہوتا ہے، ایسے لوگ موجود ہیں مثلاً اگر ظاہر کو بھی دیکھیں تو بعض لوگ ہوتے ہیں جو ظواہر کے لحاظ سے بڑے نرم دل ہوتے ہیں مثلاً یہ کسی جانور کو بھی تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے ہیں، اگر کوئی جانور ذبح کیا جا رہا ہو تو وہ منظر نہیں دیکھ سکتے ہیں۔

اگر آپ ایک قصاب کے پاس جائیں تو دیکھیں گے کہ وہ کتنا سخت دل ہوتا ہے، اس کے دل میں کوئی رحم نہیں ہوتا ہے یعنی اس جانور کی نسبت اس کا دل سخت ہوتا ہے یا عموماً ہسپتالوں میں جو نرسیں ہوتی ہیں یہ روز لوگوں کو انجکشن لگا لگا کر اور زخم دیکھ دیکھ کر عادی ہو جاتی ہیں، ان کا بیماروں سے روزمرہ سروکار ہوتا ہے لہٰذا ان کا دل بہت سخت ہو گیا ہے، اب کوئی بڑی دردناک آواز میں رو رہا ہو تو بھی اس کے دل پر ذرا اثر نہیں ہوتا ہے، اگر مریض کو دیکھنے کیلئے کوئی وزیٹر (Visitor) گیا ہو تو اس کا دل نرم ہو جاتا ہے، وہ بے چارہ پریشان ہو جاتا ہے لیکن یہ دل بیٹھے رہتے ہیں اور انہیں کوئی اثر نہیں ہوتا ہے چونکہ ان کا دل سخت ہو جاتا ہے اور حتیٰ روایاتِ حج میں ہے کہ جوں ہی حج کرو تو فوراً واپس آ جاؤ، کیوں؟ کیونکہ جو حج کے بعد وہاں زیادہ رہے گا اس کا دل سخت ہو جائے گا یعنی کعبہ اب اس پر اثر نہیں کرتا چونکہ حج تک تو حج میں مشغول ہوتا ہے لیکن حج کے بعد بازاروں، مارکیٹوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور یہ امور انسان کے دل کو سخت کر دیتے ہیں۔ روایات میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کن کن چیزوں سے دل سخت ہوتا ہے، مر جاتا ہے اور بالکل اثر قبول کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

قساوتِ قلبی

ایک حالت جو فہمِ قرآن میں مانع بنتی ہے یہی قساوت و سختیٔ قلب ہے، اس کو نرم کریں، قساوت کے مقابلے میں خشوع ہے،

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ٥ (١٦)

نماز بہت مشکل کام ہے مگر ان لوگوں کے لئے نہیں جو خشوع و خضوع والے ہیں۔

سخت دل لوگوں پر عبادتیں گراں گزرتی ہیں، جب دل قساوت کا شکار ہو تو عبادات، مناجات، دعا اور معنویت گراں گزرتی ہیں یعنی عبادتیں اور مناجات انسان پر ایک ہتھوڑے کی طرح اثر کرتی ہیں، یہ برداشت نہیں کر سکتا ہے لیکن خاشع دل، نرم دل پر اثر ہوتا ہے اور وہ یہ چیزیں سن کر گریہ کرتا ہے۔ اسی لئے مواعظ بھی سخت دلوں پر بہت گراں ہوتے ہیں،

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ٥

خشوع یعنی دل کو نرم کرو، دل نرم کرنے کے لئے ایک چیز گریہ ہے، تاکید ہے کہ آپ عبادت کے اندر روئیں چونکہ رونے سے دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں، انسان کا دل نرم ہو تو رونا آتا ہے اور رونے سے دل نرم ہوتا ہے، نرم دل روتا ہے لیکن جس کا دل بہت سخت ہو وہ اصلاً سرے سے نہیں روتا ہے، کوشش بھی کرے تو آنسو نہیں نکال سکتا ہے لیکن نرم دل لوگ روتے ہیں اور قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ...... (١٧)

کیا صاحبان ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل ذکرِ خدا کیلئے نرم

قساوتِ قلب

ہو جائیں......

دل جب تک نرم نہ ہوتو قرآن بھی اثر نہیں کرتا ہے۔ دل کی سختی کے موجبات میں سے ایک گناہ بھی ہے اور قرآن سمجھنے کی راہ میں ایک مانع گناہ اور معصیت ہے۔ روایت میں ہے کہ بسا اوقات عبادتوں میں لذت محسوس نہیں ہوتی ہے یا بعض اوقات عبادتیں ترک ہو جاتی ہیں، مستحبات ترک ہو جاتے ہیں، فرمایا کہ یہ گناہ کی وجہ سے ہے،

حتیٰ رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

عَلاقَةُ الْقَلْبِ مَعَ الدُّنْيَا تَمْنَعُ حَلاوَةَ الْعِبَادَةِ...... (۱۸)

دنیا سے دل کی محبت عبادت کی شیرینی کو روک دیتی ہے......

یہ گناہ کہ جن کو ہم اہمیت نہیں دیتے ہیں چاہے چھوٹے گناہ ہوں یا بڑے گناہ، ان کی وجہ سے دل سخت ہو جاتا ہے، ہم سزا کے اعتبار سے چھوٹے بڑے گناہ تقسیم کرتے ہیں یعنی جس کا طمانچہ معمولی سا ہو وہ چھوٹا گناہ ہے اور جس کا تھپڑ زوردار ہو وہ گناہِ کبیرہ ہے، ہم اثر کے لحاظ سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ نتیجے کے لحاظ سے دیکھتے ہیں، سزا کے لحاظ سے دیکھتے ہیں، اثر کے لحاظ سے دیکھیں، گناہ کی سزاؤں کو چھوڑ دیں بلکہ آپ فقط یہی دیکھیں کہ گناہ کا اثر کیا ہوتا ہے؟ گناہ انسان کے دل کو سخت کر دیتا ہے، بعض چیزیں ہوتی ہیں کہ اگر ان کے اوپر پانی چھڑک دیا جائے تو سخت ہو جاتی ہیں، جب تک پانی اس پر نہیں پڑا وہ نرم ہے اور جوں ہی اس کے اوپر پانی پڑے گا یہ سخت ہو جائیں گی، ایک قطرہ پانی پڑا تو بھی سخت ہو جائیں گی، اگر آپ نے پورا لوٹا اس کے اوپر گرایا تو بھی

سخت ہو جائیں گی لہٰذا اس کے اوپر ایک قطرہ بھی نہ گرنے دیں، سیئات و گناہ انسان کے دل کو سخت کر دیتے ہیں، ہمیں عبادتوں میں لذت کیوں محسوس نہیں ہوتی ہے؟ قرآن میں لذت کیوں محسوس نہیں ہوتی ہے؟ اور قرآن کیوں ہمیں اپنی طرف نہیں بلاتا ہے، نہیں کھینچتا ہے بااینکہ قرآن کے اندر کشش ہے، جذب کرتا ہے، قرآن کے اندر جاذبہ شدید ہے لیکن مشکل ہماری وجہ سے ہے۔

جس طرح سے مقناطیس اور لوہا ہیں، مقناطیس میں لوہے کو کھینچنے کے لئے شدید کشش موجود ہے لیکن اگر لوہے کو زنگ لگا ہوا ہو اور لوہے کی راہ میں کوئی مانع پڑا ہوا ہو تو یہ مقناطیس اس لوہے کو نہیں کھینچتا ہے، حجاب میں چھپا ہوا لوہا کہ جس کے اوپر پردے چڑھے ہوئے ہیں اور موانع نے اس کو لپیٹا ہوا ہو تو اس لوہے کو مقناطیس نہیں کھینچتا ہے، عبادتوں کے اندر لذت ہے، عبادتوں میں مقناطیسیت ہے اور کلامِ خدا میں یہ مقناطیسیت و کشش درحقیقت خود خدا کی کشش ہے چونکہ وہ رب ہے اور رب اپنے مربوب کو اپنی طرف کھینچتا ہے، خالق مخلوق کو اپنی طرف کھینچتا ہے، یہ مقناطیسیت ہے لیکن مخلوق اور مربوب کبھی گناہوں کے پردے میں لپٹ جاتے ہیں اور ان میں زنگ پڑ جاتا ہے لہٰذا اب مقناطیس جتنا شدید بھی ہو پھر بھی اسے اپنی طرف نہیں کھینچتا ہے۔

۳) ترکِ عمل

قرآن فہمی کی راہ میں ایک بڑا مانع یہ ہے کہ جب انسان بارگاہِ قرآن میں جاتا ہے خصوصاً جو رغبت و شوق رکھتے ہیں وہ قرآن کی بارگاہ میں جاتے ہیں اور اس کے اندر غور و خوض کرتے ہیں تو

ایک مطلب سمجھ میں آجاتا ہے، بالآخر روحِ قرآن وظاہرِ قرآن میں سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو جاتا ہے اور پھر اس سے آگے گزر جاتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا ہے یعنی ترکِ عمل مطابق با قرآن۔ جب انسان قرآن کو سمجھتا ہے تو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کو اپنا تا بھی جائے، ایک اصطلاح کہ جو اہلِ علم استعمال کرتے ہیں وہ تحقق کہلاتی ہے، تحقیق اور چیز ہے تحقق اور چیز ہے۔

اگر انسان قرآن میں تحقیق کرے تو محقق بنتا ہے اور محققینِ قرآن فراواں ہیں لیکن بزرگان واہلِ معرفت کہتے ہیں کہ آپ محققِ قرآن سے آگے بڑھیں یعنی متحققِ قرآن بنیں، محققِ قرآن یعنی جس نے بہت سارے موضوعات میں مطالعہ کر لیا ہے اور بڑی کثرت سے معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔ متحققِ قرآن یعنی جس نے قرآنی تعلیمات کو اپنے وجود کے اندر منتقل کر دیا ہے، اپنے وجود کا حصہ بنالیا ہے۔ بعض اساتید اس کی تعبیر کرتے ہیں البتہ یہ فارسی تعبیر ہے اور اردو میں رائج نہیں ہے لیکن اردو میں اس کا کوئی متبادل بھی نہیں ہے، اردو میں صرف اس کی تفسیر کی جا سکتی ہے، وہ تعبیر یہ کرتے ہیں کہ دانائی اور دارائی، تحقیق اور تحقق میں فرق کیا ہے؟ ایک دانائی ہے اور ایک دارائی ہے، دارا ہونا یعنی مالک ہونا، اس چیز کا صاحب ہونا، دانا ہونا یعنی فقط آگاہ ہونا، اس کو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے سرمایہ دار اور سرمایہ دان میں فرق ہے، سرمایہ دان کون ہیں؟ سرمایہ دان وہ ہیں کہ جن کو سرمایہ کا علم ہے، یہ یونیورسٹیوں میں جو اقتصاد پڑھاتے ہیں وہ سرمایہ دار نہیں ہیں، سرمایہ کمانے کا علم ان کے پاس موجود ہے لیکن سرمایہ نہیں ہے، سرمایہ دار اور ہوتا ہے، سرمایہ دان اور ہوتا ہے۔

اسی طرح سے دین دار اور دین دان دونوں میں فرق ہے، دین دان وہ لوگ ہیں کہ جو دین

ترکِ عمل

کے بارے میں دانائی رکھتے ہیں، دانشِ دین ان کے پاس ہے لیکن دین دار وہ ہوتے ہیں کہ جن کے اندر دین اترا ہوا ہوتا ہے، دین جن کے وجود کا حصہ بنا ہوتا ہے، یہ دین دار ہوتے ہیں، دین دانی کافی نہیں ہے بلکہ دین داری ضروری ہے، اسی طرح سے قرآن دانی کافی نہیں ہے بلکہ قرآن داری ضروری ہے، انسان قرآن دار ہو نہ کہ فقط قرآن دان ہو، یہ کس طرح سے بنتا ہے؟ اس طرح سے کہ قدم بہ قدم، لفظ بہ لفظ ایک ایک مرحلہ طے کرتے جاؤ اور اس کو اپنے وجود کے اندر منتقل کرتے جاؤ تا کہ انسانِ قرآنی بن جاؤ، قرآن اس طرح اپنے اندر لے کر آتا ہے نہ یہ کہ فقط علمی دروازے و دریچے کھولتا ہے کہ ایک آیہ سمجھ لی ہے اب دوسری آیہ سمجھتے ہیں پھر تیسری آیہ سمجھتے ہیں، نہیں بلکہ پہلی آیہ سمجھ لی تو اس کو اپنے وجود میں منتقل کرو، جب وجود میں منتقل کردیں اور آپ اپ گریڈ (Upgrade) ہو جائیں تو اب دوسرے مرحلے میں چلے جائیں گے۔

جیسے بچوں کے ڈیجیٹل گیمز (Digital games) میں ہوتا ہے کہ جو عموماً بڑے کھیلتے ہیں، بہانہ بچوں کے لئے ہوتا ہے لیکن زیادہ تر کھیلتے بڑے ہیں، ان گیمز کے اندر یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک مرحلہ یا ایک منزل ہوتی ہے اگر آپ اس کو کھیل لئے تو پھر اس سے آگے دوسرا مرحلہ یا دوسری اسٹیج (Stage) شروع ہو جاتی ہے، دوسرا مرحلہ خود ہی آٹومیٹکلی (Automatically) کھل جاتا ہے، اگر اس کو بھی آپ نے پورے طریقے سے کھیل لیا تو پھر تیسرا مرحلہ خود بخود آٹومیٹکلی کھل کر سامنے آتا ہے، اب آپ تیسرے میں آجائیں لیکن جو پہلا نہیں کھیل سکا وہ کبھی بھی دوسرے مرحلے میں نہیں جاسکتا ہے۔ آپ اسی سے سمجھ لیں کہ ترقی وارتقاء اس کو کہتے ہیں کہ قرآن میں انسان پہلی آیہ

سمجھ کے دوسری آیہ میں نہیں جا سکتا ہے، پہلے پہلی آیہ کو سمجھ کے اس کو وجود میں اتارنا ہے پھر دوسری آیہ کا آپشن (Option) خود ہی کھل جاتا ہے، جب دوسری کو اپنے دل میں اتارتا ہے تو پھر تیسری آیہ انسان پر اپنا دروازہ کھول دیتی ہے، یہ ہوتا ہے انسانِ قرآن دار نہ کہ انسانِ قرآن دان، یہ ایک مانع ہے کہ انسان قرآن کو فقط زبانی جمع خرچ کے ساتھ اس کا حساب بے باق کردے۔

٤) قرآن کا آلائی استعمال

ایک اور مانع جو فہمِ قرآن میں رکاوٹ ہے البتہ یہ ایک طرح سے قرآن کے ساتھ جفا بھی ہے وہ قرآن سے ابزاری فائدہ اٹھانا ہے یعنی انسان اس دید سے قرآن کی طرف جائے کہ قرآن کو بعنوانِ آلہ استعمال کرے۔قرآن نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور روایات میں بھی معصومین علیہم السلام نے منع کیا ہے کہ قرآن کو آلہ کے طور پر استعمال نہ کرو بلکہ ایک منبعِ ہدایت کے طور پر استعمال کرو۔بعض لوگ قرآن سے ہدایت نہیں لیتے ہیں بلکہ فقط ایک ذریعہ، ایک وسیلہ اور ایک ابزار کے طور پر قرآن کو استعمال کرتے ہیں، اردو میں اس کیلئے لفظِ اوزار استعمال کرتے ہیں، ابزار فارسی میں ہے، اصل ابزار ہی ہے لیکن اردو تلفظ میں اس کو اوزار کہتے ہیں، اوزار یعنی آلات، ایک آلہ کے طور پر قرآن کو استعمال کرنا۔

آلات بہت سارے ہیں مثلاً کھانے کے آلات ہیں، پکانے کے آلات ہیں، اُٹھانے کے آلات، رکھنے کے آلات ہیں، ایسی بہت ساری چیزیں ہماری زندگی میں ہیں، صرف صنعتی دنیا کی

وجہ سے یہ آلات کی دنیا زیادہ ہوگئی ہے، آلات اس وقت کثرت سے ہیں اور اتنے ہیں کہ ان کے اندر صاحبِ آلات گم ہیں، آلات کا ڈھیر لگا ہوتا ہے، ہمارا گھر آلات سے بھرا ہوتا ہے، چمچے، کانٹے، چھری، پلیٹیں یہ سارے آلات ہیں، کچھ پکانے کے، کچھ کھانے کے اور کچھ مہمانوں کے آلات ہیں حتیٰ انسان اسیرِ آلات ہے، ہر چیز کو بعنوانِ آلہ استعمال کر کے دیکھتا ہے۔

قرآن کا آلاتی استعمال

بعض لوگ دین کو بھی آلے ہی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، خصوصاً پاکستان میں یہ دین فقط ایک آلہ ہے، حکومتیں آ کر دین کو فقط ایک آلے کے طور پر اور اپنے اقتدار کے ذریعے کے طور پر استعمال کرتی ہیں، حتیٰ بہت ساروں کے ہاتھوں میں دین فقط ایک آلہ ہے، آلہ یعنی وہ ذریعہ کہ جس کی مدد سے انسان کوئی کام کرتا ہے جیسے قلم ہے، قلم کو آلہ کہتے ہیں، کیوں کہتے ہیں؟ چونکہ اس کی مدد سے ہم لکھتے ہیں، اصل مقصود لکھائی ہوتا ہے، قلم مقصود نہیں ہے، قلم کے ذریعے سے لکھتے ہیں اس لئے قلم آلہ کہلاتا ہے، کام میں نے کیا ہے اور کام خود لکھائی ہے لیکن قلم کی مدد سے کیا ہے اس وجہ سے قلم کی حیثیت فقط آلے جیسی ہے، آلے کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، اصلی پوزیشن (Position) اس کو کبھی بھی نہیں دیتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہیں گے کہ آلہ وہ چیز ہوتی ہے کہ جسے انسان کسی کام کے کرنے کے لئے ایک ذریعے کے طور پر اختیار کرتا ہے لیکن وہ مقصد نہیں ہوتا ہے، مقصد انسان خود ہوتا ہے یا وہ کہ جس کے حصول کے لئے انسان فعل انجام دیتا ہے۔ انسان کے پاس آلاتِ عمل و آلاتِ کار فراواں ہیں اور جوں ہی کام ختم ہوتا ہے تو انسان ان آلات کو ترک کر دیتا ہے، جس طرح سے قلم سے جوں ہی

لکھائی کا کام ختم ہوتا ہے تو انسان اس آلے کو ترک کر دیتا ہے۔

لوگ دین کو بھی آلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں مثلاً اپنی شخصیت بنانے کے لئے، اپنی شہرت کے لئے، اپنا کاروبار چمکانے کے لئے، بعض ایسے ہیں یعنی سیٹھ بہت زیادہ دین دار بن کر آتے ہیں کیونکہ اس سے ان کا ایک دینی چہرہ بنتا ہے اوران پر اعتماد کر کے گاہک زیادہ آتے ہیں کہ یہ دینی آدمی ہے لہٰذا یہ گھپلا نہیں کرے گا اور جتنا گھپلا یہ کرتا ہے اتنا کوئی دوسرا نہیں کرتا ہے۔

دین کو تجارت کا آلہ بنانا، شہرت کا آلہ بنانا، معیشت کا آلہ بنانا، یہ سب دین سے ابزاری فائدہ اُٹھانا ہے، دین آلہ نہیں ہے، ابزار مقاصدِ انسان نہیں ہے بلکہ دین منشورِ حیات ہے، اسی طرح سے قرآن سے آلہ کے طور پر استفادہ نہ کریں، قرآن سے ابزاری فائدہ کیا ہے؟ فرض کریں کہ ایک شخص مقالہ لکھتا ہے اور مقالے کو وزنی بنانے کے لئے چند آیات بھی اس کے اندر ڈالنی ہیں لہٰذا معجم کھولتا ہے اور مناسب آیات اس میں سے اٹھا کر ڈال دیتا ہے تاکہ کسی طرح سے مقالہ وزنی بنے، یہاں قرآن آلے کے طور پر استعمال ہوا ہے، مقالہ نویسی کے لئے مقالہ اعلیٰ ہونا چاہئے۔ مقاصدِ قرآن کھولنے کے لئے مقالہ آلہ ہونا چاہئے نہ کہ مقالے کو وزنی بنانے کے لئے قرآن آلہ ہونا چاہئے۔

حضرتِ جبرئیل علیہ السلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آلہٴ نزولِ قرآن نہیں ہیں، اگرچہ جبرئیل علیہ السلام قرآن لے کر آئے ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ نورانی پر نازل ہوا ہے لیکن ان کی حیثیت آلے جیسی نہیں ہے۔ جو چیز بھی بطورِ آلہ استعمال ہوتی ہے وہ فاعل کے ہاتھ میں فقط ایک ذریعہ ہے

قرآن کا آلاتی استعمال

لیکن اس عمل میں آلے کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس عمل سے آلے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہوتا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واسطۂ وحی ہیں نہ کہ آلہ در وحی، واسطے سے مراد یہ ہے کہ اس وحی کے نزول میں دونوں کی تاثیر ہے، جس طرح سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تاثیر ہے اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی تاثیر ہے اور ساتھ تاثر بھی ہے یعنی جس طرح سے قرآن دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی یہ وحی اثر انداز ہے درحالیکہ آپ قلم کی مدد سے جو کچھ لکھیں، جتنے علمی مطالب لکھیں تو خود قلم کا ان علمی مطالب میں کوئی دخل نہیں ہوتا، نہ یہ علمی مطالب اس قلم پر اثر انداز ہوتے ہیں، نہ قلم کی کوئی تاثیر ان مطالب کے اوپر ہوتی ہے اور نہ ہی ان سے قلم کوئی فائدہ اٹھاتا ہے، فاعل ہوتا ہے اور فعل ہوتا ہے درحالیکہ واسطہ ایسا نہیں ہوتا ہے، واسطہ اس عمل کے اوپر تاثیر بھی ڈالتا ہے اور اس عمل سے متاثر بھی ہوتا ہے لہٰذا واسطے فیضِ خدا ہیں۔

قرآن کا آلاتی استعمال

قرآن بھی ہدایت کا ذریعہ ہے لیکن اسے آلہ کے طور پر استعمال نہ کریں، انسان قرآن کو اپنے مقاصدِ دنیوی وغیر دنیوی کے لئے آلہ وابزار کے طور پر استعمال نہ کرے، ممکن ہے کہ یہ مقصد علمی مقصد ہو اور قرآن آلے کی حیثیت رکھتا ہو، ایک اوزار یا ابزار کی حیثیت رکھتا ہو مثلاً ایک تقریر کرنی ہے تو اس تقریر کو وزنی بنانے کے لئے، مؤثر بنانے کے لئے یا یہ کہ اس مقابلے کو جیتنے کے لئے انسان قرآن کو بطورِ آلہ استعمال کرے۔

اس طرح سے جب قرآن کو یا آیاتِ قرآنی کو استعمال کیا جاتا ہیں تو ان آیاتِ قرآنی سے انسان نہ متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی آیاتِ قرآنی کی حقیقت و مفہوم کو درک کرتا ہے، استفادۂ ابزاری از

دین، استفادۂ ابزاری از دینی شخصیات، استفادۂ ابزاری از دینی منابع کثرت سے ہے اور اسی وجہ سے درعینِ حال انسان کا دین سے اور دینی منابع سے سروکار ہے لیکن متاثر نہیں ہوتا ہے اور ان پر عمل نہیں کرتا ہے یا ان سے ہماری زندگیوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم دینی منابع کو بعنوانِ آلہ استعمال کر رہے ہوتے ہیں، اپنی شخصیت بنانے کے لئے یا ڈگری اور مدرک کے لئے قرآن کو فقط ایک آلہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

قرآن کا آلاتی استعمال

بعض لوگ قرآن کو کسی مدرسے تک رسائی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں یہ بھی استفادۂ ابزاری از قرآن ہے مثلاً قرآن حفظ کریں کہ اقامہ مل جائے، قرآن حفظ کریں کہ انسان کو ویزہ ملا جائے یا قرآن حفظ کریں کہ ہمیں شہرت مل جائے، ملازمت مل جائے، کم عمری میں حفظِ قرآن کا کوئی ریکارڈ (Record) ٹوٹ جائے، قرآن پڑھنے سے انسان کو پروموشن (Promotion) مل جائے اور دنیوی لحاظ سے کوئی پوسٹ (Post) مل جائے، یہ سب قرآن سے استفادۂ ابزاری اور اوزاری ہے، اسی طرح سے اگر ساری دنیا بھی قرآن کی طرف آجائے تو قرآن سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا جیسے کہ نہیں پڑتا ہے۔ قرآن کا آلائی، ابزاری و اوزاری استعمال وسیع ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اہلِ مذہب ہی کر سکتے ہیں، جو بے دین ہیں یا غیر مذہبی لوگ ہیں وہ تو اس سے ابزاری فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں، زیادہ تر دینی مذہبی لوگ یہ کام کرتے ہیں۔

کم و بیش ہر طبقے نے یہ استفادہ کیا ہے اور قرآن کے علاوہ اہلبیتؑ سے بھی استفادۂ ابزاری کرتے ہیں بلکہ اہلبیتؑ سے اوزاری استفادہ زیادہ لیتے ہیں، ولایت ولایت کرنا، علیؑ علیؑ

کرنا، اہلبیت علیہم السلام کا دم بھرنا، ایامِ فاطمیہ علیہا السلام برگزار کرنا، ایامِ فاطمیہ علیہا السلام کو بعنوانِ ابزار استعمال کرنا، کس لئے؟ تاکہ لوگ آئیں اور ہمارا گھر رجوع کا ایک منبع بن جائے، اہلبیت علیہم السلام سے معاذ اللہ ایک آلے کے طور پر استفادہ نہ کریں مثلاً اپنی شخصیت بنانے کے لئے، لوگوں سے پی آر (Personal Relation) بنانے کیلئے، مال کمانے کیلئے یا کسی اور وجہ سے۔

مذاہب اور ادیان میں حتیٰ علمی میدان میں بھی قرآن سے استفادۂ ابزاری زیادہ ہوا ہے۔ کلامی نظریات کہ جس میں لوگ خارج از قرآن جبر کے قائل ہوئے ہیں یا تفویض کے قائل ہوئے ہیں کہ آیا انسان اپنے فعل میں مختار ہے یا آزاد؟ بالآخر جدھر رجحان گیا، جیسی تعلیم و تربیت ہوئی، جس مکتب و مسلک سے انسان منسلک و متاثر رہا یا تقلیداً انسان نے جس چیز کو اپنا لیا تو اب بعد میں ان لوگوں نے قرآن سے آیات ڈھونڈ کر اپنے مسلک کو ثابت کرنا ہے، یہ بھی استفادۂ ابزاری از قرآن ہے۔ انسان قرآن سے ہدایت نہیں لے رہا ہے یا مثلاً قرآن کی قسم کھانا ہے، منع بھی کیا گیا ہے کہ قرآن کی قسم نہ کھائیں لیکن پھر بھی عموماً لوگ قرآن کو قسم کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ابزار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ذریعۂ قسم بناتے ہیں۔ سامان مہنگا بیچنے کے لئے یا سستا خریدنے کے لئے عموماً دکاندار حضرات قرآن کی قسم فوراً کھالیتے ہیں۔

ایک اور استفادہ جو قرآن سے فراواں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جیسے وہابیت نے خارج از قرآن بیٹھ کر دین کے بارے میں، توحید کے بارے اپنا ایک نظریہ بنالیا ہے اور پھر قرآن سے استفادہ ابزاری کرتے ہیں، وہ بعض آیات کو لے کر کہتے ہیں کہ یہ وہابیت کی تائید کر رہی ہیں یا پھر

انسان غلو کا قائل ہو جاتا ہے اور پھر قرآن پڑھتے ہوئے اس کو بعض آیات اپنی معین و مددگار نظر آتی ہیں چونکہ اس کا رجحان اسی طرف ہے اس وجہ سے یہ آیات اس کو اپنی حامی و معین نظر آتی ہیں لہٰذا یہ بھی استفادۂ ابزاری کرتا ہے، اسی طرح سے قرآن کو نیزوں پہ اٹھایا گیا تو یہ بھی استفادۂ ابزاری از قرآن ہے۔ جنگِ صفین میں اوزار کے طور پر، آلہ کے طور پر قرآن کو نیزوں پہ اٹھا کر ایک بہت بڑا فتنہ ایجاد کیا گیا کہ جس کے نتیجے میں امیر المومنین علیہ السلام کی سپاہ میں سے ایک بڑی اکثریت اس کے فریب میں اور دام میں آ گئی حالانکہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دھوکہ ہے، یہ قرآن کو فقط ایک ابزار و اوزار کے طور پر استعمال کرنا ہے، آپ اس دھوکے میں نہ آئیں، قرآن اس لئے نہیں آیا تھا کہ جس مقصد کے لئے یہ لوگ استعمال کر رہے ہیں، یا مثلاً انہوں نے قرآن سے ہی ایک آیت لے لی کہ

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ......(۱۹)

حکم صرف اللہ کے اختیار میں ہے......

اور خوارج نے امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت کی نفی کی، یہ قرآن سے استفادۂ اوزاری ہے، ایک آلے کے طور پر قرآن سے استفادہ کیا گیا، قرآن منبعِ ہدایت ہے نہ کہ اپنے مقاصد تک پہنچنے اور اپنے من گھڑت اعمال انجام دینے کا اوزار یا اپنی شخصیت بنانے کا آلہ۔ قرآن کا اس طرح کا استعمال اگر گھر گھر بھی فراواں شروع ہو جائے تو بھی قرآن سے ہماری زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن فراوانی انہی کاموں کی نظر آتی ہے کہ قرآن کو آلہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے مثلاً جیسے پہلے بھی

اشارہ ہوا تھا کہ تعویزوں کے لئے قرآن کا استعمال کرنا، قرآنی آیات کی خوبصورت خطاطی کرنا کہ یہ آپ بیچیں یا قرآن کی سی ڈیز بنانا اور اس سے اپنا کاروبار بنانا یا چمکانا، یہ سب قرآن سے استفادۂ اوزاری ہے۔

اس زمانے میں لوگ کثرت سے قرآن سے مانوس ہیں، اس وقت قرآن کی طرف جتنی توجہ ہے شاید ہی کسی زمانے میں اتنی توجہ ہو، قرآن کی طرف اس وقت اہلِ قرآن یعنی مسلمانوں کی توجہ بھی زیادہ ہے، غیر مسلموں کی بھی اور دشمنانِ قرآن کی توجہ بھی قرآن کی طرف سب سے زیادہ ہے، اگر کوئی تندی کر رہا ہے تو بھی قرآن کو فقط آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے، اگر کوئی خاموش اور ساکت ہے تو بھی قرآن کو آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے یعنی قرآن کے ذریعے سے اپنے اعمال کی توجیہ کرتا ہے کہ جس طرح مغیرہ کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام نے عمارؓ سے کہا تھا کہ اس کو چھوڑ دو، اس شخص نے اس لئے دین پڑھا ہے، اس لئے علمِ قرآن و تفسیر حاصل کیا ہے تاکہ اپنے اعمال کی توجیح کر سکے یعنی یہ قرآن سے بعنوانِ آلہ وابزار اپنے غلط کاموں کو صحیح قرار دینے کے لئے استفادہ کرتا ہے، یہ بڑا پرخطر مانعِ فہم ہے کہ انسان قرآن کی طرف آتا بھی ہے لیکن محروم رہ جاتا ہے، عمر بھر قرآن کے ساتھ بسر ہوتی ہے لیکن درعین حال قرآن سے استفادہ نہیں کر پاتا۔

۵) کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

ایک بڑا مانع کہ جس میں مسلمان اور مومنین زیادہ مبتلا ہیں وہ قرآن کا متبادل قرار دینا ہے

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

یعنی کسی بھی چیز کو متبادلِ قرآن قرار دے دینا اور متبادل کے طور پر استعمال کرنا، قرآن کا کوئی متبادل نہیں ہے، یہ طے کرلیں کہ قرآن کی طرف اسی لئے رغبت نہیں ہیں کیونکہ انسان کے نزدیک متبادل موجود ہے، ہمیشہ جس چیز کا بھی متبادل موجود ہو وہ چیز اتنی موردِ رجوع نہیں ہوتی ہے۔

بازار میں دوائیں ملتی ہیں لیکن بہت ساری دوائیں ایسی ہیں کہ جن کا کوئی متبادل نہیں ہے، ان کی طرف سب آتے ہیں اور ان کی ڈیمانڈ (Demand) سب سے زیادہ ہوتی ہے کہ جن کا کوئی متبادل نہیں ہے لیکن بعض ایسی دوائیں ہیں کہ جن کا متبادل موجود ہے کہ یہ نہیں ملی تو ہم دوسری لے لیں گے، ایسے راستے بھی ہیں کہ جن کا متبادل راستہ کوئی بھی نہیں ہے، ایسی سڑک شہر کے اندر یا ملک کے اندر موجود ہوسکتی ہے کہ جس کا کوئی متبادل نہ ہو تو اس پر بڑا رش ہوتا ہے لیکن جن سڑکوں کا متبادل موجود ہو، دوسرے فرعی راستے موجود ہوں تو وہاں اتنا رش نہیں ہوتا ہے چونکہ وہاں دوسرے راستوں سے بھی لوگ آجاسکتے ہیں۔

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دے دینا

جن لوگوں نے قرآن کا متبادل بنالیا ہے یا گھڑ لیا ہے وہاں قرآن کم رنگ ہے چونکہ متبادل موجود ہے لیکن جہاں قرآن کا متبادل نہیں ہے وہاں قرآن کے اوپر زیادہ رش اور رجوع ہے، ممکن ہے کہ یہ متبادل مختلف طریقوں سے متبادل بنایا ہے، بعض نے کہا کہ عقل قرآن کی متبادل ہے، جس طرح سے بعض نے ختمِ نبوت کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ عقلِ بشری اب کامل ہوگئی ہے یعنی عقل کو دین کا متبادل راستہ اور قرآن و نبوت کا متبادل قرار دیا ہے، کسی نے عقل کو دین کا متبادل لے لیا ہے اور کسی نے سائنس و ٹیکنالوجی اور علم کو کہا کہ چونکہ قرآن اس وقت ضروری تھا جب بشر نے اتنی ترقی نہیں کی

تھی، اتنی علمی پیش رفت نہیں ہوئی تھی، بہت ساری چیزوں کے اسرار معلوم نہیں تھے اور طبیعت میں انسان نے اتنا غور وخوض نہیں کیا تھا لہٰذا اس وقت تک انسان کو قرآن اور دین کی ضرورت تھی لیکن اب جب کہ علم آگیا ہے، سائنس آگئی ہے، ترقی ہوگئی ہے لہٰذا ٹیکنالوجی بہترین متبادل قرآن ہے۔

بعض کے نزدیک ٹیکنالوجی نعم البدلِ قرآن ہے، اسی لئے بعض سیکیولر (Secular) ذہنیت کے لوگ اسی نظریے کے قائل ہیں کہ ٹھیک ہے قرآن کتابِ خدا ہے لیکن اس معاشرے کے لئے ہے کہ جس میں علم وترقی وسائنس وٹیکنالوجی نہ ہوں، اب جبکہ ساری چیزیں میسر ومہیا ہیں تو پھر کیوں قرآن کی طرف اصرار کرتے ہیں؟ یہ تو سیکیولر طبقہ کی بات تھی لیکن بعض دینداروں نے دین ہی میں سے کوئی چیز اٹھا کر اس کو متبادلِ قرآن قرار دیا ہے، از جملہ بعض کے نزدیک فلسفہ متبادلِ قرآن ہے، دیگر علوم متبادلِ قرآن ہیں۔

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

بعض کے نزدیک اہلبیت علیہم السلام متبادلِ قرآن ہیں اسلئے قرآن کی طرف رجوع کم ہے اور اس میں شیعہ زیادہ مبتلا ہیں کہ اہلبیتؑ کو قرآن کے متبادل راستے کے طور پر اپنایا ہوا ہے، غلط تعارف ہوا ہے قرآن کا بھی اور اہلبیت علیہم السلام کا بھی، جیسے پہلے اشارہ ہوا کہ ایک مانع یہ ہے کہ ہمیں کسی چیز کی شناختِ درست نہ ہو یعنی قرآن کی درست شناخت نہ ہو یا اہلبیت علیہم السلام کی درست شناخت نہ ہو تو یہ انہی تک پہنچنے کے لئے بہت بڑا مانع ہے، اہلبیت علیہم السلام اور قرآن کا صحیح تعارف نہیں ہوا ہے، جس طرح سے آغازِ اسلام میں یہ انحراف پیدا ہوا، آغازِ اسلام میں ہی بعض لوگوں نے جب یہ نعرہ لگایا کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ...... (۲۰) ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے...... اسی وقت سے یہ انحراف پیدا ہوا یعنی

انہوں نے قرآن کو اہلبیت علیہم السلام کا متبادل سمجھا، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متبادل سمجھا اور کہا کہ ہمارے لئے یہ متبادل کافی ہے، جب یہ ہمارے پاس ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے طبقے نے آکر وہی کام کیا لیکن متقابلِ دوم نے متبادل دوم کو لے کر کہا کہ ہمارے لئے اہلبیت علیہم السلام کافی ہیں قرآن ضروری نہیں ہے، دونوں انحراف ہیں کہ قرآن بدلِ اہلبیت علیہم السلام ہے اور اہلبیت علیہم السلام بدلِ قرآن ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو متبادل راستے پیش نہیں کئے ہیں بلکہ دو ہم آہنگ راستے پیش کیے ہیں یعنی دو منابع پیش کئے ہیں کہ جن کے اندر کمالِ ہم آہنگی اور ساتھ ہے، دونوں کے اندر معیت ہے نہ کہ یہ متبادل ہیں۔

اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَینِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِترَتِی أَهلَبَیتِی...... (۲۱)

بے شک میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میرے اہلبیت علیہم السلام ......

عترت، سنت یا اہلبیت علیہم السلام جو بھی تعبیر ہو چکی ہے، اہل سنت کے ہاں اس طرح کی روایت نقل کی گئی ہے کہ کتاب اللہ و سنتی، سنتی ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، بے شک قرآن اور سنت کو مان لیں یا قرآن اور اہلبیت علیہم السلام کو مان لیں لیکن نہ سنت متبادلِ قرآن ہے اور نہ ہی قرآن متبادلِ سنت ہے بلکہ دونوں ہم آہنگ ہیں، قرآن اور اہلبیت علیہم السلام دونوں ایک ساتھ ہیں، پھر اس کے بعد فرمایا کہ دونوں کا ساتھ نہ ٹوٹنے والا ساتھ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تاکید کے ساتھ بیان فرمایا کہ

وَاِنَّهُمَا لَن یَّفتَرِقَا......

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے......

یہ اصلاً ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے ہیں خواہ متبادل قرار دے کر ایک کو لے لیں اور ایک کو چھوڑ دیں یعنی اہلبیت علیہم السلام کو لے کر قرآن چھوڑ دیں یا قرآن کو لے کر اہلبیت علیہم السلام کو چھوڑ دیں تو بھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے ہیں، یہ عِدل ہیں، عِدل یعنی ہم پلہ نہ کہ متبادل، یہ غلط تصورِ قرآن و اہلبیت علیہم السلام ہے کہ یہ ایک دوسرے کے متبادل ہیں، وہ قرآن کے پیچھے چلتے ہیں اور ہم فلاں کے پیچھے چلتے ہیں، اگر جنت جانے کے لئے اہلبیت علیہم السلام کو انتخاب کیا تو بدونِ قرآن ممکن نہیں ہے اور اگر بہشت کے لئے قرآن کا انتخاب کیا تو بدونِ اہلبیت علیہم السلام ممکن نہیں ہے، دونوں ایک ساتھ ہیں لہٰذا کوئی چیز متبادلِ قرآن نہیں ہے اور قرآن کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ ممکن نہیں ہے، اصل میں خدا نے ایسا راستہ بنایا ہی نہیں ہے، ممکن ہے کہ کوئی حدیث کو متبادل راستہ بنا لے مثلاً اہلِ حدیث یا اخباری، شیعوں کے اندر ایک گروہ بنامِ اخباری ہے کہ یہ لوگ ابھی دوبارہ زندہ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مشکل ہے چونکہ پہلے جنہوں نے یہ مکتب شروع کیا تھا باسواد لوگ تھے، پڑھے لکھے تھے لیکن ابھی جو کوشش کر رہے ہیں وہ بے سواد اور ان پڑھ لوگ ہیں جو اخباریت کے احیاء میں مشغول ہیں، پہلے اخباری پڑھے لکھے ہوتے تھے، دانا تھے لیکن یہ ان پڑھ اخباری ہیں کہ جن کو صحیح لکھنا بھی نہیں آتا ہے کہ اخباری کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ کس سے مشتق ہے؟ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ حدیث متبادلِ قرآن ہے، یہ قرآن کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔

اہل سنت میں ایک گروہ بنامِ اہلِ حدیث ہے وہ بھی ایسے ہی ہے، جو کچھ حدیث میں ہے

کسی چیز کو قرآن کا متبادل قرار دینا

وہ ان کے لئے حجت ہے، قرآن کا متبادل انہوں نے حدیث کو ڈھونڈ لیا ہے۔کوئی بھی چیز متبادلِ قرآن نہیں ہے، نہ مفاتیح متبادلِ قرآن ہے، نہ فقہ متبادلِ قرآن ہے، نہ حدیث متبادلِ قرآن ہے اور نہ اہلبیت علیہم السلام متبادلِ قرآن ہیں، یہ سب کے سب تابعِ قرآن ہیں اور قرآن سے متخذ ہیں، قرآن سے لئے گئے ہیں اور قرآن کی وجہ سے حجت ہیں مثلاً اگر قرآن نہ ہوتو حدیث کی حجیت نہیں رہ جاتی ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام نے ہمارے لئے حدیث پرکھنے کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ اس کو قرآن پر پیش کرو اگر مطابق بہ قرآن ہے تو درست ہے اور اگر مطابق بہ قرآن نہیں ہے تو درست نہیں ہے، تعبیریں ہیں کہ اگر مخالفِ قرآن ہے تو اس کو دیوار پہ دے مارو، نہ کہ حدیث کو لے لو اور قرآن کو چھوڑ دو۔قرآن پر عمل کرنا ہے، اگر حدیث کی سند بہترین سند ہو لیکن خلافِ قرآن ہو تو وہ حدیث حجیت نہیں رکھتی ہے، وہ من گھڑت حدیث ہے۔ائمہ معصومین علیہم السلام نے خود فرمایا کہ جو مخالفِ قرآن ہے اس کو جال کر کے، گھڑ کے ہمارے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے، ہمارے ساتھ اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے چونکہ ہم کبھی بھی خلافِ قرآن اظہارِ بیان نہیں کرتے ہیں۔

جلد بازی

٦) جَلد بازی

فہمِ قرآن میں مانعِ دیگر عجلت اور جلد بازی ہے کہ انسان جلدی جلدی میں، ایک رات میں سارا قرآن سمجھنے کی کوشش کرے، جس طرح سے قرأتِ قرآن میں جلد بازی ہوتی ہے، جیسے تراویح میں پڑھتے ہیں، معلوم نہیں ہوتا ہے کہ وہ کیا پڑھتے ہیں؟ کسی کو پتہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ عربی پڑھ رہے

ہیں یا غیر عربی پڑھ رہے ہیں، اتفاقاً یہ وہ طبقہ ہے کہ جو ایک طرف سے کہتا ہے کہ اگر ایک مخرج یا ایک تلفظ غلط ہو گیا یا جا بجا ہو گیا تو اس صورت میں جہنم چلے جائیں گے لیکن دوسری طرف سے خود اسی طرح سے قرآن پڑھتا ہے، یہ خود کدھر جائیں گے جو سات منٹ میں سپارہ پڑھتے ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک ہفتے یعنی سات دنوں سے کمتر قرآن ختم کرنا جائز نہیں ہے، ایک شخص نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ جلدی کر سکتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے زیادہ نہیں، پہلے فرمایا تین ماہ میں پھر فرمایا ایک ماہ میں ختمِ قرآن کریں چونکہ آپ نے سمجھنا ہے، آپ جلد بازی اور عُجلت نہ کریں۔

جلد بازی

قرآن میں بعض جگہیں رکنے کی، وقف و توقف کی اور ٹھہرنے کی ہوتی ہیں، ترتیل کا یہی معنیٰ کیا گیا ہے، یہ روایت امیر المومنین علیہ السلام سے ہے، پوچھا گیا کہ ترتیل سے کیا مراد ہے تو حضرتؑ نے یہی فرمایا کہ جس آیہ پر جاتے ہو اس آیت پر رک جاؤ، غور کرو، فکر کرو، تدبر کرو یہ ترتیل ہے۔ ابھی ترتیل ایک فن بن گیا ہے کہ اگر لمبی سر کے ساتھ پڑھے تو وہ قرأت ہے اور چھوٹی سر کے ساتھ پڑھے تو ترتیل کہلاتی ہے۔ حالانکہ ترتیل کا مطلب غور کر کر کے، فکر کر کر کے پڑھنا، کسی آیت سے ایسے ہی نہ گزر جاؤ، آیاتِ قرآن کو جلدی کے ساتھ عبور نہ کرو، جس طرح سے قواعدِ تجوید میں ہے کہ وقف ہیں، یہاں پر سانس توڑنی ہے، یہاں پر سانس نہیں توڑنی ہے، یہاں پر وقف کرنا ہے، یہاں پر وقف جائز و لازم و ممنوعہ ہے، اسی طرح سے معانئ قرآن کے لئے بھی وقفِ لازم ہیں، ایک قرآن ایسا تدوین ہو کہ جس میں یہ غور و فکر کرنے کے وقوف درج ہوں۔

ابھی قرآن کا استخارہ ایڈیشن (Edition) بھی نکلا ہے کہ جس کے اوپر خوب و بد لکھا ہوا ہے، دکانوں پر ملتا بھی ہے، جس کے اوپر لکھا ہوا ہے استخارہ ایڈیشن۔ آج کل قرآن کے مختلف ایڈیشن ہیں مثلاً ایک جہیز ایڈیشن ہے کہ جس کی جلد گولڈن ہے اور بہت مہنگا ہے جو دلہن کو دیتے ہیں، جسے ہاتھ نہیں لگانا ہوتا ہے صرف جہیز میں رکھتے ہیں اور اس کا عنوان ہی جہیز ایڈیشن ہے، اسی طرح سے استخارہ ایڈیشن ہے، اس کو پڑھنا نہیں ہے، اس کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ یہ صفحہ خوب ہے اور یہ صفحہ بد ہے۔ کاش ایک ایڈیشن ایسا چھپے کہ اس میں غور و فکر کرنے کے آداب لکھے گئے ہوں، ہر صفحے میں غور و فکر و تدبر کے آداب لکھے ہوئے ہوں، مثلاً آدابِ فہم قرآن ایڈیشن۔ کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ ختمِ قرآن کتنے دنوں میں کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ چھ مہینوں سے ایک آیہ میں مشغول ہوں، اور حقیقت ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر ایک انسان کی روح قرآن سے مانوس ہو جائے، حقیقتِ قرآن سے انسیت پیدا کر لے تو شاید انسان کو ایک آیت ہی آگے نہ بڑھنے دے، قرآن کے اندر اتنا عمق اور اتنی گہرائی ہے۔

لکیر کا فقیر ہونا

۷) لکیر کا فقیر ہونا

ان موانع فہمِ قرآن میں سے ایک لکیر کا فقیر ہونا ہے، لکیر کا فقیر ہونا اصطلاح ہے، لکیر کے فقیر سے کیا مراد اندھی تقلید ہوتی ہے، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کہیں کہ مثلاً یہ کپ اُٹھالیں تو کپ اٹھا لیتے ہیں اور پرچ نہیں اٹھاتے ہیں، ایسے لوگ متعدد ہیں کہ جو ایسے اطاعت گزار

ہیں، یہ پرچ کیوں نہیں اٹھاتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ آپ نے تو نہیں کہا تھا کہ پرچ اُٹھاؤ بلکہ آپ نے کپ اٹھانے کا کہا تھا، انسان اتنا لکیر کا فقیر نہیں ہونا چاہئے، چونکہ ہر فرمان کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں، ہر تکلم اور گفتگو کے بھی لوازمات ہوتے ہیں، بسا اوقات محاورہ یا کنایہ استعمال کیا جاتا ہے، کنایہ و محاورہ نہ ہو اور صراحت سے بھی اگر ایک بات کی جائے تو اس سے بھی انسان بہت کچھ سمجھ لیتا ہے، اگر انہیں کہہ لیں کہ دروازہ بند کر دو تو وہ کھڑکی بند نہیں کرتے ہیں چونکہ فقط دروازہ کہا تھا یا مثلاً انہیں کہیں کہ تھوڑی سی اِدھر جگہ بنا دو تو وہ تھوڑی سی جگہ بناتے ہیں کہ وہ بیٹھنے کے بھی قابل نہیں ہوتی۔ عموماً کنایہ ہوتا ہے کہ مثلاً تھوڑا سا پانی دینا تو وہ آپ کے لئے تھوڑا سا پانی رسد کرتا ہے، وہ آپ کو اس گلاس کی تہہ میں تھوڑی سی رطوبت ڈال کے دے گا، اگر انہیں کچھ کہیں تو کیا کہیں گے؟ آپ نے ہی کہا تھا کہ تھوڑا سا پانی دے دو، یعنی محاوراتی زبان کے لوازمات اور معانی کے لوازمات یہ نہیں سمجھتے ہیں، یہ سادہ لوحی، سادگی، نافہمی اور کج فہمی ہے، اس طرح سے لکیر کا فقیر نہیں بننا۔

لکیر کا فقیر ہونا

بعض لوگ عام زندگی میں بھی ایسے ہیں، ہی لکیر کے فقیر ہیں مثلاً حرم کی مثال لے لیں، حرم کے کئی دروازے ہیں، اگر انسان پہلی دفعہ کسی دروازے سے اندر آیا تھا یا حرم کے پہلے دروازے سے کسی دوست کے ساتھ اندر گیا تھا تو اب ساری عمر جتنا عرصہ وہ حوزے میں ہے اسی دروازے سے آتا جاتا ہے اسی کو کہتے ہیں کہ لکیر کا فقیر ہے، اس کے اندر یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی ہے کہ میں ایک دن کسی دوسرے دروازے سے بھی آؤں، وہاں سے بھی آ کر دیکھوں کہ وہاں کیا منظر ہے؟ وہاں سے کیا نظر آتا ہے؟ وہاں کیا اتفاق رونما ہوتا ہے؟ چونکہ پہلے دن اسی دروازے سے آیا ہوں

لہٰذا اسی دروازے سے جانا ہے، جس گلی سے مجھے دوست حرم لے کر گیا تھا اب میں ساری عمر اسی گلی سے آنا جانا کروں تو یہ لکیر کا فقیر ہونا ہے۔

یہ موانعِ فہمِ قرآن میں سے ہے کہ کسی نے ایک لکیر کھینچ دی تو چونکہ پہلے کسی نے یہ بات نہیں کی تو ہم بھی نہیں کرتے ہیں اور اکثر لوگوں کی یہ عادت بھی بنی ہوئی ہے، فرض کریں کہ ایک جوان طالب علم ایک مقالہ لکھتا ہے، ایک بیان نامہ لکھتا ہے، تھیس (Thesis) لکھتا ہے اور اس میں ایک نئی تحقیق پیش کرتا ہے، پھر وہ اسے اپنی اس جیوری (Jury) میں پیش کرتا ہے کہ جہاں داور بیٹھا ہوتا ہے اور وہ اس سے سب سے پہلا سوال کیا کرتے ہیں؟ اس کا حوالہ کہاں ہے؟ کیا ضروری ہے کہ ہر بات کا حوالہ ہو؟ اگر وہ کہے کہ اس کا حوالہ نہیں ہے بلکہ یہ مطلب میں نے خود سوچا ہے تو اس کو رد کر دیتے ہیں، آپ کو سوچنے کا حق ہی نہیں ہے، ہر چیز کا حوالہ ہونا چاہیے، چونکہ حوالہ مانگتے ہیں تو ایک بزرگوار نے تھیسز لکھا اور اس میں امامؒ کا یہ قول لکھا کہ

دین ما عین سیاستِ ما است و سیاست ما عین دین ما است۔

چونکہ نیچے حوالہ لکھنا ضروری تھا، ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حوالہ کہاں ہے تو انہوں نے نیچے فٹ نوٹ (Footnote) میں لکھا کہ جمہوری اسلامی کا دس کا نوٹ،، چونکہ اس پہ یہ جملہ لکھا ہوتا ہے کہ

دیانت ما عین سیاستِ ما است و سیاست ما عین دیانتِ ما است۔

لکیر کا فقیر ہونا

انہوں نے دس تومان کا نوٹ حوالے کے طور پر لکھا، ظاہر ہے کہ جب ہر چیز کا حوالہ مانگیں گے تو پھر ایسا ہی حوالہ نقل بھی کرنا پڑے گا۔ ان جوان طلبہ کو اجازت دیں، میدان دیں اور ان سے کہیں کہ اپنی بات کریں، سب سے زیادہ نمبر کس کے ہونے چاہئے؟ جو اپنی بات کرے، یہاں سب سے زیادہ نمبر کس کے ہیں؟ جو دوسروں کے چبائے ہوئے لقمے لا کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی خود سے غور وفکر کے ذریعے ایک نتیجے پر پہنچا ہے اور اس کا حوالہ نہیں ہے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ آپ کو سوچنے کا حق نہیں ہے، یہ مانعِ فہم ہے اور اس سے انسان ترقی نہیں کر سکتا ہے۔

۸) خود کو راھنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھنا

مانعِ دیگر کہ جس کو غرور وتکبر کا لازمہ بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ ایک مستقل چیز ہے یعنی بسا اوقات غرور تکبر کی وجہ سے یہ مانع پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی اور وجہ سے بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان قرآن فہمی میں اپنے آپ کو راہنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھے، کوئی یہ کہے کہ قرآن سمجھ میں آیا ہے لیکن میں کسی کا محتاج نہیں ہوں، نہ کسی کی کتاب کا، نہ کسی فن کا، نہ کسی ادب کا، نہ کسی قاعدے کا اور نہ ہی کسی ضابطے کا تو یہ اشتباہ ہے۔ قرآن فہمی کے لئے آمادگی کی ضرورت ہے، علمی آمادگی کی بھی ضرورت ہے، ذہنی آمادگی کی بھی ضرورت ہے، قلبی آمادگی کی بھی ضرورت ہے، ہر طرح کی آمادگی کی ضرورت ہے تاکہ انسان قرآن کو سمجھ سکے۔

آپ بچوں کو اتنا تیار کر کے، آمادہ کر کے، کتابیں بستے میں ڈال کر اسکول کیوں بھیجتے ہیں؟

چونکہ اسکول ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں پر آمادگی ہے یعنی مکانی آمادگی ہے، زمانی آمادگی ہے، انسانی آمادگی ہے، ماحول کی آمادگی ہے، اسی کو اسکول کہتے ہیں، وَ اِلَّا بچے کو آپ چوراہے پر بٹھا دیں اور ایک ٹیچر کو کہیں کہ اس کو یہاں کتاب پڑھا دے، چوراہا تعلیم کے لئے آمادگی کی جگہ نہیں ہے، جس طرح بعض پڑھا کو ہوتے ہیں کہ وہ گھر میں ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں اور بس اسٹاپ پہ کتاب لے کر پڑھ رہے ہوتے ہیں، اُدھر نمازِ جماعت کھڑی ہوتی ہے اور آواز آتی ہے کہ قد قامت الصلوٰۃ لیکن یہ کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے، اتنے پڑھا کو ہو تو آپ گھر میں کیوں نہیں پڑھتے ہو، اگر انسان بہت پڑھنے والا ہے تو گھر، مدرسے، اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں زیادہ سے زیادہ پڑھ سکتا ہے اور پھر اس کے بعد دوسرے کام بھی نمٹا سکتا ہے۔

مثلاً بس اسٹاپ پہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کتاب ہاتھ میں لئے کھڑے بھی ہیں اور دوسروں کی باتیں بھی سن رہے ہیں چونکہ کچھ لوگ اسٹاپ پہ کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، اگر کسی نے کوئی اشتباہ والی بات کی تو یہ انہیں وہیں پر ٹوک دیتا ہے کہ نہیں یہاں پر یہ بات آپ نے کی ہے بلکہ وہ ایسے ہیں، جناب آپ تو مطالعہ کر رہے تھے ہماری باتوں میں آپ کی توجہ کیسے ہے؟ یہ ریاکاری ہے لہٰذا یہ کام نہ کریں، کبھی بھی بس اسٹاپوں پہ، بسوں میں، رش میں، چوک میں اور بھیڑ میں مطالعے کی جگہ نہیں ہے، مطالعے کے لئے آسودہ ماحول کی ضرورت ہے، زمانی شرائط ہیں، مکانی شرائط ہیں، جسمانی شرائط ہیں، روحی شرائط ہیں، مطالعہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب یہ شرائط پوری ہوں، اگر انسان تھکا ہوا ہے، نیند آئی ہوئی ہے تو انسان ایک لفظ پڑھتا ہے تو پھر آنکھیں بند ہو جاتی ہیں لہٰذا پھر اٹھتا

خود کو راہنمائی اور تعلیم سے بے نیاز سمجھنا

ہے اور پھر پڑھنا شروع کر دیتا ہے، یہ ذہن تو سویا ہوا ہے، سویا ہوا ذہن کیا مطالعہ کرے گا؟ انسان کو تازہ ذہن چاہیے، آمادہ ذہن چاہیے۔ کھانا اتنا کھایا ہوا ہے کہ انسان بیٹھ نہیں سکتا ہے اور اس وقت کتاب کھول کر پڑھنا شروع کرے تو اس میں کچھ بھی سمجھ نہیں آتا ہے۔ مرحوم شہید اولؒ، شہیدِ ثانیؒ اور دیگر علماء نے مطالعے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ریا کاری ہے، اس طرح سے نہ کریں۔ اس طرح اسٹاپ پہ جب کسی آقا کو مطالعے میں غرق دیکھتے ہیں تو چند ایک جوان متاثر بھی ہو جاتے ہیں چونکہ ان کو خود نہیں پتہ ہے، وہ اَن پڑھ ہوتے ہیں اس لئے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک بزرگوار خاتون تھیں، وہ خود پڑھی ہوئی نہیں تھی، ان کا بچہ اسکول میں پڑھتا تھا اور اکثر کلاسوں میں فیل ہوتا تھا لیکن وہ خود اپنے بچے کی ذہانت کی بڑی قائل تھی، کہتی تھی کہ اس کو ساری کتابیں ازبر ہیں، وہ جب بھی اس بچے سے سبق سنتی تھیں تو وہ آکر امی کو قومی ترانہ سناتا تھا، اس کو فقط قومی ترانہ یاد تھا اور وہ سمجھتی تھیں کہ اس کو ساری کتاب ازبر ہے یعنی وہ کتاب کھولتا تھا اور قومی ترانہ سنا دیتا تھا۔ اس سے ایسے سادہ لوح لوگ ہی متاثر ہو سکتے ہیں لیکن کیا آپ خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں؟ یا اپنے آپ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں؟

خود کو راہنمائی اور تعلیم سے بے نیاز سمجھنا

قرآن سمجھنے کے لئے بھی شرائط چاہئیں، آمادگی روحی چاہیے، جیسے کہا گیا ہے کہ قرآن کے لئے عربی جاننا ضروری ہے، بعض کا اصرار ہے کہ عربی کے بغیر ترجموں سے قرآن سمجھ میں آ سکتا ہے، مترجم کو سمجھ میں آیا ہو تو آپ کو سمجھ میں آئے گا، آپ کی فہم مترجم پر موقوف ہے، مترجم تو واسطۂ وحی نہیں ہیں، جس طرح سے کہا کہ آپ ملازمت کے لئے انگریزی پڑھتے ہو اور بچوں پر اتنا پیسہ خرچ

کرتے ہو، بعض تو لاکھوں روپیہ بچوں کی انگریزی پہ خرچ کرتے ہیں درحالیکہ عربی سیکھتے ہوئے نہ صرف خرچہ نہیں ہوتا ہے بلکہ خرچہ ملتا بھی ہے لیکن پھر بھی عربی کی طرف نہیں آتے ہیں، یہ طاغوتی ذہنیت ہے، یہ جس کی بھی ذہنیت ہو اور وہ عربی کو پسماندگی کی علامت سمجھے تو یہ طاغوتی ذہنیت ہے، پوری دنیائے اسلام، امتِ مسلمہ واہلِ قرآن کے لئے عربی سیکھنے کا ماحول بن جانا چاہئے۔ آپ کو کوئی یہودی بغیر عبری زبان کے نظر نہیں آئے گا، اصلاً وہ یہودی نہیں ہے کہ جس کو عبری نہیں آتی ہے، سب یہودی عبری جانتے ہیں کیونکہ ان کا مطلب، ان کی کتاب عبری میں ہے، ان کا متن عبری میں ہے، ان کی مذہبی زبان عبری ہے۔

ابھی سب کہتے ہیں کہ قرآن انگلش میں ہو حتیٰ اردو بھی انگلش میں لکھتے ہیں یعنی رومن میں، جیسے ایک چیٹنگ (Chatting) کی زبان ہے تو وہ انگلش میں، اردو انگلش میں، عربی انگلش میں، دعائیں انگلش میں، مناجات انگلش میں، سارا کچھ انگلش میں ہو۔ آپ عربی سیکھو، کتنا وقت لگتا ہے عربی سیکھنے میں؟ بہت کند ذہن ہوئے تو بھی دو سال لگیں گے، بارہ سال، چودہ سال تم انگلش سیکھتے ہو تو دو سال عربی نہیں سیکھ سکتے ہو؟ اور اب تو اس کے لئے نیٹ (Net) کے ذریعے اہتمام بھی ہوسکتا ہے اور مواصلاتی ذریعے بھی بہت اچھے ہیں، یہ اہتمام گھر گھر میں ہوسکتا ہے۔ کم از کم آمادگی یہ ہونی چاہئے کہ قرآن عربی میں ہے اور ہمیں عربی معلوم ہونی چاہئے، ضرورت کی حد تک عربی سے ہمیں آشنائی ہونی چاہئے۔

قرآن معارف بتا رہا ہے اور ہدایت کی کتاب ہے لہٰذا ہدایت کے لئے انسان کو علمی لحاظ

سے مسلح ہونا چاہئے، اس کے لئے انسان بہت سارے علوم انسان سیکھے تا کہ آمادہ ہو نہ کہ ان علوم کے ذریعے سے تفسیر کرے، ان علوم کو قرآن پر ٹھونسے یا قرآن کو ان علوم پر زبردستی منطبق کرے۔ وہ علوم جو انسان کو آمادہ کرتے ہیں اور اس کی صلاحیت بڑھا دیتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ فلسفہ پڑھنے کے لئے ریاضی کی ضرورت ہے، ریاضی یعنی ریاضت جو ورزش کو کہتے ہیں، عربی زبان میں ریاضی علم کو نہیں کہتے ہیں، اس علم کا نام وہی جبر ہے، جس کو الجبرا کہتے ہیں، اس کا نام ہی جبر ہے، ریاضی اس کو اس وجہ سے کہتے ہیں چونکہ یہ اس پر مشق کراتی تھی، فلسفہ پڑھنے کے لئے یا کسی بھی علم میں جانے کے لئے علمِ ریاضی پڑھتے تھے چونکہ ریاضی ایک طرح کی ذہنی ورزش ہے یعنی علمِ ریاضی ذہن کو تیار کرتا ہے۔ ریاضی خود اعداد کا علم ہے، اس کے اندر جمع، تفریق ہے لیکن جو یہ کام کرلے اس کا ذہن بہت تیز ہو جاتا ہے لہٰذا اگر انسان نے ریاضی پڑھ کر ذہنی طور پر مشق کی ہوئی ہے اور پھر قرآن پڑھے تو اس کو بہتر قرآن سمجھ میں آئے گا بجائے اس کے کہ جو یہ کام نہیں جانتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو آمادہ کرے۔

خود کو راہنمائی اور تعلم سے بے نیاز سمجھنا

البتہ یہاں اس فرق کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ انسان قرآن کے اندر مہارت اور معلمِ قرآن بننے کیلئے تخصص حاصل کرے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر فرد اتنی حد تک تخصص پیدا کرے کہ مثلاً ایک چودہ سالہ قرآنی کورس ہے تو وہ انسان پورے کا پورا پڑھے، ضرورت کی حد تک عربی سیکھے، اتنے مقدماتِ علمی اپنے اندر تیار کرلے کہ اگر سادہ سا قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو قرآن سمجھ میں آئے، وہ کسی مترجم کا محتاج نہ ہو، کسی مفسر کا محتاج نہ ہو بلکہ اپنے دین کی کتاب سے اپنا

منشور خود سمجھ سکے، قرآن منشورِ حیاتِ انسان ہے، انسان کو قرآن پڑھنا نہیں آتا ہے تو اور کیا آئے گا؟ جس کو قرآن پڑھنا نہیں آتا ہے اگر وہ ساری دنیا کے علوم سیکھ لے تو بھی جاہل ترین انسان ہے۔

۹)ثانوی مطالب پہ توجہ دینا

فہمِ قرآن کی راہ میں ایک اور بڑا مانع اصلی مطالب کو چھوڑ کر فرعی اور ثانوی مطالب پر توجہ دینا ہے۔ جیسے قرآن کا طریقہ ہے وہی عام عرفی بول چال کا، عام محاورے کا طریقہ ہے چونکہ قرآن لوگوں کے لئے آیا ہے تو لوگوں کی ہی زبان میں آیا ہے، زبانِ قرآن کی بابت یہ مطلب بعض بزرگان نے تفسیر میں لکھا ہے اور خوب نکتہ ہے کہ قرآن کتابی زبان میں نہیں ہے بلکہ خطابی زبان میں ہے، یہ بڑا لطیف نکتہ ہے، جیسے پہلے درج کیا تھا کہ ایک تقریر جب کتاب بنے اور اسے تحریری شکل دیں تو آدھے معانی گم ہو جاتے ہیں اسی طرح قرآن کی کتابی زبان نہیں ہے بلکہ خطابی زبان ہے لہٰذا مطلب کے اندر مطلب ہے، یہ الکلام یجر الکلام کی طرح ہے اور ایک بات میں سب باتیں ہیں، خطابی زبان ایسی ہی ہوتی ہے، ایک شخص جب کسی کو سمجھا رہا ہوتا ہے، کوئی مطلب ہدایت کر رہا ہوتا ہے اور راہنمائی کر رہا ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کی مثال و تمثیل بھی پیش کرتا ہے اور اس کے لئے زبان بھی بدلتا رہتا ہے۔

خطابی زبان بدلتی رہتی ہے مثلاً جب آپ خود بھی گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو غیر محسوس طور پر اپنی زبان بدلتے رہتے ہیں، کس طرح؟ کبھی آپ ''تم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کبھی ''آپ''

کہنا شروع کردیتے ہیں، کبھی ''تو'' کہتے ہیں، اسی طرح کبھی غائب کے صیغے، کبھی حاضر کے صیغے، کبھی متکلم کے صیغے استعمال کرتے ہیں، ایک انسان کو دیکھیں کہ پانچ منٹ میں کتنی دفعہ زبان بدلتا ہے؟ کیوں؟ کیونکہ یہ زبان بدلنا تفہیم کے لئے ضروری ہے، کتاب میں زبان بدلنی نہیں ہوتی ہے، جب آپ کتاب لکھ رہے ہوں تو جہاں لفظِ ''آپ'' ہے تو آخر تک آپ ہی رہے گا، اس میں آپ کو ''تو'' نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن یہاں بولنے والا ہر قالب میں چلا جاتا ہے، بولنے والا کبھی صیغۂ غائب میں گفتگو کرتا ہے، کبھی صیغۂ خطاب میں بولنے لگتا ہے، کبھی صیغۂ متکلم میں بولنے لگتا ہے، کبھی انا ونحن کہنے لگتا ہے اور کبھی انتم وفلاں کہنے لگتا ہے، کبھی ھو وھا اُولاء کہنے لگتا ہے، یہ خطابی زبان کی خصوصیات ہیں، چونکہ قرآن عام لوگوں کی زبان میں آیا ہے اور عام لوگوں کی زبان کتابی زبان نہیں ہے بلکہ خطابی زبان ہے۔

لوگ خطابی زبان بولتے ہیں نہ کہ کتابی زبان بولتے ہیں لہٰذا ہم بھی جب لوگوں کے سامنے جا کر کتابی باتیں کرتے ہیں تو وہ بور ہونے لگتے ہیں، ایس ایم ایس (SMS) شروع کردیتے ہیں لیکن اگر آپ خطابی زبان میں گفتگو کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔اس ترتیب ولطافتِ قرآن پہ غور کریں کہ کس طرح قرآن لہجے بدلتا ہے؟ معانی منتقل کرتا ہے اور انسان کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے، کہاں سے کہاں لے جاتا ہے؟ نہج البلاغہ خطابی زبان ہے، نہج البلاغہ کے خطبوں کے اندر جو چاشنی موجود ہے، جو لطافت موجود ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ خطابی زبان ہے، کتابی زبان نہیں ہے اور جس کو خدا یہ ہنر دے دے، یہ فن دے دے کہ اسے لوگوں کو تفہیم اور بیان کرنے کا ڈھنگ آجائے

تو یہ بیان ایک لطفِ خدا ہے، قرآن نے اس کو نعمتِ خاصِ خدا ذکر کیا ہے، نعماتِ خدا میں سے ہے کہ

اَلرَّحْمٰنُo عَلَّمَ الْقُرْآنَo خَلَقَ الْاِنْسَانَo عَلَّمَهُ الْبَيَانَo (۲۲)

وہ خدا بڑا مہربان ہے۔ اس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اسے بیان سکھایا ہے۔

یعنی خدا نے انسان کو نعمتیں دیں اور سب سے بڑی نعمت

عَلَّمَهُ الْبَيَانَo

یعنی خدا نے قوتِ تفہیم دی ہے، خدا نے سمجھانے کی قوت دی ہے، یہ خطابی زبان میں زیادہ بہتر ہے، خطابی زبان میں ہوتا ہی یہی ہے کہ ایک مطلب کو بیان کرنے کے لئے کئی مطالب کی طرف اشارہ ضمنی کرنا پڑتا ہے، قرآن کے اصلی خطوط و اصلی محور ہیں اور ان اصلی خطوط کو قرآن نے ہر طریقے سے بیان کیا ہے، کبھی مثال کے ذریعے، کبھی قصے کے ذریعے، کبھی ضمیر غائب و حاضر کے ذریعے، قرآن نے لہجے بدلے ہیں لیکن ان لہجوں میں اصلی مطلب گم نہیں ہوتا ہے، اصلی مطلب ساتھ رہتا ہے، انسان کو اصلی مطلب کے ساتھ ساتھ رہنا چاہئے اور وہ جو ثانوی چیزیں ہیں ان کو ثانوی ہی رکھے لیکن بعض اس مشکل میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے ثانوی چیزیں اہمیت اختیار کر جاتی ہیں اور اصلی مطلب گم ہو جاتا ہے۔

ثانوی مطالب پہ توجہ دینا

آپ تفسیروں میں دیکھیں کہ حتیٰ قرآن میں لوگوں کے اکثر سوالات فرعی مسائل کے بارے میں ہیں، مثلاً قصہء آدم علیہ السلام میں، خلقتِ آدم علیہ السلام میں خداوند تبارک وتعالیٰ کا بنیادی مقصود کیا

ہے؟ لیکن اساسی ترین سوال جو آج تک سب کے ذہنوں میں اٹھتا ہے وہ شجرِ ممنوعہ ہے کہ جو آدم علیہ السلام نے کھایا تھا کہ وہ درخت کونسا تھا؟ یہ لاینحل سوال ابھی تک موجود ہے اور ساری تحقیقات اس کے اوپر ہیں یا خداوند تبارک وتعالیٰ نے نبیٔ بنی اسرائیل کے ذریعے بنی اسرائیل کو کہا کہ

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ...... (۲۳)

ثانوی مطالب پر توجہ دینا

اس قریہ میں داخل ہو جاؤ تو ساری بحث اس قریے میں ہے کہ یہ دیہات کونسا تھا؟ جو بھی تھا بالآخر قریہ تھا اس کو چھوڑیں اور اصل مطلب کو پکڑیں کہ کہنا کیا چاہتا ہے، اس طرح کی ثانوی چیزیں جو قرآن نے اصلی مطلب کی تفہیم کے لئے، وضاحت کے لئے ساتھ ذکر کی ہیں تا کہ اصلی مطلب واضح وروشن ہو لیکن ان ثانوی مطالب نے اہمیت حاصل کر لی ہے اور جو قرآن کی اصلی باتیں ہیں وہ گم ہوگئی ہیں اور اس کے فراواں نمونے ہیں، تقریباً ہر جگہ آپ قرآن میں جا کر دیکھ لیں کہ ثانوی باتیں اصلی مقام پر آ بیٹھی ہیں، یہی مانعِ فہمِ قرآن ہیں، جن لوگوں کو قرآن کے اندر شدید رغبت ہے وہ ان مسائل میں زیادہ تحقیق میں لگے ہوئے ہیں کہ فرشتے مونث ہیں یا مذکر ہیں؟ اسی بحث میں سارا وقت لگا دیتے ہیں مثلاً جنت کی نعمتوں کے بارے میں تحقیق جاری ہے، ایک روحِ جنت ہے کہ قرآن اسی طرف منتقل کرنا چاہتا ہے اور کچھ جنت کی تفہیم و وضاحت کے لئے ثانوی چیزیں ہیں، جنت کے ذیلی اور ضمنی مسائل ہیں لیکن ساری توجہ ان ضمنی مسائل کے اندر ہے، حوریں ونہریں جنت کی ضمنی بخشیں ہیں، اصل جنت کی طرف توجہ کرو کہ انسان کے لئے جنت ہے کیا چیز؟ قرآن نے اتفاقاً نمونے بھی پیش کئے ہیں کہ صدرِ اسلام میں بھی یہی مشکل تھی، لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت

سارے سوال کرتے تھے، اگر ان میں اکثر باتیں دیکھیں تو کوئی کام کی بات نہیں پوچھتے تھے، اکثر ثانوی مسائل کے بارے میں پوچھتے تھے مثلاً

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ...... (۲۴)

آپؐ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں، اگر اس سے مراد روحِ انسان ہو تو یہ بڑا عمیق اور دقیق سوال ہے لیکن وہ کیا پوچھتے تھے؟ وہ جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں زیادہ پوچھتے تھے چونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم جو بات کرتے ہیں، جو سازش کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتا دیتے ہیں، تو وہ اکثر پوچھتے تھے کہ یہ کون ہے؟ یہ روح جو آپ کو آگاہ کر دیتی ہے، یہ کبھی ہمارے ہاتھ چڑھ جائے تو اس سے جان چھڑا لیں گے، سوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی ضمنی بات کو پکڑ لیا اور یہ عملاً بھی ہوتا ہے، آپ کو بھی تجربہ ہوگا، مجھے زیادہ تجربہ ہوا ہے چونکہ گفتگو میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ سب حاضرین کو سمجھ میں آجائے، حاضرین مختلف ہوتے ہیں، کوئی پڑھا لکھا ہوتا ہے، کوئی ان پڑھ ہوتا ہے، بالآخر کسی کا مطالعہ ہوتا ہے کسی کا نہیں ہوتا ہے اور ہر ایک کو سمجھانا ہوتا ہے لہٰذا گفتگو میں مثالوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے لیکن عموماً لوگ انہی مثالوں میں پھنس جاتے ہیں یعنی جو مثال اصل مطلب کی تفہیم کے لئے دی جاتی ہے تو بعض اسی مثال میں پھنس جاتے ہیں، کسی جگہ ایسے ہی مثال دیتے ہوئے بلی کا ذکر آیا اور وہ دو گھنٹے کی گفتگو تھی لیکن جب گفتگو ختم ہوئی تو ایک آدمی بلی پر ہی غور کر رہا تھا، یہ مانع از فہمِ قرآن ہے۔ اصلی خط کو نہ چھوڑیں کیونکہ ضمنی بات ضمنی بات ہے۔

ثانوی مطالب پر توجہ دینا

۱۰) اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجھی

اصول وکلیاتِ قرآن سے بے توجہی ایک اور مانع ہے کیونکہ قرآن کے کچھ کلیات ہیں یعنی اصلی موٹے خطوط ہیں اور قرآن کی ہدایت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ تمام نسلوں کے لئے ہے، قیامت تک کے لئے ہے اور یہ کسی خاص نسل کے لئے نہیں ہے، امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر قرآن ایک نسل کیلئے ہوتا تو اس نسل کے مرنے سے قرآن بھی مرگیا ہوتا درحالیکہ نسلیں مرگئی ہیں اور قرآن زندہ ہے، پس اس کا مطلب ہے کہ قرآن مصادیق کا اسیر نہیں ہے اور شانِ نزول کا اسیر نہیں ہے لہٰذا آیاتِ قرآن کو شانِ نزول اور مصادیق کے اندر پابند کرنا ایک مانعِ فہم قرآن ہے، شانِ نزول یا مصداق اگر ہے بھی تو اس کو اتنی ہی اہمیت دی جائے کہ جتنا اس پر تطبیق ہوسکتا ہے، قانونِ کلی ایک عام قانون ہے لیکن قانون کی عمومیت اور کلیّت کو بیچ میں سے ختم نہ ہونے دے، ایسا قانون جو تمام نسلوں کے لئے ہے، مفسرِ قرآن کی اسی لئے ضرورت ہے کہ یہی چیزیں الگ کرکے ہمیں بتائے کہ یہ قانون کا خطِ کلی ہے، اصلِ کلی ہے، یہ تمام زمانوں کے لئے ہے لیکن یہ خصوصیت فقط اس مصداق کی ہے، تطبیقی پہلو کو اس کلی پہلو سے جدا کریں۔

۱۱) فقط انتخابی آیات پر توجہ دینا

مانعِ آخر انتخابی اور گزینشی (Selected) عمل کردن، گزینش یعنی چن چن کے آیات ڈھونڈنا، تلاش کرنا مثلاً سو آیات سے گزر کر ایک سو ایک نمبر آیت پر پہنچنا، یہ کام نہ کریں، اس طرح

سے قرآن پر عمل نہ کریں بلکہ تمام قرآن ہدایت ہے، ہر آیۂ قرآن ہمارے ہدایت کے لئے ہے نہ کہ فقط چنی ہوئی چند آیات، اس وقت ہمارے ہاں قرآن بھی منبر پر ہی پیش ہوتا ہے، اہلبیت علیہم السلام بھی منبر پر ہی پیش ہوتے ہیں، پورا دین منبر پر ہی ہے، منبر سے ماورا کچھ بھی نہیں ہے اور منبر پر فقط انتخابی آیات پڑھی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ہمارے بعض حضرات قرآن کی طرف فقط انہی آیات کی وجہ سے غور کرتے ہیں کہ جو اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں ہیں اور جو اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں نہیں ہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہے، یہ عمل نہیں ہونا چاہئے مثلاً فقہ میں بھی یہی کام ہوتا ہے، فقیہ آتا ہے اور قرآن میں جو آیاتِ احکام ہیں وہ چن لیتا ہے باقی آیات سے کوئی سروکار نہیں ہے یا اگر علمِ اخلاق کا کوئی عالم آئے تو وہ فقط اخلاقی آیات انتخاب کرتا ہے اور باقی قرآن سے کوئی سروکار نہیں ہے،

نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ...... (۲۵)

یعنی ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے......

یہ نہ کریں یعنی قرآن کو تکہ پارہ نہ کریں، قرآن کو کاٹیں نہیں، جیسے دین کے ساتھ ایک ستم یہ بھی ہوا ہے کہ دین ایک پورا ہم آہنگ مجموعہ تھا، معارف کا، اعمال کا، اخلاق کا، احکام کا، نظام کا، اس کو ہم نے کاٹ کاٹ کے، الگ الگ کر کے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ دیا ہے، احکام کسی نے لے لئے، اخلاق کسی نے لے لیا، جہان شناسی کسی نے لے لی، دوسرا شعبہ کسی اور نے لے لیا۔ اس طرح سے قرآن گم ہو جاتا ہے، قرآن انسان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے یعنی فقیہ کو فقہ بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے اگر دوسری آیات اس کے سامنے نہ ہوں، حکیم کو حکمت سمجھ میں نہیں آتی ہے اگر فقہ کی

آیات اس کی نظر میں نہ ہوں، اور متخلق کو اخلاق سمجھ میں نہیں آتا ہے اگر باقی آیات اس کی نظر میں نہ ہوں، پورا قرآن ایک مجموعہ ٔ ہدایت ہے اس کو الگ الگ نہ کریں کیونکہ قرآن کی فہم میں یہ بھی ایک بڑا مانع ہے۔

انشاء اللہ خداوند تبارک وتعالیٰ اس قرآن کے صدقے ہمارے دلوں کو ان موانع سے پاک فرمائے۔ آئندہ فصل میں ادبِ ہفتم کی وضاحت کی جائے گی۔

فقط اختلافی آیات پر توجہ دینا

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ۲۴)

(۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷۸)

(۳)......(شرح أصول الكافي- مولى محمد صالح المازندرانى، الجزء ۳، صفحه ۲۰۶) (شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبى الحديد، أبو حامد، عز الدين، المتوفى : ۶۵۶ ھ،الجزء ۱۹، صفحه ۲۴۶)

(۴)......(غرر الحكم و درر الكلم، الجزء ۱، صفحه ۸)(ميزان الحكمة - الريشهرى، الجزء ۴، صفحه ۲۳۰)(شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبى الحديد. أبو حامد، عز الدين، المتوفى : ۶۵۶ھ، الجزء ۱۸، صفحه ۲۳۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۱۸)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۵۰)(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ۴)(سورۂ مبارکہ جاثیہ، آیہ۲۰)

(۶)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۴۳)(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ۷)

(۷)......(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ۲۲)(سورۂ مبارکہ زخرف، آیہ۲۳)

(۸)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۷۰)

(۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۸۵)(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ۴)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۴)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۳)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷،۶)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۰)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۵۲)(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۴۹)
(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ۱۲۵)(سورۂ مبارکہ حج، آیہ۵۳)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۱۲)
(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۶۰)(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ۲۰)(سورۂ مبارکہ محمدؐ، آیہ۲۹)
(سورۂ مبارکہ مدثر، آیہ۳۱)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۴۷)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۴۵)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ حدید، آیہ۱۶)

(۱۸)......(مجموعۂ ورام ،الجزء ۱ ،صفحہ۱۴۸)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۵۷)(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۴۰)
(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۶۷)

(۲۰)......(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارمالشِیرازی، الجزء ۱۶ ، صفحہ ۵۲۲)(تدوین القرآن، الجزء ۴، صفحہ ۱۸)
(قرآن کریم از منظر امام رضا علیہ السلام، الجزء ۲، صفحہ ۵)
(شرح أصول الکافي - مولی محمد صالح المازندرانی، الجزء ۱۲ ، صفحہ ۲۴۲)(کاملة دفاع عن القرآن الکریم، الجزء ۱ ،صفحہ۹)

(أحاديث أم المؤمنين عائشة - السيد مرتضى العسكرى، ۲،صفحه ۱۷۵)

(على المرتضىٰ نقطة باء البسملة)(ولأول مرة فى تاريخ العالم)

(۲۱)......(البيان فى تفسير القرآن،الجزء ۱ ،صفحه۵)(مراجعات قرآنية)(بحار الأنوار- العلم العلامة الحجة فخرالامة المولى الشيخ محمد باقر المجلسى " قدس اللّٰه سره "، الجزء ۲، صفحه ۲۲۶)

(مناقب أمير المؤمنينؑ - محمد بن سليمان الكوفى، الجزء ۲، صفحه ۱۴۵)

(مسند الامام علىؑ، الجزء ۳، صفحه ۱۹۵)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثين الحاج ميرزا حسين النورى الطبرسیؒ، الجزء ۷، صفحه ۲۵۵)(المسترشد - محمد بن جرير الطبرى،الجزء ۱ ، صفحه ۴۷۹)(دعائم الاسلام، الجزء ۱ ، صفحه ۲۸)(حياة أمير المؤمنينؑ عن لسانه - الشيخ محمد محمديان، الجزء ۲ ، صفحه ۹۴)(وسائل الشيعة- الفقيه المُحدِّثِ الشيخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ،الجزء ۱ ،صفحه۷۶)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ رحمٰن، آیہ۴،۳،۲،۱)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۵۸)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ۸۵)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۵۰)

فصلِ ادبِ ہفتم

﴿تخصیص﴾

۱)تخصیص سے مراد

۲)فقط لافظِ قرآن نہ بنیں

۳)خود کو مُخَاطَبْ نہ سمجھنا، قرآن کی مہجوریت کا سبب

٤)دعا کو اپنے دل کی آواز بنائیں

☆پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں میں استغفار کی وجہ

☆تعلیم دینے کی دو صورتیں

☆معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں

٥)قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں

٦)مُخَاطَبِ قرآن نہ بننے کا نقصان

۷)انسان عکس العمل کب دکھاتا ہے؟

۸)مُخَاطَبْ بننے کے ثمرات

۹)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ تربیت

۱۰)قرآن کو قصۂ شب نہ سمجھیں

☆خود کو قلبِ قصہ میں ڈھال کر پرکھیں

۱۱)حیوانات اور دیگر موجودات سے عبرت

۱۲)قرآن کی ہر آیہ میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں

۱۳)قرآن کا اندازِ تخاطب خطابی ہے

۱٤)مخاطب بننے کے اثرات

۱۵)شکر سے مراد

۱٦)قرآن فقط معصومین علیہ السلام کیلئے نازل نہیں ہوا

۱۷)مذہبی طبقے کی دیگر مشکلات

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ ہفتم تخصیص ہے، صدر المتالھینؒ کتابِ شریف مفاتیح الغیب میں ادبِ ہفتم کو یوں بیان فرماتے ہیں،

☆ **السابع: التخصیص، وھو ان یقدر العبد انہ ھو المقصود بکل خطاب......**

۱)تخصیص سے مراد

تخصیص سے مراد یہ ہے کہ خالصتاً مخصوصاً یہ خطاب میرے لئے ہے یعنی انسانِ قرآن شناس وقرآن خوان جب قرآن کی طرف آتا ہے، مطالعۂ قرآن، تلاوتِ قرآن وتدبر در قرآن مجید کرتا ہے تو فقط قاریٔ قرآن نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن قرار دے، ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ ویسے تو ہم بہت ساری چیزیں پڑھتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام امور کہ جن کا ہم مطالعہ کرتے ہیں ان کے مُخاطَبْ بھی ہوں یعنی سب کچھ ہم سے ہی کہا جا رہا ہو، اکثر ایسے ہوتا ہے کہ مخاطبینِ اصلی کوئی اور طبقہ ہوتا ہے لیکن ہم ان خطابات کا مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں۔

روزمرہ گفتگو میں بھی ہمارا یہ معمول رہتا ہے کہ ہم کچھ چیزیں سنتے ہیں لیکن اس کے مُخاطَبْ ہم نہیں ہوتے ہیں، کہا اور سنایا کسی اور کو جا رہا ہوتا ہے لیکن سنتے یا پڑھتے ہم ہیں۔ ہم اکثر کتابیں پڑھتے ہیں کہ جن میں کسی کے حالاتِ زندگی درج ہوتے ہیں مخصوصاً تاریخ کی کتابوں کے مخاطب ہم نہیں ہوتے ہیں، بہت سارے قضایا یہ ایسے ہیں مثلاً کسی شہنشاہ نے اپنے کسی درباری کو کوئی حکم دیا یا کسی مافوق نے اپنے ماتحت کو کوئی حکم دیا، یہ ہم پڑھ رہے ہوتے ہیں لیکن پڑھتے ہوئے ہماری

ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ ہم مخاطَب نہیں ہیں لہٰذا مخاطبین والا عکس العمل بھی نہیں دکھاتے ہیں، ہم اس کے قاری ہوتے ہیں اور ہمارا قارئین والا عکس العمل ہوتا ہے یا فقط ایک گزارش کی حد تک، نگاہ کرنے کی حد تک پڑھتے ہیں لیکن اس پہ کوئی ردِعمل نہیں دکھاتے ہیں چونکہ اس کے مخاطبِ اصلی ہم نہیں ہوتے ہیں۔

۲)فقط لافظِ قرآن نہ بنیں

لہٰذا انسان اجنبی بن کر قرآن نہ پڑھے اور فقط قرآنی الفاظ کو حکایت نہ کرے، اس طرح سے کہ یہ بس معمولی عبارتیں ہیں یا کلام ہے کہ جس طرح سے کتابوں کے اندر یا دیگر مکتوبات کے اندر کچھ عبارتیں درج ہوتی ہیں اور انسان اپنی زبان سے ان کو حکایت کرتا ہے۔ فقط حاکیِ قرآن، مخبرِ قرآن اور لافظِ قرآن نہ بنیں اور ادائیگیٔ الفاظِ قرآن فقط مخارج کی حد تک نہ ہو بلکہ مُخاطَبِ قرآن بنیں یعنی تمام خطابات وآیاتِ قرآن وفرامینِ خدا کو اپنا مُخاطِبْ سمجھیں کہ مجھے خطاب ہو رہا ہے، جس طرح سے حقیقتاً گرکوئی ہم سے مخاطِب ہو کر ہم ہی سے بات کر رہا ہو تو ہم اس کی بات پوری توجہ سے سنتے ہیں، اس کے ہر جملے پر غور کرتے ہیں، دقت کرتے ہیں، ہمارے لئے اگر کوئی فائدے اور سود کی بات ہو تو اس کے اوپر غور کرتے ہیں، اگر ہمارے لئے ضرر کی بات ہو تو اس پر توجہ کرتے ہیں، کسی مطلب سے ہمیں روکا جا رہا ہو تو اس سے رک جاتے ہیں، کسی مطلب پر اگر ہمیں اکسایا جا رہا ہو تو اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جس طرح سے دو فرد آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر رہے

ہوتے ہیں اور پوری توجہ سے سنتے ہیں، فون پر گفتگو ہو رہی ہو، ایک دوسرے کے حضور میں گفتگو ہو رہی ہو یا بالمشافہہ گفتگو ہو رہی ہو تو پوری توجہ اور انہماک سے محو ہو کر ایک دوسرے کی گفتگو سنتے ہیں، اسی طرح سے انسان اپنے رب کا کلام بھی دوبدو سنے، اس طرح سے سنے کہ فقط رب ہو اور انسان ہو۔ ایسا نہ سمجھے کہ یہ ایک عمومی گفتگو ہے یا کسی اور کے متعلق گفتگو ہے یا یہ کسی اور قوم کے قصے ہیں اور میری معلومات میں اضافے کے لئے مجھے کہا گیا ہے کہ آپ قرآن پڑھو یا ثواب کے حصول کے لئے مجھ سے مطالبہ و تقاضا کیا گیا ہے کہ آپ قرآن کی طرف نگاہ کرو کہ اس میں حکمتیں ہیں۔ اس طرح سے نہ ہو کہ جیسے لغت کی کتابیں یا دیگر علمی کتابیں ہیں کہ جن کی طرف انسان رجوع کرتا ہے تو انسان کو کچھ معانی حاصل ہو جاتے ہیں بلکہ بعض نے اس سے بڑھ کر کہا ہے کہ جس طرح سے مولا اور عبد کے درمیان تبادلۂ خطاب ہوتا ہے اسی طرح سے انسان نماز بھی پڑھے اور عبادت بھی اسی طرح ہو۔

سورۂ فاتحہ کیلئے خصوصاً کہا گیا ہے کہ یہ بینِ رب و عبد ایک مکالمہ ہے۔ حدیثِ قدسی میں خدا فرماتا ہے کہ آدھا کلام میرا ہے عبد کے ساتھ اور آدھا کلام عبد کا ہے میرے ساتھ۔ اگر انسان خدا کا مُخاطَب بننے اور خدا سے مُخاطِب ہونے کا ادب، ڈھنگ اور فن سیکھ جائے تو لطفِ خدا شاملِ حال ہو جاتا ہے، دعا خدا سے بات کرنا ہے، نماز خدا سے بات کرنا بھی ہے اور خدا سے بات سننا بھی ہے اور قرآن خدا کے خطاب کو سننا ہے، یہ ایک قسم کا دوطرفہ تعلق ہے یعنی میں ہوں اور میرا خدا ہے اور میں خصوصاً خودِ خدا سے یہ کلام سن رہا ہوں نہ کہ معمولی قاری کی طرح معمول کی کتب کا مطالعہ کر رہا

ہوں کہ جن کتابوں کے مؤلف سینکڑوں یا ہزاروں سال پہلے اپنی ذہنی محفوظات لکھ کر اس دنیا سے گزر گئے ہیں بلکہ انسان یہ یقین کرے کہ میں ایک زندہ اور حی ذات کے سامنے میں موجود ہوں اور یہ زندہ ذات اور حی ذات ایک زندہ اور حی موجود سے خطاب کر رہی ہے، نہ میں مردہ سے سن رہا ہوں، نہ کاغذ سے سن رہا ہوں اور نہ کسی حجاب کے پیچھے سے سن رہا ہوں بلکہ مستقیم خدا سے یہ کلام سن رہا ہوں۔

۳) خود کو مُخَاطَب نہ سمجھنا، قرآن کی مهجوريت كا سبب

قرآن کی مہجوریت کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ عملی طور پر قرآن کی فہم کے دوران یہ آداب ملحوظ نہیں ہوتے ہیں، حتیٰ وہ لوگ جو رغبت بہ قرآن رکھتے ہیں، تلاوتِ قرآن کرتے ہیں اور تفسیرِ قرآن بھی کرتے ہیں تو کم تر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو مخاطَبِ قرآن بھی سمجھیں کہ یہ سب کچھ جو ہم پڑھ رہے ہیں، پڑھا رہے ہیں، تفسیر کر رہے ہیں، تجزیہ کر رہے ہیں، تحلیل کر رہے ہیں یہ سب ہمارے بارے میں ہے، قرآن ہمیں سب کچھ کہہ رہا ہے، قرآن مجید میں ایسی آیات فراواں ہیں کہ جن سے یہی تاثر ملتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ مخاطبِ قرآن ہم سب ہیں، چونکہ ھدی للناس ہے، قرآن مجید اگرچہ قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے لیکن مخاطبِ قرآن فقط نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک وسیلہ ہیں تا کہ اصلی مخاطبین تک وحیٔ خدا پہنچ جائے، یہ خطاب امانت کے ساتھ اور صحیح طریقے سے اپنے مخاطبین تک پہنچ جائے، اس لئے رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امین ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کا لقب بھی امین ہے یعنی امانت کے ساتھ یہ خطابات حضرت

جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اور پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مخاطبینِ اصلی کے لئے پہنچیں، یعنی دو امین وسیلوں کے ذریعے خداوند تبارک وتعالیٰ نے مخاطبینِ اصلی تک اپنا پیغام پہنچایا ہے۔ اگر انسان کے ذہن میں پہلے سے یہ تصور موجود ہو کہ قرآن کا مخاطب ہم نہیں کوئی اور ہے اور ہم تو صرف ثواب کے لئے پڑھتے ہیں، خیر و برکت کے لئے پڑھتے ہیں تو اس طرح قرآن مہجور ہو جاتا ہے۔

٤) دعا کو اپنے دل کی آواز بنائیں

اسی طرح سے دعائیں بھی ہیں چونکہ قرآن کے کچھ مطالب دعاؤں کے اندر بھی موجود ہیں مثلاً جب ہم خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتے ہیں، خصوصاً منقول و ماثور دعائیں تو اگر ہم یہ سمجھ کر خدا کی بارگاہ میں دعائیں پیش کریں کہ یہ میرے دل کی آواز ہے، یہ میری اپنی پکار ہے، میری دعا ہے، میرا سوال ہے، میری طلب ہے پھر تو یہ میری دعا شمار ہوتی ہے لیکن اگر میں اس دید سے پڑھوں، اس ذہنیت سے پڑھوں کہ اس دعا کے پڑھنے کا ثواب ہوتا ہے یعنی دعا نہیں ہے بلکہ اس کے تلفظ کا، اس کے ورد کا اور زبان سے دہرانے کا ثواب ہوتا ہے، میں ایک مقدس متن سمجھ کر اس کو پڑھ رہا ہوں اور اس دعا کو میں نے اپنے دل کی آواز اور فریاد میں تبدیل نہیں کیا بلکہ فقط اس وجہ سے پڑھا چونکہ یہ معصومین علیہم السلام سے یہ منقول ہیں اس وجہ سے ایک مقدس چیز ہے، اگر میں اسے اپنی زبان پر جاری کروں تو مجھے ثوابِ کثیر ہوگا تو ایسا شخص محروم رہ جاتا ہے، جو فقط ثواب کے حصول کے لئے پڑھے گا اور اس دعا کو اپنے دل کی پکار نہیں بنائے گا وہ مقصودِ اصلی سے دور رہے گا۔

☆پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں میں استغفار کی وجہ

ایک اور طریقے سے دعا میں اسی کا شبیہ مطلب بھی موجود ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے استغفار کرتے تھے۔ جو ہمارے لئے ایک سوال ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں یہ دعائیں جو ائمہ علیہم السلام سے منقول ہیں، یہ ائمہ علیہم السلام کی نہیں ہیں بلکہ یہ تو لگتا ہے کہ بہت گناہگار لوگوں کی دعائیں ہیں درحالیکہ ائمہ علیہم السلام نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے، مولانا روم نے طوطے پر ایک تمثیل پیش کی ہے کہ کسی دکاندار نے طوطا پالا ہوا تھا، وہ طوطا بولتا تھا، ایک دن وہ طوطا اڑا اور اس دکان سے تیل کی شیشی گرادی، دکاندار کو غصہ آیا اور اس نے طوطے کو پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا جس کی وجہ سے اس کے سر کے سارے بال جھڑ گئے اور وہ گنجا ہوگیا، اس طوطے نے بولنا چھوڑ دیا، دکاندار نے جتنے جتن کیے کہ یہ بولے لیکن وہ نہیں بولا، طوطے کی وجہ سے گاہک بھی دکان میں آتے تھے، ایک دن ایک گنجا گاہک آیا کہ جس کے سر کے بال گرے ہوئے تھے، جوں ہی وہ دکان میں داخل ہوا تو طوطا بول پڑا کہ کیا تو نے بھی تیل گرایا ہے؟ اس سے سمجھاتے تھے کہ جس کے بال نہیں ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ اس نے تیل کی شیشی گرائی ہے اور اس کو سزا ملی ہے۔ لوگ بھی اسی طوطے کی طرح ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی استغفار کر رہا ہو وہ ہماری طرح ہی کسی جرم کا ارتکاب کیا ہوا ہے، سب کے سر کے بال شیشی گرانے سے نہیں گرتے ہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اکثر دعائیں جو ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول ہیں وہ ہمارے ساتھ

مناسب اور سازگار لگتی ہیں چونکہ ہماری قلبی و عملی حالت ایسی ہی ہے مثلاً ہم خداوند تبارک وتعالٰی سے گناہ کی معافی مانگتے ہیں، اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہیں، معصیتوں کا اعتراف کرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں چونکہ ہم ہیں ہی گناہ گار لیکن بعض سادہ اندیش وسادہ لوح انسان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری دعائیں معصومین علیہم السلام کے لئے نہیں ہیں چونکہ وہ تو معصوم ہیں، انہوں نے جب کوئی گناہ ہی نہیں کیا ہے تو وہ توبہ کیوں کریں؟ وہ کیوں استغفار کریں؟ کیوں اعتراف کریں؟ کس بات کا اقرار کریں؟ یعنی یہ دعا معصومینؑ نے فقط ہمیں تعلیم دینے کے لئے بیان فرمائی ہیں اور خود اپنے دل کی پکار بنا کر ان کا اظہار نہیں کیا، معصوم علیہ السلام کے قلبِ نورانی سے یہ دعا نہیں نکلی ہے بلکہ صرف ہمیں بتانے کے لئے اور ہمیں متوجہ کرنے کے لئے کہ اس طرح سے خداوند تبارک وتعالٰی کو پکارا جاتا ہے۔

☆تعلیم دینے کی دو صورتیں

تعلیم دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جیسے ایک بڑا آدمی کسی چھوٹے بچے کو تعلیم دے رہا ہو کہ بچہ جو تلفظ ادا نہ کر سکتا ہو یا حرکت انجام نہ دے سکتا ہو تو اس کو مشق کروا رہا ہوتا ہے کہ آپ اس طرح سے انجام دو لیکن وہ بڑا آدمی خود نیت نہیں کرتا ہے، فرض کریں کہ کسی بچے کو آپ نماز پڑھا رہے ہیں اور آپ بھی وہی ذکر زبان سے ادا کرتے ہیں کہ جو بچے سے ادا کروانا چاہتے ہیں اور وہی حرکتیں انجام دیتے ہیں کہ جو بچے سے انجام دلوانا چاہتے ہیں لیکن آپ خود نیتِ نماز نہیں کرتے ہیں اس لئے آپ کی نماز بھی نہیں ہوتی ہے اور اس کو نماز شمار ہی نہیں کیا جاتا ہے مثلاً آپ بچے کو مشق کروانے کے

لئے تکبیرۃ الاحرام انجام دیتے ہیں تو اس اللہ اکبر سے وہ محرماتِ نماز آپ پر لاگو نہیں ہوتے ہیں، اس کے بعد آپ بات بھی کر سکتے ہیں، ہنس بھی سکتے ہیں، رو بھی سکتے ہیں، قبلہ سے دائیں بائیں بھی ہو سکتے ہیں چونکہ آپ نے نیتِ نماز نہیں کی ہے، آپ فقط ایک ادا اپنا رہے ہیں تاکہ بچہ میری تقلید میں یہی اعمال انجام دے اور جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ اس سے سرزد ہو، یہاں پر فقط تعلیم دینا مقصود ہے لہٰذا اس نماز کو بڑے کیلئے نماز سمجھا ہی نہیں جاتا ہے۔

☆ تعلیم دینے کی دو صورتیں

تعلیم دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک انسان بچے کو ساتھ کھڑا کرتا ہے اور خود واقعاً نماز پڑھتا ہے، حقیقتاً نیت کرتا ہے، حقیقی تکبیرۃ الاحرام کہتا ہے اور پھر اس کے بعد ساری حرکات وسکنات حقیقی نیت کے ساتھ انجام دیتا ہے، پھر اس کے بعد وہ محرماتِ نماز ومبطلاتِ نماز اس کے لئے لاگو ہو جاتے ہیں، آیا آئمہ اطہار علیہم السلام کی پہلی والی صورت ہے؟ یعنی نہ نیت ہے، نہ ارادہ ہے بلکہ صرف خدا کی بارگاہ میں آئے ہیں تاکہ مومنین کو سکھائیں اور مجرمین وگناہ گاروں کو یہ تعلیم دے سکیں کہ خدا کو کس طرح سے پکارا جاتا ہے، خود سے جب اللّٰھم کہتے ہیں، ربنا کہتے ہیں تو نیت نہیں کرتے ہیں کہ واقعاً تہہِ دل سے یہ ہماری پکار ہے اور ہم واقعاً صداقت سے خدا کو پکار رہے ہیں، جب ایک طرف سے ہم انہیں معصوم سمجھتے ہیں تو وہ معصوم اس بے ادبی سے بھی معصوم ہیں چونکہ یہ بے ادبی ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں آکر انسان خود نیت نہ کرے، خود ربنا، اللّٰھم نہ کہے فقط دوسروں کو متوجہ کرے کہ آپ کہو اللّٰھم، میں آپ کو سکھا رہا ہوں ورنہ مجھے تو اللّٰھم کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

☆معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں

منتہیٰ یہ کہ ہم معصومین علیہم السلام کی دعاؤں، استغفار، توبہ یا اقرار واعتراف کو اپنے اوپر قیاس نہ کریں، جیسا کہ ایک محاورہ ہے کہ

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ......(۱)

بعض کا درجہ مقربین کا ہے اور بعض کا درجہ ابرار کا ہے یعنی بعض اچھے انسان ہیں لیکن درجۂ ابرار پر فائز ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ان سے بالاتر مقام پر مقربینِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں یعنی قریب تر ہیں اور ابرار سے کافی اوپر ہیں، جو کچھ مقربین انجام دیتے ہیں وہ ابرار انجام نہیں دیتے لیکن جو کچھ ابرار انجام دیتے ہیں وہ مقربین بھی انجام دیتے ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ بعض چیزیں ابرار کے لئے حسنہ ہوں لیکن مقربین کے لئے حسنہ نہیں ہیں، اس کو ایک تعلیمی مثال سے بیان کرتے ہیں، فرض کریں کہ ایک کلاس کے اندر مختلف طلبہ ہیں اور ان طالب علموں میں سے بعض ذہین ہیں، محنتی ہیں اور ہمیشہ سو میں سے سو نمبر لیتے ہیں لیکن ذہین بچے نے ایک امتحان ایسا دیا کہ جس میں اسے پورے سو نمبر نہیں ملے، فرض کرلیں کہ اس نے چالیس نمبر لئے اور اسی کلاس میں کچھ بچے ایسے ہیں کہ جو ہمیشہ فیل ہوتے تھے، وہ تینتیس نمبر بھی نہیں لے سکتے جو پاس ہونے کے لئے ضروری ہیں لیکن اس امتحان میں اتفاقاً ان میں سے کسی نے چالیس نمبر لے لئے لہٰذا جو بچہ ہمیشہ فیل ہوتا تھا وہ چالیس نمبر لے کر خوش ہو جاتا ہے اور وہ جو ہمیشہ اول آتا تھا، سو نمبر لیتا تھا وہ چالیس نمبر لے کر افسردہ ہو جاتا ہے، ایک ان چالیس نمبروں پر خوش ہے اور ایک ان چالیس نمبروں پر ناراحت ہے، ایک کے

لئے جشن ہے اور ایک کے لئے عزا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ایک مقربین میں سے ہے اور ایک ابرار میں سے ہے، یہ چالیس نمبر فیل ہونے والے کیلئے حسنہ ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے لیکن یہی چالیس نمبر اس ذہین کیلئے کہ جو ہمیشہ اول پوزیشن پہ آتا تھا سیئہ ہیں، لہٰذا

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْن......

بہت ساری چیزیں ہیں جو ابرار کے لئے خوب ہیں لیکن مقربین کے لئے خوب نہیں ہیں، چونکہ انسانوں کے مختلف درجات ہیں، ائمہ علیہم السلام کا اعتراف وہ نہیں ہے کہ جو ہمارا اعتراف ہے، ہمارا گناہ وہ نہیں ہے کہ جس پر ائمہ علیہم السلام خداوند تبارک وتعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہیں، ہم واقعاً معصیتِ خدا کرتے ہیں، ہم حدودِ شریعتِ خدا توڑ کر اس پر مغفرت طلب کرتے ہیں لیکن معصومؑ حدودِ شریعتِ خدا نہیں توڑتا، وہ اس لحاظ سے بھی معصوم ہیں، پھر وہ کیوں خدا کی بارگاہ میں اتنی مغفرت طلب کرتے ہیں؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں استغفار کرتے تھے؟

جس طرح زوجۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ آپ تو نبیٔ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو کوئی گناہ نہیں کرتے ہیں، پھر یہ کثرت سے استغفار کیوں کرتے ہیں؟ یا کثرت سے شکر کیوں کرتے ہیں؟ ایک جگہ جواب دیا کہ

اَلَا اَكُوْنُ عَبْداً شَكُوْراً...... (۲)

یعنی کیا میں خدا کا عبدِ شاکر نہ بنوں؟ اور ایک جگہ پر فرمایا کہ میں جب لوگوں کی تبلیغ میں مشغول ہوتا ہوں، لوگوں کی ہدایت میں جو وقت صرف کرتا ہوں، اس پر استغفار کرتا ہوں، کیوں؟

☆ معصومین علیہم السلام کی استغفار کو خود پر قیاس نہ کریں

اس لئے کہ جب میں مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تو خالق کی طرف توجہ کا مرتبہ کم ہو جاتا ہے، اسی بابت استغفار کرتا ہوں، توجہ در خالق پہ اتنی بھی کمی نہیں آنی چاہئے۔ لہٰذا ان کی مغفرت ان کاموں پر نہیں ہے کہ جو ہمارے کاموں پر ہے۔

یہیں پر مولانا روم نے کہا کہ

کار پاکان راقیاس از خود مگیر

گرچه ماند در نبشتن شیر و شیر......(۳)

پاک لوگوں کی سیرت کو اپنے اوپر قیاس مت کرو، وہ جو استغفر اللہ کہتے ہیں تو کسی اور وجہ سے کہتے ہیں، آپ استغفر اللہ کسی اور وجہ سے کہتے ہیں، ایک آدمی نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے استغفر اللہ کرتا ہے جبکہ ایک آدمی نماز پڑھ کر استغفر اللہ کرتا ہے کہ میں نے جو نماز پڑھی ہے وہ بے ادبانہ اور گستاخانہ نماز پڑھی ہے اور اس کی طرف توجہ نہیں تھی۔

مثلاً ایک آدمی فیل ہونے پر استغفر اللہ کر رہا ہے اور ایک کم نمبر لینے پر استغفر اللہ کر رہا ہے، دونوں کے درجات میں فرق ہے لہٰذا معصومین علیہم السلام معاذ اللہ دعاؤں میں اداکاری نہیں کرتے تھے کہ گویا یہ محض ایک اداکاری تھی اور نیت کے بغیر دعائیں کرتے تھے کہ اتنی مناجاتِ عالیہ بارگاہِ خدا میں کرتے تھے لیکن یہ ان کے دل کی پکار نہیں ہوتی تھیں، ہرگز بارگاہِ معصومین علیہم السلام کے بارے میں ایسا تصور نہیں کرنا چاہئے بلکہ صدقِ دل سے معصومین علیہم السلام نے یہ دعائیں اپنے لئے کی ہیں، یہ مناجاتِ شعبانیہ اپنے لئے کی ہیں، راویوں نے سن کر ان کو ہمارے لئے نقل کیا ہے نہ کہ فقط ہمیں تمرین اور

مشق کروانے کے لئے معصومین علیہم السلام نے یہ ساری دعائیں بیان کی ہیں۔

۵)قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں

اسی طرح قرآن مجید میں جب کسی جگہ بنی اسرائیل کا تذکرہ آجاتا ہے، قوم لوط علیہ السلام کا تذکرہ آجاتا ہے، قوم نوح علیہ السلام کا تذکرہ آجاتا ہے، کہیں قصۂ آدم علیہ السلام ہے، کسی جگہ قصۂ ابراہیم علیہ السلام ہے اور کسی مقام پر مثلاً قصۂ فرعون ونمرود وشداد وقارون وہامان ہے، جب ہم ان قصوں میں وارد ہوتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خطاب جو فرعون کے لئے آیا ہے تو یہ صرف فرعون کیلئے ہے، یہ خطاب جو بنی اسرائیل کیلئے آیا ہے تو بنی اسرائیل مخاطب ہیں، یہ خطاب جو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے آیا ہے تو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں یا یہ خطاب جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے آیا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں، پس قرآن کی کسی آیہ میں ہمارا نام نہیں ہے لہٰذا ہم مخاطب نہیں ہے، اگر کوئی اس ذہنیت کے ساتھ قرآن پڑھ رہا ہو تو اس کیلئے قرآن ایک علمی کتاب ہے لیکن ہدایت کی کتاب نہیں ہے۔ علمی کتابیں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے تاریخ کی کتابیں ہیں، تاریخ میں تذکرے فراواں ہیں لیکن کسی چیز کا موضوع ہم خود نہیں ہیں، کسی کا موضوع کوئی بادشاہ ہے، کسی کا موضوع رعیت ہے، کسی کا موضوع دشمن ہے، کسی کا موضوع دوست ہے، کسی کا موضوع وزیر ہے، کسی کا موضوع کچھ اور ہے لیکن تاریخ میں کسی بھی جگہ ہم خود موضوع نہیں ہیں، تاریخ وار کتاب نہ پڑھیں یعنی کلامِ خدا کو اس طرح سے نہ پڑھیں چونکہ یہ ھدی للناس ہے یعنی فرد فردِ بشر کے لئے ہدایت ہے لہٰذا اس کے معانی یہ ہیں کہ فرد

قرآن کو فقط علمی کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں

فردِ بشر مخاطبِ قرآن ہے، پس قرآن پڑھتے ہوئے انسان یہ یقین پیدا کرلے کہ میں مخاطَبِ اصلیٔ قرآن ہوں اور یہ مجھے کہا جارہا ہے۔

٦) مُخَاطَبِ قرآن نہ بننے کا نقصان

محرم میں اکثر اعلان ہورہے ہوتے ہیں کہ فلاں صاحب فلاں کیمپ (Camp) میں آجائیں، فلاں آدمی فلاں جگہ آجائے یا مثلاً دو آدمی مل کر حرم گئے اور وہاں ایک دوسرے سے دور ہوگئے تو ایک آدمی اطلاعات میں جاکر اعلان کرواتا ہے کہ میرا وہ ساتھی یہاں پر آجائے لیکن ہم اس پر کان بھی نہیں دھرتے ہیں، ہماری موجودگی میں شاید سو دفعہ حرم میں اعلان ہوتا ہے کہ زید وہاں آجائے، بکر وہاں آجائے، عمرو وہاں آجائے لیکن ہم کسی خطاب پر کوئی عکس العمل نہیں دکھاتے ہیں، ہم اپنے عمل میں مشغول رہتے ہیں، اگر نماز پڑھ رہے ہیں تو نماز پڑھتے رہتے ہیں، اگر مفاتیح پڑھ رہے ہیں تو مفاتیح میں مشغول ہیں، اگر قرآن میں مشغول ہیں تو قرآن پڑھ رہے ہوتے ہیں چونکہ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ یہ خطابات ہم سے نہیں ہیں، ہمیں نہیں بلایا جارہا ہے لہٰذا ہم کمالِ آسودگی سے بیٹھے رہتے ہیں اور عکس العمل نہیں دکھاتے ہیں۔

اسی طرح قاریانِ قرآن جب قرأت قرآن کرتے ہیں تو بڑی اچھی دھن میں، بڑے اچھے سر میں اور بڑے اچھے انداز سے پڑھتے ہیں، بہت خوبصورت مخارج ادا کرتے ہیں اور تجوید و قرأت کے سارے فنون اس پر لاگو کرتے ہیں، حافظانِ قرآن نے سارا قرآن از بر کیا ہوا ہوتا ہے،

مفسرانِ قرآن ایک ایک آیہ کے ایک ایک لفظ کو تحلیل و تجزیہ کر کے پیش کرتے ہیں اور کتابیں چھاپتے ہیں لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی انسان کسی مورد میں بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ اصلی مخاطَبِ قرآن میں خود ہوں یعنی درحقیقت ایک مقدس متن کے طور پر اور فقط ثواب کے حصول کیلئے میں حفظ نہیں کر رہا یا پڑھ رہا بلکہ اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ یہ خطاب میرے مولا کی طرف سے خود مجھ سے ہے۔ خطاباتِ قرآنی کے مقابلے میں ہمارا عکس العمل اس وجہ سے نہیں ہے یعنی ہماری زندگی مطابق بہ خطاباتِ قرآنی اس لئے نہیں ہے چونکہ ہم اپنے آپ کو مخاطَبِ قرآن نہیں سمجھتے ہیں۔

قرآن نے اگر کہیں روکا ہے تو ہم رکتے نہیں ہیں، قرآن نے اگر کہیں امر کیا ہے تو ہم اٹھتے نہیں ہیں، قرآن نے اگر وعدہ دیا ہے تو ہم اس وعدے سے امیدوار نہیں ہوتے ہیں، قرآن نے اگر دھمکی دی ہے تو ہم ڈرتے نہیں ہیں، قرآن نے اگر جہنم کا کہا ہے تو ہمیں پرواہ نہیں ہوتی ہے، قرآن نے اگر جنت کا کہا ہے تو ہمیں آرزو نہیں ہوتی ہے، قرآن نے اگر توبیخ و سرزنش کی ہے تو ہم متاثر نہیں ہوتے ہیں، قرآن نے اگر کسی کی مدح کی ہے تو ہم اس طرف جانے کی کوشش نہیں کرتے، اس لئے کہ قرآن کا مخاطب بن کر نہیں پڑھتے ہیں۔ قرآن کو قاری بن کر پڑھتے ہیں، ایک حافظ کے طور پر قرآن پڑھتے ہیں کہ ایک آیہ کو بیس دفعہ دہراتے رہیں تا کہ ذہن نشین ہو جائے، ذہن نشین کرنے کے لئے قرآن پڑھتے ہیں فقط اس لئے کہ یہ خطاب میرے ذہن سے کہیں باہر نہ چلا جائے، اسی طرح تقریر کرنے کے لئے، خطاب کرنے کے لئے اور لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ہم قرآن پڑھتے ہیں یا مثلاً کتاب لکھنے کے لئے، تفسیر لکھنے کے لئے اور متعدد جلدیں بنانے کے لئے ہم قرآنی

آیات کا مطالعہ کرتے ہیں، غور و تدبر کرتے ہیں لیکن مخاطب بن کر قرآن نہیں پڑھتے ہیں، ممکن ہے کہ ہم قرآنی آیات سے دقیق ترین تجزیئے اور تحلیلیں کریں لیکن پھر بھی قرآن ہمیں کچھ عطا نہیں کرے گا چونکہ ہم اپنے آپ کو مخاطَبِ قرآن نہیں سمجھتے ہیں۔

۷)انسان عکس العمل کب دکھاتا ہے؟

قرآن کے مقابلے میں عکس العمل دکھانے کیلیئے ادب یہی ہے کہ انسان قرآن کا مُخاطَبْ قرار پائے یعنی یہ کہے کہ یہ پورا قرآن مجھ سے مُخاطِبْ ہے، یعنی اس طرح سے ذہنیت ہو کہ روئے زمین پر فقط تنہا میں ہوں اور یہ سارا قرآن فقط مجھ سے خطاب کر رہا ہے، ہر ہر آیت اور ہر ہر لفظِ قرآن درحقیقت مجھے پکار رہا ہے، اگر کمزوریاں بتا رہا ہے تو میری بتا رہا ہے، اگر عیب بتا رہا ہے تو میرے بتا رہا ہے، اگر سرزنش کر رہا ہے تو میری کر رہا ہے، اگر دھمکی دے رہا ہے تو مجھے دے رہا ہے، اگر وعدۂ عذاب دے رہا ہے تو مجھے وعدۂ عذاب دے رہا ہے، اگر کسی مطلب کو جتلا رہا ہے تو مجھے جتلا رہا ہے، جب انسان اس طرح سے مخاطب بنے تو عکس العمل دکھاتا ہے۔

جس طرح سے ان خطابات میں کہ جن میں مخاطب ہم ہی ہوتے ہیں مثلاً جہاں پر ہمیں کہا جاتا ہے کہ آیئے آپ کھانا کھالیں تو ہمیں پتہ ہے کہ ہمیں ہی کہہ رہے ہیں لہٰذا فوراً اٹھ بیٹھتے ہیں، اگر کوئی کہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے اٹھ جایئے تو ہم وہاں پر رک جاتے ہیں چونکہ ہمیں پتہ ہے کہ ہمیں کہہ رہے ہیں اور اگر اس پر کان نہ دھریں تو دوبارہ متوجہ کر کے کہتا ہے کہ بھائی آپ سے کہہ رہا

ہوں یعنی متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ اٹھئے لیکن قرآنی خطابت میں ہماری یہ ذہنیت نہیں ہے، کیوں نہیں ہے؟ کیونکہ ہم اسے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مقدس کتاب ہے، مقدس متن ہے کہ جس کے پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے یعنی معاوضہ ملتا ہے، جیسے اسکول میں پڑھنے سے ڈگری (Degree) ملتی ہے، کالج کی کتابیں پڑھنے سے سند ملتی ہے، یہ پڑھنے سے ملازمت ملتی ہے، یہ پڑھنے سے شہرت ملتی ہے، یہ پڑھنے سے مرید زیادہ ہوتے ہیں، یہ پڑھنے سے مقلد زیادہ ہوتے ہیں، یہ سب معاوضے ہیں درحالیکہ قرآن اس لئے نہیں آیا ہے کہ آپ قرآن پڑھو تو پھر آپ کو قرآن سے باہر ایک معاوضہ دیا جائے گا۔

جس طرح آج کل قرآن کے مقابلے ہوتے ہیں، اس میں بچوں سے کہتے ہیں کہ قرآن پڑھو تو آپ کو ٹرافی دیں گے، سائیکل دیں گے، یادگاری شیلڈ دیں گے یعنی اس کو غیر قرآنی جائزہ، غیر قرآنی انعام دے دیتے ہیں، کسی کو کمپیوٹر دے دیتے ہیں، کسی کو ریٹرن ٹکٹ دے دیتے ہیں اور کسی کو تفریح کا کوئی اور سامان دے دیتے ہیں۔ یہ بچہ جب قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو مخاطب نہیں سمجھ سکتا ہے چونکہ وہ قرآن کو جائزے کے لئے پڑھ رہا ہوتا ہے، وہ قرآن اس شے کے لئے پڑھ رہا ہے، بچوں کو اگر قرآن سکھانا ہے تو ان کی صحیح بنیادوں پر تربیت کریں، پہلے بھی بیان کیا تھا کہ بچوں کو سرکس کے حیوان نہیں بنائیں، ان کو سرکس کے گھوڑے نہیں بنائیں، ان کو قرآنی کرتب نہ سکھائیں کہ یہ کچھ قرآنی کرتب سیکھ کر لوگوں کو محظوظ کریں، یہ تربیتِ قرآنی نہیں ہے، تربیت قرآنی یہ ہے کہ بچے کو اس طرح سے بنادیں کہ اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن سمجھیں، بچہ یہ سمجھے کہ میں قرآن کا مُخاطَبْ

انسان عکس العمل کب دکھاتا ہے؟

ہوں، قرآن مجھے پکار کر کہتا ہے اور جب انسان قرآن کا مخاطب بنتا ہے تو یہ سارا قرآن اس کے وجود میں اترتا ہے۔

۸) مُخَاطَبْ بننے کے ثمرات

جب ہم اپنے آپ کو ہر ہر آیت کا مخاطب سمجھتے ہیں تو قرآن ہماری روحوں کے اندر اثر کرتا ہے اور ہماری روحوں کے اندر اترتا جاتا ہے۔ ہم قرآن کو اجنبی بن کر پڑھتے ہیں یعنی لاتعلق ہو کر قرآن پڑھتے ہیں کہ کوئی خطاب اپنی طرف آنے ہی نہیں دیتے، اول تو قرآنی آیات کو ان کے شانِ نزول کے ساتھ منحصر سمجھتے ہیں کہ یہ فلاں منافق کے بارے میں تھی، یہ فلاں کافر کے بارے میں تھی، یہ فلاں مومن کے بارے میں تھی یعنی دوسرے کو بھی اس میں شامل نہیں سمجھتے ہیں نہ فقط اپنے آپ کو مخاطبِ آیہ نہیں سمجھتے ہیں بلکہ کسی اور کو بھی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ اس کو مختص و منحصر از شانِ نزول سمجھتے ہیں کہ یہ آیہ فلاں شخص کے بارے میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر ہم دوسروں کو بھی اس میں شامل کرنا چاہیں تو اپنے علاوہ سب کو شامل کرتے ہیں مثلاً جتنی بھی سرزنش کی اور نفاق کی آیات پڑھتے ہیں تو ایک نیم نگاہ اپنے مخالفین پہ رکھی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ساری منافقت کی آیات ان کے بارے میں ہیں لہٰذا جب ہمیں موقع ملتا ہے تو جتنی نفاق کی آیات ہیں وہ اپنے مخالفین، اپنے رقیبوں اور اپنے حریفوں پر فٹ (Fit) کرتے ہیں یعنی اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن نہیں سمجھتے ہیں۔

اسی طرح بسا اوقات سوال بھی کرتے ہیں کیونکہ عوام اور طلبہ میں بھی یہ ایک عام معمول اور

نقص ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے، سوال انسان کے اپنے لئے ہونا چاہئے لیکن بعض اپنے لئے سوال نہیں کرتے ہیں بلکہ کسی دوسرے کو سنانے کیلئے کرتے ہیں مثلاً مجلس میں فلاں آدمی بیٹھا ہوا ہے کہ جس سے میری آج کے دن کوئی گفتگو ہوئی تھی یا کسی بات پر اختلاف تھا تو مجلس میں یا کسی گفتگو میں آکر سوال کرتا ہے کہ مولانا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور جب وہ جواب دے رہے ہوتے ہیں تو بار بار اس کو متوجہ کرتا ہے کہ اب تم اس کو سنو، یہ سوال اس کا اپنا نہیں ہے لہذا یہ جواب کی طرف بھی توجہ نہیں کرتا ہے چونکہ سوال اس نے کسی اور کے لئے کیا تھا لہذا جواب بھی کسی اور کے لئے مانگ رہا ہے۔

نہج البلاغہ ہم پر کیوں اثر نہیں کرتی ہے؟ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ نہج البلاغہ کے مُخاطَب کوفی لوگ ہیں، امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کی، اپنے پیروکاروں کی اور اپنی سپاہ کی سرزنش کی ہے، انہیں سخت سست کہا ہے اور کہا کہ تم بدترین لوگ ہو جو مجھے میسر آئے ہو، ہم اصلاً نہج البلاغہ کے ان خطبوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور خود کو مخاطب نہیں سمجھتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اشعث ابن قیس اور فلاں فلاں کے بارے میں ہیں، یہ سب ہمیں نہیں کہا ہے اور ہم میں تو یہ صفات موجود نہیں ہیں، اپنے نفس کو تبریہ کرتے ہیں۔ ہمیشہ سب سے پہلے اپنے آپ کو مخاطب قرار دیں، اگر خود اس فلٹر (Filter) سے درست گزر گئے، اگر خود اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ لیا تو پھر ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی حالت بھی ہمیں نظر آئے یا کسی دوسرے کو بھی مخاطبِ قرآن بنانے میں مدد کر سکیں، مُخاطَبِ قرآن بننا ہنر ہے، اس نکتے پر غور فرمائیں کہ مفسرِ قرآن بننا بہت آسان ہے، حافظِ قرآن

بننا بہت آسان ہے، قاریٔ قرآن بننا بہت آسان ہے لیکن مُخاطَبِ قرآن بننا بہت مشکل ہے اور یہ سب سے بڑا ہنر ہے۔

اگر آپ نے اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن بنادیا مثلاً بڑے نامی گرامی مفسر جیسے علاّمہ طباطبائیؒ کہ جن کا مقامِ تفسیری بہت بلند اور عالی ہے، بعض اوقات کسی کے ذہن میں آتا ہے کہ آیا ہوسکتا ہے کہ میں بھی ایک دن علامہ طباطبائیؒ کی طرح تفسیرِ قرآن کروں؟ تو آپ کر سکتے ہیں، علامہ بننا کوئی مشکل کام نہیں ہے، اگر آپ محنت و زحمت کریں تو آپ علامہ طباطبائیؒ سے بھی بالاتر مفسر بن سکتے ہیں، علامہ طباطبائیؒ بھی آپ کی طرح تھے، انہوں نے محنت کی، کوشش کی اور لطفِ خدا شاملِ حال ہوا پھر خدا نے نورِ قرآن ان کے سینے میں اتار دیا اور مفسرِ قرآن بنے، یہ کام آپ بھی کر سکتے ہیں اور آسانی سے کر سکتے ہیں۔ فرض کریں اس وقت جو حفاظِ قرآن ہیں کہ جو بیس طریقوں سے قرآن پڑھتے ہیں، الٹا پڑھتے ہیں، سیدھا پڑھتے ہیں، دائیں سے بائیں پڑھتے ہیں، بائیں سے دائیں پڑھتے ہیں، مثلث پڑھتے ہیں، کراس پڑھتے ہیں، دائرہ پڑھتے ہیں، سرکس کے جتنے کرتب ہیں سارے انہوں نے سیکھے ہوئے ہیں، خصوصاً جب چھوٹا بچہ یہ کام کر رہا ہوتا ہے تو بڑے انسان کو بڑی حسرت ہوتی ہے کہ یہ سب چھوٹا سا بچہ کر رہا ہے اور میں ایک آیت بھی درست نہیں پڑھ سکتا ہوں، آپ بھی یہ کام کر سکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ بڑا کام کر سکتے ہیں لیکن اگر اپنے آپ کو مخاطبِ قرآن نہیں بنایا تو یہ سب کچھ کر کے بھی آپ کسی بڑے مقام پر نہیں پہنچ سکتے۔

اگر آپ تفسیرِ قرآن نہیں کر سکتے ہیں، حفظِ قرآن نہیں کر سکتے ہیں، درست قرأتِ قرآن

مخاطب بننے کے ثمرات

نہیں کر سکتے ہیں تو حرج نہیں ہے لیکن اگر آپ قرآن سے درست اثر لے سکتے ہیں تو آپ نے بڑا کام کیا ہے، اگر مخاطبِ قرآن بن سکتے ہیں تو آپ نے بڑا کام کیا ہے۔

۹)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ تربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن لوگوں کی تربیت کی وہ اس طرح سے نہیں کی کہ ان میں سے کسی کو بٹھا کر حفظ میں لگا دیا، کسی کو قرأت میں لگا دیا، کسی کو اِس فن میں، کسی کو اُس فن میں لگا دیا، ابوذرؓ کو کہا کہ آپ نے یہ فن سیکھنا ہے، سلمانؓ کو کسی اور فن پہ لگا دیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب کو مخاطبینِ قرآن قرار دیا یعنی پہلے مخاطب تیار کئے اور بعد میں قرآن سنایا۔ مخاطبِ قرآن بننا اہم ہے، انسان پہلے مخاطب بنتا ہے تو پھر قرآن دل میں اترتا ہے، اگر ہم ہدایت کرنا چاہتے ہیں، تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے مخاطب پیدا کریں یعنی اگر آپ کے مخاطب پہلے سے بنے ہوئے نہیں ہیں تو انہیں خود بنائیں۔

فرض کریں کہ ایک شخص مجلس پڑھنے جاتا ہے اور اس کی مجلس میں فراواں لوگ آجاتے ہیں تو یہ اس کے مخاطب نہیں ہیں، یہ کس کے مخاطب ہیں؟ یہ کسی شاعر کے مخاطب ہیں، کسی ذاکر کے مخاطب ہیں، کسی خطیب کے مخاطب ہیں۔ یہ مبلغ کے مخاطب نہیں ہیں، مبلغ نے اپنے مخاطبین خود بنانے ہیں، پہلے ان کا ذہن بنائے، ان کا دل بنائے، ان کو آمادہ کرے پھر جب مخاطبِ اصلی بن جائیں تب ان سے خطاب کرے تو معارفِ دینی ان کے دل میں اتریں گے، عموماً درسوں میں ایسے

ہوتا۔ کہ ہم کتابیں پڑھتے ہیں لیکن مخاطبینِ کتب نہیں ہوتے ہیں لہٰذا سارا علم کتابوں میں رہ جاتا ہے اور ہمارے اندر منتقل نہیں ہوتا ہے، ہم فقہ پڑھتے ہیں، اصول پڑھتے ہیں، کلام پڑھتے ہیں، عقائد پڑھتے ہیں، اخلاق پڑھتے ہیں لیکن ہمارے اندر ان کتب کا مواد ایک فیصد بھی منتقل نہیں ہوتا ہے بلکہ انہی صفحوں میں رہ جاتا ہے، کیوں رہ جاتا ہے؟ چونکہ ہم خود کو ان خطابات کا مخاطب نہیں سمجھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ فلاں اور فلاں کے بارے میں ہے۔

۱۰) قرآن کو قصۂ شب نہ سمجھیں

صاحبِ کتاب نے خوبصورت تعبیر کی ہے کہ جب آپ قصص انبیاء علیہم السلام پڑھتے ہیں تو ان کو آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ قصہ شب ہیں، یہ الف لیلیٰ کی داستانیں نہیں ہیں، الف لیلیٰ قصوں کی کتاب ہے یعنی ہزار راتیں، اصل لفظ اَلف ہے جس کو غلطی سے الف پڑھتے ہیں، الف لیلیٰ نہیں بلکہ اَلف لیلیٰ یعنی ہزار شب، ہزار داستان، قدیم زمانے میں جب لوگوں کی زندگیوں میں کمپیوٹر داخل نہیں ہوا تھا اور جب ساری رات چیٹنگ (Chatting)، انٹرنیٹ (Internet) اور یہ کام نہیں ہوتے تھے حتیٰ یہ لوگ بجلی سے بھی محروم تھے لیکن بعد میں خصوصاً ٹی وی نے بھی وہ ماحول تھوڑا توڑ دیا لیکن دیہاتوں میں ابھی بھی یہ ماحول ہے کہ لوگ راتوں کو ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں خصوصاً سردیوں کی راتوں میں چونکہ گرمی کی رات چھوٹی سی ہوتی ہے، ان میں مشترک فیملیز (Families) بھی ہوتی تھیں لہٰذا یہ لوگ سردیوں کی راتوں میں ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے، پھر گھر کا بڑا آدمی، کوئی خاتون یا

مرد جو اچھی زبان رکھتا ہو، اچھا حافظہ رکھتا ہو کوئی نہ کوئی داستان چھیڑ دیتا تھا، یہ لوگ فرضی کہانیاں اور قصے بیان کرتے تھے، یہ شبانہ قصے کس لئے تھے؟ رات کاٹنے کے لئے تھے، ان قصوں کا مقصود فقط ایک ہوتا تھا کہ کسی طرح سے رات کٹ جائے۔

آج کل کی ڈیجیٹل (Digital) نسل کو یہ معلوم نہیں ہے کہ داستانِ شب کیا ہوتی ہے؟ رات کاٹنے کے لئے کہانیاں قصے کیا ہوتے ہیں؟ البتہ بعض جگہوں پر یہ معمول ہے ابھی بھی اس نسل کے آثار باقی ہیں کہ ان کو چیٹنگ (Chatting) پر مزہ نہیں آتا ہے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر مستقل چیٹنگ کرتے ہیں یعنی گھر سے باہر آ کر روڈ پہ، چوک پر یا کسی نالے کے کنارے بیٹھ کر ساری رات گفتگو کرتے رہتے ہیں، یہ گفتگو کیوں ہوتی ہے؟ فقط ٹائم پاس کرنے کے لئے کہ کسی طرح سے رات گزر جائے، اس کو قصہ شب کہتے ہیں، داستانِ شب اصطلاحی محاورہ ہے، داستانِ شب یعنی رات کاٹنے کے لئے کوئی کہانی سنانا، اکثر کہانیاں اور افسانے اسی لئے بنے ہیں کہ لوگوں کو رات کاٹنے کے لئے مشکل پیش آتی تھی۔

صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ قرآن کو قصۂ شب نہ سمجھو، یعنی قصص قرآن جو انبیاء علیہم السلام کے یا امتوں کے متعلق ہیں ان کو یہ نہ سمجھو کہ یہ داستانِ شب ہیں مثلاً معاذ اللہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ داستان شب ہے۔ داستانِ شب وغیرہ ایک دوسرے کو محظوظ کرنے اور فقط ٹائم پاس کرنے کے لئے ہیں، کہانیوں کا فن یہیں سے شروع ہوا ہے چونکہ انسان کو ٹائم پاس کرنے کے لئے کچھ مواد کی ضرورت ہے، بیکاری انسان کے لئے جہنم ہے، فراغت عذاب ہے لہٰذا فراغت کے لمحات کو پر کرنے

کے لئے قصے، داستانیں، کہانیاں، ڈرامے اور فلمیں بنائی گئی ہیں اور اس صنعت کی ساری رونق اسی وجہ سے ہے چونکہ بے کار لوگ بہت ہیں، اگر انسان کے پاس بیکاری نہ ہو تو سرے سے یہ ساری صنعتیں ایک دم ٹھپ ہو جائیں گی، جس ملک میں لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہ ہو وہاں یہ صنعتیں اتنی زیادہ نہیں ہیں، لیکن ہم داستانِ قرآن وقصصِ قرآنی کو قصہ شب نہ سمجھیں، ان ساری داستانوں میں ہم ہیں۔

☆خود کو قلبِ قصہ میں ڈھال کر پرکھیں

اگر ہم قرآنی مخاطب بن جائیں تو قصوں کے مخاطب بھی بن سکتے ہیں لیکن کس ذہنیت سے اور کس نفسیات سے انسان نگاہ کرے؟ مثلاً فرض کریں کہ آپ فلم دیکھ رہے ہیں اور وہ ایسی حماسی فلم ہے کہ جس کے اندر ہیرو کوئی اچھا کام کر رہا ہے، بچہ جب یہ فلم دیکھ رہا ہوتا ہے تو وہ کہانی کے اندر چلا جاتا ہے، وجدانی، روحی اور ذہنی طور پر بچہ باہر نہیں ہوتا ہے بلکہ کہانی، ڈرامے یا فلم کے اندر موجود ہوتا ہے یعنی محو ہوتا ہے، ممکن ہے کہ بڑا یہ کام نہ کر سکے لیکن بچہ جب ڈرامہ یا فلم دیکھتا ہے یا بچوں کی جو مثبت داستانیں ہیں ان میں بچہ خود اس ہیرو کی جگہ پہنچا ہوا ہوتا ہے، وہ ہیرو کے قالب میں اپنے آپ کو لے آتا ہے چونکہ وہ کہانی کا مخاطَب بنا ہے، ذہنی طور پر اس نے خود کو کہانی میں اتار لیا ہے اور جزوِ کہانی بن گیا ہے، کہانی پڑھنے والا نہیں بلکہ رول پلے (Role-play) کرنے والا ہے، بچے کو پسند نہیں ہوتا ہے کہ سپر مین یا کوئی اور ہیرو اچھا کام کر رہا ہو اور میں فقط اسکے لئے تالیاں بجا رہا ہوں،

وہ بچہ اس ہیرو کے قالب کے اندر روح بن کر اتر جاتا ہے یا یوں کہیں کہ وہ ہیرو بچے کے قالب میں روح بن کر آجاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں ہوں، سارا کارنامہ میں نے کیا ہے، اپنی ذہنیت میں تصور و تخیل کے اندر وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔

اسی طرح ہمیں قصصِ قرآنی کے اندر، قالبِ قصہ کے اندر چلا جانا چاہئے، قاریِ قصہ نہ بنیں بلکہ قالبِ قصہ کے اندر اتریں، مثلاً داستانِ بنی اسرائیل کہ جس میں مثبت اور منفی دونوں کردار ہیں، طالوت و جالوت کا قصہ کہ جس میں مثبت اور منفی کردار ہیں، اسی طرح سے حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داوٗد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے موجود ہیں، جب انسان آیاتِ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق پڑھ رہا ہو تو اس ادب سے پڑھے کہ خود ابراہیم علیہ السلام بن جائے، انسان ابراہیمؑ تو نہ بنے بلکہ سیرتِ ابراہیم علیہ السلام و اسوۂ ابراہیمی کے اندر اتر جائے کہ یہ میں ہوں جو منجنیق میں پڑا ہوا ہوں اور آگ میرے سامنے ہے، یہ بت میں نے توڑے ہیں، یہ نعرۂ توحید و اعلائے کلمۃ اللہ میں نے کیا ہے اور یہ سارے لوگ اس وقت میری طرف متوجہ ہیں، یہ چیز صرف پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتی ہے کہ انسان صرف ان آیات کو رٹ لے۔

☆ خود کو قالبِ قصہ میں ڈھال کر پڑھیں

اسی طرح کربلا کا میدان ہے، ایک ہے کربلا سن کر رونا اور ایک ہے کربلا میں پہنچنا، ان مصائب کے ذریعے سے اور ان شبیہوں کے ذریعے سے جو منظر بنایا جاتا ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان کربلا کے قالب میں پہنچ جائے، جب ہم مصائب میں سنیں کہ ایک شہیدِ کربلا میدان میں اترتا ہے تو ہم فقط یہ تصور نہ کریں کہ وہ میدان میں جا رہا ہے اور ہم فقط اس کا قصہ سن کر روتے رہیں،

بلکہ انسان کا اسوہ اس وقت کربلائی بنتا ہے کہ جب وہ خود اس قصے کے قالب میں پہنچ جائے یعنی میں اس شہید کے قالب میں جا رہا ہوں اور یہ سب میں کر رہا ہوں۔

کہانیوں اور قصوں میں منفی اور مثبت دونوں کردار ہوتے ہیں مثلاً جب داستان میں ایک منفی کردار پیش کیا جاتا ہے تو انسان یہ دیکھے کہ کہیں میں تو اسکے قالب میں نہیں ہوں؟ کہیں یہ میرا روپ تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں کہانی کے اس کردار کی شکل میں باہر آ گیا ہوں؟ مثلاً کسی کہانی کے اندر ایک دھوکہ باز، ایک فریب کار کا کردار ہے تو انسان یہ نہ سمجھے کہ کہیں یہ دھوکہ باز میں تو نہیں ہوں؟

بچوں کی کہانیوں اور بڑوں کی داستانوں میں بعض جگہ احمق اور بیوقوفی کے کردار بھی ہیں کہ ایک آدمی کو بیوقوف کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کو دیکھ کر ہم فقط ہنستے ہیں، وہ ہمیں محظوظ کرنے کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ ہمارا آئینہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ یہ بیوقوف کہیں میں تو نہیں ہوں؟ کہیں میں تو مسخرہ عالم نہیں بنا ہوا ہوں؟ کہیں یہ میری روح تو نہیں کہ جو جسم کی صورت میں فلم اور کہانی میں دکھائی جا رہی ہے کہ تم بھی تو ایسے ہی احمق ہو مثلاً بچوں کیلئے بلی اور چوہے کا جو کارٹون ہے کہ جسے بچوں سے زیادہ بڑے زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں اس میں بلی عموماً چوہے سے شکست کھا جاتی ہے یعنی بلی ہمیشہ رسوا ہوتی ہے باا ینکہ بلی شکاری ہے اور چوہا بزدل اور ضعیف و ناتوان، لیکن اس کہانی میں بلی کو احمق، بیوقوف اور سفیہ بتایا گیا ہے، بچہ جب یہ دیکھتا ہے تو اس کو چوہا بننا پسند آ جاتا ہے چونکہ چوہا ایک ماہر چالاک، ہوشیار، زیرک اور بافراست ہوتا ہے، اس لئے بچہ پسند کرتا ہے کہ چوہا بنے یعنی

☆ خود کو قلبِ قصے میں ڈھال کر رکھیں

آپ بچے سے پوچھیں کہ آپ ان میں سے کون ہو؟ ٹام یا جیری، تو وہ کیا کہے گا؟ میں جیری ہوں چونکہ ٹام بیوقوف واحمق ہے اور ہمیشہ جیری کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے لہٰذا بچہ پسند کرتا ہے کہ وہ اچھا کردار میں بنوں؟ لہٰذا انسان منفی کردار کو بھی اپنے اوپر تصور کر کے پرکھے کہ کہیں میں تو اسکے قالب میں نہیں ہوں اور اتفاق سے بچپن میں یہ تصور ہوتا ہے لیکن بڑے ہو کر ہم لاتعلق ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے کردار نہیں ہیں۔

۱۱) حیوانات اور دیگر موجودات سے عبرت

روایت میں ہے کہ عبرتیں اسی طرح سے لینی ہیں، روایت میں ہے کہ یہ حیوانات جو تمہارے اطراف میں گھوم رہے ہوتے ہیں یہ تمہاری صفات کا تجسم ہیں لہٰذا تم ان سے عبرت لو۔ ہم آیاتِ قرآن کے مخاطب بھی بنیں اور آیاتِ تکوینی کے مخاطب بھی بنیں، یہ حشرات جو روزمرہ ہماری زندگی میں دخیل ہیں، فرض کریں یہ گھریلو مکھی کہ جس کا ہم سے روز سروکار ہے، اس مکھی کو اگر انسان عبرت کے طور پر دیکھے کہ آیا میں بھی کہیں مکھی تو نہیں ہوں؟ مکھی کا کیا کام ہے؟ ہمیشہ غلاظت پر بیٹھنا، ہمیشہ گندگی پر بیٹھنا، انسان سوچے کہ کہیں میں بھی تو ایسا نہیں ہوں؟ میں بھی ہمیشہ گندی صفات، گندے افعال، گندی سوچ اور گندے کردار کی طرف مائل ہوں، یہ مکھی میرے گھر میں بار بار کیوں آتی ہے؟ میری ناک پہ بیٹھتی ہے، صرف متوجہ کرنے کے لئے کہ تم بھی میری طرح ہی ہو چونکہ حیوانات تجسمِ اعمالِ انسان اور تجسمِ صفاتِ انسان ہیں، ہر جانور میں انسان ہی کی ایک صفت

مجسم ہوتی ہے، ان سے عبرتیں لیں۔ یعنی خدا نے مجھے مخاطب قرار دینے کے لئے آیاتِ تدوینی بھی نازل کی ہیں اور آیات تکوینی بھی خلق کی ہیں اور پھر مجھے کہا ہے کہ

لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ......(۴)

یقیناً ان کے واقعات میں صاحبانِ عقل کے لئے سامان عبرت ہے......

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّ آثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ وَمَا کَانَ لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّاقٍ٥(۵)

کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے والوں کا انجام کیا ہوا ہے جو ان سے زیادہ زبردست قوت رکھنے والے تھے اور زمین میں آثار کے مالک تھے پھر خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی گرفت میں لے لیا اور اللہ کے مقابلے میں ان کا کوئی بچانے والا نہیں تھا۔

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ......(۶)

اسی طرح کہیں فرمایا کہ

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ......(۷)

فَاعۡتَبِرُوۡا یَا اُولِی الۡاَبۡصَارِ٥(۸)

تو صاحبانِ نظر عبرت حاصل کرو۔

یعنی ان قصوں میں صاحبانِ بصیرت کے لئے عبرت ہے، کیا وہ زمین پر گھوم پھر کر نہیں

دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا؟ اے اولی الابصار عبرت لو، اگر اولی الابصار نہیں ہو تو عبرت نہیں لے سکو گے اور اس وقت ہمیں یہ چیزیں لاتعلق نظر آئیں گی یعنی ہم ان سے لاتعلق اور وہ ہم سے لاتعلق، جب بھی انسان کوئی منظر دیکھتا ہے تو اس مخاطِب کا منظر بنے۔

۱۲)قرآن کی ہر آیہ میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں

انسان قرآن کا مخاطَب بن کر اس کے اندر موجود پیغام دریافت کرے یعنی قرآن پڑھنے کے لئے یہ طے کرلو کہ جب بھی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

یا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پڑھو تو آیت کا مُخَاطَبْ بن کر پڑھو، یعنی ہر آیت کے اندر جو میرے لئے ایک مخصوص پیغام ہے وہ مجھے اس آیت سے تلاش کرنا ہے کہ یہ آیت مجھے کیا دے رہی ہے؟ ہر چند اس میں میرا نام نہیں ہے، ممکن ہے کہ مثبت آیت ہو اور ممکن ہے منفی آیت ہو کہ جس طرح استخارہ میں خوب و بد کہتے ہیں، اگر کسی ظالم و مشرک و کافر کا قصہ ہو تو کہتے ہو کہ یہ استخارہ درست نہیں ہے اور اگر مومنین کا تذکرہ اور مجاہدین کا تذکرہ ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خوب ہے، یہ کام ہو جائے گا حالانکہ دونوں چیزوں میں اصلاً ربط نہیں ہے، اسی طرح سے انسان جب مثبت مضمون کی آیات پر آئے تو دیکھے کہ ان کے اندر میرے

لئے کیا پیغام موجود ہے اور اگر منفی مضمون کی آیات ہیں کہ جو سرزنش کر رہی ہیں تو ان میں بھی تلاش کرے کہ ان آیات کے اندر میرے لئے شخصاً کیا پیغام ہے، ممکن ہے خصوصاً کسی اور کے لئے پیغام ہو لیکن شخصاً ہر آیت کے اندر میرے لئے پیغام ہے اور مجھے اس پیغام تک پہنچنا ہے، جب تک میں خود اس پیغام تک نہیں پہنچتا تو اس کا مطلب ہے کہ ابھی قرآن نہیں سمجھا ہوں۔

مثلاً مجھے معلوم ہو جائے کہ ابن عباس نے، مجاہد نے اور قطادہ و مقاتل نے اس آیت کے ذیل میں کیا کہا ہے لیکن میں پھر بھی ابھی قرآن نہیں سمجھا ہوں، زمخشری کی ساری تفسیر حفظ بھی کرلوں اور مبتدا و خبر و عامل و معمول سب کچھ معلوم بھی ہو جائے تو بھی ابھی قرآن مجھ سے حل نہیں ہوا ہے کہ جب تک میرا پیغام قرآن مجھے نہیں دیتا ہے، ہر آیت سے میرے لئے ایک پیغام ہونا چاہیے، یہ اصلی ادبِ قرآن ہے، اس ادب کے بغیر قرآن جب پڑھا جاتا ہے تو مفسر پیدا ہوتا ہے، حافظ پیدا ہوتا ہے، قاری پیدا ہوتا ہے، استادِ قرآن پیدا ہوتے ہیں، انسان سب کچھ بن جاتا ہے لیکن انسانِ قرآنی نہیں بن سکتا ہے۔

قرآن کی ہر آیت میں اپنے لئے پیغام تلاش کریں

ہم کس طرح سے مُخاطَب بنیں؟ مثلاً آیاتِ اوامر ہیں کہ جن کے اندر امر ہے، خواہ وہ امر بنی اسرائیل کے لئے ہے یا قرآن کی دیگر داستانوں کے ضمن میں ہے یا قرآن کا کوئی شرعی اور فقہی امر ہے، کسی قسم کا بھی امر ہے لیکن وہ خدا کا امر ہے، یہ امر جب انسان کو قرآن میں نظر آئے تو انسان سمجھے کہ مامور میں ہوں مثلاً قرآن میں جب کہا جاتا ہے کہ نیکی کرنے اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو تو انسان یہ سمجھے کہ یہ مجھے کہا جا رہا ہے، اسی طرح تمام منہیات کہ

جو قرآن میں فراواں ہیں، نواہی یعنی جن چیزوں سے قرآن نے روکا ہے، قرآن نے مختلف طبقوں کو مختلف چیزوں سے روکا ہے مثلاً بعض کو کہا ہے کہ جھوٹ نہ بولو، بعض کو کہا کہ چوری نہ کرو، کسی کو کہا ہے کہ غیبت نہ کرو، کسی کو کہا ہے کہ گناہ نہ کرو، معصیت نہ کرو، بعض کو کہا ہے کہ خیانت نہ کرو اور ممکن ہے کہ کسی خاص طبقے کی طرف اشارہ ہو مثلاً کسی چیز سے عورت کو روکا گیا ہو یا کسی مرد کو کہا گیا ہو کہ یہ کام نہ کرو تو فرق نہیں ہے، اگر عورتوں کو فواحش سے روکا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے منع کیا جا رہا ہے، انسان ان تمام اوامر و نہی کا خود کو مُخاطَب سمجھے۔

۱۳) قرآن کا اندازِ تخاطب خطابی ہے

قرآن کا اپنا ایک انداز اور اسلوب ہے چونکہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کتابی زبان نہیں ہے یہ بعض اہلِ تفسیر کا نکتہ ہے لیکن کسی نے بہت خوبصورت اور لطیف نکتہ بیان کیا ہے، لگتا ہے کہ قرآن سے مانوس تھا، انہوں نے فرمایا کہ قرآن کی زبان کتابی نہیں ہے بلکہ خطابی زبان ہے، کتابی زبان وہی اجنبی زبان ہوتی ہے، کتاب پڑھ کر انسان اپنے آپ کو مخاطِب نہیں کر رہا ہوتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو کسی ریاضی (Mathematics)، فزکس (Physics) اور کیمسٹری (Chemistry) کی کتاب کا مُخاطَب نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ ان میں کتابی زبان ہوتی ہے یا مثلاً فقہ کی کتاب ہے، فقہ کی زبان میں عموماً فرضی مثالیں ہوتی ہیں کہ زید نے یہ کیا، بکر نے یہ کیا، عمرو نے یہ کیا لیکن خطابی زبان میں بات کرنے کا ایک خاص اسلوب ہے، جیسے پہلے اشارہ کیا تھا کہ خطابی

زبان میں اسلوب یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی کردار مختلف روپ بدلتا رہتا ہے، جملے بدلتے رہتے ہیں، مثلاً ایک ہی آدمی کو اگر خطاب کرتے ہوئے دیکھیں تو وہ کبھی ضمیرِ متکلم استعمال کرتا ہے، کبھی ''ہم'' کہنا شروع کر دیتا ہے، کبھی ''آپ'' کہنا شروع کر دیتا ہے، کبھی ''تو'' کہنا شروع کر دیتا ہے، کبھی ''وہ'' کہنا شروع کر دیتا ہے لیکن اگر ''ہم'' کہے تو بھی مراد وہی چیز ہے، اگر ''آپ'' کہے تو بھی مراد وہی چیز ہے، اگر ''وہ'' کہے تو بھی مراد وہی چیز ہے یعنی اس کی ضمیروں کے فرق سے معانی کے اندر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

قرآن کا انداز تخاطب خطابی ہے

فرض کریں کہ کوئی خطیب آپ کے سامنے تقریر کر رہا ہو تو بعض جملوں میں ضمیریں بدل رہا ہوتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ ہم قرآن درست نہیں پڑھتے ہیں، آپ قرآن صحیح نہیں پڑھتے ہیں، لوگ قرآن درست نہیں پڑھتے ہیں یا انسان قرآن درست نہیں پڑھتے ہیں یہ مختلف لہجے ہو گئے لیکن مقصود سب میں ایک ہی تھا، یہ خطابی زبان ہے لیکن کتابی زبان میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ کبھی ''ہم'' کہہ رہے ہیں، کبھی ''آپ'' کہہ رہے ہیں، کبھی ''تم'' کہہ رہے ہیں اور کبھی ''تو'' کہہ رہے ہیں بلکہ کتابی زبان میں انسان اکتا جاتا ہے، مضطرب ہوتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتی ہے لیکن شفاہی خطاب میں یہ اسلوب ہے۔ قرآن کا انداز خطابی لہجے کا ہے، خطابی زبان کا یہ معمول ہے یا لازمہ ہے کہ خطابی زبان میں بعض اوقات سنایا کسی کو جاتا ہے اور مقصود کوئی اور ہوتا ہے یعنی حتماً ایسا ہوتا ہے نہ کہ کبھی کبھار ہوتا ہے، لوگ بھی جب بات کر رہے ہوتے ہیں تو اسی طرح سے کر رہے ہوتے ہیں مثلاً کسی اچھے کو سناتے ہیں اور مقصود کسی برے کو سمجھانا ہے یعنی ایک بہت اچھے آدمی کو کہہ رہے ہوتے ہیں کہ

یہ کیا کیا آپ نے؟ ایسے نہیں کرنا، تا کہ وہ دوسرا سمجھ جائے۔

محاوراتی زبان میں کہتے ہیں کہ کہے بیٹی کو سنائے بہو کو، ساس جب بہو کو سرزنش کرنا چاہتی ہے تو ڈائرکٹ (Direct) بہو کو نہیں کہتی ہے کہ ایسی کی تیسی بلکہ اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہوتی ہے اور بہو بھی سمجھ رہی ہوتی ہے، بیٹی ہنس رہی ہوتی ہے لیکن بہو کو مروڑ پڑ رہے ہوتے ہیں چونکہ اس کو پتہ ہے کہ یہ سب کچھ مجھے کہہ رہی ہے۔

اسی طرح فرض کریں کہ ایک آدمی نے سچ بولا ہے اور ایک آدمی نے جھوٹ بولا ہے، لیکن جس نے سچ بولا ہے اس سے جا کر کہتے ہیں کہ خبردار جھوٹ نہیں بولنا، تو اس نے تو جھوٹ نہیں بولا، وہ بھی نہیں کہتا ہے کہ مجھے کیوں کہہ رہے ہو، اسے بھی پتہ ہے کہ فقط سنایا مجھے جا رہا ہے اور کہا کسی اور کو جا رہا ہے، خطابی انداز یہی ہوتا ہے۔

قرآن میں بہت زیادہ خطاب ایسے ہیں کہ جہاں اللہ فرما رہا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ...... (۹)

یہ بھی ہمیں خطاب ہے یا یہ آیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ...... (۱۰)

یہ بھی ہمیں خطاب ہے چونکہ یوں تو نہیں ہے کہ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے لئے اترا ہے، یہ انسان کی ہدایت کیلئے اترا ہے، قرآن ھدی للناس ہے لیکن طریقۂ قرآن یہ ہے کہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے، کبھی اطرافیانِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے لیکن درحقیقت مقصودِ خطاب

ہر نسل ہے، ہر نسل کے ہر فرد کو خطاب ہے، اس لئے اجنبی ہو کر قرآن نہ پڑھیں۔

ہم اخبار پڑھتے ہیں تو اس اخبار میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو انسان کو خوشحال کرتی ہیں اور کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ جو پریشان کرتی ہیں مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایرانی اخبار پڑھا اور اس ایرانی اخبار میں لکھا ہوا ہے کہ پٹرول راشننگ شروع ہوگئی ہے تو آپ کہیں گے کہ یہ تو ایرانیوں کے لئے ہوئی ہے، ہمارے پاس پٹرول ہے نہ گاڑی ہے نہ کچھ اور ہے، اس خبر کا ہم سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے یا فرض کرلیں کہ فلاں ملک نے اپنی عوام کے لئے یہ قانون پاس کردیا ہے مثلاً ترکی کے اندر آئندہ سے یہ قانون پاس ہو جائے گا، آپ کہتے ہیں کہ یہ ترکی کیلئے ہے ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟ ہمیں کب ترکی جانا ہے؟ یہ اجنبی بن کر خبر پڑھنا ہے، صرف معلومات میں اضافہ کے لئے ہے، پورا اخبار پڑھ دیتے ہیں یا سن لیتے ہیں لیکن معلومات میں اضافے کے لئے کہ مطلع رہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

قرآن ہمیں فقط دنیا سے مطلع کرنے کے لئے نہیں آیا ہے، اپنے اردگرد سے باخبر کرنے کے لئے نہیں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں یوں ہوتا تھا، فلاں میں یوں ہوتا تھا، بلکہ قرآن سناتا بنی اسرائیل کو ہے اور سمجھاتا اہلِ قرآن کو ہے، قرآن سناتا اہلِ تورات کو ہے اور مقصود اہلِ قرآن ہیں، جب سورۂ جمعہ میں کہا جاتا ہے کہ

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا......(۱۱)

قرآن کا انداز تخاطب خطابی ہے

ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بار رکھا گیا اور وہ اسے اٹھا نہ سکے اس گدھے کی مثال ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو......

تو یہ وہی خطابی زبان ہے، یہ سنا تا کسی کو ہے اور مقصود کوئی اور ہے، قرآن کن لوگوں کو کہہ رہا ہے کہ اگر آسمانی کتاب لے لی اور آسمانی کتاب کے حامل بن گئے لیکن اس پر عمل نہ کیا اور وہ اپنی زندگیوں میں نہ اتاری تو آپ گدھوں کی طرح ہو؟ یہ کن کو کہا گیا ہے کہ اس کو ہر نمازِ جمعہ میں پڑھو؟ یا کم از کم روزِ جمعہ میں پڑھو؟ ہر چند کہ ان آیات میں نام یہود کا ہے لیکن یہ اہلِ قرآن سے کہا جا رہا ہے کہ اسے اس لئے پڑھو کہ مُخاطَب تم ہو،

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوْا اِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ...... (۱۲)

آپ کہہ دیجئے کہ یہودیوں اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تمام انسانوں میں تم ہی اللہ کے دوست ہو تو موت کی تمنّا کرو۔

سنایا کن کو جا رہا ہے؟ اے وہ لوگوں جو یہودی ہو لیکن سمجھایا کن کو جا رہا ہے؟ یَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو یعنی جو اپنے آپ کو مسلمان اور مومن کہتے ہو، اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو تو

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنتُمْ صَادِقِيْنَ٥

یعنی اگر اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنّا کرو۔ مخاطب بنیں، ان ساری آیات کے

قرآن کا اندازِ تخاطب خطابی ہے

مخاطب بنیں، جو سرزنش کر رہی ہیں ان کے بھی اور جو تعریف کر رہی ہیں انکے بھی، البتہ یہ مطلب بعد میں آئے گا کہ ہم کس طرح سے قرآن سے اثر لیں، ابھی یہ بات ہے کہ فقط قرآن کے مخاطب بنیں، اجنبی بن کر قرآن نہ پڑھیں، جس طرح سے سلیبس (Syllabus) کی کتابیں پڑھتے ہیں اسی طرح سے قرآن نہ پڑھیں، اتفاقاً ہم بچوں کو جب قرآن سکھا رہے ہوتے ہیں تو اسی وقت سے ہی ان کو اجنبی قرار دے کر قرآن سکھا رہے ہوتے ہیں، بسا اوقات شانِ نزول بھی بتا رہے ہوتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارے میں ہے، وہ فلاں کے بارے میں ہے، اگر تھوڑا بہت اس کے ذہن میں ہوتا بھی ہے کہ یہ میرے بارے میں ہے تو شانِ نزول سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ بس اب کنفرمیشن (Confirmation) ہوگئی ہے کہ یہ میرے بارے میں نہیں ہے، شانِ نزول اگر معنیٰ سمجھنے میں مدد دیتا ہے تو خوب ہے لیکن شانِ نزول میں مخاطب کو گم نہ کریں، یہ نہ ہو کہ مخاطب کوئی تھا اور بنا کسی اور کو جائیں، بات ہمیں سمجھائی جا رہی تھی اور ہم یہ کہیں کہ نہیں یہ تو فلاں کے لئے تھی۔

مخاطب بننے کے اثرات

۱٤)مخاطب بننے کے اثرات

کتاب میں بعض مطالب اثنائے عبارت میں بیان ہوئے ہیں،

☆ وهو ان يقدر العبد انه هو المقصود بكل خطاب......

عبد کیا گمان کرے؟ کیا یقین پیدا کرے؟ کیا سوچ کر جائے؟ یعنی اپنی ذہنیت کس طرح بنا کر جائے؟ انسان یقین کرے کہ میں مُخاطَب ہوں، سارا قرآن میرے لئے ہے،

☆ فاذا سمع فی القرآن امراً......

اگر کوئی آیت ایسی آتی ہے کہ جس کے اندر امر موجود ہے،

☆ او نهياً او وعداً او وعيدا......

یا نہی موجود ہے یا وعد موجود ہے یا وعید موجود ہے، وعد یعنی جنت کا وعدہ، کامیابی کا وعدہ، فلاح کا وعدہ، نجات کا وعدہ، ثواب کا وعدہ اور وعید یعنی دھمکیاں، جہنم، رسوائی، خزی اور قرآن کے بیان کردہ عذاب یعنی عذاب النار، عذابِ الیم، عذابِ مھین، عذابِ عظیم، عذابِ شدید، عذاب الحریق، عذابِ مقیم، عذاب الھُون، عذاب الخلد، عذاب الخزی، عذابِ غلیظ، عذاب السعیر، عذابِ واصب، عذاب الجحیم، عذاب الحمیم، عذاب السموم، عذابِ مستقر۔

☆ قدر ان الخطاب معه......

یہ سب کس کو کہا جا رہا ہے؟ مجھے کہا جا رہا ہے، انسان ان تمام آیات سے اثر لے، ایک یہ ہے کہ یہ عبرت کے لئے خوب ہے، بسا اوقات کوئی بورڈ لگایا جاتا ہے تو اس کا مخاطب میں ہوں، اگر ڈرائیور گاڑی چلا رہا ہو اور دائیں بائیں ٹریفک کے سائنز (Signs) لگے ہوئے ہیں تو کیا وہ آنکھیں بند کر کے چلائے کہ ان کا مجھ سے کیا رابطہ ہے یہ تو کسی اور کے لئے لگے ہوئے ہیں، نہیں، یہ آپ کے لئے لگے ہوئے ہیں، آپ مخاطب ہیں کہ یہاں پارکنگ ممنوع ہے، یہاں اسپیڈ اتنی رکھیں، یہاں بریک لگائیں، یہاں پر اوور ٹیک (Overtake) نہ کریں، آپ ان سارے سائنز کے مخاطب ہیں، انسان ہر ہر نقطے کا اپنے آپ کو مخاطب سمجھے۔

مخاطب بننے کے اثرات

☆ **فلیعمل بمؤادہ......**

اس کے معنیٰ کے مطابق عمل کرے۔ مخاطب بنانے سے مراد کیا ہے؟ مخاطب بننے کا ایک اور اثر یہ ہے کہ انسان فوراً اس خطاب پر عمل کرتا ہے، فی الفور عکس العمل دکھاتا ہے، اگر امر ہے تو اٹھ کر عمل کرتا ہے، اگر نہی ہے تو ترک جاتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ میں نے سنا اَن سنا کر دیا ہے، قرآن میں ایک آیت ہے کہ جس کو ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ بعض کو ہم نے دل دیئے ہیں لیکن سمجھتے نہیں ہیں، آنکھیں دی ہیں لیکن دیکھتے نہیں ہیں، کان دیئے ہیں لیکن سنتے نہیں ہیں، یہ کون لوگ ہیں؟

أُولٰئِکَ کَالْأَنْعَامِ......(۱۳)

یہ جانوروں کی طرح ہیں، یہ حیوانوں کی طرح ہیں، یہ دل و عقل و فہم و سب کچھ رکھ کر بھی جانور ہیں یعنی جانور سے بھی بدتر ہیں،

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ٥ (۱۴)

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین زمین پر چلنے والے وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ہیں۔

یعنی زمین کے اوپر سب سے برا چلنے والا متحرک موجود وہ انسان ہے کہ جو گونگا، بہرا اور اندھا ہے۔ جس کو خدا نے دل دیا ہے لیکن سمجھتا نہیں ہے، عقل دی ہے لیکن سوچتا نہیں ہے، آنکھیں دی ہیں لیکن دیکھتا نہیں ہے، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب انسان خطاب پڑھتا ہے تو متوجہ نہیں ہوتا ہیں کہ یہ خطاب مجھ سے ہے، آیاتِ خدا مجھے پکار رہی ہیں، مجھ سے مخاطب ہیں، مجھے بلا رہی ہیں لیکن یہ

نہیں سنتا ہے یعنی بہرا ہے، یہ حشرات یہ جانور اور یہ سارے موجودات اسے عبرت کے نمونے دکھا رہے ہیں لیکن یہ دیکھتا نہیں ہے یعنی اندھا ہے، قرآن اس کے لئے نازل کیا ہے لیکن یہ سمجھتا نہیں ہے۔ بیوقوف یہی ہوتا ہے کہ آپ اس کا صریح نام لے کر بھی کہیں تو یہ سمجھتا ہے کہ کسی اور کو کہا جا رہا ہے مجھے نہیں کہہ رہے ہیں۔

☆ وان سمع قصص الاولين و الانبياء عليهم السلام......

اور اگر انسان قرآن میں گزشتہ قوموں کے، انبیاء علیہم السلام کے یا ان کی امتوں کے قصے مشاہدہ کرتا ہے،

☆ فليذ عن ان قصة السمر، غير مقصود......

تو یہ یقین کر لے کہ یہ قصصِ شب نہیں ہیں یا ان قصوں کو بیان کرنے سے مقصود بچوں کو سلانے کے لئے رات کی داستانیں نہیں ہیں، یہ فقط داستان سرائی نہیں ہے کہ جو لوگوں کا معمول تھا کہ راتوں کو بیٹھ کر ٹائم پاس کرنے کے لئے کوئی قصہ پڑھتے تھے، بعض کے اندر قوتِ تخیل قوی تھی لہٰذا وہ فوراً قصہ بھی بنا لیتے تھے اور گھڑ لیتے تھے، قرآن میں مقصود از قصص، قصصِ شب نہیں ہیں۔

☆ بل الاعتبار......

بلکہ ان قصوں سے مقصود عبرت لینا ہے۔

☆ فليعتبر كيف لايقدر هذا......

انسان دیکھے کہ کیوں میں مخاطبِ قرآن نہیں ہوں؟ ان قصوں سے عبرت لے،

☆ والقرآن ما نزل علی الرسول صلی اللّٰہ علیہ و آلہ خاصۃ......

قرآن فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تو نازل نہیں ہوا ہے بلکہ انسان کے لئے نازل ہوا ہے، ھدی للناس ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نازل ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واسطۂ نزولِ قرآن ہیں نہ کہ فقط وہ ہی مخاطبِ قرآن ہیں اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سارے قرآن پر عمل کرنا ہے،

☆ بل شفاء و ھدی للعالمین......

بلکہ قرآن تمام عالمین کے لئے شفا اور ہدایت ہے۔ قیامت تک آنے والی نسلیں مخاطبِ قرآن ہیں، فرد فرد مخاطبِ قرآن ہے لہٰذا جب انسان قرآن کی ہر آیہ سے اثر لیتا ہے تو قرآنی صفات دلِ انسان پر متمکن ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

شکر سے مراد

۱۵)شکر سے مراد

☆ ولھذا امر اللّٰہ الکافۃ بشکر ھذہ النعمۃ العمیمۃ......

اس وجہ سے خداوند تبارک وتعالیٰ نے سب کو حکم کیا ہے کہ اس عمومی نعمت کے اوپر شکر کرو کہ جو خدا نے تمہیں عطا کی ہے، شکر سے مراد یہ نہیں ہے کہ پیٹ بھر کر پھر آخر میں ڈکار لے کر کہے شکر الحمد للہ، اس کو شکر نہیں کہتے ہیں، شکر سے مراد یہ ہے کہ جو نعمت خدا نے دی ہے اس کو بروئے کار لانا، اس کو استعمال میں لانا۔ خدا نے کتاب دی ہے تو شکرِ خدا اس کتاب اس کو پڑھنا ہے نہ یہ کہ

کتاب الماری یا کسی اونچی جگہ پر رکھ کر کہے کہ شکریہ، یہ شکر نہیں ہے، چہ بسا یہ منافقت ہے کہ انسان بروئے کار نہ لائے اور زبان سے شکریہ کہہ دے۔ شکریہ ہے کہ جو کچھ دیا ہے اس کو بروئے کار لائے، اگر یہ پڑھنے کے لئے دی ہے تو اس کو پڑھو، یہ شکرِ کتاب ہے، علم کا شکر یہ ہے کہ اس پر عمل کرو، ہر نعمت کا ایک صحیح مصرف ہے لہٰذا اس کو اسی جہت میں استعمال کرنا شکرِ نعمت ہے۔

۱۶) قرآن فقط معصومین علیہ السلام کیلئے نازل نہیں ہوا

☆وقال: وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ٥ (۱۵)

خدا کی نعمت کو یاد کرو، اس نے کتاب وحکمت کو تمہاری نصیحت کے لئے نازل کیا ہے اور یاد رکھو کہ وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔

خداوند نے فرمایا کہ یہ کتاب اور یہ حکمت جو اس کے اندر ہم نے نازل کی ہے یہ کس لئے ہے؟ یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے تو مخصوصاً نہیں ہے، جس طرح سے ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ امام زمانہ علیہ السلام آئیں گے تو اپنے کام بھی کریں گے اور ساتھ میں ہمارے سارے کام بھی کریں گے یعنی یہ سارا دین امام زمانہ علیہ السلام کے لئے ہے، سارے فرائض امام زمانہ علیہ السلام کے لئے ہیں، ہمارا کام فقط یہ ہے کہ اپنی مشکلات کو امام زمانہ علیہ السلام کے ذریعے سے حل کروالیں، اسی طرح سے قرآن سارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے، ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خلاص ہونے کے لئے ایک شبہہ یہ بھی نقل کیا

جاتا ہے کہ قرآن تو فقط معصومین علیہم السلام کے لئے نازل ہوا ہے، ہم سے تو قرآن کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ تورات بنی اسرائیل کے لئے ہے، انجیل بنی اسرائیل کے لئے ہے لیکن قرآن معصومین علیہم السلام کے لئے ہے، ہم فارغ ہیں لہٰذا ہمارے لئے کچھ بھی نازل نہیں ہوا ہے۔

وَمَا أُنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ......(۱۶)

یہ کتاب جو آپ کے لئے نازل کی ہے،

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ......

اس لئے نازل کی ہے کہ تم اس سے موعظہ لو۔

☆وقال: لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۱۷)

بیشک ہم نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا بھی ذکر ہے تو کیا تم اتنی بھی عقل نہیں رکھتے ہو۔

یعنی یہ تمہارے لئے تذکر ہے، فرد فرد کے لئے تذکر ہے، تذکر کا لہجہ مختلف ہے یعنی اس غلطی میں نہ پڑ جانا کہ اس میں ہمارا نام نہیں ہے، اس میں تم کہا گیا ہے یعنی تم کہہ کے آپ کو سنایا جا رہا ہے۔ یہ محاورے کا طریقہ ہے، خواص اور عوام دونوں کا یہی طریقہ ہے۔ کبھی اللہ نے سابقہ امتوں سے خطاب کیا، کبھی اس امت سے، کبھی لہوی سے، کبھی فرد سے، کبھی قوم سے، کبھی اجتماع سے، کبھی جنگ میں جانے والوں سے، کبھی جنگ سے کترانے والوں سے لیکن یہ سب تمہارے لئے ہے، آپ ان سب کا مخاطب بنیں۔ جتنی بھی آیاتِ شرک ہیں ان کا مخاطب بنیں اور دیکھیں کہ کہیں ہم تو شرک

قرآن فقط معصومین علیہم السلام کیلئے نازل نہیں ہوا

کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں؟ جتنی بھی آیاتِ نفاق ہیں ان سب پر توجہ کریں کہ کہیں ہمارے دل کے اندر تو یہ اوصاف موجود نہیں ہیں؟ چونکہ قرآن ہمیں مخاطب کر رہا ہے کہ یہ نفاق لوگوں کے اندر موجود ہے، لوگ یعنی میں،

☆وقال: هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ٥(١٨)

یہ عام انسانوں کے لئے ایک بیانِ حقائق ہے اور صاحبانِ تقویٰ کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے۔

١٧)مذہبی طبقے کی دیگر مشکلات

عرصۂ دراز سے اس مسئلے نے میرے ذہن کو متوجہ کیا ہوا ہے اور یہ سنجیدہ مشکل ہے کہ مذہبی طبقے کے اندر ایسی کمزوریاں، ایسے ضعف اور ایسی مشکلات ہیں کہ جو مذہب کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ مثلاً نشئی طبقے میں ایسے کام ہیں کہ جو نشہ بازوں کے ساتھ سازگار ہیں جیسے نشئی ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے ہیں، اگر کبھی ان سے واسطہ پڑا ہے تو آپ ان کو دیکھیں کہ جب وہ دوسرے کو چرس کا سگریٹ پیش کرتے ہیں تو پورے وجود کے ساتھ اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اور بسم اللہ بھی ساتھ کہتے ہیں لیکن ایک مذہبی آدمی اگر افطار میں بیٹھا ہوا ہے اور دوسرے کو کہے کہ کھجور دینا تو وہ عجیب طریقے سے غصے سے پھینکتا ہے حالانکہ مومن کو تو بسم اللہ کہہ کے ادب سے دینا چاہئے۔

اسی طرح دنیاداروں اور تاجروں کو دیکھیں، باوجودیکہ ایک دوسرے کیلئے تجارتی رکاوٹ ہیں لیکن درعینِ حال ایک دوسرے کے حریم کا خیال رکھتے ہیں، ایک دوسرے پہ اعتماد کرتے ہیں، ایک

دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔ بہت سارے غیر مذہبی طبقات کو اپنی اپنی دنیا میں جا کر دیکھیں کہ ان کا اپنی فیلڈ (Field) کے ساتھ اتنا تضاد نہیں ہے کہ جتنا مذہبیوں کا اپنی فیلڈ کے ساتھ تضاد ہے یعنی مذہبی کا مذہب کے ساتھ جتنا تضاد ہے اتنا کسی اور میں نہیں ہے، مذہبی اور مذہب میں جنگ ہے، مذہب کچھ کہتا ہے اور مذہبی کچھ اور کہتا ہے، ایک ناروا کام جو مذہبی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی نے دوسروں کو تبدیل کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے کہ میں اس کو ٹھیک کر کے رہوں گا، پوری پوری فائلیں ایک دوسرے کے بارے میں بنا رکھی ہیں، فلاں یہ کرتا ہے، اس کو یوں نہیں کرنا چاہئے اور اس کو یوں نہیں کہنا چاہئے۔ اگر مذہب یہ کہتا ہے کہ تم اپنے ذمہ دار ہو، تم خود کو ٹھیک کرو، اگر خود کو ٹھیک کرلیا تو پھر تمہیں باور ہو جائے گا کہ میں کسی اور کو بھی ٹھیک کر سکتا ہوں کیونکہ انسان نمونے کے طور پر ایک کام کرتا ہے تو پھر امید بڑھتی ہے مثلاً آپ ایک کتاب لکھیں تو اندازہ ہوگا کہ آپ اور کتابیں بھی لکھ سکتے ہیں۔ آپ دوسروں کا ٹھیکہ چھوڑ دیں اور اپنا ٹھیکہ لیں اور اپنا ٹھیکہ اس طرح لے سکتا ہے کہ اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن قرار دے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ٥(١٩)

یہ عام انسانوں کے لئے ایک بیانِ حقائق ہے اور صاحبانِ تقویٰ کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے۔

جس طرح سے سورۂ مبارکہ بقرہ میں بھی یہی آیا تھا کہ قرآن متقین کیلئے ہدایت ہے۔ اگلی فصل میں انشاءاللہ ادبِ ہشتم درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(الکافی- الکلینیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۲۰۵)(ترجمہ تفسیر المیزان - علامہ محمد حسین طباطبائی رحمة اللّٰہ علیہ)(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظلہ، الجزء ۷، صفحہ ۱۲۰)(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ)

(۲)......(نفحات القرآن - آیةاللّٰہ العظمیٰ مکارم الشیرازی مدظلہ)(الکافی- الکلینیؒ، باب الشکر، الجزء ۲، صفحہ ۱۴۲)(بحار الأنوار- علامہ مجلسیؒ، الجزء ۱۶، صفحہ ۲۶۴)(حلیة الأبرار - السید ہاشم البحرانی، الجزء ۱، صفحہ ۲۴۷)(میزان الحکمة-الریشھری، الجزء ۱۰، صفحہ ۳۱۵)

(۳)......(مثنوی معنوی، بہ تصحیح :رینولد ا.نیکلسون، دفتر اول،صفحہ ۱۶)

(۴)......(سورۂ مبارکہ یوسفؑ،آیہ۱۱۱)

(۵)......(سورۂ مبارکہ غافر،آیہ۲۱)

(۶)......(سورۂ مبارکہ یوسفؑ،آیہ۱۰۹)(سورۂ مبارکہ غافر،آیہ۸۲)(سورۂ مبارکہ محمدؐ،آیہ۱۰)

(۷)......(سورۂ مبارکہ روم،آیہ۹)(سورۂ مبارکہ فاطر،آیہ۴۴)

(۸)......(سورۂ مبارکہ حشر،آیہ۲)

(۹)......(سورۂ مبارکہ انفال،آیہ۶۴)(سورۂ مبارکہ انفال،آیہ۶۵)(سورۂ مبارکہ انفال،آیہ۷۰)

(سورۂ مبارکہ توبہ،آیہ۷۳)(سورۂ مبارکہ احزاب،آیہ۱)(سورۂ مبارکہ احزاب،آیہ۲۸)

(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۴۵)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۵۰)(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۵۹)

(سورۂ مبارکہ ممتحنہ، آیہ۱۲)(سورۂ مبارکہ طلاق، آیہ۱)(سورۂ مبارکہ تحریم، آیہ۱)(سورۂ مبارکہ تحریم، آیہ۹)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۴۱)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ۶۷)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ۵)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ جمعہ، آیہ۶)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۷۹)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ۲۲)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۳۱)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۳۱)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ۱۰)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ۱۳۸)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ۱۳۸)

فصلِ ادبِ هشتم

«تاثر و وجد»

(حصّه اول)

۱)وجد کا معنٰی

۲)اللّٰه کو پانا هے،نه که سمجهنا هے

۳)قرآن کو اپنے وجود میں اتاریں

٤)وجد،اهلِ معرفت کی نظر میں

٥)متاثر هونا کمال کی علامت

٦)هر چیز سے متاثرهونا ضعف هے

۷)وجد،شوق کی ایک حالت

۸)حالتِ وجد کے اثرات

۹)عشق،اصطلاحِ دینی

۱۰)انسان پرقرآن کی مقناطیسیت کی علامات

۱۱)کسی چیز کو پانے اور سمجهنے میں فرق

۱۲)معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

۱۳)رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد

۱۴)جیسی آیت ویسی حالت

۱۵)عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ھے

۱٦)شوق و وجد، عالم توحید و ملکوت کے مقناطیس

۱۷)قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ ہشتم تاثر و وجد ہے،

☆ الثامن: التأثر والوجد وهو ان يتأثر باطنه ويتنور قلبه بانوار الكلام......

آٹھواں ادب تاثر و وجد ہے کہ اس کا باطن متاثر ہو اور اس کا قلب خدا کے کلام سے نورانی ہو۔ تاثر یعنی متاثر ہونا، اثر قبول کرنا۔ تاثیر اثر چھوڑنے کو کہتے ہیں اور تاثر اثر لینے کو کہتے ہیں، قرآن سے اثر لینا یعنی جب آپ مخاطبِ قرآن بنیں تو قرآن سے اثر بھی لیں اور وجد کی کیفیت ہو۔ مراد یہ ہے کہ انسان متاثر ہو، باطنِ انسان، روحِ انسان پر قرآن اثر کرے اور قرآن کی نورانیت سے انسان کا دل نورانی ہو۔ یہ متاثر ہونا ہے اور یہی وجد ہے۔

گزشتہ ادب یہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو مُخاطَبِ قرآن قرار دے، یہ ادبِ ہشتم اسی چیز کا اثر ہے یعنی انسان جب قرآن پڑھے اور بارگاہِ قرآن و خدمتِ قرآن میں حاضر ہو تو اس طرح سے قرآن میں تدبر کرے اور تلاوتِ قرآن کرے کہ متاثر ہو، قرآن سے اثر لے، قرآن کا ہمارے وجود کے اوپر، ہماری روح کے اوپر اثر پڑے اور اثر بھی اس طرح سے پڑے کہ انسان پر حالتِ وجد طاری ہو اور یہ ادبِ ہفتم ہی کا نتیجہ ہے کہ پہلے انسان اپنے آپ کو قرآن کا مُخاطَب قرار دے تا کہ قرآن اس پر اثر کرے اور چونکہ مخاطبِ اصلی قرآن دلِ انسان ہے لہٰذا دل جب تک تاثر کے لئے، اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو تو یہ حالت حاصل نہیں ہوتی ہے، دل کو آمادہ کرنے کیلئے سابقہ آداب مؤثر ہیں جیسے توجہ در عظمتِ قرآن، تطہیرِ قلب اور حضورِ قلب وغیرہ۔ اگر انسان مُخاطَبِ قرآن نہ بن سکے

اور فقط قاریٔ قرآن، حافظِ قرآن اور مفسرِ قرآن رہے تو ادبِ ہشتم تک اس کی نوبت نہیں آتی ہے۔

۱)وجد کا معنٰی

وجد کی حالت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس طرح سے غرق و محو در قرآن ہو کہ بے خود ہو جائے یعنی ایک بے خودی کی حالت انسان کے اوپر طاری ہو، بے خودی یعنی انسان دوسرے تمام تعلقات سے منقطع ہو کر فقط محوِ کلامِ خداوند تبارک و تعالیٰ ہو اور کلام کے اندر چونکہ ذاتِ متکلم متجلی ہے ، ذاتِ خداوند تبارک و تعالیٰ جلوہ گر ہے لہٰذا یہ محوِ تجلیٔ ذاتِ خداوند تبارک و تعالیٰ ہو، اس کی علامت یہ ہے کہ انسان جب قرآن پڑھتا ہے اور مختلف معارف و معالم و تعلیماتِ قرآن سے ایک ایک کر کے آشنا ہوتا ہے تو انہی معارف کے مضامین کے مطابق انسان کے اوپر صفات طاری ہوں اور حالات طاری ہوں اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب یہ ساری چیزیں انسان کے دل میں اتریں، انسان کے اندر منتقل ہوں، انسان پر یہ حالت فقط فہمِ ذہنی یا قرآن کے مفاہیم کو صرف سمجھ لینے سے طاری نہیں ہوتی ہے، جب تک انسان مضامینِ قرآن اور معارفِ قرآن مجید سے متصف نہ ہو۔

وجد لغت میں کسی چیز کے پا لینے کو کہتے ہیں، کسی شے کے وجود کو پا لینا وجد کہلاتا ہے، سمجھ لینا وجد نہیں ہے بلکہ پانا وجد ہے۔

وجد کا معنٰی

۲) اللہ کو پانا ہے، نہ کہ سمجھنا ہے

پہلے بھی فصلِ ادبِ اول میں بعض مطالب کے ضمن میں یہ اشارہ ہوا تھا کہ مثلاً ہم بات کرتے ہیں کہ خدا کو ثابت کرنا ہے، خدا کو سمجھنا ہے، خدا کے اوپر دلیلیں قائم کرنی ہیں، ساری عمر انسان یہ کام کرتا رہے پھر بھی خدا سے دور ہی رہے گا کیونکہ خدا کو پانا ہے۔ خدا وہ ذات ہے، وہ حقیقت ہے کہ جس حقیقت تک ہمیں پہنچنا ہے، وصول الی اللہ، قرب الی اللہ، لقاء بخدا اور نہایتاً وجدِ خدا، جس طرح سے سید الشہداء علیہ السلام نے اور قرآن نے بھی یہ ساری تعبیریں استعمال کی ہیں کہ مثلاً اگر تم انابت کرو، توبہ کرو یعنی خدا کی طرف رجوع کرو،

ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝(۱)

پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا پائے گا۔

وَلَا يَجِدُ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا ۝(۲)

اور خدا کے علاوہ اسے کوئی سرپرست اور مددگار مل بھی نہیں سکتا ہے۔

لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝(۳)

تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ہیں۔

ہم نے اللہ کو پانا ہے نہ کہ فقط ذہن سے سمجھنا ہے، خدا مفہوم نہیں ہے کہ ذہنی چیز ہو اور خدا کو ہم ذہن میں لے آئیں یا محسوسات میں سے نہیں ہے کہ ہم حواس کے ذریعے سے خداوند تبارک وتعالیٰ کو دیکھیں بلکہ خدا پانے کی چیز ہے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جو ہم نے پائی ہیں یا جن

کے لئے ہم جملہ یا تعبیر ہی یہی استعمال کرتے ہیں کہ میں نے اس چیز کو پالیا ہے نہ کہ اس کو سمجھ لیا ہے مثلاً ایک مقام میں نے پالیا ہے، سرور و خوشی میں نے پالی ہے، پالینا یعنی اس کا وجود میرے وجود کے ساتھ ایک ہو جائے اور میرا وجود اس کے وجود کے ساتھ ایک ہو جائے، وہ میرا حصہ اور میرا جزو بن جائے جیسے سرور پانے کی چیز ہے وگرنہ انسان لغت میں لفظِ سرور کے معانی دیکھ لے تو سرور سمجھ تو گیا ہے لیکن پایا نہیں ہے۔

جس طرح سے مریض درد پاتا ہے اور ڈاکٹر درد کو سمجھتا ہے، طبیب میں درد کا وجدان نہیں ہے یا طبیب واجدِ درد نہیں ہے، یہ فقط درد کو سمجھتا ہے لیکن ممکن ہے کہ مریض درد کو بیان نہ کر سکتا ہو اور درد کی طبیب جیسی تشریح اور بلیغانہ و فصیحانہ تفسیر نہ کر سکتا ہو لیکن درد کا اثر اپنے وجود کے اندر رکھتا ہے یعنی درد کا وجود اور مریض کا وجود دونوں آپس میں ملے ہوئے ہوں، وجودِ مریض کے اندر درد موجود ہے نہ کہ مفہومِ درد موجود ہے، درد ذہنِ مریض کے اندر ہے اور مفہومِ درد ذہنِ طبیب کے اندر ہے لہٰذا اس درد سے طبیب کراہتا نہیں ہے، اس درد سے طبیب ہائے ہائے نہیں کرتا، اس درد سے طبیب کی فریادیں نہیں نکلتی ہیں، اس درد سے طبیب کرب و ابتلاء میں مبتلا نہیں ہوتا ہے، اس درد سے طبیب کی رنگت ختم نہیں ہوتی ہے، سمجھتا ہے لیکن سمجھنے کے باوجود درد اپنا اثر طبیب کے اندر ایجاد نہیں کرتا ہے، درد کے سارے آثار مریض کے اندر موجود ہیں چونکہ یہ واجدِ درد ہے اور وہ عالمِ درد ہے، طبیب کو درد سمجھ میں آگیا ہے اور مریض نے درد کو پالیا ہے۔

جس طرح سے انسان نگاہوں سے بہت کچھ پالیتا ہے مثلاً فرض کر لیں کہ اگر ایک شخص

ہمیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے تو اس کی نگاہوں سے ہم اپنے اندر ایک حالت پا لیتے ہیں درحالیکہ وہ بولا نہیں ہے، ہم فقط سمجھے نہیں ہیں بلکہ ہم نے اس کی آنکھوں سے کسی چیز کو پایا ہے، لمس کیا ہے، اس کی نفرت، اس کا کینہ، اس کا غصہ اور اس کا غضب ہم نے محسوس کیا ہے، لمس کیا ہے اور اس کو اپنے اندر پایا ہے یا مثلاً کہہ لیں کہ کسی شخص کے اندر محبت ہو، کسی شخص کے اندر رجحان و رغبت ہو تو اس کی نگاہوں سے ہم اپنی نسبت اس کی محبت محسوس کرتے ہیں، ہم اپنے وجود سے اس کی محبت کو لمس کرتے ہیں یعنی ہم نے اپنے وجود سے اس کی محبت کو اپنے اندر محسوس کیا ہے اور اسی کو حالتِ وجدان کہتے ہیں۔

اہلِ معرفت کے یہاں وجد ایک اصطلاح بھی ہے، یہ معنیٔ لغوی وجدان تھا، معنیٔ اصطلاحی وجدان کہ جو اہلِ معرفت کے یہاں رائج ہے، اہل معرفت سے مراد پھر وہ شعبدہ باز اور ٹھگ قسم کے لوگ ذہن میں نہ آئیں یعنی جو صوفیاء اور عرفاء کے نام سے دیواریں دوڑاتے ہیں اور طے الارض کرتے ہیں اور فلاں فلاں کام کرتے ہیں وہ مراد نہیں ہیں، مراد از عرفاء مقربینِ خدا ہیں یعنی جنہوں نے خدا کو پا لیا ہے، جن کا ربط و اتصال ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ سے ہے، جو محو و فانی در ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں یعنی ربانی موجودات، ربانی انسان اور ربانی علماءِ عرفاء ہیں، جب اہلِ معرفت کہا جاتا ہے تو اس سے یہ عرفاء مراد ہوتے ہیں۔

اہلِ معرفت کے سب سے کامل نمونے اور مصداق خود ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں، ائمہ اطہار علیہم السلام نے اپنا عرفان و تصوف اس طرح سے پیش نہیں کیا ہے کہ جس طرح سے آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ

جس میں مرید بازی، خانقاہ بازی اور ریاضت و چلے وفلاں فلاں چیزیں شامل ہیں۔اسی شریعت سے،اسی دین کے ذریعے سے ائمہ اطہار علیہم السلام نے لوگوں کو معرفت کی راہ کا راستہ بتادیا ہے، انہی بہترین طریقوں میں سے ایک طریقہ حضرت سید ساجدین علیہ السلام کی مناجات و دعائیں ہیں،اس سے بالاتر عرفان ابھی تک نہ بشر پیش کر سکا ہے اور نہ اس مقام و مرتبے تک پہنچ سکا ہے کہ جہاں پر عرفانِ ائمہ ھدیٰ علیہم السلام ہے۔

اسی طرح سے انسان قرآن کو یا ذاتِ خدا کو بھی پائے نہ کہ صرف سمجھے،بعض لوگ ذاتِ خدا کو خوب سمجھتے ہیں، علمائے کلام اور علمائے فلسفہ کہ جنہوں نے دلیلوں کے ذریعے سے خدا کو ثابت کیا ہے اور کئی دلیلیں قائم کی ہوئی ہیں کہ خدا ہے،ان کو خدا سمجھ آ گیا ہے لیکن خدا کو پایا نہیں ہے، سمجھ کر بھی انسان دور ہوسکتا ہے، جس طرح طبیب درد کو سمجھ کر درد سے بہت دور ہے، درد کی مشکلات، درد کے وجود، درد کی حقیقت اور درد کی لذتوں سے طبیب بے بہرہ ہے چونکہ اس نے پایا نہیں ہے بلکہ فقط کتابوں سے درد کو سمجھا ہے، اسی طرح انسان اگر خدا کو کتابوں سے سمجھ جائے تو پھر بھی خدا سے دور ہی ہے اور جو خدا سے دور ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز سے دور ہے، جس طرح سے دعائے شریفِ عرفہ میں سید الشھداء علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

مَاذَا وَجَدَ مَنْ فَقَدَکَ وَمَا الَّذِیْ فَقَدَ مَنْ وَّجَدَکَ......

اس نے کیا پایا جس نے تجھے کھویا اور اس نے کچھ نہ کھویا جس نے تجھ کو پایا۔یعنی جس نے خدا کو پالیا ہے نہ کہ سمجھ لیا ہے، خدا سمجھنے والے فراواں ہیں لیکن خدا پانے والے بہت کم ہیں۔

۳) قرآن کو اپنے وجود میں اتاریں

اسی طرح جن انسان باگاہِ قرآن مجید میں مخاطَبِ قرآن بنتا ہے تو یوں نہیں ہے کہ فقط سمجھ رہا ہے یعنی قرآن مفہوم بن کر، تصور بن کر، خیال بن کر اور معنیٰ بن کر ہمارے ذہن کے اندر ہے یا قرآن ہماری معلومات اور حافظے میں موجود ہے بلکہ ہم نے قرآن کو اپنے وجود میں پانا ہے، وجود میں اتارنا ہے یعنی جو حقیقتِ قرآن، لذتِ قرآن اور جو روحِ قرآن ہے وہ ہمارے وجود میں منتقل ہو جائے، قرآن کا وجود اور ہمارا وجود ایک ہو جائے کہ جس طرح سے وجودِ درد اور وجودِ مریض ایک وجود بن گئے ہے، جب انسان قرآن کو پالے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر قرآن کا اثر بھی ہوتا ہے، پس پہلے مخاطبِ قرآن بنے چونکہ مخاطبِ قرآن بننے سے ہم قرآن کی حقیقت کو پائیں گے اور جب حقیقت کو پائیں گے تو وہ حقیقت ہم پر اثر انداز ہوگی، اس درد کی مثال پر خوب غور کریں کہ طبیب درد شناس ہے لیکن دردمند نہیں ہے اسی طرح ممکن ہے کہ انسان قرآن شناس بن جائے لیکن قرآن اس کے وجود کے اندر منتقل نہ ہوا ہو لہٰذا یہ انسان ابھی بھی قرآن سے دور ہے۔

کبھی انسان قرآن شناس بن جاتا ہے لہٰذا تعبیرِ عربی الفاظ، قرآن کے معانی، ادبی علومِ قرآن اور دیگر علومِ متعلقاتِ قرآن کو بخوبی سمجھتا ہے حتیٰ ممکن ہے کہ آیاتِ قرآن اس نے اپنے سینے میں حفظ کر لی ہوں لیکن درعینِ حال قرآن اس کے اندر اثر نہیں کر رہا ہو کہ جس طرح سے درد طبیب کو متاثر نہیں کر رہا ہے، متاثر ہونا ضروری ہے، انسان اس وقت متاثر ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز انسان کے اندر وجوداً منتقل ہوتی ہے، اس چیز کی حقیقت انسان کے اندر منتقل ہوتی ہے اور یہ مخاطَب واقع

ہوتا ہے یعنی مخاطب بھی سماعی مخاطب نہیں بلکہ وجودی مخاطب بنتا ہے۔ روحِ قرآن کے ساتھ ہماری روح ہو یعنی ہماری روح مُخاطَبْ ہو اور قرآن ہم سے مُخاطِبْ ہو، قرآن ہم سے بات کرے اور ہماری روح اس بات کو سنے، اس طرح سے قرآن ہمارے اندر منتقل ہوتا ہے۔

٤) وجد، اہلِ معرفت کی نظر میں

اہل معرفت کے یہاں وجد ایک خاص اصطلاح ہے، عرف عام میں لوگ اس اصطلاح سے آشنا ہیں کہ خصوصاً قوالیوں کی محافل میں جب قوالی ہو رہی ہوتی ہے تو کچھ لوگ اٹھ کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں کہ یہ وجد میں آ گئے ہیں، وہ درحقیقت وجد نہیں ہوتا ہے، اس حالت کو وجد نہیں کہتے ہیں، وہاں درحقیقت انسان موسیقی کا ایک سرور محسوس کرتا ہے اور انسان کے اندر حالتِ طرب طاری ہو جاتی ہے، یہ وجد نہیں ہے کہ موسیقی اور تبلیغی آواز سے انسان اٹھ کر ناچنا اور گھومنا شروع کر دے۔

وجد سے مراد اسی معنیٰ لغوی سے محفوظ ہے یعنی متاثر ہونا، وجد یعنی جب انسان خداوند تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ کے قریب ہوتا ہے، ذاتِ خدا کے قریب ہوتا ہے، اسماء وصفاتِ الٰہیہ کو ملاحظہ و مشاہدہ کرتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر جب انسان معانقہ کرتا ہے، یہ ائمہ علیہم السلام کی تعبیر ہے کہ جب انسان اسماء وصفاتِ الٰہیہ کے ساتھ معانقہ کرتا ہے یعنی جب حقیقت وروحِ اسماء اللہ کے اتنا قریب ہو جاتا ہے تو اس وقت انسان کے اوپر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے، حالتِ وجد یعنی حالتِ فنا، ایسی

حالت کہ جس کے اندر انسان کے اوپر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا ہے یعنی انسان اپنے ارد گرد سے اور ہر اس چیز سے لاتعلق ہو جاتا ہے کہ جو انسان سے متعلق نہیں ہے، جیسے ماحول ہے، انسان کا ارد گرد ہے۔ ابھی انسان کی ہر چیز کی طرف توجہ ہے کہ مثلاً در ہے، دیوار ہے، انسان ہے، نور ہے، اسی طرح دیگر چیزیں ہیں، اس حالت کو حالتِ صحو کہتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں حالتِ محو ہے یعنی انسان ایک ایسی کیفیت جذب کر لے، اپنی طرف کھینچ لے کہ وہ انسان کو ہر دوسری چیز سے لاتعلق کر دے۔ بعض انسان ہیں کہ ان پر مطالعہ کے اندر بھی ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں کہ جو مطالعہ بھی کر رہے ہوتے ہیں اور ہر چیز کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے، نگاہیں کتاب پر ہیں اور دوسرے کی گفتگو بھی سن رہے ہیں، نگاہیں کتاب پر ہیں اور نیم نگاہ کسی دوسرے کے عمل پر رکھی ہوئی ہے اور ہر چیز کا جائزہ لے رہے ہوتے ہیں، یہ مطالعے میں نہیں ہیں بلکہ مطالعہ صرف ایک بہانہ اور ذریعہ ہے یا ایک مشغولیت ہے، یہ ہم زمان کئی مشغولیتوں میں مصروف ہیں لیکن بعض لوگ مطالعہ کے دوران مطالبِ کتاب کے اندر اس طرح سے منہمک اور محو ہو جاتے ہیں کہ اپنے ارد گرد سے بالکل کٹ جاتے ہیں اور لاتعلق ہو جاتے ہیں، ان پر ایک حالتِ بے خودی طاری ہو جاتی ہے حتیٰ اپنے آپ سے بھی لاتعلق ہو جاتے ہیں، اس عالم میں آپ ان کے جیب سے کوئی چیز نکال لیں، ان کے جیب میں کوئی چیز ڈال دیں حتیٰ آپ جسمانی طور پر ان کے وجود سے کوئی چیز ٹچ (Touch) کریں تو انہیں اصلاً سرے سے خبر نہیں ہوتی ہے چونکہ اپنی طرف توجہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود سمیت کسی مطلبِ دیگر کے اندر محو ہو گئے ہیں۔

بعض شعراء کے بارے میں ایسی کیفیت بیان کی جاتی ہے کہ وہ تخیل کے اس عالم میں پہنچ جاتے تھے کہ جہاں ان کو حالتِ محو و فنا پیش آتی تھی یعنی عالمِ تخیل میں اپنے اردگرد سے بے خبر ہو جاتے تھے، اس وقت انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا مگر یہ کہ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ معمولی حالت اور آدھی حالت پر پھر واپس آجاتے تھے، پھر اردگرد سے یعنی اپنے متعلقات سے ان کا ایک ربط برقرار ہو جاتا تھا۔

یہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے بارے میں بھی ہے مثلاً مولا علی علیہ السلام کے پاؤں سے حالتِ نماز میں تیر نکالنے کا معروف واقعہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ ہم کس طرح علی علیہ السلام کے پاؤں سے تیر کو باہر نکالیں کہ تکلیف نہ ہو، حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نماز کے اندر یہ کام کرلو، یعنی نہ یہ کہ درد ہوگا، توجہ ہوگی اور امیر المومنین علیہ السلام کے اعصاب اتنے مضبوط ہیں کہ نماز باطل ہونے نہیں دیں گے بلکہ اگر آپ نے حالتِ نماز میں تیر نکال لیا تو علی علیہ السلام کو واقعاً پتہ ہی نہیں چلے گا اور ایسا ہی ہوا، لوگوں نے تیر نکال لیا اور امیر المومنین علیہ السلام کو محسوس تک نہیں ہوا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ حالتِ محو تھی، یہ ربط بخدا و اتصال بخدا ہے، اس عالم میں انسان اردگرد سے متعلق نہیں ہوتا ہے، یہ بے خودی کی حالت ہے اور جب انسان خدا کو پالیتا ہے تو اس پر یہ حالتِ بے خودی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ اس وجہ سے طاری ہوتی ہے کہ انسان متاثر ہوتا ہے اور انسان کے اندر قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، دل جب سخت ہو جاتا ہے اور اس میں قساوت و شقاوت آجاتی ہے تو قبول کرنا چھوڑ دیتا ہے، متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے۔

وجد، اہلِ معرفت کی نظر میں

۵) متاثر ہونا کمال کی علامت

بعض لوگ متاثر نہ ہونے کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، دلِ کامل وہ ہے کہ جو بہت متاثر ہوتا ہو، ممکن ہے کہ ہم کمال اس کو سمجھتے ہیں کہ جو سرے سے متاثر نہیں ہوتا ہے، جس کے سامنے گھنٹوں گفتگو کی جائے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا کامل انسان ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ یہ شقی ترین اور قسی القلب ترین انسان ہے، جو متاثر نہ ہو، جو مناظر دیکھ کر متاثر نہ ہو، جو موعظہ سن کر متاثر نہ ہو، جو قرآن سن کر متاثر نہ ہو، جو قرآن پڑھ کر متاثر نہ ہو یا جو کسی اثر انداز چیز کے مقابلے میں بھی سختی دکھائے تو وہ دل پتھر کی طرح ہے، جس طرح سے پتھر کو آپ جو بھی منظر دکھائیں تو وہ پتھر کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوتا ہے، دل بھی کبھی ایک جماد کی طرح ہو جاتا ہے اور قرآن نے بھی کہا ہے کہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ فَهِيَ کَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً...... (۴)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت...

حالانکہ پتھر بسا اوقات نرم ہو جاتے ہیں، متاثر ہو جاتے ہیں لیکن دل اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ سرے سے متاثر نہیں ہوتا ہے۔ اپنے دل کی طرف سے ہرگز غفلت نہ برتیں بلکہ ہمارا دل نرم ہو، خاشع ہو یعنی اثر قبول کرے، نرم دل یعنی قبول کرنے والا دل، متاثر ہونے والا دل، ہم اپنے اندر یہ صلاحیت بڑھائیں۔

٦)ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف ہے

متاثر ہونا کمزوری نہیں ہے لیکن اس چیز سے متاثر ہوں کہ جو متاثر کن ہے نہ کہ ہر چیز سے متاثر ہوں۔ ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف کی علامت ہے مثلاً بعض اوقات سردی نہیں ہوتی ہے لیکن بعض کانپ رہے ہوتے ہیں تو یہ بیماری اور ضعف ہے، ممکن ہے کہ جسم کے اندر ملیریا ہے یا کوئی اور بیماری ہے کہ سردی کے بغیر کانپ رہے ہیں لیکن سردی سے کانپنا جسم کی سلامتی کی علامت ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس کا جسم سُن نہیں ہے، بے حس نہیں ہے بلکہ سالم جسم ہے، اسی طرح گرمی میں بدن کو گرمی لگنا، پسینہ آنا سلامتی جسم کی علامت ہے اور اگر شدید گرمی ہو لیکن جسم کو پسینہ نہ آرہا ہو تو یہ گرمی سے متاثر نہیں ہو رہا ہے، اس کے معانی یہ ہیں کہ یہ جسم بیمار ہے، ضعیف ہے، اس میں مرض یعنی ضعف ہے، اسی طرح سے دل بھی ہے۔

بعض دل ایسے ہیں کہ جو متاثر نہ کرنے والی چیزوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں لہٰذا یہ ضعفِ دل ہے، کمزوریٔ دل ہے مثلاً خوف آجانا، اس دشمن سے ڈر جانا کہ جس سے نہیں ڈرنا چاہئے، اس چیز سے ڈرنا کہ جس سے نہیں ڈرنا چاہئے مثلاً چوہے سے ڈر جانا، لال بیگ سے ڈر جانا، مکھی، مچھر سے ڈر جانا، حشرات سے ڈر جانا ضعف ہے لیکن جن چیزوں سے خوف کھانا چاہئے، خشیت ہونا چاہے، ان سے ڈرنا سلامتیٔ دل ہے، جن چیزوں کے مقابلے میں دل کو مقاومت کرنی چاہئے ان کے خلاف مقاومت کرنا سلامتیٔ دل کی علامت ہے، یعنی یہ قلبِ سلیم ہے۔

قلبِ سلیم یعنی جہاں متاثر ہونا چاہئے وہاں متاثر ہوتا ہے اور جن چیزوں سے متاثر نہیں

ہر چیز سے متاثر ہونا ضعف ہے

ہونا چاہئے وہاں متاثر نہیں ہوتا ہے۔ خدا سے متاثر ہوتا ہے، عبادتِ خدا سے متاثر ہوتا ہے، خوفِ خدا سے متاثر ہوتا ہے، قربِ خدا سے متاثر ہوتا ہے لیکن دنیا کو دیکھ کر متاثر نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کو دیکھ کر جن لوگوں کی رال ٹپک جاتی ہے وہ یہ نہ کہیں کہ دنیا دیکھ کر متاثر ہونا بھی دل کا ایک کمال ہے بلکہ یہ دل کا ضعف ہے، جس چیز سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اس سے متاثر ہونا دل کا ضعف ہے، حسن و جمال دیکھ کر متاثر ہونا خوب ہے لیکن قباحت دیکھ کر متاثر ہونا بیماریٔ دل ہے، ضعفِ دل ہے کہ انسان غلاظت دیکھ کر متاثر ہو جائے، دنیا کی مثال امیر المومنین علیہ السلام نے یہی بیان کی ہے کہ دنیا مانندِ غلاظت ہے، غلاظتوں سے انسان متاثر نہیں ہوتا ہے۔ پس اگر دل متاثر ہو یعنی اثر قبول کرنے والا دل ہو اور خواہ نہ خواہ کسی قوی چیز کے مقابلے میں آکر جب اس سے اثر قبول کرتا ہے تو اس کے اوپر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے، وجد یعنی بے خودی کی حالت طاری ہوتی ہے، پھر یہ ارد گرد سے کٹ جاتا ہے حتیٰ اپنے آپ سے بھی کٹ جاتا ہے، اپنی طرف اس کی توجہ نہیں رہتی ہے اور یہ اسی شے کے اندر محو ہو جاتا ہے کہ جس نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

۷) وجد، شوق کی ایک حالت

متاثر دل اور وجد کی حالت کیلئے فرماتے ہیں کہ یہ شوق کی ایک حالت ہے، شوق ایک نوعِ رغبت ہے، ایک تعلق و طلب ہے، رجحان کا نام شوق ہے۔ بعض چیزیں ہیں کہ جن کا ہمیں شوق ہے، شوق سے مراد یہ ہے کہ ہمارے وجود کے اندر ان اشیاء کی نسبت ایک رغبت اور رجحان موجود ہے

لیکن کچھ چیزوں کا ہمیں شوق نہیں ہے یعنی ہمارا دل ان سے لاتعلق ہے، کوئی چیز ہمیں کھینچ نہیں رہی ہے یعنی کشش نہیں ہے، اس کتاب میں صاحبِ کتاب مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح سے مقناطیس کے اندر مقناطیسیت ہوتی ہے اور وہ لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے، لوہے کے اندر شوق موجود ہے، لوہا مقناطیس کا مشتاق ہے لیکن یہ شوق لوہے کے اندر کیسے پیدا ہوتا ہے کہ جہاں مقناطیس ہو یہ کھنچتا ہوا اس کی طرف چلا جاتا ہے اور جا کر اس کے وجود سے مرتبط ہو کر اس سے متصل ہو جاتا ہے۔ کمال کی وجہ سے، قوت کی وجہ سے اور جاذبے کی وجہ سے مقناطیس کے اندر کشش موجود ہوتی ہے اور جو اس کشش اور جاذبے کے اندر آ جائے اس کے اندر شوق پیدا ہو جاتا ہے، شوق ہمیں انہی چیزوں کا پیدا ہوتا ہے کہ ہم جن کے جاذبے کی مدّ میں آ چکے ہیں، فرض کریں کہ مقناطیس کے جاذبے کی جو مدّ ہے یا جس طرف اس کا رخ ہے اس راستے میں اگر لوہا آ جائے تو جاذبہ مقناطیس میں آ کر اس میں شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ مقناطیس کی طرف دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے لیکن جو لوہا اس سمت میں نہ ہو یا حجاب کے پیچھے ہو یعنی اس مدّ سے باہر ہو کہ جہاں یہ لوہا نہیں کھنچتا ہے تو اس لوہے کے اوپر وجد کی کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے۔

وجد، شوق کی ایک حالت

اسی لئے انسان جب بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں جائے تو مرکبِ شوق کے ساتھ جائے، قرآن بارگاہِ خدا ہے، کلامِ خدا ہے، متکلم ذاتِ خدا ہے، ہم مخاطبِ قرآن بنیں، نہ فقط قاری و حافظِ قرآن، اجنبی بن کر کبھی بھی قرآن نہ پڑھیں، کتبِ روایات میں آیا ہے کہ

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... (۵)

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۶)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۷)

یعنی بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے۔

یہ جو مُردوں کے لئے اجارے پر قرآن پڑھتے ہیں کہ ایک ٹائم کا کھانا مل جائے گا یا آپ مردے کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن پڑھ لیں تو اتنے پیسے مل جائیں گے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انسان اجنبی بن کر قرآن پڑھ رہا ہے، اسی کو اگر اور پیسے دو کہ یہ کسی سکھ کے لئے گرنتھ پڑھ دے تو یہ جا کر ڈبل پیسوں میں گرنتھ پڑھ دے گا،، جیسے وہ ملحد مولوی ہے کہ جو حافظ قرآن بھی ہے اور بچوں کو قرآن بھی پڑھاتا ہے، جمعہ بھی پڑھاتا ہے لیکن بغیر وضو کے اور جب اسے کہتے ہیں کہ یہ کام کیوں کرتے ہو تو کہتا ہے کہ یہ میری جاب (Job) ہے، یہ میری نوکری ہے، جس طرح سے دوسرے لوگ صبح آفس جاتے ہیں اور نوکری کرتے ہیں اسی طرح یہ قرآن پڑھنا، جمعہ پڑھانا، جماعت کروانا اور یہ سارے کام کرنا میری ڈیوٹی (Duty) میں شامل ہیں، حفظ بھی میں نے اسی طرح کیا ہے کہ جس طرح سے تم انگلش پڑھتے ہو اور جس طرح سے عربی ٹیچر اسکول میں جاب کرتا ہے اسی طرح سے میں بھی ایک جاب کر رہا ہوں۔

اسی طرح بعض لوگوں نے قرآن پڑھنا اور مردوں کے اوپر قرآن پڑھنا ایک پیشے کے طور پر، ایک پروفیشن (Profession) کے طور پر اپنایا ہوا ہے حتیٰ زندوں پر قرآن پڑھنا بھی بعض لوگوں کی جاب ہے، قرآن اسی لئے سیکھا ہے، اچھی دھن میں آکر قرآن پڑھتے ہیں اور معاوضہ

لے کر قرآن پڑھتے ہیں کیونکہ یہ ان کی جاب ہے، اس طرح انسان اجنبی بن کر قرآن پڑھتا ہے تو قرآن اس پر لعنت کرتا ہے۔

مخاطبِ قرآن بنیں، اجنبی نہ بنیں، فقط راویٔ قرآن و مخبرِ قرآن نہ بنیں، فقط مخارج اور قواعدِ تجوید کو ملحوظ نہ رکھیں بلکہ مخاطَبِ قرآن بنیں، مخاطبِ قرآن بننے کے بعد دل بھی خاشع ہو، نرم ہو اور پاک ہو کہ جو آدابِ سابقہ میں بیان کیا ہے، انہی کے تحت انسان کا دل بھی آمادہ ہے، انسان جب قرآن کے اندر آتا ہے تو قرآن مقناطیس کی طرح ہے، قرآن کے اندر جاذبہ ہے، کشش ہے، شدید کشش قرآن کے اندر موجود ہے، اگر دل بھی لوہے کی طرح صاف ہو، اس پر زنگ نہ لگا ہوا ہو اور ایسا دل اس جاذبے کے اندر آجائے تو یہ جاذبہ انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جب انسان قرآن کے جاذبے میں آجاتا ہے تو اس پر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے، اس کے اوپر حالتِ تاثر طاری ہوتی ہے، اس وقت انسان غیرِ قرآن سے لاتعلق ہو جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے، اسی حالت کو بے خودی کی حالت کہتے ہیں لہٰذا جب انسان جاذبے میں آجاتا ہے، کسی شوق میں آجاتا ہے تو اس وقت انسان کے اوپر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے۔

حالتِ وجد کے اثرات

۸)حالتِ وجد کے اثرات

اگر قرآن پڑھتے ہوئے حالتِ وجد طاری ہو تو اس کے اپنے آثار ہیں، ریاکاری نہ کریں مثلاً بسا اوقات دیکھا ہے کہ آپ قرآن سنتے ہیں اور لوگ جھوم رہے ہوتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ سُر پر

جھوم رہے ہوں نہ کہ معانی پہ، ایک اچھا قاری یہی آیت پڑھے تو جھومتے ہیں اور ایک بے سُر قاری جب یہی آیت پڑھے تو پھر نہیں جھومتے ہیں اسکے معانی یہ ہیں کہ دھن پہ جھوم رہے ہیں، معانی پہ نہیں جھوم رہے ہیں، اگر قرآن سادگی سے پڑھا جائے نہ کہ ساتھ اس کی لے یا دھن بھی اتنی اچھی ہو کہ وہ متاثر کن ہو تو پھر انسان کیوں نہیں جھومتا ہے؟ بعض موسیقیت کچھ چیزوں کے اندر اتنا شدید اثر دکھاتی ہے کہ انسان خود اپنے قابو سے باہر نکل جاتا ہے اور اپنے آپ کو کنٹرول (Control) میں نہیں رکھ سکتا ہے، بعض نغمات میں اتنی شدید موسیقیت موجود رہتی ہے، ان نغموں کی تاثیر ہے اور ان دھنوں کا ایک اثر ہے۔

بعض موسیقی شناس افراد کے بقول بعض راگ اور راگنیاں اس طرح کی ہیں کہ وہ آگ لگا دیتی ہیں، گانے والا اگر اس سطح کے راگ ادا کر سکے یا وہ راگنی گائکی میں گا سکے تو ماحول میں آگ لگا سکتا ہے۔ اب دوسری اشیاء کو آگ لگائے یا نہ لگائے لیکن دلوں کو آگ لگا دیتا ہے یا افراد کو اپنی جگہ سے اٹھا دیتا ہے، جذب کر لیتا ہے، یہ تاثر نہیں ہے، یہ موسیقیت، نغمے یا اس دھن کا اثر ہے کہ وہ لوگ راگ اور راگنی سے متاثر ہو رہے ہیں، ممکن ہے کہ یہ راگ کسی گانے پر فٹ (Fit) ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ راگ کسی قصیدے پر فٹ ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ راگ قرآن کی آیات پر فٹ ہو جائے، راگوں سے انسان متاثر نہ ہو بلکہ معانیٔ قرآن سے متاثر ہو، یہ معانی جب انسان کے دل میں اترتے ہیں تو روحِ قرآن یعنی ان معانی کو سن کر انسان کے اوپر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

پہلے درج کیا تھا کہ مسانخت و مناسبت قرآن کے لئے ضروری ہے، جب تک انسان

حالتِ وجد کے اثرات

مسانخ با قرآن نہ ہو، دل کو نورانی نہ بنائے اور دل کو قرآن کے ساتھ مناسبت نہ دے تو انسان اس سے متاثر نہیں ہوتا ہے، وجد اس وقت طاری ہوتا ہے کہ جب انسان معانیٔ قرآن کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دل بھی متاثر ہونے والا دل ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ، قرآن کے معانی اور قرآن کا نور شدید متاثر کن ہیں اور فطرتاً انسان کا دل بھی متاثر ہونے والا دل ہے، قرآن شدید التاثیر ہے اور دل شدید التاثر ہے، مثلاً فرض کریں کہ ایک لیمپ ہے کہ جس کے اوپر کور (Cover) اسی وجہ سے ہے کہ آنکھیں شدید نور کو ڈائریکٹ (Direct) برداشت نہیں کر سکتی ہیں، آنکھوں میں متاثر ہونے کی شدید صلاحیت ہے اور اس کے اندر متاثر کرنے کی شدید صلاحیت ہے، معمولی ٹیوب لائٹ کی طرف ہم نگاہ کر سکتے ہیں، سو، دوسو واٹ (Watt) کے بلب کی طرف ہم نگاہ کر سکتے ہیں لیکن جب ہزار واٹ سے اوپر روشنی چلی جائے تو اس کی طرف ہم ایک نگاہ بھی اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے ہیں چونکہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اس نور کی تاب نہیں لا سکتی ہیں۔

اسی طرح سے دل اور نورِ قرآن ہے، جو دل متاثر ہونے کے لئے آمادہ ہیں وہ نورِ قرآن کو برداشت کر سکتے ہیں اور نورِ شدیدِ قرآن ان کے اوپر اترتا ہے، اس وقت ان کے اوپر حالتِ شوق و حالتِ وجد طاری ہوتی ہے اور وہ جاذبۂ قرآن کے اندر آجاتے ہیں، کششِ قرآن کے اندر آجاتے ہیں اور حالتِ محو ان کے اوپر طاری ہو جاتی ہے، اس کی علامت یہ نہیں ہے کہ میں اب ریاکاری کے طور پر اپنے اوپر زبردستی حالتِ وجد طاری کرلوں، یہ ریاکاری کی چیزیں نہیں ہیں، وجدان و وجد اور کشش و شوق میں انسان ریاکاری نہیں کر سکتا ہے، شوق اپنا پتہ خود بتاتا ہے،

حالتِ وجد کے اثرات

مشک ان است کہ خود بوید نہ آنکہ عطار گوید،

یعنی جس خوشبو کی تعریف عطار کرے، خوشبو بیچنے والا کرے وہ خوشبو نہیں ہے، صحیح خوشبو وہ ہے جو خوشبو خود بتائے کہ میں خوشبو ہوں۔

اسی طرح سے شوق وہ ہے جو اپنا پتہ خود بتاتا ہے کہ یہ شوق ہے، جیسے عشق و محبت ہے، عشقِ الٰہی و محبتِ الٰہی قابلِ ریا نہیں ہے بلکہ محبت اپنا پتہ خود بتاتی ہے، ماں کو بچے سے محبت ہے، یہ محبت مشک ہے، یہ خود بتاتی ہے کہ یہاں محبت ہے لیکن بسا اوقات انسان مصنوعی محبت کرتا ہے، مصنوعی محبت کی ریا کاری کرتا ہے لیکن تھوڑے عرصے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ یہ جھوٹی اور کاذب ہے، حقیقی عشق و محبت اپنا پتہ خود بتاتے ہیں، عشق و محبت بھی ایک جاذبے کا نام ہے، اگر ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا کمال ہے، محبت محبّ کا کمال نہیں ہے، محبت محبوب کا کمال ہے، محبّ کی ساری خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو محبوب کی کشش کے بیچ میں لا کر کھڑا کیا ہے، جس طرح لوہا اگر مقناطیس کی طرف جارہا ہے اور مقناطیس میں غرق ہے تو جاذبہ مقناطیس میں ہے اور لوہا عشقِ مقناطیس میں اسی کی طرف جارہا ہے اور کھنچا ہوا ہے تو یہ کمالِ مقناطیس ہے نہ کہ کمالِ آہن ہے، یہ فولاد کا کمال نہیں ہے بلکہ اس کا سارا ہنر یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس جاذبے میں قرار دیا ہے اور جاذبے سے اپنے آپ کو ہٹا کر نہیں رکھا ہے وگرنہ دوسری چیزیں بھی ہیں مثلاً لکڑی ہے کہ وہ مقناطیس کے جاذبے میں نہیں ہے کیونکہ ادراکِ جاذبہ اس کے اندر نہیں ہے۔ اسی طرح محبوب کے اندر کشش موجود ہوتی ہے کہ جو محبّ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، معشوق کے اندر کشش موجود ہوتی ہے کہ جو عاشق کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

۹)عشق، اصطلاحِ دینی

عشق کششِ شدید کا نام ہے اور محبت اسی کششِ معمولی کا نام ہے، محبت جب بڑھ جائے اور اس قدر بڑھ جائے کہ انسان کے پورے وجود پر چھا جائے تو اسی کو عشق کہتے ہیں البتہ عشق و شہوت میں فرق ہے، لفظِ عشق کا زیادہ استعمال شہوت رانوں نے کیا ہے اور متدینین ابھی عشق کے لفظ سے ڈرتے ہیں بلکہ عشق کا لفظ استعمال کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ کہیں ایمان ہی دور نہ ہو جائے مثلاً فرشتہ بھی قریب نہ آئے۔

عشق دینی معارف میں سے ہے، یہ دینیاتی موضوع ہے، عشق اصطلاحِ دینی ہے، عشق کا لفظ یہاں سے اٹھا کر شہوت رانوں نے اپنے لئے چرالیا ہے، اس کو دینداروں سے چھین لیا ہے چونکہ یہ دین دار نہیں تھے بلکہ خشک تھے، ان کے پاس جاذبے والا دین نہیں تھا، ان دین داروں نے ایسا مذہب اپنالیا کہ جس کے اندر سرے سے جاذبہ نہیں تھا بلکہ جس کے اندر محض خشکی تھی لہٰذا وہ عاشقانہ مذہب انہوں نے ترک کر دیا اور عاشقانہ مذہب کے بجائے ان کو تاجرانہ مذہب، معادلے والا، تبادلے والا، تجارت والا، لین دین والا مذہب زیادہ پسند آیا، کیلکیولیٹر (Calculator) والا کہ اِدھر نماز پڑھی اور اُدھر حساب کیا، ایک کے دس برابر، ایک کے نر برابر، ایک کے اتنے برابر کہ جیسے یہ عشق کا مذہب نہیں ہے۔ عاشقانہ مذہب کربلا کا ہے، عاشقانہ مذہب سید الشہداء علیہ السلام کا ہے، عاشقانہ مذہب امیر المومنین علیہ السلام کا ہے، عاشقانہ مذہب اور ہوتا ہے اور تاجرانہ مذہب اور ہوتا ہے، عاشقانہ مذہب میں عاشق معشوق کے جاذبے میں گرفتار ہوتا ہے لیکن تاجرانہ مذہب میں اس معشوق

کی نعمت میں گرفتار ہوتا ہے نہ کہ اس ذات کے جاذبے میں گرفتار ہوتا ہے۔

۱۰)انسان پرقرآن کی مقناطیسیت کی علامات

قرآن کلامِ خدا ہے اور جب انسان جاذبۂ خدا میں آجاتا ہے، جاذبہ یعنی کشش، جب انسان اس کشش میں آجاتا ہے تو کلامِ خدا میں اس کیلئے مقناطیسیت پیدا ہوتی ہے اور وہ انسان کو کھینچتی ہے، اگر واقعاً اسکے لئے کشش حقیقی ہے تو اس کی اپنی علامتیں ہیں، اس کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ آیہ بہ آیہ، ایک آیت سے دوسری آیت میں پہنچتا ہے، ایک مطلب سے دوسرے مطلب میں پہنچتا ہے۔ آیات چونکہ متنوع یعنی طرح طرح کی ہیں اور موضوع کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں یعنی قرآن میں مسلسل ایک ہی طرح کی آیات نہیں ہیں کہ مثلاً جیسے خوف کی آیات ہیں، جس طرح سے ابھی موضوعی تفسیر کرتے ہیں کہ خوفِ قرآن، خوف در قرآن، خوف کی ساری آیات یکجا نکال کر پیش کرتے ہیں اور انسان کو یوں لگتا ہے کہ بس خوف ہی خوف ہے اور اس کے ساتھ کوئی بشارت نہیں ہے، قرآن کا یہ انداز نہیں ہے بلکہ قرآن میں خوف ہے تو ساتھ تسلی بھی ہے، بشارت ہے تو ساتھ انذار بھی ہے مثلاً قرآن تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے، تھوڑی سختی دکھاتا ہے پھر قرآن تھوڑی محبت دکھاتا ہے، ساتھ ہی وعدہ دیتا ہے اور ساتھ ہی وعید دیتا ہے یعنی اس طرح سے محبت آمیز طریقے سے قرآن نے انسان کو اپنی طرف جذب کیا ہے، جب ان متنوع آیات میں انسان قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے تو ہر آیہ کے بعد انسان کا عکس العمل اسی آیہ کے متناسب ظاہر ہوتا ہے۔

آیۂ بشارت میں انسان کا عکس العمل کچھ اور ہوتا ہے، آیۂ وعد میں کچھ اور ہوتا ہے، آیۂ خوف میں کچھ اور ہوتا ہے، یعنی ہر آیہ کے متناسب انسان کے وجود میں اثر ظاہر ہوتا ہے، سب سے پہلے اس کی رنگت پہ اثر ظاہر ہوتا ہے، چہرے پر اثر ظاہر ہوتا ہے البتہ جو روح کا اثر ہے وہی چہرے پر منعکس ہوتا ہے چونکہ چہرہ غمازِ روحِ انسان ہے، جس طرح سے ہماری روح، جس طرح سے ہمارا دل اثر قبول کرتا ہے تو وہی چہرہ بتا رہا ہوتا ہے، چغلی کھا رہا ہوتا ہے اور سب کو بتا رہا ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے، جیسے بیٹھے بیٹھے کسی کو خوف آ جائے تو ہم یہ خوف سب سے پہلے اس کے چہرے پر پڑھتے ہیں، اس کی نگاہوں سے پڑھتے ہیں، درحقیقت چہرہ خوف زدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ روح خوف زدہ ہوتی ہے لیکن چونکہ چہرہ روح سے مربوط ہے لہٰذا فوراً بتا رہا ہے کہ اس کو خوف آ گیا ہے یا اگر بیٹھے بیٹھے کسی کو کوئی خوشخبری سنائی جائے تو سب سے پہلے ہم اس کے چہرے سے سمجھتے ہیں کہ یہ خوشی اس کی روح میں آئی ہے چونکہ چہرے نے اس کی روح کی غمازی کی ہے۔

حالتِ سرور و حالتِ بہجت و حالتِ انبساط اس انسان کی روح میں اور دل میں موجود ہے لہٰذا آیاتِ ابتہاج میں انسان مبتہج ہوتا ہے، آیاتِ سرور میں مسرور ہوتا ہے، آیاتِ غم میں غمگین ہوتا ہے یعنی آیت بہ آیت اثر قبول کرتا ہے، جس طرح سے جاذبہ ہے کہ ایک چیز نے اپنی طرف کھینچا ہوا ہے، اب انسان کا اختیار قرآن کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے، کہیں پر انسان خوش ہوتا ہے، کہیں پر غمگین ہو جاتا ہے، یہ جاذبۂ قرآن ہے کہ جو انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے، بعض روایات اس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہیں مثلاً ایک نمونہ نہج البلاغہ میں ہے کہ قرآن کو جاذبہ سے سننا

انسان پر قرآن کی مقناطیسیت کی علامات

یعنی مُخاطَبْ بن کر سننا نہ کہ سامعین بن کر سننا۔ سامعین میں اور مخاطبین میں بہت فرق ہے اور مخاطبین میں بھی وہ لوگ جو آمادہ دل کے ساتھ سنتے ہیں، جو ہر چیز کو پا لیتے ہیں اور جن پر وجد طاری ہوتا ہے یعنی جو کچھ انہیں بتایا جاتا ہے اس کو پا رہے ہوتے ہیں نہ کہ صرف سُن اور سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

۱۱) کسی چیز کو پانے اور سمجھنے میں فرق

کچھ چیزیں پانے کی ہوتی ہیں، فرض کریں کہ آپ کسی کو محبت پیش کر رہے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ میں آپ کی محبت سمجھ رہا ہوں، محبت سمجھنے کی چیز نہیں ہے یا آپ کسی کو خوف دلا رہے ہیں اور وہ کہے کہ مجھے خوف سمجھ میں آ رہا ہے، خوف تو سمجھنے کی چیز نہیں ہے، خوف طاری کرنے کی چیز ہے، خوف وجود کے اندر اتارنے کی چیز ہے، خوف پانے کی چیز ہے یا آپ کسی کے سامنے کوئی لذت پیش کریں اور وہ کہے کہ میں اس لذت کو سمجھ رہا ہوں، لذت تو سمجھنے کی چیز نہیں ہے، لذت ذہنی چیز نہیں ہے بلکہ لذت وجودی چیز ہے کہ جو انسان کے وجود کے اندر محسوس ہو یعنی انسان قوتِ لامسہ کے ذریعے سے اس طرح مخاطب بنے کہ پائے یعنی مخاطبِ سماعی نہ ہو، مخاطبِ لفظی نہ ہو بلکہ مخاطبِ وجودی ہو، روحِ انسان مخاطَبِ قرآن ہو، روحِ قرآن روحِ انسان سے مخاطِب ہو، روحِ انسان روحِ قرآن کی مخاطَب ہو، روح روح کے ساتھ رابطہ رکھے نہ کہ فقط انسان کانوں سے قرآن کا مخاطبِ سماعی بن جائے یعنی کوئی ایک پڑھے اور ہم کانوں سے سنتے جائیں لیکن روح کے سامنے وہ روحِ قرآن پیش نہ کریں اور نہ ہماری روح اس کو دریافت کرنے کے لئے حاضر ہو، روح کے ساتھ جو چیز سنی جائے،

کسی چیز کو پانے اور سمجھنے میں فرق

مخاصب بن کر جو چیز سنی جائے تو اس وقت وجد و جذبہ کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

۱۲)معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

جن لوگوں پر بہت زیادہ جذبہ وفنا کی کیفیت طاری ہوتی ہے ان کے لئے سنبھلنا اور مشکل ہے، جن لوگوں کو ابھی اور ہنسنا ہے اور کھیلنا کودنا ہے، ابھی اور لذتیں اٹھانی ہیں وہ اپنے اندر یہ حالت ایجاد نہ کریں چونکہ یہ حالت انسان کو پریشان کرتی ہے اور اگر شدید ہو جائے تو انسان کو مزید پریشان کرتی ہے اور شاید انسان اس دنیا سے ہی گزر جائے۔

نہج البلاغہ میں ایک خطبہ بنامِ خطبۃ الھمّام ہے، ھمام ایک شخص ہے کہ جس نے امیر المومنینؑ کے پاس آکر تقاضا کیا کہ آپ میرے لئے حقیقتِ تقویٰ بیان فرمائیں، یہ خطبہ بارہا سب نے پڑھا ہوا ہے، اس کی تفسیریں بھی ہوئی ہیں اور اس پر تقریریں بھی ہوتی ہیں، مطالب بھی بیان ہوتے ہیں اور یہ اخلاقیات کا ایک اصلی موضوع واقع ہوا ہے، امیر المومنین علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تقویٰ اچھی چیز ہے، متقی بنو، اچھے کام کرو، خدا حافظ، اس نے کہا کہ یہ تو بات نہیں بنی، مزید بیان کریں، ایسا نہیں تھا کہ امیر المومنین علیہ السلام کا حوصلہ نہیں تھا کہ اس وقت تھکے ہوئے تھے یا معاذ اللہ خستہ تھے اور چاہتے نہیں تھے بلکہ امیر المومنین علیہ السلام یہ دیکھ رہے تھے کہ آیا اس کی عطش حقیقی ہے یا کاذب ہے؟

بعض اوقات ہوتا ہے کہ پیاس نہیں ہوتی ہے لیکن شربت کا رنگ بہت اچھا ہوتا ہے لہٰذا پینے کو جی کرتا ہے، نہ کہ پیاس یا اشتہا کی وجہ سے بلکہ اس وجہ سے کہ شربت بنا ہوا ہے اور ظاہراً بہت

اچھا لگ رہا ہے، پیاس تو نہیں ہے لیکن انسان چاہتا ہے کہ اگر کوئی گلاس بھر کر دے دے تو اس کے دو گھونٹ پی لے۔

جیسے بچے عموماً سبیلوں پہ جاتے ہیں، حالانکہ پیاسے نہیں ہوتے ہیں لیکن وہ چسکے کے لئے اپنے اندر کاذب عطش پیدا کرتے ہیں اور لائن میں کھڑے ہو جاتے ہیں، گلاس لے کر دو گھونٹ بھرتے ہیں اور مزہ نہیں آتا تو آدھا گلاس وہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، یہ کاذب عطش ہے، جھوٹی پیاس ہے کہ جو مصنوعی طور پر اپنے اوپر طاری کی گئی ہے، اگر انسان کے اندر حقیقی پیاس ہو تو پھر وہ رنگتِ شربت کو نہیں دیکھتا ہے کہ کونسا پانی ہے؟ کونسا پانی نہیں ہے؟ منرل واٹر (Mineral water) ہے یا دوسرا واٹر ہے؟ مثلاً قم کا کھارا پانی ہے یا میٹھا پانی ہے یا اگر روزہ رکھا ہوا ہے اور دن کو شدید گرمی اور پیاس ہے تو پھر شام کو روزہ افطار کرتے ہوئے کوئی یہ نہیں پوچھتا ہے کہ یہ کھارا پانی ہے یا میٹھا پانی ہے، اس وقت کہتا ہے کہ پانی ہونا چاہئے کہ جس سے پیاس بجھ جائے، اگر آپ وہ پانی پی کر اس سے کہیں کہ یہ تو قم کا کھارا پانی تھا تو کہتا ہے کہ مجھے محسوس نہیں ہوا چونکہ انسان کو واقعاً پیاس تھی، جب پیاس نہیں ہوتی ہے تو پھر میٹھا پانی بھی کھارا لگنا شروع ہو جاتا ہے، کہتا ہے کہ پانی میں کچھ ہے، پانی میں اس لئے کچھ ہے چونکہ پیاس نہیں ہے، آپ نے ایسے ہی دکھانے کے لئے پی لیا ہے، بعض اوقات شربت کی رنگت دیکھ کر انسان جذب ہو جاتا ہے۔

مثلاً سنا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، چلو ایک دن ان کے پاس جاتے ہیں اور مجلس و محفل میں بیٹھتے ہیں کہ کیا کہتے ہیں؟ یہ عطشِ کاذب ہے، اس لئے امیر المومنینؑ

معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

نے پہلے دیکھا کہ واقعاً اس کے اندر عطش ہے یا نہیں ہے، یوں نہیں کہ جو بھی آیا اور آ کے بولا کہ مولا کچھ بیان فرمائیں اور مولاؑ فوراً تفصیلاً بیان کرنا شروع کر دیں لہٰذا امیر المومنینؑ نے یہ دیکھنا چاہا کہ اس کے اندر تقویٰ کی خواہش ہے یا نہیں ہے، دل آمادہ ہے یا نہیں ہے، اس کے اندر ہے خشوع ہے یا نہیں ہے، متاثر ہونے کی صلاحیت ہے یا نہیں ہے، دو دفعہ حضرتؑ نے اس کو سرسری جواب دیا، جسے اجمالاً کہتے ہیں یعنی گول مول، ایسے ہی مُجمل جواب دیا کہ یہ کسی طریقے سے ٹل جائے لیکن وہ نہیں ٹلا اور اصرار کرتا رہا، عطشِ کاذب انسان کو ٹھہرنے نہیں دیتی جیسے عموماً درسوں میں عطشِ کاذب لے آتی ہے لیکن تھوڑا سا سخت درس ہوا تو انسان وہیں پر چھوڑ جاتا ہے، وہیں پر پتہ چل جاتا ہے کہ اس میں عطشِ کاذب تھی۔

فرض کریں کہ ہم استاد کے پاس جاتے ہیں اور ایک دفعہ تقاضا کرتے ہیں کہ آغا آپ ہمیں درس پڑھائیں، وہ عذر ظاہر کرتا ہے کہ نہیں پڑھا سکتا ہوں تو ہم کہیں کہ ٹھیک ہے نہیں پڑھانا ہے تو نہیں پڑھاؤ ہمارے پاس بھی پڑھنے کے لئے ٹائم نہیں ہے، تھوڑے استاد تو نہیں ہیں کسی اور کے پاس جا کر پڑھ لیں گے، اس کے معانی یہ ہوئے کہ عطشِ کاذب ہے، اگر عطشِ صادق ہوتی تو ہم اصلاً ٹلنے والا نہ ہوتے یا مثلاً ہم واقعاً سخت پیاسے ہیں اور راستے میں افطار کا ٹائم ہو گیا ہے لہٰذا کسی جگہ سبیل پر ہم آغا سے کہتے ہیں کہ پانی دو اور وہ آپ کو کہے کہ آپ کو پیاس ہی نہیں ہے پھر ہم وہاں پر اپنی پیاس ثابت کرتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات یعنی اپنے پورے وجود سے بتاتے ہیں کہ ہم پیاسے ہیں اور جب اس کو معلوم ہو جائے کہ واقعاً پیاسا ہے تو وہ سبیل کا منہ کھول دیتا ہے، اپنے

معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

اندر عطشِ صادق پیدا کریں، اپنے آپ کو پیاسا بنائیں، عموماً ہماری توقع یہ ہوتی ہے کہ اس موضوع پہ کوئی ہمیں سیراب کردے مثلاً کہتے ہیں کہ اس موضوع پہ تشنگی رہ گئی ہے، مشکل یہی ہے، موضوع کو سیراب نہ کریں، انسانوں کو بھی سیراب نہ کریں بلکہ انسانوں کو پیاسا کریں، پیاسے انسانوں کو کچھ ملتا ہے لیکن جن کی بھوک مری ہوئی ہے، جن کی پیاس مری ہوئی ہے وہ کسی چیز کی طرف رغبت بھی نہیں رکھتے ہیں۔

معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

قرآن کی نسبت سے ہماری عطش حقیقی نہیں ہے، قرآن کی پیاس ہی نہیں ہے، بسا اوقات مصنوعی عطش طاری کرتے ہیں، عموماً کسی چھوٹے بچے کو دیکھ کر قرآن کی طرف تھوڑا سا شوق بڑھتا ہے مثلاً جب وہ فرفر قرآن پڑھتا ہے اور بڑے اچھے عربی لحن میں پڑھتا ہے تو ہمیں بھی شوق گدگداتا ہے کہ ہم بھی یہاں آئیں لیکن جب ہم قرآن میں آتے ہیں تو سر میں درد ہونا شروع ہوجاتا ہے اور دوسرے دن بند کر کے رکھ دیتے ہیں، جب کسی حافظ کو دیکھتے ہیں کہ اس نے حفظِ قرآن کیا ہے اور اسے اقامہ مل گیا ہے تو ہمیں بھی شوق گدگداتا ہے کہ حفظ ہی تو ہے، چھ مہینے میں حفظ کرلیں گے تو ہمیں بھی ملے گا لیکن جب سورۂ فاتحہ سے آگے بڑھتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ حفظ کتنا دشوار کام ہے؟ لہٰذا وہیں پر چھوڑ دیتا ہے، ایسا حفظ کیا ہے؟ یہ عطشِ کاذب ہے، اگر صادقانہ پیاس ہو تو انسان ٹلتا نہیں ہے، ٹالنے والے دیکھتے ہیں اور آزماتے ہیں کہ اس کے اندر سچی پیاس ہے یا نہیں ہے؟ لہٰذا ثابت کرنا ہوتا ہے کہ میرے اندر سچی پیاس ہے، پہلے پیاس کا امتحان دینا ہوتا ہے کہ میں واقعاً پیاسا ہوں ورنہ دوسروں کو معصومین علیہ السلام بھی ٹالتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے دو تین دفعہ اس کو گول مول جواب دیا لیکن اس نے ثابت کیا کہ میں پیاسا ہوں پھر اس کے بعد حضرت نے یہ خطبہ اس کے سامنے بیان کیا، خطبۃ المتقین سنتے سنتے ھمام اس دنیا سے چل بسے، ہم بھی خطبہ پڑھتے ہیں لیکن ہم پر اثر نہیں ہوتا، کیوں نہیں ہوتا؟ چونکہ ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا وجد کی کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے، کیونکہ ہمارا دل متاثر ہونے والا دل نہیں ہے، مُنْفَعِل دل کے ساتھ نہیں جاتے ہیں بلکہ سخت دل کے ساتھ جاتے ہیں۔ سخت دلوں پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی ہے۔

اقبالؒ نے یہ شعر کسی دوسرے شاعرِ ہندی سے نقل کیا ہے کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

نادان انسان، جاہل انسان، جاہلِ مرکب اور احمق انسان پر نرم ترین کلام بھی اثر انداز نہیں ہوتا ہے، پھول کی پتی ہیرے کو کاٹ دیتی ہے لیکن دل اتنا سخت ہے کہ کلامِ نرم و نازک اس پر اثر نہیں کرتا ہے، جب مولا علی علیہ السلام نے یہ خطبہ بیان فرمایا تو راوی نے ایک دفعہ ھمام کی چیخ سنی اور ھمام بے ہوش کر گر پڑا اور وہیں پر مر گیا جبکہ یہ راوی شقی تھا کہ جس نے یہ واقعہ نقل کیا ہے، وہ ساتھ کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا لیکن اس کے دل پر ایسا کوئی اثر نہ ہوا، حضرت علیہ السلام نے ھمام کے دنیا سے گزر جانے کے بعد فرمایا کہ دل اس طرح سے متاثر ہوتے ہیں اور فرمایا کہ مجھے یہی ڈر تھا، اس کو وجد کہتے ہیں، یہ اوجِ وجد ہے، یہ بے خودی ہے، ایک بے مُوَقَّتْ بے خودی انسان پر طاری ہوتی ہے، تھوڑی دیر کیلئے بے خودی

معارف کیلئے عطشِ حقیقی پیدا کریں

طاری ہوتی ہے تو پھر انسان خودی میں آجاتا ہے، انسان اپنے آپ میں آجاتا ہے، پھر اردگرد سے رابطہ برقرار ہوجاتا ہے لیکن انسان پر ایک دائمی بے خودی طاری ہوتی ہے، انسان اتنا محو ہوجاتا ہے کہ اس کی کلام کے اندر جان نکل جاتی ہے، متاثر ہونے والے دل اس طرح سے متاثر ہوتے ہیں نہ کہ سیاہ وآلودہ دل کہ جن کے اوپر زنگ کی تہہ لگی ہوئی ہو،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً......

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت......

ان کے اوپر کوئی بھی چیز اثر نہیں کرتی ہے، قرآن کے کئی کئی دورے ان کے سامنے پڑھ دیں یا وہ خود قرآن پڑھیں تو بھی کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

۱۳) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد

روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اصحابؓ کو کہتے تھے کہ آپ قرآن پڑھو مثلاً ابن مسعود کو کہتے تھے کہ آپ قرآن کی آیت پڑھو، اور ابن مسعود نے قرآن پڑھنا شروع کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی باوجودیکہ یہ قرآن اترا ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن مسعود کو قرآن سکھایا ہے پھر بھی ابن مسعود سے کہتے ہیں کہ قرآن پڑھو۔ یہ کلامِ خدا ہے اور کلامِ خدا متاثر ہونے والے دل پر اسی طرح سے اثر کرتا ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ یہ مناجات جو ہم پڑھتے ہیں تو ائمہ علیہم السلام بھی اسی طرح سے مناجات پڑھتے تھے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ مناجات میں بے ہوش اور مدہوش ہو کر گر جاتے تھے، نقل کیا جاتا ہے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا حضرت سیدہ علیہا السلام کے پاس آیا اور بڑی پریشانی کے عالم میں، بڑی مضطرب حالت میں کہا کہ امیر المومنین علیہ السلام اس دنیا سے گزر گئے، آپ کفن و دفن کا انتظام کریں، حضرتِ سیدہ علیہا السلام پریشان نہیں ہوئیں اور بڑے اطمینان سے سنا حالانکہ وہ شخص بڑا مضطرب اور آواز باختہ تھا، کہنے لگا کہ مثلاً میں فلاں جگہ سے گزرا تو مجھے کسی کی عبادت یا مناجات کی آواز آئی؟ جب میں نے دیکھا تو وہ امیر المومنین علیہ السلام تھے، بعد میں ان پر ایک حالت طاری ہوئی لہٰذا امیر المومنین علیہ السلام گرے اور پھر وہیں پر ختم ہو گئے، میں فوراً دوڑا ہوا یہاں آیا ہوں کہ آپ کو اطلاع کروں۔ بی بی علیہا السلام نے فرمایا کہ تم نے آج علی علیہ السلام کی رحلت دیکھی ہے، علی علیہ السلام کو آج اس دنیا سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے، زہرا علیہا السلام ہر شب کو دیکھتی ہے یعنی یہ معمولِ امیر المومنین علیہ السلام ہے۔ یہ ہے وجد اور اس کو کیفیتِ وجد کہتے ہیں، وجد کیوں آتا ہے؟ وجد کی کیفیت اس لئے طاری ہوتی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا دل آمادہ ترین دل ہے، سب سے زیادہ متاثر ہونے والا دل ہے، امیر المومنین علیہ السلام کے کلام میں تاثیر اسی وجہ سے ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا دل اثر رکھنے والا دل ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام پر حالتِ وجد

انسان کلامِ خدا میں اس ادب کے ساتھ آئے اور قرآن پڑھے، با ادب ہو کر مؤدبانہ قرآن پڑھے نہ کہ بے ادبانہ پڑھے، قرآن کو ہم اجنبی بن کر نہ پڑھیں، حکایات نہ کریں، فقط تلفظ نہ کریں بلکہ اپنی روح، روحِ قرآن کے سامنے پیش کریں، روحِ قرآن کے ساتھ اپنی روح کو آمادہ کریں تاکہ روحِ قرآن ہمارے اندر اترے اور اثر کرے پھر قرآن ہمارے لئے مقناطیس ہو جائے گا اور

ہماری حیثیت اس لوہے کی ہوگی کہ جو جاذبۂ مقناطیس میں مبتلا ہے، زنگ آلود دل، زنگ آلود روحوں کے اندر کوئی مقناطیسیت موجود نہیں ہوتی ہے۔

۱۴)جیسی آیت ویسی حالت

صدر المتألھینؒ فرماتے ہیں کہ

☆ و یتفنن احواله بحسب اختلاف الایات......

چونکہ آیات مختلف ہیں، آیات کا لب ولہجہ، آیات کا پیغام اور روحِ آیات مختلف ہیں، کسی آیت میں بشارت ہے، کسی آیت میں وعدہ ہے، کسی آیت میں وعید ہے، کسی آیت میں نعمت کا تذکرہ ہے، کسی آیت میں نقمت کا تذکرہ ہے اور یہ سب انسانی احوال ہیں، کسی میں جہنم کا عذاب ہے، کسی میں بہشت کی نعمتیں ہیں، کسی میں قربِ خدا کا ذکر ہے اور کسی میں قہرِ خدا کا ذکر ہے، کسی جگہ پر لقاء اللہ کا ذکر ہے اور کسی جگہ پر ذکر ہے کہ

لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥(٨)

ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ خدا ان سے بات کرے گا اور نہ روزِ قیامت ان کی طرف نظر کرے گا اور نہ انہیں گناہوں کی آلودگی سے پاک بنائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

پس کسی جگہ جہنمِ حرمان کا ذکر ہے اور کسی جگہ پر جنتِ لقاء کا ذکر ہے۔ متاثر ہونے کے معانی یہ ہیں کہ جب انسان آیاتِ لقاء میں جائے تو وہی کیفیت انسان پر طاری ہو جو حالتِ لقاء میں طاری ہوتی ہے اور جب آیاتِ حرمان پہ پہنچے تو اس طرح سے مضطرب ہو جائے کہ جو کیفیت حالتِ حرمان، حالتِ محرومیت اور دوری کی حالت میں طاری ہوتی ہے،

☆ فیکون له بحسب کل فهم وجد وحال......

جس طرح سے اس کی آیات کی فہم ہے اسی اعتبار سے انسان کے اوپر وجد طاری ہو اور حال طاری ہو، حال بھی اسی وجد کے معنیٰ میں ہے، حال یعنی کیفیتِ وجد یا ایسی کیفیت پر طاری ہو کہ جو کسی چیز کی کشش اور جاذبے کی وجہ سے ہو اور انسان کو بے خود کر دے، اس کو حالتِ وجد اور حالتِ حال کہتے ہیں،

☆ من الحزن......

اگر ایسی صورت ہے کہ جہاں پر حزین ہونا ہے، وہاں انسان اس طرح متاثر ہو کہ حالتِ حزن طاری ہو یعنی انسان پر وجدِ حزنی طاری ہو،

☆ والخوف والخشية والرجاء والفرح......

جہاں امید کی آیات ہیں، جہاں خوشحالی کی آیات ہیں، جہاں فرح و سرور کی آیات ہیں تو اسی کے مطابق انسان کی حالت بنے۔

۱۵)عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ھے

مولانا روم نے شوق اور وجد کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ انسان کے دل کے اندر جو شوق پیدا ہوتا ہے یہ درحقیقت خدا کی طرف سے ہے، یہ حالت انسان کے دل کے اندر ڈالی جاتی ہے۔ایک شخص کہ جو خدا خدا کرتا تھا اور کوئی جواب نہیں آتا تھا تو شیطان نے جا کر اس کو بہکایا کہ تو چالیس سال سے خدا خدا کر رہا ہے، مناجاتِ پروردگار کر رہا ہے لیکن کبھی جواب نہیں آیا، یہ شیطان کے وسوسے میں آ گیا اور خدا خدا کرنا چھوڑ دیا، ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اس سے پوچھ رہا ہے کہ رات کو کیوں نہیں اٹھتے ہو؟ کیوں خدا خدا نہیں کرتے ہو؟ کہا کہ فائدہ کیا ہے خدا خدا کرنے کا جب کوئی جواب ہی نہیں دیتا، جب لبیک ہی نہیں سنی جاتی ہے، کہا کہ احمق، نادان یہ تیرا لبیک کہنا یہ تیرا یارب کہنا لبیکِ ما اَست، تو یہ سمجھتا ہے کہ تو یارب یارب کر رہا ہے، نہیں، بلکہ ہم یارب یارب کروا رہے ہیں، وہ جو تیرا شوق تھا کیا وہ شوق تو نے اپنے اندر پیدا کیا؟ وہ شوق ہم نے پیدا کیا تھا یعنی وہ ہماری مقناطیسیت تھی کہ جس کی کشش میں تو گرفتار تھا، ہم نے اپنا جاذبہ اور کشش تیرے سامنے رکھی تھی اور تجھے کھینچا تھا، تو یہ سمجھتا ہے کہ تو ہماری بارگاہ میں آیا ہے؟ یہ تیرا اٹھ کر یاربّنا کہنا یہ خود لبیکِ ما اَست، ہر یارب کے نیچے ایک لبیک ہے اور خدا موجود ہے بلکہ فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تو یارب کہے میں نے لبیک کہہ دی ہے۔

عبادات کا شوق خدا پیدا کرتا ہے

۱۶) شوق و وجد، عالم توحید و ملکوت کے مقناطیس

☆ فان الشوق والوجد مغناطیس القرب من عالم التوحید والملکوت......

صدر المتالہین ؒ فرماتے ہیں کہ وہ شوق جو ہمارے اندر عبادت کیلئے پیدا ہوتا ہے کس طرح مقناطیسِ عالم توحید و عالم بالا ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے بھی فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ خدا اگر کسی عبد سے ناراض ہو، اس پر قہر کرے، اس کو سخت ترین سزا دے اور رسوا کرنا چاہے تو اس کے دل سے شوق و لذتِ عبادت نکال لیتا ہے، انسان کا شوق ختم ہو جاتا ہے تو عبادتوں میں لذت ختم ہو جاتی ہے اور یہی بیماری ہے، اگر یہ کیفیت محسوس ہونا شروع ہو جائے اور اس کا آغاز ہو جائے یعنی شوق و لذت کم ہونا شروع ہو جائے تو فوراً علاج کریں، جس طرح سے انسان بھوکا ہو لیکن کھانے کی طرف اشتہا نہ ہو، کھانے کی طرف رغبت نہ ہو تو ہسپتال جا کر علاج کرائے ورنہ چند دنوں میں ہلاک ہو سکتا ہے، کوئی ایسی خطرناک بیماری ہے کہ جس نے اشتہاءِ انسان کو ختم کر دیا ہے۔ کیوں عبادتِ خدا میں، مناجاتِ خدا میں اور قربِ خدا میں شوقِ انسان کم ہوا ہے؟ انسان اپنی اس بیماری کا فوری علاج کرے۔

شوق، رغبت اور رجحان خداوند تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے، البتہ شوق کسی چیز کا بھی پیدا ہو سکتا ہے، یہ بھی مناسبت کی وجہ سے ہے کہ جس چیز کی انسان کی روح سے مناسبت ہو اسی چیز کا انسان کو شوق ہوتا ہے، اگر مشتاقِ دنیا ہے تو رجحان مال کی طرف ہے یعنی اگر انسان اندر سے ظلمانی

ہے تو اس کا شوق ظلمت کی طرف زیادہ ہے، اگر اندر سے نورانی ہے تو اس کا شوق نور کی طرف زیادہ ہے حتیٰ یہاں پر بھی آپ دیکھ لیں کہ علمی حلقوں میں اور علمی دنیا میں بھی ہر ایک کا شوق ایک خاص چیز کی طرف ہے، یہ شوق بتاتا ہے کہ انسان کی روح کی مناسبت کس چیز کے ساتھ ہے؟ یہیں سے روح کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرف مشتاق ہے، شہید مطہریؒ اپنے طالب علمی کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں آغاز میں ہی مثلاً سب کی کتابیں پڑھتا تھا، بزرگوں کی، فقہا کی، مؤرخین کی، محدثین کی اور مفسرین کی لیکن اندرونی طور پر مجھے اس وقت تشفّی محسوس ہوتی تھی کہ جب میں حکماء کی کتابیں پڑھتا تھا یعنی بچپن سے ہی مناسبت نظر آرہی تھی کہ یہ روح اس چیز کے لئے آمادہ ہے۔ شوق کے بغیر انسان موافق نہیں ہوتا ہے، شوق اسی کشش کو کہتے ہیں کہ کوئی کھینچے اور میں اس کی کشش کے سبب اس کی طرف چلا جاؤں۔

شوق و وجد عالمِ ملکوت کیلئے مقناطیسی جاذبہ رکھتے ہیں مثلاً قطب نما ایک عام آلہ ہے کہ جس سے ہم قبلہ تلاش کرتے ہیں، اس کے اندر ایک سوئی رکھی ہوتی ہے اور جہات مشخص ہوتی ہیں، اس کے اندر نمبر لکھے ہوتے ہیں کہ اس کو جس رخ پر بھی کریں تو وہ سوئی کس طرف چلی جاتی ہے؟ قبلے کی طرف نہیں جاتی ہے، شوال اور جنوب میں جاتی ہے یعنی اس کی دم جنوب کی طرف ہوتی ہے اور اس سوئی کا منہ شمال کی طرف ہوتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یعنی جہاں بھی آپ اس کو چکر دیں، اس کو الٹا کریں، سیدھا کریں، جدھر بھی کریں لیکن اس کا رخ ہمیشہ شمال کی طرف ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ قطب شمال میں ہے، نارتھ پول (North Pole) میں ایک مقناطیسی میدان ہے، جس طرح

شوق و وجد، عالم کو حیرت و طہارت کے مقناطیس

سے برمودا میں ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ امام علیہ السلام جہاز گراتے ہیں، امام علیہ السلام جہاز نہیں گراتے ہیں، خدا نے امام علیہ السلام کو جہاز ڈبونے کی ماموریت نہیں دی ہے بلکہ یہ مقناطیسی میدان ہے اور یہ اسی مقناطیسی شعاع کا اثر ہے، قطب شمالی کی طرف زمین کے اندر مقناطیسیت موجود ہے اور وہ زمین کے اوپر افقی طور پر پھیلتی ہے، جس طرح سے یہاں میز پر مقناطیس رکھیں تو مقناطیس کی شعاع اسی طرف آئے گی لیکن ایک مقناطیسی شعاع عمودی ہے اور اوپر کی طرف جاتی ہے یعنی ایک ہوریزونٹل (Horizontal) شعاع ہے اور ایک ورٹیکل (Vertical) شعاع ہے اس کی سوئی سیدھی اوپر کی طرف جاتی ہے، برمودا میں سمندر کے نیچے جو مقناطیس ہے اس کی شعاع عمودی ہے کہ کوئی بھی اس کے اوپر جائے تو وہ اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن قطبی علاقے میں جو مقناطیسیت ہے اس کی شعاع افقی ہے، وہ پوری زمین کے اوپر پھیل جاتی ہے لہٰذا کوئی بھی قطب نما چونکہ پارے کے اندر اس کو رکھا ہوتا ہے لہٰذا فری (Free) ہوتا ہے، وہ لوہا فکسڈ (Fixed) نہیں ہوتا ہے اور اس کو کسی چیز نے جکڑا ہوا نہیں ہوتا ہے لہٰذا آزاد آہن ہوتا ہے، کسی چیز کے اندر مقناطیسیت کا رنگ ڈال کر یا مقناطیسیت کا شائبہ ڈال کر اس کے اندر اس کو آزاد رکھیں تو ہر چیز کا رخ شمال کی طرف ہو جائے گا کیونکہ اس کی کشش و جاذبہ وہاں ہے، آپ اس کا رخ مشرق و مغرب کی طرف کریں یا جنوب کی طرف کریں لیکن وہ خود شمال کی طرف ہو جائے گا۔

یہ انسان کو سمجھانے کے لئے بہترین چیز ہے کہ ہمارا رخ جدھر بھی کریں مثلاً دنیا کی طرف کریں تو بھی خدا کی طرف ہو جائیں، اگر ہمیں شیطان کی طرف کریں تو بھی خدا کی طرف ہو جائیں

اور اگر ہمیں مال و دولت کی طرف کریں تو بھی ہم خدا کی طرف ہو جائیں، کیوں؟ کیونکہ عالمِ ملکوت میں قطب شمال سے کہیں زیادہ بڑا میدانِ مقناطیسی موجود ہے لیکن وہ لوہے کو نہیں کھینچتا ہے دلِ مومن کو کھینچتا ہے، دلِ خاشع کو کھینچتا ہے، ملکوت کے اندر بھی مقناطیسیت ہے اور عالمِ ملکوت میں شدید تر میدانِ مقناطیسی موجود ہے، عالمِ توحید میں مقناطیسیت موجود ہے۔

۱۷) قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ

قرآن عالمِ ملکوت سے ہے اور قرآن کے اندر ایک ملکوتی جاذبہ موجود ہے، قرآن کے اندر ایک مقناطیسیت ہے اور یہ کشش انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن انسان اس کشش کی طرف نہیں جارہا ہے، جس طرح آپ ایک لوہے کو ستون سے باندھ کر مقناطیس اس کے سامنے رکھیں تو یہ لوہا مقناطیس کی طرف نہیں جاتا ہے، اگرچہ مقناطیس میں کشش ہے لیکن یہ نہیں جائے گا مثلاً اگر ہم دیوار میں ٹھکی ہوئے میخ کے نزدیک مقناطیس کو لے جائیں تو بھی یہ میخ مقناطیس کی طرف نہیں آتی ہے، کیوں؟ کیونکہ یہ میخ دیوار کے اندر راسخ ہے، پھنسی ہوئی ہے اور وہ لوہا مقناطیس کی طرف کیوں نہیں آتا ہے؟ چونکہ ستون کے ساتھ ویلڈ (Weld) ہو چکا ہے اور بندھا ہوا ہے، پہلے اس کو کھولیں اور آزاد کریں پھر کششِ مقناطیس اس کو کھینچ لے گی۔

قرآن کے اندر دلوں کے لئے کشش ہے، انسان کی فطرت اور دلِ انسان آہن کی طرح

قرآنی کشش کے باوجود دل کی قرآن سے دوری کی وجہ

ہے اور قرآن مقناطیس ہے لیکن ہمارے دل قرآن کی طرف نہیں جاتے ہیں، کیوں نہیں جاتے ہیں؟ اس لئے کہ ان دلوں کے اوپر تالے پڑے ہوئے ہیں، یہ ان میخوں کی طرح ہیں جو دیواروں کے اندر ٹھکی ہوئی اور گڑی ہوئی ہیں اور گڑی ہوئی میخیں مقناطیس کی طرف نہیں آتی ہیں یا مثلاً اس دل کو شہوات اور خواہشات کی زنجیروں میں باندھا ہوا ہے اور جب اس دل کے سامنے مقناطیس رکھتے ہیں تو یہ مقناطیس کی طرف نہیں جاتا ہے بلکہ الٹا بیزار ہو جاتا ہے، یہ دل شہوات کی رسیوں میں باندھا ہوا ہے ،اس دل کو پہلے آزاد کریں، پہلے شفاف کریں،ان شہوات کی زنجیروں کو توڑیں،ان خواہشات کی قید سے پہلے دل کو خلاصی ورہائی دلائیں پھر مقناطیس سامنے رکھیں تو پھر دیکھ لیں گے کہ قرآن کے اندر کیسی کشش ہے۔تالیِ قرآن وہی ہے جو جاذبۂ قرآن و کششِ قرآن میں آ گیا ہو اور مقناطیسیتِ قرآن کے مدار میں اپنے آپ کو لے آیا ہو، جس نے اپنی ساری رسیاں، سارے بندھن اور ساری زنجیریں توڑ دی ہیں اور جہاں جہاں ان کا رسوخ تھا وہ رسوخ اس نے ختم کر دیا ہے، اب اس نے خود کو قرآن کے سامنے پیش کیا ہے اور قرآن اس کا ہاتھ تھام کے آگے لے جانا چاہتا ہے تو یہ آگے جانے کے لئے تیار ہے۔البتہ تالیِ قرآن کی مزید وضاحت اس فصل کے حصۂ چہارم میں درج کی جائے گی۔انشاء اللہ اس فصل کے حصۂ دوم میں دل کی سختی و نرمی کے اسباب اور عشقِ الٰہی کی مقناطیسیت کی وضاحت بھی کی جائے گی۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۱۱۰)

(۲)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۱۲۳)

(۳)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۶۴)

(۴)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۴۷)

(۵)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیۃ اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)
(تفسیر القرآن الکریم - السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۱۸۹)
(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحہ ۱۸۴)
(مستدرک سفینۃ البحار - آیۃ اللّٰہ علی النمازی، الجزء ۸، صفحہ ۴۶۱)
(میزان الحکمۃ - الریشھری، الجزء ۸، صفحہ ۲۱۰)

(۶)......(فی رحاب القرآن)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۲۵۰)(سنن النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(۷)(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، الجزء ۱۱، صفحہ ۳۶۵)

(۸)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۷۷)

فصلِ ادبِ ہشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ دوم)

١)دل کب متاثر ہوتا ہے؟

٢)قلب کو تاثر کیلئے آمادہ کرنے والی چیزیں

☆خشیت

☆راہب دل

٣)دل کی سختی و نرمی کے اسباب

٤)تاثر،انسان کے بلوغ کی نشانی

٥)عزت کا معنٰی

٦)بہترین دل معرفت سے متاثر ہوتا ہے

٧)عشقِ الٰہی کی مقناطیسیت

٨)منظومۂ شمسی،عکسِ منظومۂ انسانی

٩)طبیعت و فطرت میں محاذ آرائی

١٠)مولا علی علیہ السلام، فانی در ذاتِ خدا

١١)مجنوں کیلئے لیلٰی کے خط کی اہمیت

۱۲)مشکلات میں شکرِ خدا

۱۳)عاشقانہ دعا و مناجات کریں

۱٤)اهلبیت علیہم السلام کی سیرت میں جاذبۂ خدا

۱۵)قرآنی زبان سے مراد

۱)دل کب متاثر ہوتا ہے؟

انسان ہر چیز سے متاثر نہیں ہوتا ہے، بعض خاص چیزیں انسان پر اثر کرتی ہیں کہ جن کو قبول کرنے کے لئے دل تیار ہو مثلاً ہم بہت کچھ پڑھتے ہیں، کتابیں پڑھتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، ہمیں مختلف لوگوں کے خطوط آتے ہیں، کچھ ایسے لوگوں کے خط موصول ہوتے ہیں کہ جن سے ہم بیزار ہیں، کچھ ایسے لوگوں کے خطوط موصول ہوتے ہیں کہ جن سے بیزار بھی نہیں ہے اور کوئی محبت بھی نہیں ہے، لاتعلقی ہے یا معمول کے مطابق ہے لیکن کچھ ایسے افراد کے خطوط آتے ہیں کہ جن سے انسان کو شدید لگاؤ ہوتا ہے، اگر ایک غیر متعلق آدمی ہمیں خط لکھ بھی دے اور اس کے خط میں ہمیں معلوم بھی ہو جائے کہ وہ بیمار ہے تو ہمارا دل منقلب نہیں ہوتا ہے، اس کی بیماری کا سن کر اثر بہت کم ہوتا ہے لیکن جب اپنی اولاد کا سنتے ہیں، اپنے ماں باپ کا سنتے ہیں، اپنے بہن بھائیوں کا سنتے ہیں، کسی ایسے عزیز کی بیماری کا سنتے ہیں کہ جس سے ہمیں لگاؤ اور محبت ہے اور قلبی ناتا و تعلق ہے تو اس کی بیماری کا سن کر ہمارے اوپر زیادہ اثر ہوتا ہے۔

ہم بہت سارے افراد کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوئے ہیں یا انہیں کوئی توفیق حاصل ہوئی ہے مثلاً پاس (Pass) ہوئے ہیں یا کسی بھی مرحلے میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں تو سن کر ہم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا ہے، ہم ردعمل نہیں دکھاتے ہیں لیکن اپنے کسی عزیز، اپنی کسی محبوب شخصیت کے بارے میں جب یہ خبر سنتے ہیں تو اس کی کامیابی کی خبر ہم پر اثر کرتی ہے، جب ہم اپنے بیٹے کے پاس ہونے کی خبر سنتے ہیں، اپنے بھائی کے پاس ہونے کی خبر سنتے

ہیں، اپنے دوست کے پاس ہونے کی خبر سنتے ہیں اور غیر متعلقہ آدمی کے متعلق یہی خبر سنتے ہیں تو خبریں دونوں ایک جیسی ہیں لیکن ایک خبر ہم پر اثر کرتی ہے اور دوسری اثر نہیں کرتی ہے، اس وجہ سے کہ ایک کے ساتھ ہمارا قلبی تعلق ہے اور دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، قرآن کے ساتھ جب تک انسان کا قلبی تعلق برقرار نہ ہو تو انسان متاثر نہیں ہوتا ہے، پہلے حضورِ قلب کی فصل میں ایک اشارہ ہوا تھا کہ ہمارا دل قرآن کی طرف اور خدا ہی کی طرف متوجہ رہے، عبادت سے اور قرآن سے جب ہماری کوئی مناسبت ہو، کوئی جوڑ ہو، کوئی سنخیت ہو، یہی لفظ استعمال کیا تھا کہ سنخیت ہو یعنی کوئی مناسبت، کوئی ایسی صفت کہ جو ہم میں بھی ہو اور قرآن میں بھی ہو، ایسی قدرِ مشترک کہ جو ہم دونوں کو آپس میں ملائے، ایک دوسرے سے مرتبط کرے، جب تک انسان کا دل قرآن کے ساتھ تناسب پیدا نہ کرے، مسانخت پیدا نہ کرے تو قرآن انسان کے اوپر اثر نہیں کرتا ہے، جب انسان اجنبی بن کر قرآن پڑھتا ہے، حاکیٔ قرآن ہوتا ہے، قاریٔ قرآن ہوتا ہے، راویٔ قرآن ہوتا ہے تو متاثر نہیں ہوتا ہے، چہ بسا انسان کا قرآن کے ساتھ اور قرآنی ابحاث و قرآنی علوم کے ساتھ شدید سروکار ہے لیکن انسان کے وجود پہ اس کا اثر نہیں ہوتا ہے۔

۲) قلب کو تاثر کیلئے آمادہ کرنے والی چیزیں

جو حالات ہمیں متاثر کرنے کے لئے دل کو آمادہ کرتے ہیں قرآن نے خود ان حالات کا ذکر کیا ہے۔

☆خشیت

ایک چیز خوف ہے البتہ بصورتِ خشیت، عظمت کے نتیجے میں جو خوف پیدا ہوتا ہے اس کو خشیت کہتے ہیں، کسی چیز کے کمال اور عظمت کے نتیجے میں انسان خوف زدہ ہوجاتا ہے، باعظمت منظر کو دیکھ کر، باعظمت شے کو دیکھ کر حتیٰ باعظمت جسم کو دیکھ کر انسان مرعوب ہوجاتا ہے، انسان کے دل میں خوف آجاتا ہے مثلاً آپ ایک بہت اونچا پہاڑ دیکھیں تو اس پہاڑ کر دیکھ کر دل مرعوب ہوجاتا ہے عموماً ادبیات میں اس کے لئے دل دہل جانے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اس منظر کو دیکھ کر دل دہل جاتا ہے۔

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ......(۱)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے......

اسی طرح اگر کوئی پُر تلاطم دریا دیکھے کہ جس کے اندر طغیانی ہو، اس میں امواج اور لہریں اٹھ رہی ہوں اور اس کی طغیانی کی بہت شدید آواز ہو تو انسان کا دل دہل جاتا ہے یا انسان ناگہاں ایک بے کراں اور بے کنارہ سمندر دیکھتا ہے اور جب اس کا سامنا کرتا ہے تو انسان کا دل دہل جاتا ہے چونکہ اس کے اندر عظمت ہے، اس پانی کے مجموعے کے اندر یا اس پہاڑ کے اندر ایک ہیبت موجود ہے کہ جو انسان کے دل پر اثر کرتی ہے، دل خاشع ہو، دل کے اندر خشیت ہو، انسان کا دل اس اثر کو

خشیت ☆

قبول کرے کہ جو کسی شے کی عظمت کے باعث انسان کے اوپر پڑ رہا ہے، دل دہلنا انسان کا ایک کمال ہے، عظمت کے سامنے کھڑے ہو کر انسان کا دل اگر نہیں دہلتا تو اس دل کا علاج کروائے، بہت ساری جگہوں پر انسان کا دل دہل جانا چاہئے کہ جب انسان ایسے باعظمت مناظر کے سامنے جاتا ہے۔

☆ راہب دل

ایک دل، دلِ راہب ہے،

فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ہ (۲)

پس تم صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے بھی راہب کا تذکرہ کیا ہے، یہ بھی ایک قسم کا خوف ہی ہے لیکن یہ ایسا خوف ہے کہ جو کسی کی یاد کی وجہ سے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، ایک خوف عظمت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جسے خشیت کہتے ہیں، ایک خوف کسی کے یاد آنے سے دل میں پیدا ہوتا ہے مثلاً آپ کو کسی کام سے بھیجا گیا اور پھر جیسے کہا کہ انسان کے ساتھ مشغولیت ہے، انسان لہو میں مشغول ہو جاتا ہے، لہو یعنی ہر وہ کام جو ہمیں اصلی کام سے ہٹا کر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرالے، کھینچ لے، فرض کریں کہ ہم دکان پر افطاری کا سامان خریدنے کے لئے گئے لیکن راستے میں کسی کا کوئی ایکسیڈنٹ (Accident) دیکھا تو تماشائی بن کر وہیں کھڑے ہو گئے یا کوئی شخصیت آئی ہوئی ہے

اور لوگ اس کے ارد گرد جمع ہیں تو آپ بھی کھڑے گئے اور اس میں محو ہو گئے تو اس کو لہو کہتے ہیں چونکہ اس کام نے اصلی مقصد سے توجہ ہٹا دی ہے، ناگہاں یاد آتا ہے کہ میں افطاری کا سامان لینے آیا تھا، گھر میں سب منتظر ہیں تو یہاں بھی یاد آ جانے سے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ ظاہر ہے والد نے بھیجا ہے، والدہ نے بھیجا ہے، کسی شخصیت نے بھیجا ہے یا حتیٰ دوستوں کے لئے فوراً انسان کے دل میں ایک خوف کی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ مجھے جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ میں نے نہیں کیا، وہ میرے منتظر بیٹھے ہیں، کسی نے حکم دیا تھا اور اس حکم کو میں نہیں بجا لایا، یہاں بھی انسان کے دل میں ایک خوف پیدا ہوتا ہے، اس کو راہب کہتے ہیں، علمائے یہود، علمائے نصاریٰ اپنے لئے لفظِ راہب استعمال کرتے تھے، رہبان کا لفظ استعمال کرتے تھے، رہبان ور رہبانیت اسی سے مشتق ہے۔

رُہبانیت یعنی ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا اور خدا کے خوف کی وجہ سے کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ جو باعثِ ناراضگی وسَخَطِ خدا بن جائے، البتہ علمائے نصاریٰ نے خود سے کچھ من گھڑت چیزیں اختیار کر لی تھیں کہ جو خدا نے نہیں کہی تھیں مثلاً ایک بات یہ کہتے تھے کہ جو بھی راہِ خدا میں آئے اور اپنے آپ کو راہِ خدا میں وقف کر دے تو اسے شادی نہیں کرنی چاہئے اور بظاہر یہ نہیں کرتے، خداوند نے فرمایا کہ یہ ہم نے نہیں کہا تھا، ہم نے اس کو جائز قرار دیا ہے، ہم نے اس کو مباح قرار دیا ہے بلکہ بعض حالات میں لازم اور واجب قرار دیا ہے، انہوں نے اپنے لئے خود رہبانیت اختیار کی ہے یعنی حتیٰ اس طرح سے بھی ہم بارگاہِ خدا سے دور نہ ہوں، شادی اس لئے نہیں کرتے تھے کہ اسے بھی تقربِ خدا سے دوری کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے، خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نہیں کہا تھا، ایسی رہبانیت انہوں

نے خود اختیار کی ہے اور اس کا حق بھی ادا نہیں کیا اور پھر یہ چھپ چھپا کر یہ کام کر لیتے تھے، رہبانیت یعنی خوف،

فَاِيَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ٥

فقط مجھ سے ڈرو، یعنی حدِ خدا توڑ کر انسان ڈرے تو یہ رہب ہے، آج کی ادبیات میں اور آج کی عربی میں بھی لفظِ ارہاب دہشت گردی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے چونکہ وہ بھی خوف ہے، انسان کو خوف پیدا ہوتا ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ارہاب ہے، بنیادی معنیٰ خوف ہے کہ انسان کسی فرمان کے ترک کرنے سے اور پھر اس ترک کے بعد فرمان کے یاد آنے سے اور عقاب و عذاب و بعد میں آنے والی سزا کو ذہن میں تصور کر کے جب ڈرتا ہے، کانپتا ہے تو اس کو رہب کہتے ہیں،

انسان کا دل خاشع بھی ہو اور دلِ راہب بھی ہو، خشوع یعنی دل نرم ہو، یہ بہت اہم صفت ہے، اس ادب کے لئے دلِ خاشع کی ضرورت ہے، خشوع کی ضرورت ہے چونکہ بہت ساری چیزیں گراں گزرتی ہیں، بھاری ہیں اور ہم پر بوجھ ہیں، عبادتیں ہم پر بوجھ ہیں، اگر نرم دل ہو تو بہت ساری چیزیں اس کیلئے بوجھ نہیں ہیں لیکن اگر دل نرم نہ ہو بلکہ سخت ہو تو اس کے لئے بوجھ ہیں، اگر دلِ خاشع نہ ہو تو صبر و صلوٰۃ بوجھ ہے،

وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلَاةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخَاشِعِيۡنَ ٥ (۴)

صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو، نماز بہت مشکل کام ہے مگر ان لوگوں کیلئے نہیں جو خشوع و خضوع والے ہیں۔

عبادت سخت و دشوار ہے سوائے ان کے کہ جن کے دل نرم ہیں۔ جیسے مطالعہ ہے، کوئی کتاب پڑھنا بعض پر بہت بوجھ ہے، حقیقتاً ایسے ہے کہ مطالعہ نہیں کرتے ہیں اور اگر پڑھیں بھی تو سر میں درد ہونے لگتا ہے، بلڈ پریشر ہائی ہونے لگتا ہے، ان کے لئے مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ دل نرم نہیں ہیں، مطالعے کے لئے، علم کے حصول کے لئے دل آمادہ نہیں ہیں، یہی افراد گھنٹوں بیٹھ کر فلم دیکھیں گے، ڈرامے دیکھیں گے، نیٹ پر بیٹھیں گے، چیٹنگ کرتے رہیں گے لیکن ایک صفحہ مطالعہ کرنا ان کے لئے

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ......

یہ ان کے لئے سخت ہے، بہت دشوار ہے چونکہ ہر کام کی مناسبت سے دل کے اندر ایک نرمی چاہیے، دل کی نرمی جسمانی نرمی نہیں ہے، دل کی نرمی یعنی دل منفعل ہوتا ہو، متاثر ہوتا ہو۔ اس دل کو نرم دل کہتے ہیں کہ جو متاثر ہوتا ہو، اثر قبول کرتا ہو یعنی علم کو قبول کرنا دل کی نرمی ہے، دل قابل ہے، قبول کرنے والا ہے، اگرچہ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دوسروں کو کچھ دیں درحالیکہ تکامل لینے سے ہوتا ہے نہ کہ دینے سے، انسان جتنا لے اتنا بڑا ہوتا ہے اور لینے کے لئے دل کی آمادگی کی ضرورت ہے اور دلِ خاشع چاہیے۔

۳) دل کی سختی و نرمی کے اسباب

بعض لوگوں کیلئے قرآن بہت گراں اور بوجھ ہوتا ہے، قرآن پڑھنا، قرآن سننا، قرآن کے

اندر تدبر کرنا قرآن کے اندر تفکر کرنا، معارفِ قرآن تک پہنچنا بہت کبیر اور سنگین ہے چونکہ دل خاشع نہیں ہیں بلکہ قسی ہیں۔ دل کو نرم کریں، دِل کی نرمی اور سختی کے اسباب ہیں کہ دل سخت کیوں ہوجاتا ہے؟ لہو یعنی مشغولیت دل کو سخت کر دیتی ہے، لعب دل کو سخت کر دیتا ہے، مزاح دل کو سخت کر دیتا ہے، قہقہے لگانا، زیادہ ہنسنا دل کو سخت کر دیتا ہے، عورتوں کے ساتھ خلوت دل کو سخت کر دیتی ہے، خلوت بہ نساء نہ صرف نامحرم کے ساتھ حتیٰ محرم کے ساتھ بھی، مرد اگر زنانہ ماحول میں زیادہ رہے تو مرد کا دل بھی سخت ہوجاتا ہے، عورتیں بھی اگر مردوں کے جھرمٹ میں زیادہ رہیں اور ہمیشہ مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلیں تو عورتوں کا دل بھی سخت ہوجاتا ہے۔ یہ اثرِ متقابل ہے، خواہشات سے دل سخت ہوجاتا ہے، گناہوں سے دل سخت ہوجاتا ہے، یہ دل کی سختی کے اسباب ہیں، ان سے دل سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔

دل کو نرم کیسے کریں؟ دل کو نرم کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ گریہ ہے، گریہ اور نرمی دونوں لازم وملزوم ہیں، ہمیشہ نرم دل آدمی روتا ہے اور رونے سے دل مزید نرم ہوتا ہے۔ پہلے نرمی ہوتی ہے تو اس سے انسان روتا ہے اور رونے سے دل کے اندر مزید نرمی آتی ہے، اس لئے عبادتوں کے اندر گریے کی تاکید کی گئی ہے کہ بہترین عبادت وہ ہے جس میں انسان گڑگڑائے، روئے، البتہ خشیتِ خدا اور خوفِ خدا سے روئے نہ کہ دیگر چیزوں کی وجہ سے، ابھی ہم دعا بھی پڑھتے ہیں، مناجات بھی پڑھتے ہیں مگر رونے کے لئے بیچ میں مصائب پڑھنے پڑتے ہیں، وہ گریہ اپنی جگہ ہے، عزاداری کا گریہ ایک الگ گریہ ہے، مناجات کے اندر رونا، بارگاہِ خدا میں رونا، دعا کے اثنا میں ذکرِ

خدا سے رونا ایک الگ گریہ ہے، مخلوط نہیں کیا کریں مثلاً بسا اوقات ہوتا ہے کہ دل اداس ہے اور رونے کو جی چاہتا ہے، عموماً محفلِ دعا ومناجات میں بھی جو لوگ رو رہے ہوتے ہیں تو سارے دعا و مناجات کی وجہ سے نہیں رو رہے ہوتے ہیں بلکہ کچھ اپنے دکھوں پر رو رہے ہوتے ہیں، مجالس میں بھی مصائب سن کر بعض لوگ جو روتے ہیں تو سارے مصائبِ کربلا پہ ہی نہیں روتے ہیں، کچھ اپنے دردوں کو رو رہے ہوتے ہیں، یہ الگ الگ رونے ہیں، اپنے درد کو رونا ہے تو کسی بند کمرے میں جا کر رو لیا کریں، کسی خلوت خانے میں جا کر چند آنسو بہا لیا کریں کہ جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو، سید الشہداء علیہ السلام کے لئے جب رونا ہے تو صرف سید الشہداء علیہ السلام کے لئے روئیں لیکن جب مناجات میں رونا ہے تو صرف خدا کے لئے روئیں، نماز میں روئیں، قرآن پڑھتے ہوئے گریہ کریں، دل کو نرم کریں، اس سے دل قرآن کی طرف جذب ہو جاتا ہے، قرآن کے ساتھ دل کا ایک تعلق برقرار ہو جاتا ہے، دل نرم ہوتا ہے تو انسان کے اوپر قرآن اثر کرتا ہے۔

٤) تاثر، انسان کے بلوغ کی نشانی

اگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم بلوغ کی منزل پر پہنچے ہیں یا نہیں تو یہ دیکھیں کہ ہم کس سے متاثر ہوتے ہیں۔ تاثرِ انسان دلیلِ بلوغتِ انسان ہے، متاثر تو سب ہوتے ہیں، کوئی ایسا انسان نہیں ہے حتیٰ شقی ترین انسان، قسی القلب ترین انسان بھی متاثر ہوتا ہے جیسے وہ مظلوموں سے متاثر نہیں ہوتا ہے، اسے لوگوں کے فقر وفاقہ، ناداری اور بیکسی پہ رحم نہیں آتا ہے، نرم نہیں ہوتا ہے لیکن کسی جگہ

آتا ہے تو متاثر ہو جاتا ہے، شہوتوں سے متاثر ہو جاتا ہے، شہوت رانی بھی ایک تاثر ہے، تاثیر نہیں ہے، انسان یہ گمان کرتا ہے کہ شہوت رانی تاثیر ہے حالانکہ یہ بھی تاثر ہے، اس سے انسان مغلوب و متاثر ہو جاتا ہے کیونکہ ماحول ایسا ہے۔

فرض کریں کہ ایک نامحرم بے حجاب یا بدحجاب عورت بازار میں آتی ہے اور اس کو دیکھ کر ایک مرد کے اندر احساسِ شہوانی پیدا ہوتا ہے تو یہ شخص متاثر ہوا ہے، مغلوب ہے، منفعل ہے، یہ بھی متاثر ہوا ہے لیکن منظرِ شہوانی سے متاثر ہوا ہے۔ بچہ دکان میں یا بازار میں جب کھلونا دیکھتا ہے تو وہیں پر مچل جاتا ہے، یہ بھی کھلونا دیکھ کر متاثر ہوا ہے۔ ایک پیٹو انسان جب کھانا دیکھتا ہے تو وہیں پر متاثر ہو جاتا ہے، یہ رال ٹپکنا متاثر ہونے کی علامت ہے، اسی متاثر ہونے سے انسان پہچانا جاتا ہے اور انسان کی شخصیت معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ کیسا انسان ہے؟ کن چیزوں سے متاثر ہوتا ہے؟ فرض کریں کہ کسی کے سامنے آپ بہت کچھ بیان کریں تو وہ کسی سے متاثر نہیں ہوتا ہے لیکن موسیقی چلے تو فوراً متاثر ہو جاتا ہے، اسی سے شخصیت معلوم ہو جاتی ہے، انسان کی شخصیت کھلتی ہے، کیفیتِ تاثر سے، اثر قبول کرنے سے شخصیت معلوم ہوتی ہے۔

بچے عموماً خیالات سے، تخیلات سے بہت متاثر ہوتے ہیں، اگر آپ بچوں کے سامنے کوئی سنجیدہ فلم چلائیں تو ان پر سرے سے کوئی اثر نہیں ہوتا ہے لیکن کارٹون چلائیں یا خیالی دنیا کی کوئی چیز پیش کریں تو فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، خیال باف انسان اس طرح متاثر ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ہماری خوشامد کرے تو ہم متاثر ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ہم پر تنقید کرے تو ہم متاثر ہو جاتے ہیں، یہیں سے

پتہ چلتا ہے کہ ضعیف انسان ہے یا قوی انسان ہے، اگر شہوتوں سے متاثر ہوتے ہیں، خواہشات سے متاثر ہوتے ہیں، خیالات سے متاثر ہوتے ہیں، خوش آمدوں سے متاثر ہوتے ہیں، تنقید سے متاثر ہوتے ہیں تو ضعیف و کمزور انسان ہیں، یہ ابھی بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔

۵) عزت کا معنیٰ

بالغ انسان وہ ہے کہ جو شہوتوں، خواہشوں، خیالوں، خوش آمدوں اور تنقیدوں سے متاثر نہ ہوتا ہو، ان چیزوں کیلئے انسان کو قسی و سخت ہونا چاہئے، اس کو قساوت نہیں کہتے ہیں البتہ اس کو عزت کہتے ہیں، انسان کے اندر دو طرح کی سختی ہے، ایک مثبت سختی ہے اور ایک منفی سختی ہے، مثبت سختی یہ ہے کہ آپ برائیوں سے متاثر نہ ہوں مثلاً جیسے ہم گھر بناتے ہیں تو یہ گھر سخت ہونا چاہئے تاکہ بارش اس کے اندر نہ جائے، یہ مثبت سختی ہے لیکن گھر ایسا بنائیں کہ نور بھی اس کے اندر نہ جائے تو یہ منفی سختی ہے، گھر کے اندر، سردی نہ آئے، پانی نہ آئے لیکن نور تو آنا چاہئے، اگر اچھی چیزوں کے بارے میں سختی آجائے اور انسان اچھی چیزوں سے متاثر ہونا چھوڑ دے یا اچھی چیزوں کو قبول کرنا چھوڑ دے تو اس کو قساوت کہتے ہیں لیکن اگر انسان غلط چیزوں سے متاثر ہونا چھوڑ دے، غلط چیزوں کے مقابلے میں جب مقاومت پیدا ہو جائے تو اس کو عزت کہتے ہیں، یہ بھی ایک سختی ہے، عزت کا معنیٰ بھی سختی ہے، خدا کی ذات عزیز ہے چونکہ کوئی چیز خدا پر اثر انداز نہیں ہے، خدا سرے سے منفعل نہیں ہے، ذاتِ خداوند تبارک و تعالیٰ کسی سے بھی متاثر نہیں ہوتی ہے۔

اگر انسان کمالات سے متاثر ہوتا ہے، باعظمت چیزوں سے متاثر ہوتا ہے، معارف سے متاثر ہوتا ہے، علم سے متاثر ہوتا ہے تو یہ بہترین حالت ہے، یہ دلِ خاشع و نرم ہے، جس طرح سے دوسرے لوگ لطیفے سن کر لطف اندوز ہوتے ہیں یعنی متاثر ہوتے ہیں، کوئی لطیفہ سناتا ہے تو ہم ہنس پڑتے ہیں، یہی تاثر ہے یعنی اس نے ہماری روح کے اوپر اثر کیا ہے، اگر کسی نے ہمارے احساسات ابھارے ہیں تو فوراً احساسات متاثر ہوتے ہیں، یہ بھی انسان کے دل کا ایک شعبہ ہے یعنی معرفت، فہم اور تحریکات کے ساتھ احساس بھی دل کا کام ہے، ممکن ہے کہ اگر کوئی ہمارے احساسات کو بھڑکائے اور ابھارے تو ہم فوراً بھڑک جاتے ہیں یعنی منفعل ہوجاتے ہیں، متاثر ہوجاتے ہیں، احساساتی طور پر غضب میں آجاتے ہیں یا خوش ہوجاتے ہی۔ کبھی فوراً نرم ہوجاتے ہیں یا فوراً سختی آجاتی ہے، یہ بھی متاثر ہونا ہے لیکن بسا اوقات انسان کے احساسات کو نہیں ابھارا جاتا ہے جیسے انبیاء علیہم السلام انسان کی عقول کو ابھارنے کے لئے آئے ہیں، تحریکِ عقول کر رہے ہیں نہ کہ تحریکِ احساسات کر رہے ہیں، انبیاء علیہم السلام احساسات ابھارنے نہیں آئے بلکہ افکار ابھارنے آئے ہیں، عقولِ انسان کو ابھارنے آئے ہیں۔ بہترین انسان وہ ہے جو نبی کے سامنے مقاومت نہ کرے کیونکہ یہ عزت کے معنیٰ کا مصداق نہیں بلکہ قساوت کا مصداق ہونا ہے، اگر نبی اس کی عقل کو ابھار رہے ہیں تو اس کی عقل ابھر جائے۔

عزت کا معنیٰ

٦) بہترین دل معرفت سے متاثر ہوتا ہے

سب سے بہترین دل وہ ہے جو معارف اور علم سے متاثر ہو، معرفت سے متاثر ہو، لذتِ معرفت سب سے عالی ترین لذت ہے، صاحبِ کتاب صدر المتألھینؒ معروف بہ ملا صدراؒ فرماتے ہیں کہ سب سے عالی لذت معرفت کی لذت ہے، جنت میں بھی انسان کو جو سب سے بہترین لذت ملے گی وہ معرفتِ خدا کی لذت ہے یعنی جنتِ لقاء۔ انگور کھا کے، انار کھا کے، درختوں کی گھنی چھاؤں میں، نرم مسندوں پر بیٹھ کر نظارے کرنے، دودھ اور شہد پی کے اتنی لذت محسوس نہیں ہوتی کہ جتنی لذت انسان کو معرفت سے محسوس ہوتی ہے، یہ لذت اہلِ معرفت کیلئے قابلِ توصیف نہیں ہے مثلاً فرض کریں کہ ہم لوگ جو اہلِ معرفت نہیں ہیں، معرفت کی لذت سے آشنا نہیں ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ لذتِ معرفت کیا چیز ہوتی ہے؟ ایسے ہی جیسے بچے کو نکاح کی لذت معلوم نہیں ہے، اگر نابالغ بچہ ہو، چار پانچ سال کا بچہ ہو تو اس کو آپ جتنا سمجھائیں گے کہ نکاح کی کیا لذت ہوتی ہے؟ عقد کی کیا لذت ہوتی ہے؟ البتہ صرف صیغہ پڑھنے کی نہیں نکاح کی لذت تو اس کو سمجھ نہیں آئے گی یعنی اسے معلوم ہی نہیں ہے چونکہ اس کے اندر وہ جوہر و گوہر ابھی زندہ نہیں ہوا ہے، اس کے اندر لذت محسوس کرنے والا مادہ نہیں ہے، اس کو بلوغ تک پہنچنے دیں، ممیّز ہونے دیں، بارہ تیرہ سال کی عمر کے بعد آہستہ آہستہ اس کے اندر اس لذت کو محسوس کرنے کی حس پیدا ہو جائے گی، اس سے پہلے یہ نابالغ ہے لہٰذا اگر ہمیں اہل معرفت کہتے ہیں کہ قرآن لذت دیتا ہے، ہمیں عبادتیں لذت دیتی ہیں تو ہم اس بچے کی طرح ہیں کہ جو حیرت سے دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا لذت ہے؟

جب بچوں پہ قرآن ٹھونستے ہیں، بچوں سے زبردستی قرآن حفظ کراتے ہیں تو اس کیلئے تو یہ عذاب ہے نہ کہ لذت ہے، کیوں کہتے ہیں کہ یہ عذاب ہے حالانکہ قرآن سے تو لذت محسوس ہونی چاہیے، قرآن حفظ کر کے جب لوگ واہ واہ کرتے ہیں تو اس وقت وہ لذت محسوس کرتا ہے، قرآن سے لذت محسوس نہیں کرتا ہے بلکہ لوگوں کی داد سے لذت محسوس کرتا ہے، یہ لذت اس کی حس کی اشباہ پیش کر رہی ہوتی ہے اور اس کی اِشتہا کو پورا کر رہی ہوتی ہے۔

بالغ انسان وہ ہے کہ جو معرفت سے لذت اٹھانا شروع کر دے، انسان کے لئے علم لذت بخش ہو جائے، حقیقت شناسی لذت بخش ہو جائے اور انسان اس لذت کا ادراک نہیں کر سکتا کہ جو معرفت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے یعنی ایک صاحبِ معرفت انسان پر جب ایک حقیقت کشف ہوتی ہے تو اس سے وہ جتنی لذت محسوس کرتا ہے اتنی لذت کوئی کھاپی کر اور جسمانی لذتوں سے حاصل نہیں کر پاتا، اصلاً یہ لذتیں آپس میں قابلِ قیاس نہیں ہیں، یہ انسان کے بلوغ کی علامت ہے کہ انسان قرآن سے لذت محسوس کرنا شروع کر دے، فرماتے ہیں کہ انسان اتنا متاثر ہو کہ اس کے اوپر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے، وجد کی کیفیت کب طاری ہوتی ہے؟ جب دل بہت متاثر ہو، منفعل ہو اور اتنا متاثر ہو کہ قرآن اس کے اوپر چھا جائے اور یہ ساری حقیقت دل کو گھیر لے۔

۷) عشقِ الٰهی کی مقناطیسیت

جب تک روحِ قرآن، روحِ انسان کا احاطہ نہ کر لے اس وقت تک وجد کی کیفیت طاری

نہیں ہوتی ہے مثلاً جب ہماری توجہ ایک ہی وقت میں کئی چیزوں کی طرف ہوتی ہے تو ایک چیز نے ہمیں گھیرا نہیں ہوتا ہے، جیسے اس فصل کے پہلے حصے میں یہ نکتہ درج ہوا تھا کہ حقائق، معرفت، علم اور کمال کے اندر ایک مقناطیسیت موجود ہے اور سب سے بڑی مقناطیسیت منبعِ کمال کے اندر یعنی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں موجود ہے، اسی کو عشقِ خدا کہتے ہیں، عشقِ الٰہی اسی مقناطیسیت کا نام ہے۔

یہ عشق یا یہ مقناطیسیت کس انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے؟ جیسے آہنی مقناطیس ہر چیز کو نہیں کھینچتا جیسے پتھر، لکڑی اور پلاسٹک کو نہیں کھینچتا ہے بلکہ فقط آہن کو کھینچتا ہے اور وہ بھی اس وقت کہ جب اس کے سامنے کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو جیسے قطب نما کی مثال دی تھی کہ شمالی پول میں ایک بڑا مقناطیسی میدان ہے کہ جس سے مسلسل مقناطیسی لہریں اٹھ رہی ہیں اور یہ زمین پر پھیلتی ہیں اس وجہ سے ہمیشہ قطب نما کا رخ شمال کی طرف ہوتا ہے، ایسی ہی مقناطیسیت عالمِ ملکوت، عالمِ توحید، اسماء و صفاتِ خدا اور ذاتِ خدا میں ہے، روحِ انسان کا قطب نما ہمیشہ خدا کی طرف ہے چونکہ جاذبہ، کشش اور مقناطیسیت وہاں پر ہے لیکن جب انسان عالمِ طبیعت میں آتا ہے، عالمِ مادہ میں آتا ہے، اس چراگاہ میں آتا ہے کہ جس کو خدا نے ہمارے لئے فرمایا تھا کہ یہ تمہارے لئے آمادگاہ ہے لیکن ہم نے آمادگاہ کو چراگاہ بنالیا۔

جانوروں کے لئے زمین چراگاہ ہے لیکن انسان کے لئے آمادگاہ ہے، آمادگاہ قرآنی اصطلاح ہے، آمادگاہ یعنی مَہد، ہم نے زمین کو تمہارے لئے مہد قرار دیا، ایران میں یہ اصطلاح زیادہ

رائج ہے، عرب ملکوں میں بھی بچوں کی نگہداری کیلئے کہ جہاں چھوٹے بچوں کو رکھتے ہیں اس کو مہدِ اطفال کہتے ہیں، مہد یعنی آمادگاہ کہ جہاں پر بچوں کو نہ صرف رکھا جاتا ہے، دودھ پلایا جاتا ہے بلکہ جہاں پر بچوں کے لئے ہر چیز موجود ہے، آمادہ کی گئی ہے، فقط بچوں کے لئے اس چیز کو بنایا گیا ہے، بچوں کی ساری ضرورتیں وہاں پر موجود ہیں، اسی طرح سے خدا نے زمین کو انسان کے لئے مہد قرار دیا ہے اور جانوروں کے لئے مرتع قرار دیا ہے، جانوروں کے لئے چراگاہ ہے لیکن انسانوں کے لئے آمادگاہ ہے لہٰذا انسان یہ نہ سمجھے کہ میں چراگاہ میں ہوں۔

چراگاہ میں کھانے پینے کا جاذبہ ہے، شہوتوں کا جاذبہ ہے، بہت ساری چیزوں کا جاذبہ ہے، ہم اس وقت بہت ساری چیزوں کے جاذبے میں ہیں یعنی گوناگوں مقناطیس ہمیں اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، دنیا اپنی طرف کھینچ رہی ہے، مال و دولت اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، جہاں طلبی اپنی طرف کھینچ رہی ہے، یہ سب جاذبے ہیں اور جھوٹے مقناطیس ہیں۔ یعنی یوں کہہ لیں کہ ایک حقیقی مقناطیس ہے اور کچھ شیطانی مقناطیس ہیں یعنی کاذب اور جھوٹے مقناطیس ہیں اور بیچ میں انسان ہے۔

یہ مطلب شاید پڑھنے سے اتنا ذہن میں نہ آئے بلکہ اس کو مجسم کرنے کی ضرورت ہے، تصویر کی زبان میں یا کسی عملی زبان میں اس کو دکھانے کی ضرورت ہے یعنی ہمارے چاروں طرف مقناطیسی میدان ہے۔ بازاروں میں مقناطیسی میدان ہے اور ہمارے اندر خواہشات ہیں، ہر خواہش کو ایک مقناطیس اپنی طرف کھینچ رہا ہے، پیٹ کا مقناطیس کھانے ہیں، آنکھوں کے مقناطیس کچھ اور

ہیں، کانوں کے مقناطیس کچھ اور ہیں، شہوات کے مقناطیس کچھ اور ہیں، حشم کے مقناطیس کچھ اور ہیں، حبّ و مال و دنیا کے مقناطیس کچھ اور ہیں، شخصیت سازی کے مقناطیس کچھ اور ہیں، انانیت کے مقناطیس کچھ اور ہیں، ہزاروں مقناطیس ہمارے اردگرد ہیں، تجربہ کرلیں، یہ ایک کھیل ہوگا کہ آپ چار پانچ مقناطیس رکھ کر بیچ میں ایک چھوٹی سوئی رکھیں اور پھر دیکھیں کہ وہ ان کے درمیان ناچ رہی ہوگی یعنی کبھی ایک کی طرف جائے گی پھر اسے دوسرا کھینچے گا، یہ مقناطیسی ناچ ہے، رقصِ مقناطیسی ہے، یہی رقص جو ہم دنیا میں اس وقت کر رہے ہیں، انسان اس وقت مقناطیسی رقص میں مشغول ہے، شہوتیں اپنی طرف کھینچتی ہیں، جہاں طلبی اپنی طرف کھینچتی ہے، انانیت اپنی طرف کھینچتی ہے، دنیا اپنی طرف کھینچتی ہے، مقام و منزلت اپنی طرف کھینچتے ہیں، فلاں اپنی طرف کھینچتا ہے اور بیچ میں ہم مقناطیسی رقص میں مشغول ہیں، کبھی اِس کوچے میں کبھی اُس کوچے میں، کبھی اُس بے روئی میں، کبھی اِس بے روئی میں، کبھی اِس در پر کبھی اُس در پر، کبھی اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا کبھی اس کے سامنے کھجل، کبھی اس کے سامنے رسوائی، یہ سارا مقناطیسی رقص ہے، انسان اس مقناطیسی رقص میں کتنا پست ہوجاتا ہے کہ بسا اوقات فاحشہ عورتیں بھی انسان کو نچانا شروع کردیتی ہیں، متدینین کو آلودہ لوگ بھی رقص کروانا شروع کردیتے ہیں اور یہ ان کے ساتھ رقص میں مشغول ہوجاتا ہے۔ جب تک انسان ان مقناطیسوں سے آزاد نہ ہو تو مقناطیسِ ملکوتی میں جذب نہیں ہوگا، انسان یہ رقص چھوڑ دے تو اس وقت کیفیتِ وجد طاری ہوجاتی ہے یعنی ہمارے سراپا کو چاروں طرف سے باقی کششیں چھوڑ دیں، باقی جاذبے چھوڑ دیں اور فقط جاذبۂ خدا، جاذبۂ الٰہی، جاذبۂ توحیدی و جاذبۂ ملکوتی چاروں

طرف سے ہمارے وجود کو گھیر لے تو اس سے جو اتفاق رونما ہو گا اسی کو وجد کہتے ہیں۔

۸) منظومۂ شمسی، عکسِ منظومۂ انسانی

انسان اس وقت کسی مقناطیس کے جزم میں جاتا ہے کہ جب دوسرے جاذبوں سے آزاد ہو جائے، اس کو اپنا مدار سمجھ میں آ جائے، اپنا راستہ سمجھ میں آ جائے۔ منظومۂ شمسی کہ جس کا ایک حصہ ہم بھی ہیں یعنی زمین بھی ہے، زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، یہ سورج ہی کے گرد کیوں گھومتی ہے؟ باوجودیکہ جتنے بھی سیارے اور ستارے ہیں سب کے اندر جاذبہ ہے، چاند زمین کے گرد گھومتا ہے اور زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس طرح یہ پورا منظومہ بنا ہوا ہے، تنہا زمین نہیں ہے اور بھی بہت ساری چیزیں سورج کے گرد گھوم رہی ہیں، یہ سورج ہی کے گرد کیوں گھوم رہی ہیں؟ مثلاً زمین چاند کے گرد کیوں نہیں گھومتی؟ مریخ و مشتری کے گرد کیوں نہیں گھومتی؟ ان کے اندر بھی تو جاذبہ ہے لیکن زمین کو معلوم ہے، اول تو زمین کے شایانِ شان جاذبہ ان کے اندر موجود نہیں ہے بلکہ وہ زمین ہی کی طرح کی چیزیں ہیں۔ مریخ، پلوٹو، یورینس، نیپچون وغیرہ بھی زمین جیسی چیزوں کے نام ہیں، جسامت میں چھوٹے بڑے ہیں لیکن سنخ ایک ہے، قبیلہ ایک ہے، اپنے جیسے کے گرد انسان نہیں گھوم سکتا ہے، زمین کو معلوم ہے کہ میں اپنے جیسے کسی موجود کے گرد نہیں گھوم سکتی اگر چہ اس کے گرد جاذبہ ہے لیکن زمین کو معلوم ہے کہ یہ جاذبہ میرے لئے نہیں ہے، مجھے اس جاذبے سے آزاد ہونا ہے، مجھے اس کشش سے آزاد ہونا ہے، اگر زمین مشتری کی کشش سے آزاد ہو گی تو سورج کے گرد گھوم سکے گی،

چاند زمین کے گرد کیوں گھومتا ہے؟ یہ چاند مشتری کے گرد بھی گھوم سکتا تھا چونکہ اس کے اندر بھی کشش ہے، مریخ و زحل و عطارد کے اندر بھی کشش ہے، جتنے سیارے اس وقت کشف ہو چکے ہیں ان سب کے اندر کشش ہے لیکن چاند فقط زمین کے گرد گھومتا ہے، کیوں؟ کیونکہ چاند نے پہلے اپنے آپ کو سب سیاروں کی کشش سے آزاد کیا ہے، ان کی کشش سے باہر آیا ہے اور اپنے آپ کو فقط زمین کی کشش میں قرار دیا ہے لہٰذا زمین کے گرد ہمیشہ گھومتا رہے گا۔

ہم کب خدا کے گرد گھومیں گے؟ جب غیرِ خدا کے جاذبے سے آزاد ہو جائیں گے یعنی ہمارا منظومہ اس وقت تک درست نہیں ہے، ہماری حرکتیں اس وقت تک درست نہیں ہیں جب تک ہم دنیوی جاذبوں سے آزاد نہ ہو جائیں۔ زمین کی حرکت کتنی موزوں ہے، آپ لمحات بلکہ لحظات کی تقسیم بھی کریں کہ ابھی تک انسان نے کیا کام کیا ہے، اس وقت انسان نے وقت کو تقسیم کیا ہوا ہے مثلاً صدیوں کے سال، سالوں کے مہینے، مہینوں کے ہفتے، ہفتوں کے دن، دنوں کے گھنٹے، گھنٹوں کے منٹ، منٹ کے سیکنڈ اور سیکنڈ کے مزید دقیقے بنائے ہوئے ہیں یعنی سیکنڈ کے ثانئے، ثانئے کے ثالثے، ثالثے کے رابعے، رابعے کے خامسے، خامسے کے ستّے بنائے ہوئے ہیں، نجومی جو اوقات بتاتے ہیں کہ مثلاً سورج طلوع ہوگا تو وہ ہمیں ہماری زبان میں بتاتے ہیں کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر طلوع ہوگا لیکن نجومی اپنی زبان میں کیا کہتے ہیں؟ سورج طلوع ہوگا چھے بج کر پانچ منٹ تیس ثانئے تیرہ ثالثے پندرہ رابعے سولہ خامسے پہ، ہمیں سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ یہ بیچ میں ثانئے وغیرہ کی کیا ضرورت ہے، چونکہ ہم ثانئے تک ہی سمجھ سکتے ہیں، ثانئے سے آگے زمان اتنا چھوٹا ہو جاتا ہے کہ

منظومہ شمسی عکس منظومہ انسانی

ہمارے موٹے دماغ میں نہیں آسکتا ہے لیکن ریاضی دانوں کے، نجومیوں کے محاسبے میں آجاتا ہے، وہ ٹائم کو عاشرِ ے تک تقسیم کرتے ہیں۔

زمین کا اتنا دقیق نظام کیوں ہے؟ اس کا اس قدر منظّم و مرتب نظام اس وجہ سے ہے کہ زمین کسی کے جاذبے میں ہے، اگر زمین آزاد ہوتی اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو کیا اتفاق رونما ہوتا؟ کبھی مریخ سے ٹکرا رہی ہوتی، کبھی مشتری سے ٹکرا رہی ہوتی، کبھی زحل سے ٹکرا رہی ہوتی، ہم کیوں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں؟ ہماری ٹکر کبھی اپنے ہم مذہب سے ہوتی ہے، کبھی مخالفِ مذہب سے ہوتی ہے، کبھی پڑوسی سے ہوجاتی ہے، کبھی اپنے ہی ہمدرد سے ہوجاتی ہے، ہم حجرہ سے ہوجاتی ہے، اس طرح ہم آپس میں کیوں ٹکراتے ہیں؟ چونکہ کسی کے جاذبے میں نہیں ہیں، اپنے حال پہ چھوڑے ہوئے ہیں، اگر کسی منظومہ کے اندر ہوتے، کسی کشش کے اندر ہوتے تو ہمارا بھی زمین کی طرح ایک مدار ہوتا کہ جس کے اندر ایک لحظے کیلئے بھی کوئی خلل رونما نہ ہوتا، امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ اگر سارے کے سارے انبیاء علیہم السلام فرض کریں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کو ایک بڑے حال میں جمع کردیا جائے اور سو سال اکٹھے زندگی گزاریں تو ایک چھوٹے سے مسئلے پر بھی ان میں اختلاف رونما نہیں ہوگا، ایک دوسرے سے نہیں ٹکرائیں گے، کیوں نہیں ٹکرائیں گے؟ چونکہ سارے انبیاء علیہم السلام منظومۂ الٰہی میں پیوستہ ہیں اور منظومۂ خدا سے متصل ہیں یعنی سب کا محور خدا ہے۔

یہاں تو کوئی کسی کے گرد گھوم رہا ہے، کوئی کسی اور کے گرد گھوم رہا ہے، کوئی اِس شخصیت کا چاند بنا ہوا ہے، کوئی اُس شخصیت کا چاند بنا ہوا ہے، وہ شخصیت خود کسی جاذبے سے آزاد ہے لہٰذا

منظومۂ شمسی، عکسِ منظومۂ انسانی

شخصیت شخصیت سے ٹکرا رہی ہے، چاند چاند سے ٹکرا رہے ہیں، اِس کے مرید اُس کے مریدوں سے اور اُس کے مرید اِس کے مریدوں سے ٹکرا رہے ہیں، اِس کے مقلدین اُس کے مقلدوں سے اور اُس کے مقلدین اِس کے مقلدوں سے ٹکرا رہے ہیں، کیوں؟ کیونکہ سب آزاد ہیں، کشش نہیں ہے یعنی اس جاذبہٗ خدا سے آزاد ہو چکے ہیں، خدا نے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ ہم خدا کی کشش میں کب آئیں گے؟ جب دوسری کششوں سے اپنے آپ کو آزاد کرائیں گے اور یہی سخت ہے، زمین نے یہ کام کرلیا ہے، ستاروں، سیاروں نے اپنا یہ کام کرلیا ہے کہ اپنے آپ کو دوسری تمام کششوں سے آزاد کرا کے اپنا ایک منظومہ بنالیا ہے اوران کیلئے طے ہوگیا ہے کہ ہمیشہ سورج کے گرد گھومنا ہے۔

منظومہ شمسی کی عکس منظومہ انسانی

انسان نے یہ کام ارادتاً کرنا تھا، اسلئے خدا نے زمین و آسمان و پہاڑ اور سب سے پوچھا کہ ہم نے مدار مقرر کر کے آپ کو اس میں جبراً چلانا ہے یا آپ نے خود اپنا مدار ڈھونڈنا ہے؟

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَأَبَيۡنَ أَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَأَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡإِنۡسَانُ......(۴)

بیشک ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا بس انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا......

یعنی ہم نے یہ امانت سب کو پیش کی کہ ہم مدار بنا کے دیں یا آپ خود اپنا مدار بنالو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم سے نہیں ہوسکتا ہے ہمیں بنا کر دو لیکن انسان نے خود قبول کرلیا،

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ○

کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔

اس ظالم و جاہل کو نہیں پتہ کہ کتنا سخت کام اس نے اپنے ذمے لے لیا ہے؟ یہ مدار ڈھونڈنا کتنا سخت ہے؟ اور مدار پہ چلنا کتنا سخت ہے؟ یہ ہزار جاذبوں میں گرفتار ہو جائے گا تو اس کو اپنا مدار نہیں ملے گا، یہ کبھی اِس کے گرد گھومے گا، کبھی اُس کے گرد گھومے گا، اس کو فرصت ہی نہیں ہو گی کہ یہ خدا کی طرف آئے، طوافِ کعبہ کا ایک فلسفہ یہی ہے کہ انسان کو مدار مل جائے، کعبہ کے گرد جو گھمایا جاتا ہے کہ سات چکر لگاؤ تو یہ سات چکر اس لئے نہیں ہیں کہ تمہاری چربی بیلنسڈ (Balanced) ہو جائے بلکہ یہ سات چکر اس لئے ہیں کہ شاید ان سات چکروں میں سے کسی ایک آدھ چکر میں تمہارے پلے یہ بات پڑ جائے کہ ہمارا وہ نقطہ، وہ منظومہ کونسا ہے کہ جس کے گرد ہمیں گردش کرنا ہے۔ انسان ان کاذب مقناطیسوں کے جاذبوں سے آزاد ہو تو پھر منظومہ الٰہی میں پیوستہ ہوتا ہے اور منظومہ خدا سے متصل و متاثر ہوتا ہے۔

۹) طبیعت و فطرت میں محاذآرائی

اسی طرح تمثیلی واقعات بھی پیمانے ہیں، کچھ واقعات کو اگر دینداروں کے سامنے پیش کریں تو تھوڑا اجر یمہ داران کا تقدس ہو جاتا ہے لیکن مولانا روم کے بقول کہانی و قصہ پیمانہ ہوتا ہے، آپ اس پیمانے کے اندر جو چیز موجود ہے اس پر توجہ رکھیں، پیمانے کو نہ دیکھیں کہ کیسا ہے، پیمانے

بھر کر اندر جو جام دیا جا رہا ہے اس کو دیکھیں، اگر آپ کسی جگہ جائیں اور وہاں آپ کو شربت بھر کر دیا جائے تو آپ گلاس گھما گھما کر نہ دیکھیں کہ گلاس کس قسم کا دیا ہے، یہ دیکھیں کہ اس کے اندر کیا پڑا ہوا ہے؟ یہ عورتیں کسی کے گھر جاتی ہیں اور ان کو وہاں چائے ملے تو عموماً ان کی ساری توجہ پیالی پہ ہوتی ہے کہ کونسا ماڈل ہے؟ کس سال کا ہے؟ اس کی قیمت کیا ہے؟ چائے کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے کہ چائے اچھی بنی ہے یا نہیں، پیمانہ بین نہ ہوں، اس پیمانے کے اندر جو کچھ ہے اسے دیکھیں۔

تمثیلی واقعات کی زبان بزرگان نے ہمیں سمجھانے کے لئے اختیار کی ہے، فقط ہماری تعلیم کی خاطر ہے، لیلیٰ مجنوں کا یہ قصہ بھی ایک پیمانہ ہے، اس کے اندر یہی جاذبہ و کشش بیان کی گئی ہے، مولانا روم نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ مجنوں کسی اور شہر میں تھا اور لیلیٰ کسی اور شہر میں، جس کو ایرانی لیلی کہتے ہیں، تلفظ کا فرق ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے جیسے بعض موسیٰ علیہ السلام کو موسی علیہ السلام تلفظ کرتے ہیں، ہرج نہیں ہے دونوں جائز الوجہین ہیں، یہ بھی غلط نہیں ہے لیکن ہمارے یہاں رائج اردو میں اسے زیادہ تر لیلیٰ تلفظ کرتے ہیں۔ مجنوں نے لیلیٰ کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس اونٹنی پہ سفر کیا کہ جو مجنوں نے پالی ہوئی تھی، اتفاق سے اونٹنی کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا، بچے کو مجنوں نے وہیں گھر میں باندھا اور اونٹنی لے کر سفر پر نکل گیا، سفر طولانی تھا، صحرائی سفر تھا، اونٹنی کو بار بار اپنا بچہ یاد آتا تھا یعنی اونٹنی اپنے بچے کی کشش میں تھی، جاذبہ اپنے بچے کی طرف تھا چونکہ ماں ہے اور ماں اور بچے میں بھی کشش ہوتی ہے، ماں بھی مرکزِ ثقل ہے، مرکزِ کشش ہے اور بچہ بھی مرکزِ کشش ہے، کبھی بچہ ماں کی کشش میں مبتلا ہوتا ہے اور کبھی مائیں بچوں کی، جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو ماں کی کشش میں مبتلا ہوتا

طبیعت و فطرت میں مجاذ آرائی

ہے لیکن تھوڑی مونچھیں نکلتی ہیں تو فقط بیچاری ماں اس کی کشش میں ہے، یہ حوزے میں آ جاتا ہے اور خط تک نہیں لکھتا ہے، ان کو اطلاع تک نہیں دیتا ہے کہ میں خیریت سے ہوں، بھول جاتا ہے، ماں اس کی کشش میں مبتلا ہے اور یہ آزاد ہے۔

یہ اونٹنی اپنے چھوٹے بچے کی کشش میں مبتلا ہے اور مجنوں کس کی کشش میں مبتلا ہے؟ وہ لیلیٰ کے جاذبے میں ہے، یہاں پر اب جنگ ہے، اس تمثیل میں توجہ کریں کہ یہ خوبصورت تمثیل ہے، مجنوں جب بیدار ہے تو اونٹنی کی پشت پر بیٹھا ہوا ہے اور اونٹنی کی مہار مجنوں کے ہاتھ میں ہے، اس وقت اونٹنی کو سیدھا لیلیٰ کی طرف، شہرِ لیلیٰ کی طرف متوجہ رکھتا ہے لیکن چونکہ سفر زیادہ ہے اور سفر میں سختیاں ہیں، صحرا ہے، پیاس ہے، دھوپ ہے لہٰذا تھوڑا سا سایہ آتا ہے تو مجنوں کو اونٹنی کی پشت پر نیند آ جاتی ہے اور جوں ہی مجنوں سوتا ہے تو وہ لگام ڈھیلی پڑ جاتی ہے، اونٹنی کی مہار ڈھیلی پڑتی ہے تو اونٹنی کو پتہ چل جاتا ہے کہ مجنوں سو گیا ہے، اونٹنی وہیں سے اپنا راستہ لیتی ہے اور اسے لے کر سیدھی واپس اپنے شہر کی طرف آ جاتی ہے چونکہ اس کا بچہ وہاں پر ہے، تھوڑی دیر بعد پھر جب مجنوں آرام کر لیتا ہے، بقول ایرانیوں کے جب یہ چُرت لگا لیتا ہے، جب اپنی ایک جھپکی لے لیتا ہے تو پھر جاگ جاتا ہے، دیکھتا ہے کہ جو سفر طے کیا تھا پھر وہیں پر ہے، جہاں سے چلا تھا وہیں پر ہے، اونٹنی اس کو واپس وہیں پر لے آئی ہے، پھر دوبارہ اس کا رخ موڑتا ہے، لگام کھینچتا ہے اور اس کو دوبارہ شہرِ لیلیٰ کی طرف متوجہ کرتا ہے، یہ کشمکش اونٹنی اور مجنوں کے اندر موجود ہے، کیوں؟ کیونکہ محبوبِ مجنوں کسی اور شہر میں ہے اور محبوبِ ناقہ کسی اور شہر میں ہے، یہ تمثیل کس چیز کی ہے؟ یہ روح اور بدن کی تمثیل ہے۔

روح مجنوں ہے اور بدن ناقہ ہے، روح کی لیلیٰ خدا ہے اور بدن کی لیلیٰ چراگاہ ہے اور دونوں میں یہ کشمکش ہے، انسان کے اندر یہ طبیعت وفطرت کی جنگ ہے، دونوں دو الگ الگ چیزوں کی کشش میں آئے ہوئے ہیں، دونوں الگ چیزوں کی مقناطیسیت میں آئے ہوئے ہیں، ناقہ کسی اور مقناطیس کی کشش میں گرفتار ہے اور مجنوں کسی اور کی، مجنوں یعنی روح، مجنوں کا معشوق خدا ہے لیکن بدن کا معشوق طبیعت، عالم مادہ، خواہشات، شہوات، آرام، آسائش اور عافیت ہے۔ جوں ہی روح غافل ہوتی ہے، غفلت روح کی نیند ہے، مجنوں کا پشتِ ناقہ پر سوجانا غفلتِ روح ہے، روح کے غافل ہوتے ہی یہ ناقہ مجنوں کو بھی لے کر واپس آجاتا ہے، یوں تو نہیں ہے کہ مجنوں کو اتار کر کہ تیرا آدھا راستہ طے ہوگیا تو یہاں بیٹھ میں بچے سے مل کر واپس آؤں، نا، چونکہ یہ اس پر سوار ہے لہٰذا جب روح غافل ہو جائے تو بدن اس کو روح سمیت واپس انحطاط وپستی وذلت میں ڈال دیتا ہے لہٰذا روح کو غفلت سے نکلنا ہے، روح کو بیدار و ہوشیار رہنا ہے، روح کو ایک لحظے کے لئے بھی غفلت نہیں برتنی اور اگر برتی تو اس کا سارا طے کیا ہوا سفر ایک لحظے کی غفلت سے واپس آجائے گا۔

۱۰) مولا علی علیہ السلام، فانی در ذاتِ خدا

مولا علی علیہ السلام ایک لحظے کیلئے بھی اپنے محبوب رب سے غافل نہیں ہیں لہٰذا ہلا ہلا کے نماز میں تیر کھینچ لیں لیکن اس انسان کو خبر نہیں ہے، یہ جب مناجاتِ خدا میں مشغول ہوجاتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی دنیا سے رحلت ہوگئی ہے، اس کی مناجات پڑھ کر آج لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے جو

اس طرح سے خدا کی بارگاہ میں مناجات پیش کرتا ہے؟ کیوں؟ کیونکہ اس کو سراپا جاذبۂ خدا نے اپنی طرف کھینچا ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمانا تھا کہ

لَا تَسُبُّوا عَلِیّاً...... (۵)

تم علیؑ کو گالی نہ دو (برا نہ کہو)......

یعنی علی علیہ السلام کو ناسزا نہ کہنا، کیوں؟

فانّہ مَمْسُوْسٌ فِیْ ذَاتِ اللّٰہِ......

بے شک یہ ذاتِ خدا میں ضم ہے (جذب ہے)......

مولا علی علیہ السلام مقناطیسِ خدا میں اس قدر مجذوب ہیں کہ علی علیہ السلام کا سراپا الٰہی مقناطیسیت میں گھرا ہوا ہے۔ اس لئے ماسوا اللہ کسی اور کے جاذبے میں مبتلا نہیں ہیں، دنیا آتی ہے تو کہتے ہیں کہ تجھے تین طلاقیں دیدی ہیں، اقتدار آتا ہے تو کہتے ہیں کہ تم میرے نزدیک پھٹے ہوئے جوتے سے بھی زیادہ بدتر ہو، امیر المومنین علیہ السلام غیر از خدا کسی جاذبے میں مبتلا نہیں ہیں، فقط اسیرِ جاذبۂ خدا ہیں، اس حالت میں انسان پر کلامِ محبوب اثر کرتا ہے۔

۱۱) مجنوں کیلئے لیلیٰ کے خط کی اہمیت

لیلیٰ کا خط اگر آج ہمیں مل جائے تو ہم اس کو ایک ادبی سند کے طور پر رکھیں گے، ادبیات میں ایک یہ خط بھی شامل کرلیں گے یا صرف پڑھ دیں گے لیکن اگر مجنوں کو لیلیٰ کا خط مل جائے،

مولانا روم نے ایک اور واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن مجنوں کتے کے قدم کی جگہ کو چوم رہا تھا۔

ہمچو مجنون کاو سگی را می نواخت
بوسہ اش می داد و پیشش می گداخت......(۲)
گِرد او می گشت خاضع در طواف
ہم جلابِ شکّرش می داد صاف
بو الفضولی گفت ای مجنونِ خام
این چہ شَیدا است این کہ می آری مُدام

یعنی ایک دن مجنوں کتے کی قدم گاہ کو چوم رہا تھا اور خاضع ہو کر اس قدم گاہ کے گرد گھوم رہا تھا، عاقل لوگ حیران تھے، چونکہ وہ مجنوں تھا اور باقی سارے عاقل تھے۔ کسی نے پوچھا کہ اے مجنون تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو اس کا اس قدر شیدائی ہے کہ یہ فضول کام انجام دے رہا ہے۔ مجنوں نے جواب دیا کہ تمہاری نظروں میں یہ فضول کام ہو گا لیکن اسے میری نظروں سے دیکھو،

گفت مجنون تو ہمہ نقشی و تن
اندر آ و بنگرش از چشمِ من
کاین طلسم بستۂ مولی است این
پاسبان کوچۂ لیلی است این

مجنوں کیلئے لیلیٰ کے نقش قدم کی اہمیت

ہمّتش بین و دل و جان و شناخت
کا وجا بگزید و مسکن گاہ ساخت
او سگ فرّخ رخِ کہف من است
بلکہ او ہم درد و ہم لہفِ من است
آن سگی کہ باشد اندر کوی او
من بہ شیران کی دھم یك موی او

یعنی تم فقط ظاہر دیکھ رہے ہو جبکہ میرے پیشِ نظر اس کام کا باطن ہے۔ دراصل یہ کتا لیلیٰ کے کوچے کا پاسبان ہے۔ اس کا درد وغم میرا درد وغم ہے اور میں اس کتے کے ایک بال کا مقایسہ ومقابلہ کسی شیر کے بال تک سے نہیں کر سکتا ہوں۔

اس کا قدم لیلیٰ کے کوچے سے ہو کر آیا ہے لہٰذا تمہیں کیا معلوم کہ اس قدم کی کیا اہمیت ہے؟ مجنوں اس کتے کا قدم چومتا ہے کہ جو لیلیٰ کے کوچے سے ہو کر آتا ہے لیکن اگر لیلیٰ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک عبارت مجنوں کو مل جائے؟ اگر لیلیٰ کا خط مجنوں کو مل جائے تو کیا کرے گا؟ ہمیں ملے تو ہم کیا کہیں گے؟ ہم کہیں گے کہ یہ ایک عربی ادب ہے، ادبیات میں سے ایک کتاب ہے اور اس کو بھی سلیبس (Syllabus) میں ہونا چاہئے، لیلیٰ کا خط بھی حفظ کرنا چاہئے، اس کو حفظ کر کے اقامہ لینا چاہئے، اس کو حفظ کر کے الٹا پڑھنا چاہئے، سیدھا پڑھنا چاہئے اور مجنوں وہاں بیٹھ کر کلمہ بہ کلمہ رٹّہ لگانا شروع کر دے، ہمارے لئے لیلیٰ کا خط ذریعۂ آمدن بن جاتا ہے، لوگوں کو جا کر کہیں کہ یہ لیلیٰ کا

خط ہے، ابھی نیلام کریں اور اعلان کریں کہ لیلیٰ کا خط آیا ہے تو یہ خط کمائی کا ذریعہ بن جائے گا لیکن مجنوں کو اگر لیلیٰ کا خط مل جائے تو مجنوں کیا کرے گا؟ وہی مولانا روم کی تمثیل والا مجنوں یعنی روح، مجنوں کو اگر لیلیٰ کا خط ملے تو کیا کرے گا؟ مجنوں صرف خط پڑھے گا نہیں بلکہ خط سراپا وجودِ مجنوں کو گھیر لے گا، مجنوں وجد میں آجائے گا، مجنوں بے خود ہو جائے گا کیونکہ مجھے لیلیٰ نے پکارا ہے۔

یہ کلامِ خدا لیلیٰ ٔ حقیقی ٔ مومن ہے۔ جب خدا کا کلام، خدا کی عبارت ہمارے سامنے آئے تو ہم وجد میں کیوں نہیں آتے؟ کیونکہ صرف کلامِ خدا کو مُردوں کے لئے پڑھتے ہیں، مجنوں کو اگر کلامِ لیلیٰ ملے تو جا کر قبرستان میں مُردے کے ایصالِ ثواب کے لئے پڑھے گا کہ سطر سطر کا ثواب اس مردے کو پہنچے؟ نہیں بلکہ وہ تو وجد میں آجائے گا اور اس کو یہ کلام سراپا گھیر لے گا، یہ اس کو ایک ایک سطر پڑھنا شروع کر دیتا ہے کہ جو جو لفظ لیلیٰ لکھ رہی ہے، مجنوں کی حالت ہمیشہ اسی طرح ہے، روایات میں لکھا کہ ہے جب سید الشہداؑ نے حبیب ابن مظاہرؓ کو خط لکھا اور وہ خط جب حبیبؓ نے پڑھنا شروع کیا تو زوجہ حبیبؓ چہرۂ حبیبؓ کو دیکھ رہی تھی اور سطر سطر پر حبیبؓ کی حالت و رنگت بدل رہی تھی، کیوں؟ کیونکہ لیلیٰ کا خط آیا ہے، یہ تاثر ہے، حبیبؓ کی کیفیت بدل گئی، خط دیکھ کر اور اسے ملاحظہ کر کے، اس پر نگاہ ڈال کر حبیبؓ کی کیفیت بدل گئی۔

قرآن کو دیکھ کر انسان کی کیفیت کیوں نہ بدلے کہ یہ میرے پرور دگار کا، میرے معبود کا کلمہ ہے، یہ سطر، یہ عبارت، یہ سورہ، یہ آیت، یہ قرآن میرے معشوق کا کلام ہے، خدا کے ساتھ عاشقانہ رابطہ ہو، عبادتیں عاشقانہ کریں۔

مجنوں کیلئے معشوق لیلیٰ کے خط کی اہمیت

۱۲) مشکلات میں شکرِ خدا

ہمارے حالات یہ ہیں کہ ہمیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو فوراً گلہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ یہ کیا گیا ہے؟ عرض کیا کہ یہ سارے قصے تمثیل ہیں، تمثیلات میں نہیں جانا ہے۔ ایک مرتبہ لیلیٰ شربت بانٹ رہی تھی، لوگ شربت لینے کے لئے اپنے اپنے کاسے و پیالے لے کر لائن میں کھڑے تھے، مجنوں بھی لائن میں کھڑا ہو گیا، سارے لوگ شربت کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور مجنوں لیلیٰ کے لئے، کسی کی نگاہ لیلیٰ پر نہیں ہے، سب کی نگاہ شربت پہ لگی ہوئی ہے لیکن مجنوں کی نگاہ لیلیٰ پہ ہے، جب مجنوں کی باری آئی تو سب کو وہ شربت بھر بھر کر دے رہی تھی لیکن مجنوں کی باری آنے پر اس کا پیالہ لے کر پتھر پر مار کر توڑ دیتی ہے، مجنوں ناچنا شروع کر دیتا ہے، مجنوں وجد میں آجاتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ تو تو بہت لیلیٰ لیلیٰ کرتا تھا، آخر یہی رابطہ تھا لیلیٰ کا کہ تو تو صبح و شام جیتا ہی لیلیٰ کے ذکر میں تھا؟ لیکن آخر اس نے تیرا کاسہ توڑ دیا، کہا نادانوں غور کرو، تم میں سے کسی کا کیوں نہیں توڑا؟ تم بھی تو بہت سارے تھے، ہزاروں کی صف لگی ہوئی تھی، تم بھی اپنا کاسہ لے کر گئے لیکن تم میں سے کسی کا کاسہ کیوں نہیں توڑا؟ وجد میں آگیا کہ میرا کاسہ توڑ دیا اور شربت بھی نہیں دیا۔

یہ مجنوں کون ہے؟ مجنوں یعنی خدا پرست انسان، مجنوں خدا پرست انسان ہے اور لیلیٰ سے مراد خدا ہے، خدا کی نعمتیں بٹ رہی ہیں، کافر جاتا ہے بوری بھر کر دیتے ہیں، گاڑی بھی دیتے ہیں، بنگلہ بھی دیتے ہیں، ڈرائیور بھی ساتھ دیتے ہیں، سب کچھ دیتے ہیں، منافق جاتا ہے، فاسق جاتا ہے، فاجر جاتا ہے، دنیادار جاتا ہے، تاجر جاتا ہے، سب جاتے ہیں اور سب کو دیتے ہیں لیکن

جب مومن بارگاہِ خدا میں آتا ہے تو جو اس کے گھر میں ہے وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، پھر یہ مومن گلہ کرنے لگتا ہے کہ خدا خدا کرتے تھے، یہی تمہارا خدا تھا؟ بلکہ وہ یہ کہے کہ خدا تو ہم سے زیادہ راضی ہے، یہاں مومن کو وجد میں آنا چاہئے کہ آخر خدا نے تمہیں کیوں مریض نہیں کیا؟ فقط مجھے کیوں مریض کیا ہے؟ آخر خدا نے تمہارا ہاتھ کیوں نہیں کاٹا؟ فقط میرا ہاتھ کیوں کاٹا ہے؟ آخر خدا نے تمہیں کیوں اس حالت میں مبتلا نہیں کیا ہے؟ مجھے کیوں اس حادثے میں، اس حالت میں مبتلا کیا ہے؟ اس لئے کہ کوئی ربط ہے، کوئی نظر ہے، کوئی عنایت ہے، یہ ہم پر عنایتِ خدا ہے ورنہ شربت مہم نہیں ہے بلکہ خدا مہم ہے، شربت نہ بھی ملا تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مولا علی علیہ السلام کیلئے لیلیٰ کون ہے؟ خدا ہے، اس لئے امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پروردگار تیری جنت کی لالچ میں وجد میں نہیں ہوں بلکہ تیرے جاذبے میں گرفتار ہوں، فھمتک نہیں کہا بلکہ فرمایا کہ

وَجَدْتُکَ أَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ...... (۷)

(اے خدا!) میں نے تجھے لائقِ عبادت پایا تو میں نے تیری عبادت کی......

تیرے جاذبے میں گرفتار ہوں نہ کہ اوروں کے جاذبے میں گرفتار ہوں، تو معشوق ہے، یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان دوسرے جاذبوں سے نکلے۔

مشغولات میں ذکرِ خدا

۱۳)عاشقانہ دعا و مناجات کریں

پس دعائیں عاشقانہ مانگیں، مناجات عاشقانہ ہوں، بعض لوگ خدا سے فقط تاجرانہ دعائیں مانگتے ہیں، یہ بھی دے دے، وہ بھی دے دے، فقط لینے کی بات کرتے ہیں، آپ خدا سے عاشقانہ بات کریں۔ دعائے ابوحمزہ ثمالیؒ دیکھیں کہ خدا کے ساتھ عاشقانہ بات کرتے ہیں کہ اے پروردگار اگر تو نے مجھے اپنی عنایتوں سے نہیں نوازا، اگر تیرا لطف میرے شاملِ حال نہیں ہوا تو میں کیا کروں گا؟ اِدلال کروں گا، اِدلال عاشقانہ باتیں کرنے کو کہتے ہیں، کیا کروں گا؟ دنیا کو پکار پکار کر کہوں گا کہ یہ میرا پروردگار و معبود ہے۔ انسان خدا کے ساتھ اس طرح سے متصل ہو تو اس وقت انسان پر کلامِ خدا اثر کرتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن مسعود سے کہا کہ میرے لئے یہ آیہ پڑھو اور ابن مسعود نے وہ آیہ پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت دگرگوں ہوگئی، ابن مسعود کو رکنا پڑا، آیہ ختم کرنی پڑی کہ ابن مسعود سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال اس سے زیادہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆ **فان الشوق والوجد مغناطيس القرب من عالم التوحيد والملكوت......**

مسلکِ شوق، مسلکِ وجد ہونا چاہئے اور ہم وعدوں کے امیدوار بن کر آئے ہوئے ہیں، وعدے سن کر، ثواب سن کر اور بہت ساری چیزوں کی خاطر، بلکہ جاذبہ محبوب کی طرف ہو، جاذبۂ خدا کی طرف آؤ۔ شوق اور وجد عالمِ ملکوت کی مقناطیسیت ہے، کشش ہے، آمادہ دل اس میں آجاتا ہے لیکن غیر آمادہ دل کے لئے

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ○

لیلیٰ کا خط پڑھنا ایک عام آدمی کے لئے بہت دشوار ہے لیکن مجنوں کے لئے آرزو اور حسرت ہے،

یہ قربتِ خدا کا مقناطیس وکشش ہے۔ دعا بھی ایسے ہی ہوتی ہے، دعا کر کے جب انسان بارگاہِ خدا میں آجاتا ہے تو ملکوت کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے،

☆ ومن اشتد شوقه......

جس کا شوق شدید تر ہوتا جاتا ہے،

☆ اشتد انجذابه......

اس کا جاذبہ، اتصال وقرب بھی شدید تر ہوتا ہے اور محو بھی زیادہ ہوتا ہے، جتنا شوق بیشتر ہوتا ہے اتنی ہی مجذوبیت بیشتر ہوتی ہے۔

☆ واتصاله......

اس کا اتصال خدا کے ساتھ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، پھر انسان دوسری حالتوں سے باہر آجاتا ہے۔

۱۴) اہلبیت علیہم السلام کی سیرت میں جاذبۂ خدا

اہلبیت علیہم السلام کی سیرت پڑھیں، اہلبیت علیہم السلام کا فرد فرد ہمارے لئے اسوہ ہے، خصوصاً معصومینؑ تو یقیناً اسوہ ہیں، اہلبیت علیہم السلام کا خاندان اسوہ ہے چونکہ پروردہٴ مکتبِ قرآن ہے، غیر معصومین جو

اہلبیت علیہم السلام کی اولاد میں سے تھے ان میں حسنِ مثنیٰ جو حضرت قاسم علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے، انہوں نے سید الشہداء علیہ السلام سے خود جا کر حضرت سکینہ علیہا السلام کا تقاضا کیا، رشتہ مانگا، حضرت سکینہ علیہا السلام حضرت امام حسین علیہ السلام کی سب سے بڑی بیٹی کا نام ہے، برصغیر میں مشہور ہوگیا ہے کہ وہ چھوٹی بیٹی کا نام ہے، باقی ساری دنیا میں جو چھوٹی بیٹی ہے اس کا نام رقیہ علیہا السلام ہے، سید الشہداء علیہ السلام کی سب سے چھوٹی بیٹی وہ تین سالہ بیٹی ہے اور واقعاً ہے لیکن ان کا نام رقیہ علیہا السلام ہے، برصغیر میں ان کو سکینہ علیہا السلام کہتے ہیں۔ سکینہ علیہا السلام سب سے بڑی بیٹی کا نام ہے، جو زندہ رہیں اور بڑی باکمال خاتون تھیں، حسنِ مثنیٰ نے جب سید الشہداء علیہ السلام سے جنابِ سکینہ علیہا السلام کا رشتہ مانگا تو امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ ان سے شادی نہ کرو یعنی میری طرف سے اعتراض نہیں ہے لیکن یہ شوہر داری کا حق ادا نہیں کر پائے گی، لیکن کیوں؟ اس لئے کہ میری یہ بیٹی فانی در ذاتِ خدا ہے یعنی یہ بیٹی سراپا مجذوبِ خدا ہے، مقناطیسیتِ الٰہی نے، ملکوت نے اس کو گھیرا ہوا ہے، یہ بہت کم اس دنیا میں ہوتی ہے، زیادہ اُس عالم میں ہوتی ہے لہٰذا تمہاری توقع شاید پوری نہ ہو، یہ خاندانِ اہلبیت علیہم السلام کے اسوے ہیں۔

۱۵) قرآنی زبان سے مراد

☆ وتأثر العبد بالتلاوة والتدبر هوان يصير قلبه بصفة الاية المذكورة......

عبد قرآن پڑھتے ہوئے کس طرح سے متاثر ہو؟ جس طرح کی آیت آتی ہے یہ اسی صفت سے متصف ہو جائے۔ آیت میں خدا نے کیا کہا ہے؟ اسی طرح سے انسان بھی بنتا جائے، یعنی

حالات کے لحاظ سے اور عمل کے لحاظ سے تفسیرِ عملی آیت بنتا جائے،

☆ و یتخلق بھا......

انسان متخلق ہو، متخلق یعنی متصف ہو، متحقق ہو، ابھی ہم محققِ آیات ہیں، متحققِ آیات نہیں ہیں۔ ہمارے لئے آیات فقط وردِ زبان ہیں، فقط ہمارے ذہن اور حافظے میں ہیں اور ہمارے وجود میں نہیں ہیں، جس طرح سے یہ نقاش بعض چیزوں کے اوپر بڑی خوبصورت آیات لکھتے ہیں اور وہ جسم آیات سے مزین ہو جاتا ہے اسی طرح سے یہ آیات فقط ہمارے ذہن و حافظے و لائبریری و کاغذ میں نہیں ہوں بلکہ یہ آیات انسان کی صفات بن جائیں اور انسان کا عمل بن جائیں یعنی انسان قرآنی بن جائے، ایسا نہ ہو کہ جیسے ابھی رائج ہے، کرتبِ قرآنی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مثلاً بعض آیات ہیں کہ جو مناسبت رکھتی ہیں، ان کے اندر کوئی ایک آدھ جملہ ہے مثلاً کوئی آپ سے پوچھے کہ ٹائم کیا ہوا ہے؟ تو جواب دے کہ

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا○(۸)

بے شک وقت کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا مومنین پر فرض ہے۔

یا یہ آیہ پڑھ دے کہ

قُلْ لَّكُمْ مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُونَ○(۹)

کہہ دیجئے: تم سے ایک دن کا وعدہ ہے جس سے تم نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے بڑھ سکو گے۔

یہ جواب میں کہتا ہے کہ نماز وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے اور قیامت بھی آنے والی ہے، یہ قرآن کی زبان میں بولنا نہیں ہے، وہ آپ سے ٹائم پوچھ رہا ہے، یوں تو نہیں ہے کہ ادھر ساعت کا لفظ آیا اور آپ نے کوئی بھی ایسی آیہ پڑھ دی جس میں لفظِ ساعت آیا ہے، اگرچہ ساعت قیامت کے لئے کہا گیا ہو۔ آیہ کا ایک لفظ اگر سوال سے کوئی مناسبت رکھتا ہے تو کیا انسان وہ آیہ اسی مناسبت سے پڑھ دے؟ اگر کوئی آپ سے ایڈریس پوچھتا ہے تو اس کو کیا کہیں گے؟

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ٥

صدر المتالھین ؒ فرمار ہے ہیں کہ قرآن ہماری حالت وصفت بن جائے نہ کہ فقط کتاب، قرأت اور تلفظ و مفہوم رہے، ان حالات سے اپنے آپ کو متصف کریں یعنی فقط محققِ قرآن نہ ہوں بلکہ متحققِ قرآن بنیں، قرآن کی صفات سے متصف ہوں۔ اسی لئے کہا ہے کہ بے ربط آیات پڑھنا قرآن کی زبان میں بات کرنا نہیں ہے۔ یہ نہ ہو کہ جب کسی فقیر کو دیکھو تو مناسبت سے قرآن کی ایک آیت پڑھ دو مثلاً

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ ......(۱۰)

شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے......

اور وہاں سے گزر جاؤ، یہ قرآنی زبان نہیں ہے، یہ کرتبِ قرآن ہے بلکہ جب انسان فقیر کو دیکھے تو وہ قرآنی حالت جو فقر کے مقابلے میں قرآن نے ذکر کی ہے انسان پر طاری و متجلی ہو یعنی جود و سخا و غنا۔ قرآن کی زبان میں بولنا یعنی قرآنی حالت انسان کے اوپر طاری ہونا، جتنی بھی اچھی

صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں وہ انسان کے وجود میں منتقل ہوں یعنی قرآن ہماری صفت، حالت اور عمل بن جائے، اس طرح سے عمل بن جائے کہ اگر کوئی ہمارے حالاتِ زندگی لکھے تو یہ تفسیرِ آیاتِ قرآن ہو، یہ ہوتا ہے انسانِ قرآنی اور اہلبیت علیہم السلام کے حالاتِ زندگی اسی طرح سے ہیں۔ ائمہ اطہار علیہم السلام اور بالخصوص خود پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسم قرآن تھے، نمونۂ خودِ قرآن تھے۔ اگر کوئی امیر المومنین علیہ السلام کے حالاتِ زندگی لکھے تو یہ تفسیرِ قرآن ہے۔ نہج البلاغہ تفسیرِ قرآن ہے۔

انشاء اللہ اس فصل کے حصۂ سوئم میں اثر لینے کے لحاظ سے انسانوں کی اقسام اور قرآن کی مختلف آیات سے اثر لینے سے متعلق گزارشات درج کی جائیں گی۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ۲۱)

(۲)......(سورۂ مبارکہ نحل، آیہ۵۱)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۴۵)

(۴)......(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۷۲)

(۵)......(غریب الحدیث فی بحار الانوار، الجزء۳، صفحہ۱۹۷)(شرح نہج البلاغہ - جعفری)(شعراء الغدیر فی القرن الحادی عشر، الجزء۷، صفحہ۱۸)

(۶)......(مثنوی معنوی، بہ تصحیح :رینولد ا.نیکلسون، دفتر سوم، صفحہ ۳۶۳)

(۷)......(الامام علیؑ ونہج البلاغہ، الجزء ۱، صفحہ ۱)(مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسی، الجزء ۷، صفحہ ۸۱)(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء ۳، صفحہ ۲۳۷)(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۶۷، صفحہ۱۸۶)(میزان الحکمة - الریشھری، الجزء ۱۱، صفحہ۳۱۳)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازیؒ، الجزء ۷، صفحہ ۵۷)

(۸)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۰۳)

(۹)......(سورۂ مبارکہ سبا، آیہ۳۰)

(۱۰)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۶۸)

فصلِ ادبِ هشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّه سوم)

١)اقسامِ انسان بلحاظِ اوصاف

☆صاحبِ اوقات

☆صاحبِ احوال

☆صاحبِ مقامات

٢)قسی القلب،غیر متاثر نفس

٣)آیاتِ وعید کاانسان پر اثر

٤)خدا کی ربوبیت رحمانی هے

٥)خدا کا غضب بهی بغیر رحمت کے نهیں

٦)آیاتِ رحمت کا اثر

٧)هر عبادت کی بنیا د معرفت هے

٨)گستاخ افراد کے اقوال پر مشتمل آیات کا اثر

٩)جنت کے ذکر کا انسان پر اثر

١٠)جهنم کے ذکر کا انسان پر اثر

۱۱)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرآن سے اثر لینے کی کیفیت

۱۲)فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ متحققِ قرآن بنیں

۱۳)آیاتِ توکل کا انسان پر اثر

۱۴)آیاتِ صبر کا انسان پر اثر

۱۵)انسان میں قرآنی صفات پیدا نہ ہونے کا نتیجہ

۱۶)غیر متاثر افراد کیلئے قرآن کیا کہتا ہے؟

۱۷)قرآن کا ہدف، انسان کو صفاتِ ربوبیہ سے متصف کرنا

۱۸)اعلیٰ مرتبۂ معرفت

جب معارفِ قرآن صفاتِ راسخۂ انسان بن جائیں تو اس وقت انسان کے اندر ان اوصاف کی علامات ظاہر ہوتی ہیں مثلاً جب انسان خوف وخشیتِ خدا کی آیات پڑھتا ہے تو اس وقت حقیقتاً متصف بانحشیتِ الٰہی ہو جائے، البتہ اہل معرفت نے ان اوصاف کو تقسیم کیا ہے۔ یہ اوصاف کبھی فقط بصورتِ اوقات ہیں، کبھی بصورتِ حال ہیں اور کبھی بصورتِ مقامات ہیں۔

۱) اقسامِ انسان بلحاظِ اوصاف

☆صاحبِ اوقات

وقت اس کو کہتے ہیں کہ وقتی طور پر، تھوڑی دیر کے لئے ایک وصف یا ایسی حالت انسان پر طاری ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اکثریت میں ایسا ہی ہوتا ہے مثلاً اگر کسی اچھی مجلس و محفل میں جا بیٹھے اور وہاں پر انسانوں کو خوفِ خدا دلایا جا رہا ہو تو وقتی طور پر، اس محفل میں موجودگی کی حد تک دل میں خوف آ جاتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے یہ خوف انسان کے دل سے نکل جاتا ہے، جب یہ اس محفل و مجلس سے باہر جاتا ہے تو انسان پر ایک دوسری حالت طاری ہو جاتی ہے، یہاں وقت اصطلاح ہے، ان کی اصطلاح میں یہ وقت ہے اور ایسے انسان کو صاحبِ اوقات کہتے ہیں یعنی ان پر وقتی صفات طاری ہوتی ہیں اور پھر انسان ان صفات سے عاری ہو جاتا ہے۔

☆صاحبِ احوال

بعض لوگ صاحبِ احوال ہیں، صاحبِ احوال یعنی تھوڑی زیادہ دیر کیلئے یہ مثبت صفات انسان کے اوپر طاری ہوتی ہیں، کچھ عرصہ یہ صفات انسان کے اندر رہتی ہیں لیکن پھر ختم ہو جاتی ہیں، تدریجاً غیر محسوس طور یہ صفات انسان کے اندر سے ختم ہو جاتی ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی کافی تعداد اس طرح سے ہے یعنی صاحبِ احوال ہوتے ہیں۔

☆صاحبِ احوال

☆صاحبِ مقامات

کچھ انسان صاحبِ مقامات ہوتے ہیں، صاحبِ مقامات وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے اندر یہ اچھی صفات ہمیشہ کیلئے راسخ ہو جاتی ہیں اور ہرگز ترک نہیں ہوتیں، مقام اسی قیام گاہ سے ہے یعنی یہ صفات انسان کے اندر آ کر قیام کر لیتی ہیں اور راسخ ہو جاتی ہیں، انسان کے وجود اور قلب و روح کا حصہ بن جاتی ہیں اور انسان اس وجہ سے صاحبِ مقام ہو جاتا ہے یا اس طرح سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ انسانِ سالک، سالک الی اللہ یعنی جو قربِ خدا کی طرف جا رہا ہے، سفرِ قربِ خدا طے کر رہا ہے، یہ انسان سفرِ تکاملی کی منزلیں، مرتبے اور مرحلے طے کرتا ہے، جس طرح سے ہم زمینی سفر طے کرتے ہیں تو بعض جگہ منزلیں ہوتی ہیں، بعض جگہ سفر کے مرحلے ہوتے ہیں، سفر کو یا مسافت کو انسان نے تقسیم کیا ہوتا ہے مثلاً اِس شہر سے اُس شہر تک یا اِس منزل سے اُس منزل تک۔ مقصدِ اصلی تک پہنچنے سے پہلے پہلے انسان نے اپنے سفر کے لئے کئی منزلیں مقرر کی ہوتی ہیں، اسی طرح سے

سفرِ قربِ خداوندِ تبارک وتعالیٰ بھی ہے، انسانِ سالک جب اللہ کی طرف نکلتا ہے تو ہجرت کرتا ہے،

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝(۱)

اور جو بھی راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے خدا اور رسول کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے گا اس کے بعد اسے موت بھی آجائے گی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

☆ صاحبِ مقامات

یہ انسان جب خدا کی طرف جاتا ہے، ہجرت کرتا ہے تو مقامات و منزلیں طے کرتا ہے، بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں کہ جہاں تھوڑی دیر کے لئے رکتا ہے اور پھر وہاں سے نکل جاتا ہے، اسے منزل یا جائے نزول کہتے ہیں، جہاں شب گزارنے کے لئے پڑاؤ ڈالا جاتا ہے، جس طرح قافلے زمینی سفر کرتے ہیں کہ جیسے قدیم زمانوں میں قافلے پیدل یا اونٹوں اور گھوڑوں پہ سفر کرتے تھے اور ایک رات کے لئے ایک منزل پر رک جاتے تھے، اس کو منزل کہتے ہیں، جائے نزول یعنی وقتی طور پر پڑاؤ ڈالنا اور پھر دوسرے دن وہاں سے آگے کوچ کرتے تھے، سفر الی اللہ کی بھی منزلیں ہیں، بعض بزرگان نے اس کی منزلیں ذکر کی ہیں، بعض نے ہزار منزلیں ذکر کی ہیں، بعض نے سو منزلیں ذکر کی ہیں اور کچھ مقامات ہیں یعنی یہ انسانِ سالک سفر کے کچھ ایسے درجات و مرحلے طے کرتا ہے کہ یہ وہاں قیام کرتا ہے اور وہ جگہیں اس کی قیام گاہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کو مقامات کہتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ صاحبِ مقامات جب قرآن پڑھ رہا ہے تو خشیتِ خدا ہے اور جب قرآن بند کر دے تو خشیت ختم ہو جاتی ہے، بلکہ خشیت اس کے لئے ایک مقام ہے، مقامِ سالکین میں سے ایک خشیت ہے یا اگر مقامِ صبر کی آیت آئی ہے، استقامت کی آیت آئی ہے تو صبر و استقامت اس کے لئے ایک مقام بن چکا ہے، شکر کی آیت آچکی ہے تو اس کے لئے شکر ایک مقام بنا ہوا ہے، یعنی قرآن کے اثنا میں بھی شاکر ہے اور جب قرآن پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو بھی شاکر ہے یعنی یہ صفتِ قرآنی و مضمونِ قرآنی و تعلیمِ قرآنی اس کے وجود میں منتقل ہوگئی ہے۔

ضروری نہیں ہے کہ فقط پڑھتے ہوئے اس کی یہ حالت ہو بلکہ یہ صفت قرآن نے اس کے اندر دائماً منتقل کر دی ہے، یہ شاکرِ ہمیشگی اور شاکرِ دائمی ہے، جیسے صلوٰۃِ دائمی ہے یعنی انسان ہمیشہ نماز میں ہو، دائم الصلوٰۃ ہو، ضروری نہیں ہے کہ دائم الصلوٰۃ ہمیشہ مصلے پر ہو، نہیں بلکہ اگر گھر میں ہو تو بھی دائم الصلوٰۃ ہو، دفتر میں ہو تب بھی دائم الصلوٰۃ ہو یعنی وہ ہر جگہ کو اپنا مصلیٰ ہی سمجھتا ہے، مصلیٰ یعنی جائے صلوٰۃ، صلوٰۃ یعنی حضور در بارگاہِ خدا، اگر انسان ہمیشہ حاضر در بارگاہِ خدا ہو تو دائم الصلوٰۃ ہے، دفتر میں ہو تو بھی دائم الصلوٰۃ ہے یعنی بارگاہِ خدا میں ہے، راستے میں ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، گاڑی میں ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، گھر میں ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، دستر خوان پر ہو تو بھی بارگاہِ خدا میں ہے، یہ بھولتا نہیں ہے کہ میں بارگاہِ خدا سے نکل کر کسی جگہ پر آگیا ہوں، سارا عالم مظہرِ خدا ہے، سارا جہانِ ہستی مظہرِ خدا ہے، پوری دنیا اس کا مصلیٰ ہے، ساری زمین اس کا مصلیٰ ہے، ہر جگہ اور ہر ذرہ اس کا مصلیٰ ہے، جہاں بھی دیکھتا ہے وہ بارگاہِ خدا میں سجدہ کرتا ہے، خضوع و خشوع کرتا ہے، یہ ہے دائم

الصلوٰۃ انسان لیکن بعض ایسے ہیں کہ جو فقط اوقات میں صلوٰۃ میں ہیں یعنی صلوٰۃ کے مقابلے میں فقط صاحبِ اوقات ہیں، بعض صاحبِ احوال ہیں اور بعض صاحبِ مقامات ہیں لہٰذا قرآنی تعلیمات اور قرآنی معارف سے جب ہم متاثر ہوں یعنی ہمارے وجود میں قرآنی معارف منتقل ہوں تو اس طرح سے منتقل ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ہمارا وجود قرآنی بن جائے، قرآن ہمیشہ کے لئے یہ معارف ہمارے اندر منتقل کردے، یہ انسان انسانِ قرآنی ہو جاتا ہے، اس انسان کا عمل قرآنی ہے، اس کی بات قرآنی ہے، اس کی حرکات وسکنات قرآنی ہیں، اس کی ضمام اب قرآن کے ہاتھ میں ہے، یہ متاثر ہونے کا ایک مرحلہ ومرتبہ ہے۔ پس کچھ لوگ اس سفرِ قربی میں صاحبِ مقامات ہیں، کچھ لوگ صاحبِ احوال ہیں اور کچھ صاحبِ اوقات ہوتے ہیں۔

قسی القلب، غیر متاثر نفس

۲)قسی القلب،غیر متاثر نفس

کچھ لوگ قسی القلب ہیں لہٰذا وہ صاحبِ اوقات بھی نہیں ہوتے ہیں، جن کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۲)

ان کے لئے سب برابر ہے، آپؐ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر گویا مہر لگادی ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور

آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں۔ان کے واسطے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

یہ نہ صاحبِ اوقات ہیں، نہ صاحبِ احوال ہیں اور نہ صاحبِ مقامات ہیں یعنی اصلاً سرے سے سالک ہی نہیں ہیں، ان کے اندر یہ صفات آتی ہی نہیں ہیں، یہ اس راہ کے راہی نہیں ہیں، صاحبِ اوقات یعنی جن کے اندر یہ صفات وقتی طور پر آتی ہیں، مثلاً انسان قرآن پڑھتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اثر ہوتا ہے لیکن شقی اور قسی القلب پر سرے سے ایک لحظے کے لئے بھی قرآن کا اثر نہیں ہوتا ہے، جن پر اثر ہوتا ہے وہ یا صاحبِ اوقات ہیں یا صاحب احوال ہیں یا پھر صاحبِ مقامات ہیں۔اگر انسان اس طرح سے متاثر نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ یہ فقط حکایت وحا کیٔ قرآن ہے، جس طرح سے عموماً انسان پڑھتا ہے مثلاً بہت ساری عبارتیں در و دیوار پہ لکھی ہوتی ہیں، اِدھر اُدھر لکھی ہوتی ہیں، بعض اچھی عبارتیں، بعض مفہومی اور بعض غیر مفہومی عبارتیں پڑھ کر انسان اجنبی طور پر گزر جاتا ہے، اس کا فائدہ نہیں ہے بلکہ قرآن نے خود اس کی مذمت کی ہے کہ

وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ۝ (۳)

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور بس وہ اپنے خیالِ خام میں رہتے ہیں۔

بعض ایسے لوگ ہیں کہ جو کتاب سے فقط امانی کی حد تک آشنا ہیں اور امانی سے آگے نہیں بڑھتے ہیں، امانی کا معنیٰ فرماتے ہیں کہ امانی سے مراد یعنی فقط قرأتِ قرآن کرتے ہیں، تلاوتِ قرآن کرتے ہیں لیکن اس سے آگے ان کو قرآن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے چونکہ نفسِ مستعد نہیں

رکھتے ہیں، قرآن سے اثر قبول کرنے کے لئے ان کا نفس آمادہ نہیں ہے، متاثر نفس نہیں ہے، غیر متاثر نفس ہے یعنی قسی و شقی و سخت اور پتھر دل ہے کہ جس پر قرآن اثر نہیں کر رہا ہے۔

۳) آیاتِ وعید کا انسان پر اثر

صدر المتألھین فرماتے ہیں کہ اگر انسان وعید کی آیات پر پہنچے،

☆ **فعند الوعید یتضائل......**

وعید یعنی دھمکی، خوف، جہنم، دنیوی و اخروی عذاب اور قرآن کے بیان کردہ عذاب یعنی عذاب النار، عذاب الیم، عذابِ مھین، عذابِ عظیم، عذابِ شدید، عذاب الحریق، عذابِ مقیم، عذاب الھُون، عذاب الخلد، عذاب الخزی، عذابِ غلیظ، عذاب السعیر، عذابِ واصب، عذاب الجحیم، عذاب الحمیم، عذاب السموم اور عذابِ مستقر۔

یتضائل یعنی یتصاغر لہٰذا جب انسان آیاتِ عذاب و وعید پر پہنچتا ہے تو کوچک ہو جائے، چھوٹا ہو جائے، اپنے آپ کو حقیر سمجھے، اپنے اندر چھوٹے پن کا احساس کرے، انسان کے اندر تکبر نہ آئے۔ اس وقت اپنے اندر خوفِ خدا محسوس کرے۔

☆ **من خیفته......**

خوفِ خدا سے،

☆ **کأنه یکاد یموت......**

آیاتِ وعید کا انسان پر اثر

اس طرح سے اپنے آپ کو چھوٹا کرے، کو چک کرے کہ گویا یہ مرنے والا ہے، جب وعید کی بات آئے، دھمکی کی بات آئے، جہنم اور عذاب کی بات آئے تو انسان پر یہ حالت طاری ہو جائے کہ ابھی اس کی روح نکلنے والی ہے۔ اس طرح سے یہ احساس اس کے اوپر چھا جائے کہ انسان مرنے والا ہو جائے، جس طرح سے جب کسی انسان پر خوفِ شدید مُستوُلی ہو جاتا ہے، مسیطر ہو جاتا ہے، مسلط ہو جاتا ہے، چھا جاتا ہے، خوف اس کے سراپا وجود کو گھیر لیتا ہے تو انسان پر موت جیسی کیفیت طاری ہوتی ہے، اسی طرح سے انسان جب قرآن پڑھ رہا ہو اور آیاتِ خوف اور آیاتِ وعید سے گزر رہا ہو تو ایسے لگ رہا ہو کہ جیسے ابھی یہ مرنے والا ہے، جیسے ذکر کیا کہ ھمام پر اثر ہوا باوجود اینکہ امیر المومنینؑ خوف بیان نہیں فرما رہے تھے بلکہ تقویٰ بیان فرما رہے تھے لیکن اس کا نفس سننے کے لئے اس قدر آمادہ تھا کہ موت واقع ہو گئی۔

٤) خدا کی ربوبیت رحمانی ہے

☆وعند التوسع و وعد المغفرة......

توسیعِ رحمتِ خدا یعنی وسعتِ رحمتِ خدا، خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن میں بھی فرمایا ہے

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ......(۴)

اور میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے......

ہر شے پر رحمتِ خدا شامل ہے، کل جہانِ ہستی مشمولِ رحمتِ خدا ہے، مرحوم ہے، مرحوم یعنی جس کے اوپر رحمت نازل ہوئی ہے، رحمت یافتہ ہے، بدونِ رحمت نظامِ ہستی قائم نہیں ہے، ربانیت و ربوبیتِ خدا درحقیقت رحمانیت ہے، اس کے اندر رحمانیت ہے، اسماء وصفات خدا بہت زیادہ ہیں لیکن سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں فرمایا کہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۝ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۝

خدا کی ربوبیت رحمانی ہے

یعنی وہ عالمین کا رب ہے اور خداوند تبارک وتعالیٰ کی یہ ربوبیت رحمانی ربوبیت ہے مثلاً جس طرح یونیوسٹیز میں مدیریت پڑھائی جاتی ہے یعنی ایڈمنسٹریشن (Administration)، یہ ایک پورا علمی شعبہ ہے، ابھی حوزوں یا مدرسوں میں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے، شاید ایک صدی اور لگے گی کہ جب دینی اداروں میں بھی اس چیز کی اہمیت کی طرف توجہ آئے گی کہ مدیریت خود ایک فن ہے، مدیریت کی اقسام بیان کی جاتی ہیں، مثلاً ایک مدیریت، مدیریتِ پاداشی ہے یعنی انسان ایسی مدیریت کرے کہ اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ صلہ، معاوضہ اور تنخواہ دے کر ان کو لالچ دے اور کام نکال لے۔ ایک مدیریتِ دوستانہ ہے یعنی انسان اپنے ماتحتوں کا دوست بن جائے اور ان کے ساتھ دوستی کے باب سے وارد ہو اور کاریگروں کے ساتھ مزدوروں کے ساتھ ایک ایڈمنسٹریٹر اور دوست بن کر ان سے کام نکلوائے اور ایک مدیریتِ استبدادی ہے یعنی مستبد طور پر انسان اپنے ماتحتوں پر سختی کرے، ان کو خوف دلائے اور کوڑے کے ذریعے سے ان سے کام لے، یہ بھی ایک نوعِ مدیریت ہے، یہ ساری مدیریت کی اقسام ہیں، سب کے تجربے لکھے ہوئے ہیں یا ان کتابوں میں

درج ہیں کہ کونسی مدیریت کتنی کامیاب ہے، یہ ایک پورا فن ہے، اسی طرح سے ربوبیت بھی ہے لیکن مدیریت اور ربوبیت میں فرق ہے، فرض کریں کہ والدین جو مظہرِ ربوبیتِ خدا ہیں، ان کی بھی یہی صورت ہے، بعض والدین اپنے بچوں کے ساتھ معاوضہ، لالچ اور ان چیزوں سے وارد ہوتے ہیں اور بچوں کی تربیت کرتے ہیں، ربوبیت کرتے ہیں یا مظہرِ ربوبیتِ خدا بنتے ہیں، بعض والدین استبدادی ربوبیت کرتے ہیں، بچوں کو سانس نہیں لینے دیتے ہیں، ہمیشہ بچوں کے سر پر کوڑا لٹکائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو ادب ہم سکھائیں گے اور تربیت بھی کریں گے، بعض والدین کی دوستی کی ربوبیت ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ گھل مل کر دوست بن جاتے ہیں اور بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور بھی گونا گوں اقسام ہیں۔

خدا کی ربوبیت رحمانی ہے

استبدادی تربیت یافتہ انسان کا مزاج بھی الگ ہوتا ہے، دوستی کی مدیریت کے اندر تربیت یافتہ یا ربوبیت کے اندر تربیت یافتہ انسان الگ ہوتا ہے، بچوں کو دیکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ کس ماحول سے آیا ہے؟ اس کے گھر کا ماحول کیسا تھا؟ اس کے والدین کیسے تھے؟ لیکن ربوبیتِ خداوند تبارک و تعالیٰ ربوبیتِ قہاریت نہیں ہے باوجودیکہ ذاتِ خدا قہار ہے، خدا کی صفاتِ جلالیہ بھی ہیں لیکن خداوند تبارک وتعالیٰ کی ربوبیت جلالی نہیں بلکہ جمالی ہے یعنی عالمین کی تدبیر رحمت، رحیمیت، رحمانیت، جمال، کرم اور کریمیت سے ہو رہی ہے،

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۵)

اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے کریم پروردگار کے بارے میں دھوکے میں رکھا؟

۵)خدا کا غضب بھی بغیر رحمت کے نہیں

اگرچہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی بہت ساری صفات ہیں لیکن غالب صفات رحم وکرم پر مشتمل ہیں لہٰذا غضب بھی ہے لیکن خدا کی مدیریت، مدیریتِ غضبیہ نہیں ہے، عالمین کو خدا نے غضب سے تدبیر نہیں کیا ہے یا غضب کی ربوبیت انجام نہیں پا رہی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ایک لمحے کیلئے بھی اگر خدا کا غضبِ خالص نازل ہو جائے تو ہر چیز نابود ہو جائے گی۔ غضبِ خالص یا غضبِ محض خدا کی طرف سے کبھی بھی نازل نہیں ہوتا ہے حتیٰ دشمنان پر، حتیٰ شیطان پر اور حتیٰ کسی اور پر چونکہ سب مخلوقِ خدا ہیں، اپنی مخلوق پر تو خالق کبھی بھی غضبِ محض نہیں کرتا ہے مثلاً جس طرح سے والدین بچے پر غضبناک ہوتے ہیں تو وہ غضبِ محض نہیں ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہوتی ہے کہ بچہ والدین کے غضب کا شکار ہو کر بھی والدین کے ساتھ ہی رہتا ہے، والدین پھر بھی اس کو گلے لگاتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ غضبِ محضِ خالص نہیں تھا، اگر غضبِ محض ہوتا تو ماں اس کو دوبارہ کیوں گلے لگاتی؟ اور جب ماں کا طمانچہ جھیلتا ہے، تھپڑ کھاتا ہے تو اسی تھپڑ کے اندر، طمانچے کے اندر اس کی مہربانی اسے محسوس ہو رہی ہوتی ہے، اگر ہمسایہ آکر تھپڑ مارے تو شاید بچہ اس سے زیادہ تکلیف محسوس کرے لیکن اس سے زیادہ سخت تر ماں مارتی ہے لیکن اتنا چیختا چلاتا نہیں ہے چونکہ ماں کے طمانچے میں مہربانی، شفقت و رافت اور ماں کی ممتا موجود تھی جو اس نے باقاعدہ محسوس کی لہٰذا خدا کے غضب میں بھی رحمت موجود ہے، متعدد دعاؤں اور مناجات میں آیا ہے کہ

يَا مَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ......(٦)

اے وہ ذات کہ جس کے غضب پر اس کی رحمت مقدم ہے......

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ بِالرَّحْمَةِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَکَ......(۷)

اے اللہ میں تجھ سے تیری رحمت کے واسطے سوال کرتا ہوں جو تیرے غضب پر سبقت رکھتی ہے......

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی رَحْمَتِهِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَهٗ......(۸)

اللہ کی تعریف ہے اس رحمت پر جو اس کے غضب پر مقدم ہے......

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهٗ غَضَبَهٗ......(۹)

وہ ذات پاک ہے کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے......

سَبَقَتْ رَحْمَتُکَ غَضَبَکَ......(۱۰)

اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے......

وَاَنْتَ الَّذِیْ تَسْعٰی رَحْمَتُهٗ اَمَامَ غَضَبِهٖ......(۱۱)

تو وہ ہے جس کی رحمت اس کے غضب سے آگے چلتی ہے......

خدا کا غضب کبھی بغیر رحمت کے نہیں

یعنی خدا جب انسان کے اوپر غضبناک بھی ہوتا ہے تو رحمت کے لفافے میں لپیٹ کر غضب نازل کرتا ہے، جن انسانوں پر خدا نے غضب کرنا ہے تو پہلے غضب کو رحمت میں لپیٹتا ہے ورنہ غضبِ محض سے تو یہ نابود ہو جائے، نیست ہو جائے۔ غضب محض سے یہ دنیا، یہ مخلوق خدا تباہ د برباد ہو جائے۔ خالق کبھی بھی رحمت کے بغیر غضب نہیں کرتا ہے۔

۶)آیاتِ رحمت کا اثر

جن اسماء اللہ وصفاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کے ساتھ یہ جہان چل رہا ہے، جب آیاتِ قرآن میں انسان ان پر پہنچتا ہے، آیاتِ رحمت پر پہنچتا ہے، آیاتِ توسیع پر پہنچتا ہے، آیاتِ بشارت پر پہنچتا ہے، آیاتِ نعمت پر پہنچتا ہے تو انسان پر اثر ہو؟ کیسا اثر ہو؟

☆ **یستبشر**......

یعنی انسان خوشحال ہو اور یہ خوشحالی نظر آئے محسوس ہو کہ خوشحال ہے،

☆ **کأنه یطیر من الفرح**......

اتنا خوشحال ہو کہ گویا خوشی سے اُڑ رہا ہے۔ ہم خوشحال کب ہوتے ہیں؟ جب ہماری جیب میں کچھ آتا ہے، قرآن میں آیاتِ نعمت ورحمت وتوسیع پر خوش حال نہیں ہوتے ہیں، جب پیٹ میں کچھ آئے تو خوشحال ہوتے ہیں یعنی ہم نعمتوں پر خوش حال نہیں ہیں یا قرآن کی آیات کے اوپر خوشحال نہیں ہوتے چونکہ ہم پر اثر نہیں ہوتا ہے بلکہ اثر اس وقت ہوتا ہے کہ جب ہماری دنیا یا پیٹ بھرے، اس وقت ہم خوشحال ہو جاتے ہیں یعنی ہماری خوشی شہوانی خوشی ہے، قرآنی خوشی نہیں ہے، روتے بھی ہیں تو تب کہ جب ہماری انا کو ٹھیس پہنچتی ہے، جب ہمیں کوئی تکلیفِ جسمانی ہو تو ہم رو پڑتے ہیں۔

ہم میں عقلانی، الٰہی اور قرآنی غم نہیں ہے، ہم قرآن کے غم میں نہیں روتے ہیں، قرآن پڑھتے ہوئے گریہ نہیں کرتے ہیں، جب اپنا کوئی عزیز مرتا ہے تب گریہ کرتے ہیں یا جب ہمارے احساسات مجروح ہوتے ہیں تو پھر گریہ کرتے ہیں، معرفت سے گریہ نہیں کرتے ہیں، معرفت ہمیں

نہیں رلاتی ہے حالانکہ قرآن مجید نے ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پڑھا کرتے تھے تو بعض قدسیانِ مسیحی آکر قرآن سنتے تھے اور قرآن سن کر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں حالانکہ یہ مسیحی تھے لیکن ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں، کیوں بھر جاتی تھیں؟ اس معرفت کی وجہ سے جو حق کے بارے میں ان کو حاصل ہوئی تھی یعنی یہ معرفت کا رونا تھا، عرفان کا رونا تھا، عرفانی رونا اس کو کہتے ہیں کہ انسان کو معرفت رلائے چونکہ حقیقت کشف ہوگئی ہے، انسان حقیقت کے انکشاف پر روتا ہے، یہ حقیقت انسان کو رلاتی ہے نہ کہ احساسات ابھرے ہیں کہ انسان اس وجہ سے روتا ہے۔

☆ **وعند ذكر صفات الله و اسمائه......**

اور جب اسماء اللہ کا تذکرہ آجائے، قرآن میں جابجا آیات کے اختتام پر یا اثنا و آغازِ آیات میں اسماء وصفاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ فراواں ہیں، جب انسان صفات و اسماء اللہ کی تلاوت و قرأت کر رہا ہو تو پھر ہم پر کیسی کیفیت طاری ہو؟

☆ **يتطأطأ خضوعا لجلاله و عظمته......**

جھک جائے، یتطأطأ یعنی جھک جانا، ختم ہو جانا، عظمت وجلالِ خداوند تبارک وتعالیٰ کے سامنے انسان کے اندر خمیدگی آجائے چونکہ سارے اسماءِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہمیں عظمتِ خدا کا ایک پہلو بتا رہے ہیں، جیسے اس کتاب کی پہلی جلد میں فصل ادبِ پنجم کے حصہ سوم میں اشارہ ہوا تھا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے اسماءِ الٰہیہ کا یہ فلسفہ ذکر کیا ہے کہ یہ ابوابِ معرفتِ خداوند تبارک و

تعالیٰ ہیں، اگر ہم ان اسماء کے دروازے سے گزریں تو ہمیں خدا کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے، اسماء اللہ سے سرسری نہ گزریں، یہ صرف وزن برابر کرنے کے لئے آیات میں ذکر نہیں کیئے گئے، اسماءاللہ کی تاثیر ہے، انسان اسماءاللہ کے سامنے جھک جائے، خضوع کرے۔

مثلاً مذہبیوں کے اندر جیسے مسیحیوں کے اندر یہ اچھا ادب ہے لیکن عادتاً کرتے ہیں، معرفت کے ساتھ یہ کام نہیں کرتے ہیں کہ مسیحی جب بھی مثلاً کوئی مقدس چیز، کوئی حادثہ یا کوئی ایسی چیز کہ جس کے اندر قدرتِ خدا، بزرگیٔ خدا یا کوئی خوشی و غمی کا موقع و منظر ان کے سامنے آئے تو فوراً اپنے سینے پر صلیب بناتے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا یعنی خدا کی یاد میں چلے جاتے ہیں، اب معلوم نہیں کہ اپنے ذہن سے، اپنے تصور سے جاتے ہیں یا پھر ان کا مذہب انہیں کہتا ہے، مسلمانوں کے اندر البتہ مسلمانوں میں بھی برصغیر میں ہندوستان و پاکستان میں جب کوئی مقدس نام آجاتا ہے مثلاً جب اذان ہو رہی ہوتی ہے اور اس میں شہادتِ نبوتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے تو عموماً آپ نے عام مسلمانوں کے اندر دیکھا ہوگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سن کر فوراً اپنا ہاتھ چوم لیتے ہیں، وہ صلیب بناتے ہیں اور یہ اس طرح سے کرتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ کیوں کرتے ہیں اور اس کی تفسیر کیا ہے؟ لیکن یہ ایک ادب ہے کہ جو بجالاتے ہیں، عادتاً کریں پھر بھی اچھی چیز ہے لیکن اگر یہ معرفت کے ساتھ ہو یعنی بے ساختہ انسان سے یہ حرکت سرزد ہو جائے، صرف اس وجہ سے کہ انسان نے عظمتِ خداوند تبارک و تعالیٰ کو دیکھا ہے یا کوئی مقدس چیز دیکھی ہے، جیسے بعض لوگ حرم کو دیکھتے ہیں تو سینے پہ ہاتھ رکھ کر خضوع و ادب سے جھک جاتے ہیں، عادتاً کریں تو اس کا فائدہ نہیں ہے۔

۷)ہر عبادت کی بنیاد معرفت ہے

بعض چیزیں ہماری عادت ہوگئی ہیں، اگر کوئی عبادت کریں تو معرفت کے ساتھ کریں، زیارتِ حضرتِ بی بی معصومہ علیہا السلام میں آیا ہے اور حضرت معصومہ علیہا السلام کے حرم کے اوپر بھی درج ہے کہ جو بھی حضرت معصومہ علیہا السلام کی زیارت معرفت کے ساتھ کرے،

مَنْ زَارَهَا عَارِفاً بِحَقِّهَا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ......

جو شخص اس معرفت کے ساتھ (بی بی معصومہ قم علیہا السلام کی) زیارت کرے گا اس کے لئے جنت واجب ہے......

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی حدیثِ مبارک ہے کہ

مَنْ زَارَهَا عَارِفاً بِحَقِّهَا فَلَهُ الْجَنَّةُ......(۱۳)

جو شخص اس معرفت کے ساتھ (بی بی معصومہ قم علیہا السلام کی) زیارت کرے گا اس کی جزا بہشت ہوگی۔

یعنی جو بھی اس بی بی علیہا السلام کی زیارت کرے تو عارفانہ کرے، معرفت کے ساتھ کرے، ہر کام میں بنیاد معرفت ہے،

أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ......(۱۴)

اولِ دین اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے......

دین کا آغاز معرفت خداوند تبارک وتعالیٰ سے ہے،

ہر عبادت کی بنیاد معرفت ہے

وَمَنْ نَظَرَ اِلَى الْكَعْبَةِ عَارِفاً بِحَقِّهَا غفَرَ اللّٰهُ لَهُ ذُنُوبَهُ وَكَفٰى مَا أَهَمَّهُ...... (۱۵)

جو شخص کعبہ کی طرف نظر کرے اس حال میں کہ وہ کعبہ کی معرفت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اس کے اہم امور کے لئے کافی ہوگا......

لہٰذا جو بھی معصومین علیہم السلام کے حرم میں جائے لیکن

عَارِفاً بِحَقِّهَا......

معرفت کے ساتھ ان کی زیارت کرے تو اس کے اوپر آثار مترتب ہوتے ہیں، جب انسان معرفت کے ساتھ یہ سب کچھ کرے تو وہ سارے آثار انسان کو حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح سے جب اسمائے جلیلہ الٰہی سنتے ہیں تو ایک ادب یہ ہے کہ جب بھی انسان اللہ تعالیٰ کا نام سنے تو ادب کے ساتھ جلّ جلالہٗ کہے، بعض مؤدب مسلمان یہ کام کرتے ہیں کہ جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی اسمِ شریف آجائے تو فوراً زیرِ لب جلّ جلالہٗ کہہ دیتے ہیں بسا اوقات دوسرا سن بھی لیتا ہے۔

ائمہ اطہار علیہم السلام کا نام آجائے، انبیاء علیہم السلام کا نام آجائے تو وہ ادب کے ساتھ آداب ادا کرتے ہیں، عادتاً کریں تو فائدہ نہیں ہے لیکن معرفت کے ساتھ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہو تو اس سے بڑی عبادت کوئی بھی نہیں ہے،

قَالَ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَنْ أَتَى الصَّلَاةَ عَارِفًا بِحَقِّهَا غُفِرَلَهُ...... (۱۶)

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں! جو کوئی نماز کو اس کے حق کی معرفت کے ساتھ بجالائے وہ بخشا جائے گا......

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ

هٰذِهِ الْفَرِيضَةُ مَنْ صَلَّاهَا لِوَقْتِهَا عَارِفًا بِحَقِّهَا لَا يُؤْثِرُ عَلَيْهَا غَيْرَهَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بَرَاءَةً لَا يُعَذِّبُهُ...... (۱۷)

یعنی اگر کوئی شخص اس فریضۂ نماز کو اس کے وقت میں اس طرح سے ادا کرے کہ وہ اس کے حق کی معرفت رکھتا ہو اور کسی دوسری چیز کو اس پر اہمیت نہ دے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں برائت لکھ دے گا کہ اسے عذاب نہیں دے گا......

معرفت کے ساتھ کریں، چونکہ انسان متاثر ہو رہا ہے، یہ اسم انسان کے اوپر اپنا اثر چھوڑ رہا ہے اور انسان اس سے متاثر ہو رہا ہے لہٰذا خضوع کے ساتھ جھک جائے، جھکنا بھی ضروری نہیں ہے کہ فقط جسمانی طور پر جھک جائے یعنی حالتِ رکوع یا حالتِ سجود میں چلا جائے بلکہ روحِ انسان جھک جائے، خضوع آجائے، انسان کے اندر کوچکی آجائے.

انسان خداوند تبارک وتعالیٰ کے سامنے احساسِ حقارت کرے، جھک جانے سے یہی مراد ہے، جیسے انسان ایک بڑی شخصیت کے سامنے جھک جاتا ہے یعنی تسلیم ہو جاتا ہے، ملائکہ علیہم السلام جو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھکے تو یوں نہیں کہ فقط جسمانی طور پر جھکے کیونکہ ملائکہ کا جسم نہیں ہے کہ انہوں نے ساری پیشانیاں زمین پر رکھ دیں، یہ واقعہ زمین پر رونما نہیں ہوا، زمین پر اترنے سے پہلے

یہ سجدہ ہوا یا وہ شرائط جو انسان سجدے میں پوری کرتا ہے ملائکہ وہ شرائط کس طرح پوری کریں؟ کیونکہ ملائکہ کے تو گھٹنے نہیں ہیں، ملائکہ کے انگوٹے نہیں ہیں، ملائکہ کی ہتھیلیاں نہیں ہیں، ملائکہ کی پیشانیاں نہیں ہیں، پھر یہ سجدہ انہوں نے اس طرح کیا ہوگا جیسے ہم سجدہ کر رہے ہیں؟ مولانا روم کے بقول

کار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر ......(۱۸)

پاک ہستیاں اور پاک موجودات کو اپنے اوپر مقایسہ نہ کرو، یہ خیال نہ کرو کہ وہ بھی ہماری طرح یہ سارے کام کرتے ہیں، اس طوطے کی طرح کہ جس نے گنجے کو دیکھ کر کہا تھا کہ کیا آپ نے بھی تیل گرایا ہے، یہ نہ ہو کہ جہاں بھی سجدے کا ذکر آئے تو ہم یہ سمجھیں کہ ہماری طرح ہی سجدہ کیا ہوگا، انہوں نے رخ کدھر کیا تھا؟ قبلہ اس وقت کدھر تھا؟ سجدے کا لغوی معنیٰ یا سجدے کا اصلی معنیٰ خضوع ہے، جھکنا ہے، اگر انسان قلبی طور پر کسی کے سامنے جھک جائے تو یہی سجدہ ہے، بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں ملائکہ خلیفۂ خدا کے سامنے خاضع ہیں، جھکے ہوئے ہیں، جھکنا یعنی اس کی بڑائی، اس کی بزرگی اور اس کی حیثیت کو تسلیم کر لینا، مان لینا، اس کے سامنے جھکنا یعنی میں غرور و تکبر نہیں مانتا، جھکنے کے مقابلے میں ڈٹنا ہے، میں ڈٹ جاتا ہوں، نہیں مانتا ہوں، تکبر اور غرور اس کو کہتے ہیں۔

۸)گستاخ افراد کے اقوال پر مشتمل آیات کا اثر

☆ و عند ذکر الکفار مایستحیل علیه......

قرآن نے کفار کی زبان سے جاری ہونے والی سخت باتیں بھی ذکر کی ہیں، کفار و مشرکین و نادان و نافہم لوگ خداوند تبارک وتعالیٰ کی طرف بہت ساری چیزیں منسوب کرتے ہیں، کبھی خدا کی طرف معاذ اللہ اولاد کی نسبت دیتے ہیں، کبھی خدا کی طرف زوجہ کی نسبت دیتے ہیں، کبھی اولاد کی نسبت دیتے ہیں، کبھی جسمانیت کی نسبت دیتے ہیں اور وہ چیزیں جو شایانِ شانِ خدا نہیں ہیں، محال ہیں ان کی طرف نسبت دیتے ہیں، قرآن خداوند تعالیٰ کے لئے ایسے امور جب کفار و مشرکین اور نادان و جاہل افراد کی زبانی نقل کرتا ہے تو وہاں پر کیا ہونا چاہئے؟

☆ یغض صوته......

یہاں پر صوت یعنی انسان کی آواز دھیمی ہو جانی چاہئے، کس سے؟ شرم و حیا سے، انسان کو شرم آنی چاہئے، اگرچہ بات کوئی اور کر رہا ہو، بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ با معرفت انسان ناگفتہ بات پر شرمسار ہو رہا ہوتا ہے، آپ نے دیکھا بھی ہوگا کہ بالفرض آپ کا ایک بیوقوف دوست ہے، وقوفوں کو دوست نہ بنائیں، فرض کرلیں کہ آپ کا کوئی بیوقوف دوست ہے اور آپ اس کو کسی مجلس و محفل میں یا درس میں لے کر چلے گئے اور یہ درس میں یا مجلس و محفل میں اٹھ کر بول پڑا، اٹھ کر اس نے بیوقوفی کی باتیں شروع کر دیں تو آپ شرم سے جھک جاتے ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ میں شرم سے پانی پانی ہو رہا ہوں، بول وہ رہا ہے شرمسار آپ ہو رہے ہیں اور اس پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے، بیوقوف کی

بیوقوفی پر اگر عقلمند شرمسار ہو رہا ہے تو یہ عقل کی علامت ہے، یہ خوب شرم ہے، یہیں پہ شرمسار ہونا چاہیے، بعض اوقات ہوتا ہے کہ اوٹ پٹانگ کوئی کر رہا ہوتا ہے، کوئی بول رہا ہوتا ہے اور شرم کسی اور کو آرہی ہوتی ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ جن لوگوں کا شعور زیادہ ہو وہ ہی کسی کی جہالت پر شرمندہ بھی ہوتے ہیں، شعور کی ایک علامت یہ ہے کہ بے شعوروں پر باشعور کو زیادہ شرم محسوس ہوتی ہے، ہر جگہ اس کو شرم و حیا محسوس ہوتی ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرئیل کے مطالبے پر اتنی شرم محسوس ہوئی کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے کہا کہ

نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً...... (۱۹)

یعنی ہم خدا کو آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام خدا کے سامنے اس قدر شرمسار ہوئے کہ پانی پانی ہو گئے کہ میری قوم یہ کیا کہہ رہی ہے؟ حقیقت ایسے ہی ہے، مثلاً فرض کریں کہ جن طبقات سے ہم منسوب ہیں مثلاً ایک مسلمان کوئی بے ہودہ کام کرتا ہے تو ہمیں شرم آتی ہے یا کوئی بھی شیعہ اگر اس دنیا میں غلط کام کرتا ہے تو ہمیں شرم آتی ہے اور حقیقتاً شرم آنی چاہیے کیونکہ شیعہ اور غلط کام کرے یا فرض کریں کہ اگر ہم پاکستانی ہیں اور ایک پاکستانی غلط کام کرتا ہے تو ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے۔ کوئی بھی ہو، کسی جگہ بھی ہو، دنیا کے کسی نقطے پر اگر ایک غلط کام کرتا ہے تو انسان کو شرم محسوس ہوتی ہے، جب کوئی جرنیل ذلت پہ اتر آئے اس کی ذلت سے تمام پاکستانیوں کو شرم آنی چاہیے کہ جن کے اندر شعور موجود ہے اور ان کو شرم آتی بھی ہے، جس طرح سے وہ ذلت پہ اتر آئے اور جو کچھ کر آئے اور اس کے ساتھ دوسرے ذلیل طبقات، افراد اور پارٹیاں وغیرہ قوم و ملک و دین و امت کو

ذلت کی جن اتھاہ گہرائیوں کے اندر پھینک رہے ہیں یہ سب شرم آور چیزیں ہیں، شرم انبیاء علیہم السلام کا شیوہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لوگ بسا اوقات ایسی بے ہودہ باتیں کرتے تھے یا حضرتؐ کو ایسی باتیں کسی سے معلوم ہوتی تھیں تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود خدا کے سامنے شرمسار ہوتے تھے، قرآن جب کفار و مشرکین و نافہم و نادان افراد کی باتیں نقل کرتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کہا کرتے تھے تو اس وقت ہمیں بھی شرم آئے۔ شرم سے انسان کی آواز دھیمی ہو جاتی ہے۔

☆ و ینکسر فی باطنه حیاء من قبح مقالتهم......

انسان اپنے باطن میں ٹوٹ جاتا ہے، مُنقَضِبْ ہو جاتا ہے، انسان کے اندر عاجزی آجاتی ہے، انکسار و فروتنی ذاتی ہے، کیوں؟ شرم کی وجہ سے کہ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ حقیقتاً ایسے ہی ہونا چاہئے، ہم یہ کیوں نہ کہیں کہ اپنی بات پر بھی شرم آنی چاہئے، اپنے غلط اعمال پر بھی ہمیں شرم و حیا آنی چاہئے۔

حیا، حیات سے ہے، اگر انسان کا دل مرا ہوا نہ ہو تو اس کے اندر حیا ہوتی ہے، اگر کسی متدین آدمی کی ناموس، بہن، بہو یا بیٹی بے حجاب بازار میں چلی جائے یا باہر چلی جائے تو مرد کو شرم آتی ہے لیکن یہ شرم کب آتی ہے؟ جب اس کے اندر حیا ہو، حیا اس وقت ہوتی ہے کہ جب اندر حیات ہو، حیات اس وقت ہوتی ہے کہ جب دل و ضمیر زندہ ہو، جس کا ضمیر ہی مر گیا ہو، جس کا دل ہی مر گیا ہو تو اس کی بیوی، بیٹی اگر فحش طریقے سے بھی بازار میں گھومتی رہے تو اس کو کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی ہے، کیوں؟ کیونکہ حیا نہیں ہوتی ہے، اس کے اندر حیا کیوں نہیں ہوتی؟ چونکہ اس کے اندر حیات

نہیں ہوتی، اس انسان کا دل مرا ہوا ہے، ضمیر مرا ہوا ہے۔ بقول اکبر آلہ آبادی کے کہ جب مرد کی حیا مرتی ہے، مرد کا دل، ضمیر اور غیرت مرتی ہے تو اس وقت اس کی ناموس بے حیا ہو کر باہر آجاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بقول

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اگر مرد کی عقل نہ مرے، شوہر، باپ اور بھائی کی غیرت نہ مرے تو کبھی بھی ناموس بازار میں بے حجاب و بدحجاب نہیں آتی ہے۔ حیا، حیات سے ہے، زندگی سے ہے، دل و ضمیر زندہ ہو تو انسان میں حیا ہوتی ہے ورنہ حیا ختم ہو جاتی ہے، یہ علامتِ حیا ہے کہ جب ہم قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن کے اندر جب خدا کے بارے میں، اولیائے خدا کے بارے میں کفار سے منسوب باتیں نقل ہوتی ہیں تو انسان کو شرمسار ہونا چاہئے چونکہ ہمارا تعلق بشریت سے ہے اور جیسے کہا کہ اگر کوئی مسلمان غلط کام کرتا ہے تو ہمارا سر ندامت سے جھکنا چاہئے اور واقعاً شرم سے جھکے کہ ایسا کیوں ہے؟

ہمارا تعلق نوعِ بشر سے ہے، اگر اس زندگی میں زمین پر کوئی جنایت کرتا ہے، ظلم کرتا ہے، جیسے بش واوباما مایۂ شرمساریٔ نوعِ بشر ہیں، اس وقت یہ جنایت کار عراق میں، لبنان و فلسطین میں جو کچھ کر رہے ہیں اگر بشریت کے اندر شرم ہو حیا موجود ہو تو اس پر تمام بشریت کا سر جھکنا

گستاخ افراد کے اقوال پر مشتمل آیات کا اثر

ضروری ہے لیکن چونکہ دنیا کی زمین مردہ ہے اور جو تھوڑے لوگ زندہ تھے وہ میڈیا (Media) نے مار دیئے ہیں یا دوسرے زہروں نے مار دیئے ہیں، اس وجہ سے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے، ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے، شرم آنا انسان کے دل، حیات و زندگی اور انسانیت کی دلیل ہے۔

۹) جنت کے ذکر کا انسان پر اثر

☆ وعند ذکر الجنة......

اور جب جنت کا تذکرہ آئے،

☆ ینبعث من باطنه شوقاً الیها......

جب جنت کا ذکر آئے تو انسان کے اندر شوق پیدا ہو، طلب پیدا ہو، اس طرف جانے کے لئے رغبت ورجحان وسعی پیدا ہو، نہ کہ صرف خالی آرزو پیدا ہو، بسا اوقات ہوتا ہے کہ انسان کسی اچھی چیز کا تذکرہ کرتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ یہ میرے پاس ہو، رغبت پیدا ہوتی ہے، رغبت یعنی کوشش عملی، سعیِ عملی کہ انسان اس کی طرف اٹھ کر عمل کرے، حرکت کرے اور اس طرف قدم اٹھائے۔ شوق انسان کو بیٹھنے نہیں دیتا ہے، شوق میں اور آرزو میں بڑا فرق ہے، آرزوئیں بہت ہوتی ہیں، اس کو امل کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں اپنی امت کیلئے جن دو چیزوں سے بہت زیادہ پریشان ہوں، خوفزدہ ہوں ان میں سے ایک لمبی آرزوئیں ہیں، آرزوئیں تو انسان کی بہت ہیں لیکن

شوق کم ہے، ہمارے اندر انہی آرزوؤں کے بارے میں شوق نہیں ہے چونکہ شوق انسان کو اٹھاتا ہے، حرکت دیتا ہے اور ارادہ بناتا ہے پھر انسان کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے باطن کے اندر اس جنت کی طرف شوق ہے۔

۱۰) جہنم کے ذکر کا انسان پر اثر

☆ وعند وصف النار ترتعد فرايصه خوفا منها......

فرایصہ، فریصہ کی جمع ہے، فریصہ پہلو کو کہتے ہیں، بسا اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو صرف آنسوؤں سے روتے ہیں، یہ بھی ایک نوعِ رونا ہے یعنی کنٹرول کا رونا ہے کہ ایک انسان رو رہا ہے اور آنسو گر رہے ہیں لیکن باقی کوئی حرکت نہیں ہے، نہ چہرے کی نہ سر کی، یہ رونا تھوڑا رونا ہے یعنی ابھی کیفیت یا احساسات اتنی شدت سے طاری نہیں ہوئے ہیں بلکہ صرف آنسو ٹپکا رہے ہیں لیکن انسان بسا اوقات اس طرح سے روتا ہے کہ پورا بدن ہل جاتا ہے اور آواز کے ساتھ روتا ہے، جب انسان شدید گریہ کرتا ہے تو انسان کے پہلو کانپنے اور ہلنے لگتے ہیں، آپ نے دیکھا بھی ہوگا، آپ کئی دفعہ ایسے روئے ہوں گے چونکہ رونے کی حالت میں توجہ نہیں ہوتی ہے لیکن انسان کے پہلو لرز رہے ہوتے ہیں، ان پہلوؤں کو کہ جو روتے ہوئے لرزتے ہیں فریصہ کہتے ہیں، ترتعد یعنی کانپیں، انسان اس طرح سے کانپنے لگے، پہلو بازوں نے بھی کہا ہے کہ یہ جو سینے، کندھے اور پسلیوں کا درمیانی حصہ ہے اس کو فرائص کہتے ہیں، جب انسان روتا ہے تو یہ حصہ زیادہ کانپتا ہے۔

لہٰذا جب جہنم کا ذکر آجائے، نار کا ذکر آجائے، سختی خدا کا ذکر آجائے، خدا کی ناراضگی کا ذکر آجائے، غضبِ خدا کا ذکر آجائے تو انسان روئے اور اس طرح سے روئے کہ اس کے پہلو کانپنا شروع ہو جائیں۔

۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرآن سے اثر لینے کی کیفیت

☆ ولما قال رسول الله صلی الله علیه و آله لعبد الله ابن مسعود:......

وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا ہے، جن کا دل محلِ نزولِ قرآن ہے وہ خود آکر اپنے ایک شاگرد کو کہتے ہیں کہ مجھے قرآن سناؤ، عبد اللہ ابن مسعود صحابہ میں سے ہیں، علمی لحاظ سے برجستہ شخصیت ہیں، حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کہا کہ

☆ اقرا علی......

میرے لئے قرآن پڑھو، قرائت کرو، میرے لئے کوئی آیہ یا سورہ پڑھو،

☆ قال: افتتحتُ سورة النساء......

کہتے ہیں کہ میں نے سورہ نساء پڑھنا شروع کردی،

☆ فاذا بلغت الی قوله:......

پڑھتے پڑھتے جب میں سورہ نساء میں یہاں پہنچا کہ

☆فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاءِ شَهِيْدًا۝ (۲۰)

اس وقت کیا ہوگا جب ہر امت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور پیغمبر آپؐ کو ان سب کا گواہ بنا کر بلائیں گے۔

اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ......

ہر امت کا شہید، شہید یعنی گواہ، معرکۂ حق و باطل کا مقتول بھی شہید کہلاتا ہے چونکہ یہ گواہِ اعمالِ امت ہے اور وہ گواہِ اعمالِ قاتلین ہے، شہید دونوں کی گواہی دے گا کہ میرے ساتھی کون ہیں ؟ اور میرے دشمن کون ہیں؟ مجھے کیوں مارا گیا؟ کن کی رقابت میں مارا گیا؟ اور مجھے کن کے رکاب میں مارا گیا؟ اسی لئے شہید بھی اعمالِ امت کا گواہ ہے، تمام امتوں کے شہداء کو حاضر کیا جائے گا، گواہوں کو حاضر کیا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گواہوں کا گواہ بنایا جائے گا، عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ آیت پڑھی،

☆ رایت عینیه تذرفان بالدمع......

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آنکھوں کو دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آنکھوں میں ایک چشمے کی طرح آنسو امنڈ آئے اور پھر بہہ نکلے۔

تذرفان امنڈ کر بہنے کو کہتے ہیں، پانی جب امنڈتا ہے اور پھر بہنا شروع ہو جائے تو اس کو تذرفان کہتے ہیں، آپؐ کے آنسو بہنے لگے اور وہی حالت ہوگئی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پہلو کانپنے لگے،

☆ فقال لی: حسبک الان......

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بس اب اس سے آگے نہیں پڑھنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں فرمایا کہ کافی ہے یہاں سے آگے نہیں پڑھنا؟

☆ و هذا لان مشاهدة تلک الحال......

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت سنی تو فقط سامع نہیں تھے، اجنبی نہیں تھے بلکہ قرآن کا مضمون حالت بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چھا گیا، طاری ہو گیا،

☆ استغرقت قلبه بالکلية......

اس حالت نے تمام قلب کو لپیٹ لیا، پارۂ دلِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حالت نے لپیٹ لیا،

☆ ولقد کان فی الخائفین من خر مغشیاً علیه عند آیات الوعید......

اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گریہ اتنا شدید ہوا، فرماتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی نمونے موجود ہیں، بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب ان پر عذاب و جہنم و وعید اور دھمکی کی آیات پڑھی جاتی تھیں تو وہ غشی میں آجاتے تھے، بے ہوش و مدہوش ہو کر گر جاتے تھے،

☆ ومنهم من مات فی سماع تلک الایات.......

اور بعض تو ایسے تھے کہ جب ان پر یہ آیات تلاوت کی گئیں تو وہیں پر مر گئے، ان کی روح نکل گئی، ہمام بن شریح انہی میں سے ہیں، امام المتقین مولا علی علیہ السلام نے تقویٰ بیان کیا، متقین کی صفات بیان کیں، اوصافِ متقین کو قرآن سے ذکر کیا تو ہمام اس دنیا سے گزر گئے،

☆ فينبغي لتالي القرآن ان يتصف ذاته بمثل هذه الاحوال......

تالیٔ قرآن، قاریٔ قرآن، قرآن شناس اور قرآن خوان کو اس طرح سے قرآن پڑھنا چاہیے کہ مضامینِ قرآن و معانیٔ قرآن کو اپنی صفت بنائے نہ کہ فقط مفہوم بنائے، یہ حالات و صفات بنیں اور انسان ان صفات سے متصف ہو۔

۱۲)فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ متحققِ قرآن بنیں

فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ متحققِ قرآن بنیں

☆ حتی یخرج عن ان یکون حاکیاً فی کلامه......

یعنی قرآن کی صفات اور حالات سے متحقق ہوتا کہ حاکیٔ قرآن نہ بنے، فقط قاری نہ بنے، حاکی یعنی راوی، کمنٹیٹر (Commentator) نہ بنے، ابھی ہم قرآن کے کمنٹیٹر ہیں، فقط کمنٹری کرتے ہیں یعنی ایک آدمی ایسے قرآن پڑھ رہا ہے کہ جیسے کمنٹری نشر کر رہا ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ہم کمنٹیٹر نہ بنیں، قرآن کے فقط حاکی اور راوی نہ بنیں کہ قرآن میں یہ یہ لکھا ہے مثلاً جیسے ہم ایک خط پڑھتے ہیں، کوئی پوچھے کہ کیا لکھا ہوا تھا تو پڑھ کر سنا دیتے ہیں کہ اس نے یہ لکھا ہوا تھا، آج اخبار میں یہ لکھا ہوا تھا، آج فلاں کتاب میں یہ لکھا ہوا تھا، ہم حاکی اور راوی ہیں، قرآن راوی نہیں مانگتا ہے، قرآن کو حاکی و مخبر و رپورٹر نہیں چاہیے، قرآن کو وہ انسان چاہیے کہ جو قرآن اور قرآنی صفات سے متصف ہو، جن کے اندر قرآنی صفات حالات بن کر راسخ ہو جائیں،

☆ فاذا قال: انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم......

قُلْ اِنِّی أَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍo(۲۱)

کہہ دیجئے کہ میں گناہ کروں تو مجھے بڑے سخت دن کے عذاب کا خوف ہے۔

جب انسان سورۂ مبارکہ انعام اور زمر میں اس آیہ کی تلاوت کرتا ہے اور خوف زدہ نہیں ہوتا،

☆ فاذا لم یکن خائفا کان حاکیا......

یہ آیت تو پڑھ رہا ہے لیکن خوف زدہ نہیں ہے لہٰذا اگر خائف نہیں ہے تو پھر فقط حاکی و راوی ہے۔ بعض لوگ اسی طرح پڑھتے ہیں مثلاً ان کے لئے رلانا ایک ہنر ہے، بعض کیلئے مصائب پڑھنا ایک فن ہے اور لوگوں کو خوب رلاتے ہیں، بعض تو کہتے ہیں کہ ہم تو پتھر سے بھی آنسو نکال دیتے ہیں تم تو پھر بھی انسان ہو، اس لئے کہ ان کو مہارت ہے اور ان کے پاس فن ہے، جو جھوٹ انہوں نے رٹا ہوا ہوتا ہے اور اگر رٹا نہیں ہوتا ہے تو فوراً اسی وقت بنا بھی لیتے ہیں، کہتے ہیں شمر کسی اسی طرح سے پڑھنے والے کے خواب میں آیا کہ جس نے مجلس پڑھی تھی، شمر نے خواب میں آ کر اس کے سر پہ قرآن رکھ کر کہا کہ قرآن کی قسم کھا کر کہہ دو کہ میں نے اتنا ظلم کیا تھا کہ جتنا تو نے پڑھا ہے؟ یہ چیلنج نہیں ہوا ہے، آپ لوگوں کے سامنے مصائب پڑھیں، اگر کسی کی آنکھوں کو خدا نے توفیق دی ہوئی ہے تو رو پڑے گا، رونا لوگوں کا کام ہے نہ کہ ہمارا کام زبردستی رلانا ہے، آپ کا کام یہ ہے کہ صرف پڑھ دو، توفیق ہوئی تو رو لے گا اور نہیں رونا ہوا تو نہیں روئے گا، آپ کا کام ہے دعوت دینا، قبول کرنا اس کا کام ہے یا مثلاً اگر کوئی لطیفہ سنانے والا ہے تو اس کا کام فقط لطیفہ سنانا ہے، کوئی ہنسا تو ٹھیک ہے

فقط حاکیٔ قرآن نہ بنیں بلکہ محقق قرآن بنیں

نہیں ہنسا تو نہیں ہنسا لیکن شعبدہ بازوں اور جوکرز کیلئے یہ چیلنج ہوتا ہے کہ اگر لوگ نہیں ہنسے یا یہ نہیں ہنسا سکے تو پھر یہ ناکام ہو جاتے ہیں اور تنخواہ نہیں ملتی ہے۔

بسا اوقات کچھ لوگوں کیلئے رلانا پیشہ ہوتا ہے، جب رلاتے ہیں اور خوب دھاڑیں مار مار کر لوگ رو لیتے ہیں تو ایک ہلکا سا تبسم ان کے لبوں پر آ جاتا ہے چونکہ اس وقت لوگ رو رہے ہوتے ہیں اور ان کے چہروں کو نہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، بعد میں فلم دیکھیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے دل میں کیا تھا؟ یعنی میں نے رلا دیا، میں نے مجمع کی دھاڑیں نکال دیں، مصائب سید الشہداء علیہ السلام کے پڑھ رہا ہے اور خود ہنس رہا ہے، کیوں؟ کیونکہ راویٔ مصائب ہے، مصیبت زدہ نہیں ہے، ان مصائب میں خود شریک نہیں ہے، صرف حاکیٔ مصائب ہے، حاکیٔ مصائب کا دل تو نہیں جلتا ہے لیکن جس کے پاس دل ہو اور دل میں درد ہو تو وہ حاکی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اس چیز سے متصف ہوتا ہے، اس چیز سے متحقق ہوتا ہے، اس کے اندر یہ چیز اتری ہوئی اور راسخ ہوتی ہے، فرماتے ہیں کہ قرآن کے حاکی اور راوی نہ بنیں، اگر آیاتِ خوف پڑھیں تو خائف ہونا چاہیئے۔

۱۳) آیاتِ توکل کا انسان پر اثر

☆ و اذا قال: علیک توکلنا و الیک انبنا......

رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَإِلَیْکَ أَنَبْنَا وَإِلَیْکَ الْمَصِیْرُ٥(۲۲)

خدایا میں نے تیرے اوپر بھروسہ کیا ہے اور تیری ہی طرف رجوع کیا ہے اور تیری ہی طرف

بازگشت بھی ہے۔

یہ آیات نمونے کے طور پر ہیں لیکن ہر آیت ایسی ہے، کہتے ہیں کہ جب انسان اس آیت کو پڑھتا ہے کہ اے پروردگار میں نے تجھ پر توکل کیا اور میں نے تیری طرف رجوع کیا،

☆ **ولم یکن حالہ التوکل والانابۃ کان حاکیا......**

لیکن دوسری طرف سے توکل بھی نہیں ہے تو یہ راویٔ توکل ہے، نہ کہ متوکل انسان ہے۔

خدا پر توکل نہ ہونے کی علامتیں ہیں، توکل کے مقابلے میں گلہ شکوہ اور فریادیں ہیں کہ اِس کے پاس جانا، اُس کے پاس جانا، اِس کو مشکل بیان کرنا، اُس کو مشکل بیان کرنا، اِدھر بھی چڑھاوے چڑھانا، اُدھر بھی سفارش کرانا اور رشوت بھی دینا پھر کہتا ہے کہ میں خدا پر توکل کرتا ہوں۔

نقل کیا گیا ہے کہ ایک مسیحی راہب سے لوگوں نے آکر کہا کہ بارش نہیں ہوتی ہے آپ دعا کریں کہ بارش ہو، اس نے کہا کہ کل سب شہر سے باہر صحرا میں آجاؤ، جس طرح ہمارے یہاں نمازِ استقاء ہے، ان کے ہاں دعائے استقاء ہے یعنی طلبِ باران کی دعا، لوگ آگئے اور ساری امت بارش کے لئے دعا کرتی ہے، اس مسیحی راہب نے لوگوں سے کہا کہ واپس چلے جاؤ، لوگوں نے پوچھا کہ کیوں؟ کہا اس لئے کہ تم اس دعا پر کوئی ایمان واعتقاد نہیں رکھتے ہو، لوگ کہنے لگے کہ کیسے پتہ چلا کہ دعا پر اعتقاد نہیں ہے؟ کہا اس لئے کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے ساتھ چھتری لے کر نہیں آیا ہے، اگر تم کو یقین و ایمان ہوتا کہ خدا ہماری دعا سنے گا اور دعا کے بعد بارش ہوگی تو تم واپسی کیلئے بارش کا انتظام کر کے آتے لیکن تم اسی طرح سے آئے ہو کہ جیسے تمہیں خشکی میں ہی واپس جانا ہے۔ توکل اس

طرح سے نہیں ہوتا ہے کہ انسان تو کل بھی کرے اور چھتری بھی ساتھ لے کر نہ آئے، جب تو کل کرنا ہے تو کرنا ہے، اگر پڑھنے کے لئے خدا پر تو کل کر کے آئے ہو تو پھر نہ کہو کہ آغا میں جا رہا ہوں، اُس سے بھی کہو کہ آغا میں جا رہا ہوں، فلاں سے بھی کہو کہ میں جا رہا ہوں آپ میرے لئے کچھ کرنا، اگر اللہ پر تو کل کیا ہے تو پھر اپنے ہاتھ میں چھتری لے لو، چونکہ خدا کبھی بھی تو کل کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا ہے، یہ طے ہے تجربہ کر کے اپنی زندگی میں دیکھ لیں، ہم نے بہت سارے تجربے کئے ہوئے ہیں، ضرر نہیں ہوگا کسی ایک کام میں اللہ پہ تو کل کر کے دیکھیں اور صرف اللہ پر تو کل کریں، کسی غیر اللہ کی طرف رجوع نہ کریں پھر اس صورت میں آپ کو چھتری لینی پڑے گی۔

۱۴)آیاتِ صبر کا انسان پر اثر

☆ واذاقال فلنصبرن علی ما اذیتمونا......

وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَا آذَیۡتُمُوۡنَا......(۲۳)

جو اذیتیں تم ہمیں دے رہے ہو اس پر ہم ضرور صبر کریں گے......

یہ سب باتیں انبیاء علیہم السلام کی زبان سے ہیں، جب انسان اس آیت پر پہنچے تو فرماتے ہیں کہ

☆ فلیکن حاله الصبر علی الاذی و العزیمة علیه......

اگر اذیتوں، پریشانیوں، لوگوں کی باتوں اور ان تکالیف پر صابر نہ ہوں، استقامت نہ کریں، صبر کا معنیٰ سکوت نہیں ہے، صبر یعنی استقامت، اگر ان مشکلات کے مقابلے میں استقامت

نہ دکھائیں تو یہ اس آیت کا فقط حاکی ہے مثلاً راہِ خدا میں جہاد کے لئے نکلے ہو تو پریشانیاں ہیں لہٰذا صبر کرو، اگر تعلیم کے لئے آئے ہو تو پریشانیاں ہیں لہٰذا صبر کرو،

☆ حتی یجد حلاوة التلاوة وفضیلة التدبر و حسن التخلیق......

اگر اس طرح سے ہر آیہ سے متصف ہو، ہر آیہ سے متاثر ہو اور ہر آیہ کے مضمون سے متصف ہو تو انسان کو لذتِ تلاوت و شیرینیِ تلاوت محسوس ہوگی، اسے پائے گا اور وہ تدبر کی فضیلت سے آشنا ہوگا اور تخلق کے حسن سے وزیبائی اور جمال سے بھی آشنا ہوگا۔

۱۵)انسان میں قرآنی صفات پیدا نہ ہونے کا نتیجہ

☆ فان لم یکن بھذہ الصفات......

اگر یہ صفات اس کے اندر پیدا نہ ہوئیں،

☆ ولم یتردد قلبه بین ھذہ الحالات......

اور اگر اس کا دل ان حالات کے اندر آمد و رفت نہیں کر رہا ہے، متردد نہیں ہو رہا ہے، تردد یا تردید شک سے نہیں ہے، تردد یعنی آنا جانا،

☆ کان حظه من تلاوة القرآن حرکة اللسان مع صریح اللعن علی نفسه......

اگر یہ حالات طاری نہیں ہو رہے ہیں اور قرآن پڑھے جا رہا ہے تو پھر قرآن کی زبان سے

انسان اپنے آپ پر لعنت کر رہا ہے، خود لعنت ان چیزوں میں سے ہے کہ جو پلٹ کر آتی ہے، جیسے کھیل میں ایک پلیٹ نما چیز ہوتی ہے کہ جسے ہوا میں گھماتے ہیں اور وہ گھوم کے پھر وہیں آجاتی ہے کہ جہاں سے اس کو پھینکا گیا تھا، آپ نے کبھی دیکھا بھی ہوگا کہ یہ ڈسک (Disk) کی طرح ایک چیز ہوتی ہے کہ جس کو گھما کر ہوا میں چھوڑیں تو ہوا میں گھوم پھر کر پھر وہیں آجاتی ہے کہ جہاں سے اس کو چھوڑا تھا، لعنت بالکل ایسی ہی ایک چیز ہے کہ اگر ایک نا اہل آدمی، ملعون آدمی لعنت کرے تو لعنت وہاں نہیں جاتی ہے کہ جہاں پر اس نے پھینکی ہے بلکہ لوٹ کر اسی شخص کے اوپر آجاتی ہے، بہت ساری لعنتیں وہاں نہیں جاتی ہیں کہ جہاں ہم بھیجتے ہیں بلکہ وہ خود ہماری طرف لوٹ کر آجاتی ہیں، کیوں؟ کیونکہ ان کا مصداق ہم خود ہوتے ہیں مثلاً ایک آدمی ظالمین پر لعنت کر رہا ہے،

☆فی قولہ: أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ٥(۲۴)

لیکن خود ظالم ہے تو یہ لعنت کدھر جائے گی؟ یہ ادھر تو نہیں جائے گی کہ جہاں بھیج رہا ہے بلکہ یہ لوٹ کر اسی کے پاس آجائے گی کہ ظالم یہ خود ہے،

لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ٥(۲۵)

یعنی کہتا ہے کہ خدا جھوٹوں پر لعنت کرے اور جھوٹا یہ خود ہے تو لعنت گھوم کر یہیں پر آجائے گی۔

اسی طرح سے جب انسان قرآن پڑھتا ہے اور یہ حالات طاری نہیں ہوتے ہیں اور قرآن کی اگلی آیات پر پہنچتا ہے کہ جن میں خداوند تعالیٰ نے لعنت کی ہے تو وہ لعنت اسی قاری پر آجاتی ہے،

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۲۶)

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۲۷)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ......(۲۸)

بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے......

یہ خود اس کا نمونہ ہے کہ قرآن کہاں لعنت کرتا ہے؟ مثلاً جب قاری محض تلاوت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ○

تو قرآن اس قاری پر یہاں لعنت کرتا ہے کیونکہ یہ خود ظالم ہے کہ جو قرآن کا حق ادا نہیں کرتا،

☆ وفي قوله:......

یا آیتِ دیگر کہ جس کے اندر اس کی مذمت کی گئی ہے کہ

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ○(۲۹)

اللہ کے نزدیک یہ سخت ناراضگی کا سبب ہے کہ تم وہ کہو جس پر عمل نہیں کرتے ہو۔

سب سے بری چیز کبر مقتاً ہے، مقت بہت ہی بڑی برائی کو کہتے ہیں، ایسی برائی جو تحمل سے باہر ہو، خدا کے نزدیک سب سے بری چیز یہ ہے کہ آپ ایسی چیز کہیں کہ

أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ○

یعنی وہ چیز زبان پر جاری کریں کہ جو خود نہیں کرتے ہیں، یعنی جو حالت ہمارے دل میں نہیں ہے اس کی آیت، اس کی روایت، اس کی حدیث دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے اپنی زبان پر جاری کریں،

☆ وفی قوله: وهم فی غفلة معرضون......

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَo(۳۰)

لوگوں کے لئے حساب کا وقت آپہنچا ہے اور وہ بھی غفلت ہی میں پڑے ہوئے ہیں اور کنارہ کشی کئے جارہے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں، قرآن پڑھ رہے ہیں لیکن غفلت میں ہیں، وہ چیز خود ان کے اندر منتقل نہیں ہو رہی ہے،

☆ وفی قولہ: فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیَاةَ الدُّنْیَاo(۳۱)

لہٰذا جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منہ پھیرے اور زندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے آپ بھی اس سے کنارہ کش ہو جائیں۔

یعنی کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے ذکر سے منہ پھیر لیا ہے اور صرف حیاتِ دنیوی چاہتے ہیں، لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے قرآن بھی پڑھتے ہیں لیکن خود متاثر نہیں ہوتے ہیں،

☆ الی غیر ذلک من الایات......

اس کے علاوہ مذمت کی جتنی آیات ہیں۔ غافل وظالم لوگ جب آیات پڑھتے ہیں ان سے متاثر نہیں ہوتے ہیں، قرآن خود کہتا ہے کہ یہ درست نہیں ہے، بلکہ احادیث کے مطابق خود قرآن ان لوگوں پر لعنت کرتا ہے۔

۱۶)غیر متاثر افراد کیلئے قرآن کیا کہتا ھے؟

☆ و کان داخلا فی مصداق قوله:......

یہ افراد جو متاثر نہیں ہوتے ہیں اور فقط زبان سے تلفظِ قرآن ادا کر دیتے ہیں، قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے کہ

☆وَمِنهُم أُمِّيُّونَ لَا يَعلَمُونَ الكِتَابَ اِلَّا أَمَانِيَّ......(۳۲)

ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے......

یہ امّی ہیں، نادان ہیں، نافہم ہیں اور ان کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے، کتابِ خدا سے ان کو فقط امانی معلوم ہے، امانی یعنی حدس و اندازے اور آرزوئیں،

☆ یعنی التلاوة المجردة......

یعنی فقط تلفظات ہیں، فقط ادائیگی حروف ہے، بہت خوبصورت تلفظ بھی کر لیں لیکن چونکہ خود متاثر نہیں ہوتے ہیں لہٰذا ان کو فقط امانی نصیب ہوئے ہیں،

☆ و فی قوله: وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ٥(۳۳)

اور زمین و آسمان میں بہت سی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزر جاتے ہیں اور کنارہ کش ہی رہتے ہیں۔

یہ تو آیاتِ تدوینی تھیں لیکن کتنی آیات تکوینیٔ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں کہ جو اس زمین و آسمان کے اندر ہیں کہ جن سے ہم اجنبی بن کر گزر جاتے ہیں، منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں اور ان سے متاثر نہیں ہوتے ہیں،

☆ و بالجملة فليكن حاله حال قوم وصفهم الله بقوله:......

بلکہ قرآن پڑھتے ہوئے انسان کی حالت اس قوم کی ہو کہ جس کی توصیف قرآن نے خود کی ہے، جس کی توصیف خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں کی ہے یعنی انسان کی حالت ایسی ہو کہ

☆ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ٥(۳۴)

صاحبانِ ایمان درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کے سامنے ذکر خدا کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا ہو اور اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے اور وہ لوگ اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں۔

یعنی جب خدا کا ذکر اور خدا کا کلام پڑھا جائے تو ان کے دل لرز جائیں، خوف و جل اس خوف کو کہتے ہیں کہ جس سے دل لرز جائے، جس سے بدن کانپ جائے، جب انسان پر ناگہاں ایک خوف طاری ہوتا ہے تو کچھ خوف ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے رنگ اڑ جاتا ہے، کچھ خوف ایسے خوف ہوتے ہیں کہ جن سے بدن لرز جاتا ہے لہٰذا انسان کے اوپر لرزہ طاری ہو جائے، بعض دل ایسے ہیں کہ خوفِ خدا سے ان کے دل لرز جاتے ہیں، اور بعض دل ایسے ہیں کہ جب ان کے اوپر آیاتِ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے توکل میں اضافہ ہو جاتا ہے یعنی ایسا ہونا چاہئے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو انسان پر یوں اثر ہو۔

۱۷) قرآن کا ھدف، انسان کو صفاتِ ربوبیہ سے متصف کرنا

☆ **اذ القرآن انما یراد لاستجلاب ھذہ الاحوال......**

قرآن ان حالات کے جَلْبْ و جذب کرنے کے لئے نازل ہوا ہے، یہ صفات ہمارے اندر پیدا ہوں نہ کہ وہ دوسرے کام اور کرتب جو اس وقت قرآن کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ کہیں اس پر قسمیں کھائی جا رہی ہیں، کہیں اپنے گناہ چھپانے کے لئے قرآن پیش کیا جا رہا ہے، کہیں پر لوگوں کو محظوظ کیا جا رہا ہے، کہیں پر مُردوں کو ایصالِ ثواب پہنچایا جا رہا ہے، کہیں قرآن پر استخارے ہو رہے ہیں، کہیں تعویذ و گنڈے بنائے جا رہے ہیں اور کہیں کیا کیا ہو رہا ہے، قرآن اس لئے نازل ہوا ہے

تا کہ انسان کو متصفِ ربّانی بنا دے یعنی صفاتِ ربوبیہ سے متّصف کردے یعنی مظہرِ صفاتِ خدا بنادے،

تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ......(۳۵)

اپنے آپ کو خدا کے اخلاق میں ڈھال لو......

اور کسی جگہ فرمایا کہ

اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَأْخُذُ بِآدَابِ اللّٰهِ......(۳۶)

بے شک مومن آدابِ خدا کو لے لیتا ہے......

دونوں روایات ہیں، آدابِ خدا سے مؤدب بنو اور اخلاق خدا سے اپنے آپ کو متخلق کرو، اخلاقِ خدا یعنی قرآن مجید،

☆ اذ بهذه الاحوال يزيد القرب والمنزلة عنداللّٰه......

چونکہ ان حالات میں انسان کے اندر قربت حاصل ہوتی ہے یعنی خدا کے نزدیک ان حالات میں قرب و منزلت زیادہ ہوتی ہے، لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ ہینڈ بریک (Handbrake) کھینچ کر اکسلریٹر (Accelerator) دبا رہے ہوتے ہیں، جو ڈرائیور ہیں وہ سمجھتے ہوں گے اور نہیں بھی ہیں تو کسی کو دیکھا ہوگا یا تجربہ کرلیں کہ گاڑی کا ہینڈ بریک کھینچ کے پھر اکسلریٹر دبائیں، دیکھیں کہ کیا اتفاق رونما ہوگا؟ گاڑی کا ہینڈ بریک کہ جو بہت سخت ہوتا ہے اگر اسے کھینچ کر اکسلریٹر دبا رہے ہوں تو گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ اکثر نمازوں میں یہی ہوتا ہے، نمازی نے ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے

قرآن کا ہدف، انسان کو صفاتِ ربوبیت سے متصف کرنا

اور سفرِ قربی کے لئے اکسلر یٹر دبا رہا ہے، ہینڈ بریک کھینچ کے روزہ رکھتا ہے، اِدھر سے ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے اور اُدھر سے دبا کے بھوک کاٹ رہا ہے، افطاری اور سحری دبا کر کر رہا ہے، مناجات کر رہا ہے اور ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے، اس طرح سفرِ قربی طے نہیں ہوتا ہے، آگے ہینڈ بریک کیوں کھینچا ہوا ہے ؟ یعنی چونکہ اندر صفات طاری نہیں ہو رہی ہیں اور تلفظات زیادہ ہیں، قرأت ہے لیکن تدبر و تفکر اور اتصاف نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہینڈ بریک کھینچا ہوا ہے اور اکسلر یٹر دبا رہے ہو، قرب کہاں سے حاصل ہوگا؟ قرب اس وقت حاصل ہو گا کہ اس بریک کو چھوڑ دو، آزاد کردو، فری کردو پھر اکسلر یٹر دباؤ تو سفرِ قربِ خدا طے ہوگا۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ......(۳۷)

اب تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو......

اس طرح قرب حاصل ہوگا۔قرب فقط تلفظات اور ظواہر سے حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ روح سے حاصل ہوتا ہے، یہ چیز ہے کہ جو خدا کی بارگاہ میں انسان کے اندر قرب و منزلت پیدا کرتی ہے،

☆ ومشاهدة جلاله وعظمته......

مشاہدہٴ جلال اور عظمتِ خدا ان چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، احوال سے حاصل ہوتی ہے، یہ فقط تلفظات سے حاصل نہیں ہوتی۔

۱۸)اعلیٰ مرتبۂ معرفت

☆ وهی اشد مراتب المعرفة......

یہ عالی ترین مرتبہ معرفتِ انسان ہے، ایسی معرفتِ عملی کہ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر قربِ خدا پیدا ہو رہا ہو اسی کو معرفت کہتے ہیں،

☆ فالمعرفة هی المبدأ و الغاية......

یہاں پر صاحبِ کتاب کی دوسرے علماء سے ہٹ کر ایک مبنیٰ ہے، ایک بنیاد ہے، جس کی طرف ان کی یہ آخری سطر ناظر ہے، بعض لوگ یہ کہتے کہ عمل اصل ہے اور علم اس کا مقدمہ ہے، یہ فرماتے ہیں کہ معرفت اصل ہے اور عمل اس کا مقدمہ ہے۔ البتہ معرفتیں دو ہیں، ایک معرفت وہ ہے کہ جو انسان کو عمل تک لے آتی ہے اور ایک معرفت وہ ہے کہ جس تک انسان کو عمل پہنچاتا ہے اور یہ قرآن مجید میں بھی ہے، یہ نظر درست تر ہے، یہ نظریہ اس وجہ سے درست ہے کہ قرآن بھی یہی بیان فرما رہا ہے کہ

کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِo لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَo(۳۸)

ہرگز نہیں! کاش تم یقینی علم رکھتے۔ تو تم ضرور جہنم کو دیکھ لیتے۔

یعنی معرفت اور علم و یقین سے انسان کے اوپر یہ حقائق کھلتے ہیں،

وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی يَأْتِيَکَ الْيَقِيْنُo(۳۹)

اور اس وقت تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے جب تک کہ موت نہ آجائے۔

عبادتِ خدا کرو، عبادت عمل ہے لیکن اس کا نتیجہ معرفت ہے، جب معرفت حاصل ہو جائے تو انسان اس دنیا میں بیٹھ کر سارے احوالِ آخرت جان سکتا ہے، فرماتے ہیں معرفت حاصل ہوگی، لیکن کونسی معرفت؟ نہ معرفتِ لفظی، مفہومی وذہنی بلکہ معرفتِ عملی کہ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر یہ حالات واحوال ومقامات پیدا ہوں۔

پس معرفت ہی آغاز ہے اور معرفت ہی انجام ہے، شروع بھی معرفت ہے اور آخر بھی معرفت ہے، دین کل کا کل معرفت ہے، اوّل الدّین معرفتۂ و آخر الدّین معرفتۂ، دونوں معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں،

☆ لانھا......

چونکہ یہ معرفت

☆ عین المعروف بھا......

یہ معرفت عینِ معروف ہے، عارف یعنی جس کو معرفت ہو، معروف یعنی جس کی معرفت ہو، معرفت یعنی علم وآگاہی، معرفت عینِ معروف بن جاتی ہے، کب؟

☆ اذا کملت و تمت......

جب معرفت تام ہو جائے، کامل ہو جائے تو یہ معرفت عینِ معروف ہے، خود معروف سامنے آجاتا ہے، جب معرفت ناقص ہو تو معرفت اور ہے اور معروف الگ ہے، علم الگ ہے اور معلوم الگ ہے لیکن علم جب اپنی انتہا وکمال پہ جا پہنچتا ہے تو عینِ معلوم بن جاتا ہے، عینِ معروف

بن جاتا ہے،

☆ **ولهذا قيل:......**

اس لئے علمائے معرفت نے کہا ہے کہ

☆ **اذاتم العشق فهو الله.**

عشق جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو یہ خودِ خدا ہے، عشق خودِ خدا ہے، خدا یعنی سراپا عشق، عینِ عشق۔ انشاءاللہ خداوند تبارک وتعالٰی سب کو یہ مقام ومنزلت عطا فرمائے۔ آمین

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۰۰)

(۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷،۶)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۷۸)

(۴)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۵۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ انفطار، آیہ۶)

(۶)......(الصحيفة الكاملة السجادية)(صحيفة الامام عليؑ)(أدعيه جامع الاحاديث)(البلد الأمين)(مصباح المتهجد)(مصباح كفعمى)(مفاتيح الجنان)(مهج الدعوات)

(۷)......(اقبال الاعمال، الجزء ۱، صفحه ۱۹۴)

(۸)......(اقبال الاعمال، الجزء ۲، صفحه ۷۰)

(۹)......(البلد الامين، الجزء ۱، صفحه ۱۵۶)(مصباح المتهجد، الجزء ۱، صفحه ۳۳۹)(مصباح كفعمى، الجزء ۱، صفحه ۱۱۵)

(۱۰)......(البلد الامين)(جمال الاسبوع)(صحائف الأبرار فى وظائف الأسحار)(مصباح المتهجد)(مصباح كفعمى)

(۱۱)......(الصحيفة الكاملة السجادية، دعا ۱۶)

(۱۲)......(بهجت عارفان در حديث ديگران)(برگى از دفتر آفتاب)

(۱۳)......(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثين الحاج

میرزا حسین النوری الطبرسیؒ،الجزء١٠،صفحه٣٦٨)(بحار الأنوار - علامه مجلسیؒ،الجزء٢٨،صفحه٣١٧)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰه الشیخ علی النمازی،الجزء٨،صفحه٢٦٣) (مفاتیح الجنان)

(١٤)......(نهج البلاغه)(تفسیر المیزان- العلامة الطباطبائیؒ،بحث روائی، الجزء٦،صفحه٥٠)(شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ، الجزء٣،صفحه٣٢٠)(الأمثال القرآنية القياسية المضروبة للايمان باللّٰه - عبد اللّٰه بن عبد الرحمن الجربوع،الجزء١،صفحه٢٦٤)(الکلینی و الکافی - الشیخ عبد الرسول الغفاری،الجزء١،صفحه٣١٤)(شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحدید،الجزء١،صفحه٦٧)(یک هزار سخن از حضرت علیؑ، الجزء٦،صفحه١)(میزان الحکمة - الریشهری،الجزء٣،صفحه٢٨٦)

(١٥)......(من لا یحضره الفقیه - للشیخ الجلیل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویه القمیؒ، الجزء ٢، صفحه ٢٠٤)

(١٦)......(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰه الشیخ علی النمازی، الجزء٦،صفحه١٣٢)(بحار الأنوار - علامه مجلسیؒ،الجزء٩٧،صفحه٢٠٧) (جامع آیات و احادیث موضوعی نماز)

(١٧)......(تفسیر مجمع البیان - الطبرسیؒ،الجزء١٠،صفحه١١١)

(١٨)......(مثنوی معنوی،به تصحیح :رینولد ا.نیکلسون،دفتر اول،صفحه ١٦)

(١٩)......(سورۂ مبارکہ بقرہ،آیہ٥٥)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ ۴۱)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ ۱۵)(سورۂ مبارکہ زمر، آیہ ۱۳)

(۲۲)......(سورۂ مبارکہ ممتحنہ، آیہ ۴)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ ابراہیمؑ، آیہ ۱۲)

(۲۴)......(سورۂ مبارکہ ہود، آیہ ۱۸)

(۲۵)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۶۱)

(۲۶)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰه جوادی آملی مدظلہ) (تفسیر القرآن الکریم - السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۱۸۹) (بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۸۹، صفحہ ۱۸۴)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰه الشیخ علی النمازی، الجزء ۸، صفحہ ۱۲۶)(میزان الحکمة - الریشھری، الجزء ۸، صفحہ ۲۱۰)

(۲۷)......(فی رحاب القرآن)(مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۲۵۰)(سنن النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(۲۸)......(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، الجزء ۱۱، صفحہ ۳۶۵)

(۲۹)......(سورۂ مبارکہ صف، آیہ ۳)

(۳۰)......(سورۂ مبارکہ انبیاء، آیہ ۱)

(۳۱)......(سورۂ مبارکہ نجم، آیہ ۲۹)

(۳۲)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۷۸)

(۳۳)......(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ ۱۰۵)

(۳۴)......(سورۂ مبارکہ انفال، آیہ ۲)

(۳۵)......(بیان المعانی - عبد القادر بن ملّا حویش السید محمود آل غازی العانی، المتوفی: ۱۳۹۸ھ، الجزء ۵، صفحه ۲۲۱)(مفاهیم القرآن الجزء السادس)(بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسی "قدس الله سره"، الجزء ۵۸، صفحه ۱۲۹)(قبسات من نهج البلاغة)(شرح خطبه البیان امام علی بن ابی طالبؑ)

(۳۶)......(وسائل الشیعة - الفقیه المُحَدِّث الشیخ مُحمّد بن الحسن الحُر العاملیؒ، الجزء ۲۱، صفحه ۵۴۱)(آموزه های بنیادین علم اخلاق - محمد فتح علی خانی، الجزء ۲، صفحه ۱۰)(السلام فی القرآن والحدیث)

(۳۷)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۴۸)(سورۂ مبارکہ مائدہ، آیہ ۴۸)

(۳۸)......(سورۂ مبارکہ تکاثر، آیہ ۶،۵)

(۳۹)......(سورۂ مبارکہ حجر، آیہ ۹۹)

فصلِ ادبِ هشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّه چهارم)

١) بصیرتِ کشفیه کا مطلب

٢) بصیرۃ کشفیه، قرآن مجدد الانزال هے

٣) تمثیلِ استوائے قرآن بر قلب

٤) خَلْقْ اور خُلُقْ کا فرق

٥) خُلُقْ کے منابع

٦) خَلْقْ اور خُلُقْ میں هم آهنگی کی ضرورت

٧) استوائے قرآن بر قلب نه هونے کا نتیجه

٨) تالیٔ قرآن کون هے؟

٩) نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

١٠) دل کب تابعِ قرآن هوتا هے؟

١١) جیسا عارف ویسی معرفت

١٢) مکاشفۂ قرآنی

١٣) قرآنِ مجید خُلقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم هے

۱) بصیرتِ کشفیہ کا مطلب

آدابِ فہمِ قرآن میں ادبِ ہشتم التاثر والوجد ہے یعنی انسان آدابِ دیگر کے ساتھ خدمتِ قرآن میں حاضر ہو کر آیات و مضامینِ قرآن اور معارفِ قرآن سے متاثر بھی ہو، صدر المتألھینؒ اسی کو بیان فرماتے ہوئے نکتۂ دیگر بعنوانِ بصیرتِ کشفیہ ذکر فرماتے ہیں یعنی ایک ایسی بصیرت جو کشف ہو اور جس کا مکاشفہ سے تعلق ہو، یہ معمولی مطلب نہیں ہے، کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں انسان مطالعہ کے ذریعے، فہم کے ذریعے یا حتیٰ سادہ فہم کے ذریعے سے درک کر لیتا ہے، کسی کتاب میں پڑھ لیتا ہے، کسی درس میں سن لیتا ہے، کسی شخصیت سے کوئی مطلب سن لیتا ہے اور پلے باندھ لیتا ہے یعنی وہ چیزیں جو مفاہیم سے تعلق رکھتی ہوں اور ذہنی کاوشوں سے انسان ان کو آسانی سے سمجھنے پر قادر ہو جاتا ہے لیکن بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں انسان آسانی سے درک نہیں کر سکتا ہے بلکہ دلی و قلبی آمادگی کے بعد اور نفس کے تزکیہ کے بعد انسان کو یہ مطالب خداوند تبارک و تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتے ہیں، جس طرح قرآن مجید کا فرمانا ہے کہ

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ.....(۱)

اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے......

یعنی وہ مطالب کہ جو انسان کو تقویٰ کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں، وہ تعلیمات جو اسبابِ خاص کے ذریعے سے خداوند تبارک و تعالیٰ بعض نفوس کو عطا فرماتا ہے، جو شہود سے، علمِ حضوری سے یا مکاشفات کے ذریعے سے درک کرتا ہے ان کو کشفی حقائق کہتے ہیں، یہ مسلم حقیقت ہے کہ ہر وہ نفس

بصیرتِ کشفیہ کا مطلب

جو آمادہ ہو اور خداوندِ تبارک وتعالیٰ لطف وعنایت نازل فرمائے تو اس قسم کے مطالب اسے حاصل ہو جاتے ہیں، انسان کو ان معارف اور مطالب کا قدردان ہونا چاہئے چونکہ یہ مطالب ہر جگہ موجود نہیں ہوتے ہیں اور ہر کتاب، ہر شخص یا ہر عالم سے انسان کو یہ چیزیں میسر نہیں آتی ہیں۔

بصیرتِ کشفیہ کا مطلب

جیسے بعض اہلِ ادب نے ذکر کیا ہے کہ کچھ غذائیں ایسی ہیں کہ جو ہر پرندے کے لئے ہیں لیکن کچھ خوراکیں اور کچھ غذائیں ایسی ہیں کہ جو خدا نے خاص پرندوں کے لئے بنائی ہیں کہ دوسرے اس تک پہنچ بھی نہیں سکتے ہیں، ان کا ہاضمہ بھی اتنا نہیں ہوتا ہے کہ ان خوراکوں کو ہضم کر سکے اور ان کی رسائی بھی ان تک نہیں ہوتی ہے، اسی طرح سے انسان بھی ہیں، انسانوں کے لئے بھی خداوند تبارک وتعالیٰ نے بعض ایسے حقائق و معارف مقرر فرمائے ہیں کہ بعض خاص انسان ان تک پہنچ سکتے ہیں، البتہ راستہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے لیکن اس راستے کو طے وہی کر سکتا ہے اور اس باب و مرتبے تک وہی انسان پہنچ سکتا ہے کہ جو ہمت کرے اور توفیق خداوند تبارک وتعالیٰ اس کے شاملِ حال ہو جائے۔

صدر المتألہین رضوان اللہ علیہ انہی بزرگوں میں سے ہیں کہ جن پر خداوند تبارک وتعالیٰ کا یہ لطف اور عنایت شامل ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے انہیں معرفت کے وہ نکتے اور حقائق عطا فرمائے ہیں کہ جو اس حکیمِ الٰہی کی فلسفی کتابوں میں، تفسیری کتابوں میں، حدیث کی کتابوں میں اور دیگر آثار میں موجود ہیں۔ اس قسم کے حقائق کہ جو خداوند تبارک وتعالیٰ نے مخصوصاً انہیں عطا فرمائے ہیں اور پھر ان کے توسط سے ان کے شاگردوں اور فکری پیروکاروں کو یہ نکتے عطا ہوئے ہیں، فلسفی

کتابوں میں بھی اپنے انہی حقائق کو بصیرتِ کشفیہ، حقیقتِ کشفیہ یا شہودیہ یا عموماً مطالبِ عرشیہ، حقائقِ عرشیہ اور نکاتِ عرشیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲) بصيرة كشفيه، قرآن مجدد الانزال هے

☆بصيرة كشفيه☆

☆ اعلم: ان القرآن مجدد الانزال على قلوب التالين......

فرماتے ہیں کہ یہ بصیرتِ کشفیہ ہے یعنی بصیرت افروز اور بصیرت بڑھانے والا نکتہ ہے اور دوسرا یہ ہے کہ یہ مطلب کشفی ہے یعنی یہ مطلب انسان کو سادگی سے میسر نہیں آتا ہے، قرآن کے بارے میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جو ہر انسان جانتا ہے اور وہ کہیں سے بھی میسر آجاتی ہیں مثلاً آدابِ لفظی لیکن قرآن کے بارے میں یہ نکتے انہی لوگوں سے میسر آتے ہیں کہ جو اہلِ کشف وشہود ہیں، جن پر خداوند تبارک وتعالیٰ نے عنایت ولطف فرمایا ہے اور اس مقام تک پہنچایا ہے۔ صدر المتالھینؒ ادبِ ہشتم کے ذیل میں اس نکتے کو کہ جب انسان بارگاہِ قرآن میں جائے تو دلِ انسان پر قرآن کے ہر ہر مطلب سے تاثیر ہو بصیرتِ مزید عطا فرماتے ہیں کہ انسان یہ نکتہ ذہن میں رکھ لے کہ قرآن مجدّد الانزال ہے یعنی نزولِ قرآن مجدد ہے، مجدد یعنی بار بار نازل ہوتا ہے، نزولِ قرآن کے اندر تجدد ہے، تجدد سے مراد یہ ہے کہ قرآن ہر دفعہ ایک نئی حقیقت کے ساتھ انسان کے دل میں نازل ہوتا ہے، قرآن ایک نئی دنیا لے کر اور نئے ادوار لے کر انسان کے دل پر نازل ہوتا ہے اور یہ

بصیرۃ کشفیہ، قرآن مجدد الانزال ہے

تجدد کئی طرح سے ہے، ایک یہ کہ حرف حرف کی نسبت قرآن کا نزول ہے، ایک نزول قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے اور نزولِ دیگر قرآن قلبِ نورانی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قلوبِ مومنین پر ہے اور ضروری نہیں ہے کہ قرآن ہر مومن کے لئے نازل ہو، جس مومن نے بھی اپنے آپ کو آمادہ کیا ہے اور اپنے دل کو قرآن کے نزول کیلئے آمادہ کیا ہے تو قرآن اس کے دل میں نازل ہوا ہے اور مومن کے دل میں جب قرآن نازل ہوتا ہے تو بھی اس میں تجدد ہے یعنی ایک شخص کی نسبت بھی قرآن کے نزول میں تجدد ہے۔

۳) تمثیلِ استوائے قرآن بر قلب

صدر المتألہینؒ قرآن کے تجدد کی وضاحت فرماتے ہوئے ایک تشبیہ دیتے ہیں کہ قرآن اور دلِ انسان کی نسبت آپس میں وہی ہے کہ جو رحمٰن اور عرش کی نسبت ہے، قرآن نے بھی لفظِ رحمٰن استعمال کیا ہے، اس لئے رحمٰن جس طرح سے عرش پر مستوی ہے اور استوائے رحمٰن بر عرش ہے اسی طرح سے استوائے قرآن بر قلبِ انسان ہے یعنی دلِ انسان بمنزلۂ عرش ہے اور قرآن بمنزلۂ رحمٰن ہے۔ استوائے رحمٰن بر عرش کے مطالب اہل تفسیر نے قرآن کی ان آیات کے ذیل میں کہ جن میں استوائے رحمٰن بر عرش کا ذکر ہوا ہے بیان فرمائے ہیں، استوا اعتدال کو کہتے ہیں یعنی کسی چیز کو متناسب، موزوں اور متعدل حالت میں کرنے کو استوا کہتے ہیں، قرآن نے اس کے مختلف مشتقات و متعلقات استعمال کئے ہیں، سوّا بھی استعمال کیا ہے،

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ (۲)

اور نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا۔

تمثیل استوائے عرش آن بر قلب

یا اس سے متعلق اور بھی لفظ استعمال کئے ہیں، استوا یعنی کسی چیز کو بناتے ہوئے، خلق کرتے ہوئے، ترتیب دیتے ہوئے ایسا موزوں، معتدل اور متناسب بنایا جائے کہ اس کی طبیعت، مزاج یا اس سے متعلقہ قانون کے مطابق ہو، نہ اس میں تفریط ہو نہ افراط ہو، نہ اس میں کمی ہو اور نہ کوئی چیز اضافی ہو۔ عرش در مقابلِ فرش استعمال ہوتا ہے، عرش ایسے محل کو کہتے ہیں جو اوپر ہو، بلندی پر ہو اور محیط بر فرش ہو، فرش نچلے مکان کو کہتے ہیں، یہ دونوں عربی لفظ ہیں، فرش نچلی منزل یا نچلے طبقے کو کہتے ہیں کہ جس کے اوپر سایہ ہو، جس کے اوپر کوئی جسم دیگر یا محلِ دیگر محیط ہو، اسی وجہ سے سلاطین اور امراء کے تختِ حکومت کو بھی عرش کہا جاتا ہے چونکہ جسمانی طور پر بھی دوسرے سے بلند تر ہوتا ہے مثلاً جب دربار لگتا ہے تو دوسرے لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ یا نشست گاہیں محل کے اعتبار سے نیچے ہوتی ہیں اور تختِ شہنشاہ اور بادشاہ ان سے جسمانی طور پر یعنی محل کے لحاظ سے، مکان کے لحاظ سے بالاتر ہوتا ہے۔

عرش مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کسی دوسری شے کے اوپر ہر اقتدار، احاطہ اور تسلط عرش ہی کہلائے گا، دل چونکہ عرش ہے، اس اعتبار سے کہ انسان کے دیگر اعضاء و جوارح اور دیگر شعبہ ہای وجود کی طرف دل سے احاطہ ہوتا ہے یعنی دلِ انسان درحقیقت محیط ہے اور رحمان کا استوا عرش پر ہے یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ مقامِ اقتدار و احاطہ میں پورے عالم اور نظامِ ہستی کے اوپر جب

اپنے اقتدار و قدرت سے امارت وحکومت کرے تو یہ استوائے رحمان بر عرش ہے، عرش کا لفظ کسی جسمانی چیز کے لئے بھی مخصوص نہیں ہے نہ لفظِ فرش کسی جسمانی چیز کے لئے مخصوص ہے، قرآن مجید کے الفاظ یا جس زبان کے بھی الفاظ ہوں وہ مصادیق کیلئے مقرر نہیں کئے گئے ہیں، عام طور پر جب ہم الفاظ سنتے ہیں تو ان کے معانی کے طور پر مصادیق فوراً ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں مثلاً پانی کہتے ہی فوراً یہ سیال مائع کہ جو آسمان سے نازل ہوتا ہے، ندیوں، نہروں اور سمندروں میں موجود ہے اور گھروں میں استعمال ہوتا ہے مصداق کے طور پر ہمارے ذہن میں آجاتا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پانی فقط اسی مائع اور اسی سیال چیز کے اندر منحصر ہے حالانکہ یہ مصداقِ آب ہے، معنیٰ آب اور چیز ہے لیکن یہ اس کا مصداق ہے۔

مثلاً جوں ہی لفظِ قلم استعمال ہوتا ہے تو ہمارے ذہن کے اندر فوراً قلم کی رائج شکل معنیٰ کے طور پر آجاتی ہے حالانکہ یہ قلم کا مصداق ہے نہ کہ یہ قلم کا معنیٰ ہے یعنی لفظِ قلم اس کے لئے مقرر نہیں ہوا ہے بلکہ لفظِ قلم ایک معنیٰ کے لئے مقرر ہوا ہے اور اسی معنیٰ کے مصادیق میں سے یہ قلم بھی ہے کہ جو ہمارے ہاتھ میں ہے، اسی طرح سے عرش وکرسی و جتنے الفاظ قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں وہ فقط جسمانی مصادیق کے لئے نہیں مقرر ہوئے ہیں بلکہ اپنے معانی کے لئے وضع و مقرر کئے گئے ہیں لیکن ان معانی کے مصادیق اور ان کے ماتحت افراد کہ جن پر ان الفاظ کا اطلاق کیا جاتا ہے اور صدق کیا جاتا ہے ان میں سے بعض جسمانی ہیں اور بعض غیر جسمانی ہیں چونکہ ہم زیادہ تر جسمانی مصادیق کے ساتھ مانوس ہیں لہٰذا فوراً ہمارے ذہن میں یہی مادی معنیٰ تدوین ہوتے ہیں کہ مثلاً ان

سے مراد معانیٔ جسمانیہ ہیں، عرش اس مافوق مقام کو کہتے ہیں کہ جہاں پر بیٹھ کر احاطہ پیدا کیا جائے یا جس چیز کا نچلی چیزوں پر، مادون چیزوں پر اور ماتحت چیزوں پر احاطہ ہو اس کو عرش کہتے ہیں، نشست گاہِ حکمران کو یا سلطان کو بھی اسی وجہ سے عرش کہتے ہیں چونکہ وہاں بیٹھ کر نہ صرف جسمانی طور پر دوسروں سے بلندتر ہوتا ہے بلکہ اس کا احاطۂ قدرت واقتدار وحکمرانی بھی دوسروں پر پیدا ہو جاتا ہے یعنی لوگوں کے اوپر اقتدار خود ایک احاطہ ہے، یہ فقط دربار میں اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے مافوق نہیں ہے بلکہ وہ لوگ جو اس کے دربار میں نہیں ہیں، جو باہر ہیں، اس کے ملک میں ہیں، اس کے شہر میں ہیں، اس کی آبادیوں میں ہیں، اس کے دیہاتوں میں ہیں، ان سب پر بھی وہ محیط ہوتا ہے اور ان سب پر بھی مسلط ہوتا ہے، اصطلاح میں اس کو احاطہ حاصل ہوتا ہے، اس وجہ سے اس نقطے کو کہ جہاں پر بیٹھ کر وہ اپنا اقتدار ظاہر کرتا ہے، اپنی قدرت کا اظہار کرتا ہے اور فرمان روائی کرتا ہے عرش کہا جاتا ہے۔

خداوند تبارک وتعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے سے یہ ظاہری عرش مراد نہیں ہے، نہ عرشِ خدا جسمانی ہے اور نہ ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ جسمانی ہے، اس عرش سے مقصود یہ ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے زمین کو خلق کیا،

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ......(۳)

اس کے بعد اس نے آسمان کا رخ کیا......

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ......(۴)

اور اس کے بعد عرش پر اپنا اقتدار قائم کیا ہے……

یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ نے جہان کو خلق کیا اور پھر خلق کے بعد ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس کے اوپر احاطۂ قدرت پیدا کیا اور اپنے اقتدار سے اس کی تدبیر کا آغاز کیا، خدا کا تمکن جسمانی نہیں ہے کہ جیسے بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے، علیٰ ایّ حال اس تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید بھی انسان کے دل کی نسبت ایسے ہی ہے کہ جیسے استوائے رحمان بر عرش ہے یعنی دلِ انسان ایک نوعِ عرش ہے اور اس پر قرآن مستوی ہوتا ہے، قرآن کو دلِ انسان پر استوا حاصل ہوتا ہے، اس کے لئے بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح کا دل آمادہ ہو اسی طرح کا دل کے اوپر ظہورِ قرآن اور نزولِ قرآن بھی ہوگا، یہ نزول اس بات پر موقوف ہے کہ انسان نے اس عرش کو فقط قرآن کے لئے خالی رکھا ہوا ہو، اس محل کو انسان نے قرآن کے لئے آمادہ کیا ہوا ہو، اگر یہ عرش کسی کے قبضے میں ہو اور شیاطین اس کے گرد یا اس کے اوپر آگئے ہوں جیسا کہ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ بسا اوقات شیطان آجاتا ہے اور انسان کے دل میں آکر اپنا گھر بنالیتا ہے اور پھر اس کے بعد حتیٰ اس آشیانے میں تولیدِ نسل کرتا ہے، نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق شیطان دلِ انسان میں آکر تولیدِ نسل کرتا ہے، انڈے دیتا ہے، چوزے نکالتا ہے اور وہاں آباد ہو جاتا ہے، بسا اوقات اس عرشِ رحمان پر یا عرشِ قرآن پر خواہشات غالب ہو جاتی ہیں ۔ جس طرح سلطان کے تخت پر اگر سلطان توجہ نہ کرے، سلطان اپنے عرش کو اور اپنے تخت کو کوئی اہمیت نہ دے تو دوسرے آکر سلطان کی جگہ پر متمکن ہو جاتے ہیں، غاصب و نا اہل لوگ غالب آجاتے ہیں اور عرشِ سلطان پر قبضہ کر لیتے ہیں،

تمثیل استوائے قرآن بر قلب

اسی طرح سے عرشِ رحمان بھی ہے،

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی o (۵)

وہ رحمٰن جس نے عرش پر اقتدار قائم کیا۔

جس طرح سے روایت میں بھی ہے کہ

اِنَّ قَلۡبَ الۡمُؤۡمِنِ عَرۡشُ الرَّحۡمٰنِ...... (۶)

بے شک مومن کا دل خداوندِ عالم کا عرش ہے......

یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ کی حکمرانی اور حکم فرمائی دلِ انسان پر ہے اور اگر یہ دل خدا کے عرش کے طور پر ہو جائے کہ اقتدار فقط خدا کا ہو اور عہدہ فقط خدا کا ہو تو پھر جسم کے اوپر، انسانی کائنات کے اوپر اور انسانی عوالم کے اوپر اس دل کا احاطہ ہو جاتا ہے یعنی دل حکمران ہو جاتا ہے اور انسان کی باقی کائنات اس کی رعایا بن جاتی ہے اور اسکے ماتحت ہو جاتی ہے نتیجتاً کائناتِ انسانی اقتدارِ الٰہی کے تابع ہو جاتی ہے، کائناتِ نفسِ انسان پر بھی اقتدارِ خدا آ جاتا ہے کہ جس طرح سے کائناتِ جہان، کائناتِ انفسی و کائناتِ تکوینی پر قدرتِ خدا ہے، انسان اگر قرآن کے لئے دل کو آمادہ کرے اور اس کو خواہشات، قابضین، شیاطین، آرزوؤں، ہویٰ و ہوس اور دیگر گناہوں سے نجات دے تو قرآن اس وقت اِس عرش پر آ کر مستوی و متمکن ہو جاتا ہے۔

پس استوائے قرآن بردلِ انسان یہ ہے کہ قرآن اس طرح سے دلِ انسان پر محیط ہو جائے اور از طریقِ دلِ انسان، انسان کے تمام اعضاء و جوارح اور تمام وجود و تمام ہستیٔ انسان پر اس طرح

احاطہ کرلے کہ قرآن انسان کی صفت بن جائے، نہ کہ قرآن انسان کے ذہن کے اندر فقط تلفظ یا مفہوم ہو۔

۴) خَلق اور خُلق کا فرق

صدر المتالھین فرماتے ہیں کہ جیسے حدیث میں بھی موجود ہے کہ خُلقِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن تھا، خداوندتبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق قرآن کو قرار دیا ہے۔ خُلق کس طرح سے بنتا ہے؟ خُلق یعنی وہ صفاتِ راسخہ و مَلَکاتِ راسخہ کہ جو نفسِ انسان اور وجودِ انسان کے اندر موجود ہوں، یہ ملکاتِ راسخہ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ خواہ برے ملکات ہوں، ملکات سے مراد وہ صفات ہیں کہ جو انسان کے اندر آ کر بیٹھ جاتی ہیں، گھر بنا لیتی ہیں اور پھر انسان انہی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور انہی کے مطابق عمل کرتا ہے یعنی یہی صفات انسان کے اعمال اور اعضاء و جوارح کی ضمام سنبھال لیتی ہیں اور ہم ان کو اخلاقیات کہتے ہیں۔

ایک خلقتِ انسان ہے اور ایک خُلقِ انسان ہے، خَلقِ انسان وہ چیز ہے کہ جو خدا نے بنا دی ہے جیسے خداوندتبارک وتعالیٰ نے آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، سر، جسم اور ہمارا وجود بنایا اور اس پیکر میں یہ روح ڈالی، یہ خَلقِ انسان ہے اور خَلق فعلِ خداوندتبارک وتعالیٰ ہے، بعد از خَلق مرحلۂ خُلقِ انسان شروع ہوتا ہے، خُلق وہ عمل ہے یا وہ صفات ہیں کہ جو انسان خود اپنے اندر ایجاد کرتا ہے۔ وہ صفات جو خلقت کی تکمیل کے بعد انسان کے اندر پیدا ہوتی ہیں ان کو خُلق کہتے ہیں اور اس کی جمع

اخلاق یا خُلق بھی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍo(۷)

اور آپؐ بلند ترین اخلاق کے درجہ پر ہیں۔

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی فرمایا کہ

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ......(۸)

بتحقیق مجھے اس لئے بھیجا گیا تا کہ میں اخلاق کے اعلیٰ مراتب کی تکمیل کروں......

میری بعثت کا مقصد یہی ہے کہ میں اس شعبے میں لوگوں کی مدد کرنے آیا ہوں۔ خِلقت خدا کا کام ہے، تکمیلِ خُلق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام ہے۔

۵) خُلق کے منابع

انسان کا خُلق کہاں سے بنتا ہے؟ اس کے لئے مختلف منابع ہیں عموماً جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھر کا ماحول اور سوسائٹی (Society) کے اندر جیسا ماحول ہوتا ہے وہ اس کے اندر صفات پیدا کرتا ہے، ماں باپ، رہن سہن، کلچر (Culture)، تہذیب، ثقافت و تمدن اس کے اندر خُلق و صفات پیدا کرتے ہیں یعنی بچہ فقط قبول کر رہا ہوتا ہے، چاروں طرف سے، شش جہات سے اور ہر طرف سے ماحول اس کو کچھ نہ کچھ دے رہا ہوتا ہے اور وہ ان سب سے خُلقیات کشف کر رہا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں میں رہنے والوں کی خُلقیات اور طرح کی ہوتی ہیں، شہروں میں رہنے والوں کی خُلقیات اور طرح کی ہوتی ہیں، قبائل میں رہنے والوں کی خُلقیات قبائلی ہوتی ہیں، اسی طرح سے مغرب میں رہنے والوں کی خُلقیات غربی ہوتی ہیں، مشرق میں رہنے والوں کی خُلقیات شرقی ہوتی ہیں، متدین لوگوں کے گھروں میں پلنے والی اولاد کی خُلقیات دینی ہوتی ہیں، غیر متدین گھرانوں کے اندر پلنے والی اولاد کی صفات غیر اخلاقی ہوتی ہیں، شہوتوں کے اندر پلنے والوں کی صفات شہوت رانی والی ہوتی ہیں اور اسی طرح سے جس ماحول میں انسان تربیت پا رہا ہوتا ہے عموماً اسی طرح کی صفات اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ ماں باپ، تربیت، وراثت، ماحول، سوسائٹی، تاریخ، تمدن اور ثقافت وغیرہ انسان کے اندر صفات ایجاد کرتی ہیں۔ انسان کے اندر صفات ایجاد کرنے کا ایک منبع قرآن ہے، کہا گیا ہے کہ آپ جب دوسری جگہوں اور رسم و رواج سے اپنے لئے صفات حاصل کرتے ہیں تو یہ صفات قرآن سے حاصل کریں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا نے اس لئے مبعوث کیا ہے کہ وہ یہ کام کریں لہٰذا اہم صفات کو ماحول سے لینے کے بجائے، سوسائٹی سے لینے کے بجائے تعلیماتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صفات و خُلقیات لیں اور اپنائیں۔

٦) خَلق اور خُلق میں ہم آہنگی کی ضرورت

اسی مطلب کو ذرا واضح تر کر کے بیان کرتے ہیں، خَلق سے انسان کا شخص بنتا ہے اور خُلق سے انسان کی شخصیت بنتی ہے، شخص نتیجۂ خَلق ہے اور شخصیت نتیجۂ خُلق ہے، شخص خدا بناتا ہے اور

شخصیت خود انسان بنا تا ہے البتہ شخصیت بنانے کے کچھ منابع ہیں کہ جن کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان میں انسان دیکھے کہ کونسی صفات ہیں جو میرے اندر پیدا ہوں؟ کونسی خُلقیات ہیں جو میں اپنے اندر ایجاد کروں تا کہ میری خَلق کے ساتھ خُلق ہم آہنگ ہو جائے یعنی خَلق اور خُلق ایک جیسے ہو جائیں، خَلق کے بارے میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍo(۹)

بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

انسان کی خَلق بہترین خَلق ہے، کہیں فرمایا کہ

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَاo

اور نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا۔

خلق اور خُلق میں ہم آہنگی کی ضرورت

خداوند تبارک وتعالیٰ نے نفس کو پیدا کیا اور اس کے اندر تسویہ کیا، تسویہ یعنی اس کو معتدل، موزوں اور بہتر بنایا ہے، اس کی کریمانہ خلقت کی ہے، اب اس کے اندر جب شخصیت کی نوبت آتی ہے تو یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ انسان اس خَلق کے اندر خُلق پیدا کرے، شخص کے اندر شخصیت پیدا کرے، شخصیت بنانے کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو منبع قرار دیا ہے، کہا کہ خاک سے، مٹی سے، ماحول سے، جانوروں سے اور چراگاہوں میں جا کر اپنے لئے خُلق کسب نہ کرو کہ جس طرح سے اپنی غذا ہر چیز سے کسب نہیں کرتے ہو، آپ اپنی خُلق اور اپنی شخصیت بھی خدا کے بنائے ہوئے نظام سے کسب کرو یعنی دین سے حاصل کرو، آسمانی کتابوں سے حاصل کرو یعنی انبیاء علیہم السلام سے

حاصل کرو، اولیاءِ خدا علیہم السلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے ذریعے سے حاصل کرو، ان کو اسوہ اور نمونہ بھی قرار دیا ہے، وہ اسوہ اسی وجہ سے ہیں کہ ان کے اندر جتنی خُلقیات ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں، ان کی خَلق بھی خدا کی طرف سے ہے اور خُلق بھی خدا کی طرف سے ہے یعنی ان کا خُلق قرآن و دین ہے، اسی لئے روایت کے مطابق

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ......(١٠)

قرآن خُلقِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، قرآن اخلاقِ پیغمبر اکرمؐ، شخصیتِ پیغمبر اکرمؐ اور صفاتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ قرآن فقط قرأت والفاظ نہیں ہے بلکہ قرآن انسان کیلئے صفت بن جائے، پہلے کہا تھا کہ قرآن انسان کے لئے معرفت ہے، قرآن انسان کے لئے حکمت ہے، قرآن انسان کے لئے ہدایت ہے، عملاً ہدایت اس وقت بنتا ہے کہ جب انسان کے اندر منتقل ہو کر انسان کی صفت بن جائے اور وہ بھی صفتِ راسخہ اور خُلق بن جائے۔ اس لئے جب قرآن دلِ انسان میں اترتا ہے تو جیسا قرآن ہے ویسا ہی دل بنا دیتا ہے۔

۷) استوائے قرآن بر قلب نہ ہونے کا نتیجہ

اگر انسان قرآن کو اپنا خُلق نہ بنائے اور اپنی صفت نہ بنائے، اپنے اندر نہیں اتارے، دل متصف بہ قرآن نہ ہو، دل عرشِ قرآن واقع نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ اس صورت میں سرے سے انسان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ انسان نے بعض الفاظ کو تجسم کیا ہوا ہے اور انہیں سمجھتا ہے کہ یہ

قرآن ہے، مثلاً قرآن کی آیات کے الفاظ کو اگر انسان دہراتا رہے، تکرار کرتا رہے تو یہ تو قرآن نہیں ہے، اس کے اپنے خیال کے اندر تجسمِ الفاظ قرآن ہے، یہ قرآن نہیں ہے، قرآن اس حکمت، خصوصیت اور صفت کا نام ہے کہ جو انسان کے دل پر بن جائے، لہٰذا فرماتے ہیں کہ جس طرح کی آیات ہیں تو ہم یہ دیکھیں کہ قلبِ نورانی پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وذات نورانی پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کردار و سیرتِ نورانی پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح سے ہے۔

۸) تالیٔ قرآن کون ہے؟

☆ اعلم: ان القران مجدد الانزال علی قلوب التالین......

قرآن مجدد الانزال ہے، مجدد النزول ہے یعنی تجدید ہے، اس کے اندر تجدد ہے، بار بار نازل ہوتا ہے، اس کے اندر جدت ہے، لیکن کس کے دل پر؟

☆ علی قلوب التالین......

تالینِ قرآن کے قلوب پر۔ تالیٔ قرآن کون ہوتا ہے؟ اور تلاوتِ قرآن سے کیا مراد ہے؟ آیا یہی مراد ہے کہ جو آج رائج ہے کہ جس کو کہتے ہیں پڑھنا، تلفظ کرنا یا نہیں؟ اگر اس کا اجمالی طور پر معنیٰ کریں تو کہیں گے کہ تالیٔ قرآن یعنی دلِ تالی رکھنے والا، تالی تلو سے ہے، تلو یعنی پہلو میں جڑی ہوئی جو چیز ہو اور پیچھے جو چیز ہو، مثلاً کوئی چیز آگے جا رہی ہو اور بغیر فاصلے کے جو چیز متصلاً اس کے ساتھ جا رہی ہو تو اس کو تالی کہتے ہیں مثلاً ماں جا رہی ہو تو بچہ بلا فاصلہ دامن تھام کے اس کے پیچھے

پیچھے جارہا ہو اور ان دونوں کے اندر کوئی فاصلہ نہیں ہوتا ہے اس کو تالی کہتے ہیں، تالی یعنی بالکل متصل پیچھے آنا والا انسان، اس میں اور اُس میں کوئی فاصلہ موجود نہ ہو، محفل میں یا مجلس میں اگر آپ کے ساتھ کوئی انسان کسی وقفے اور فاصلہ کے بغیر بیٹھا ہوا ہو تو اس انسان کو کہتے ہیں کہ یہ آپ کا تالی ہے یعنی بالکل متصل اور آپ کے بعد ہے، البتہ تالیٔ قرآن یعنی ایسا انسان کہ جو قرآن کے پیچھے جارہا ہے، بلا فاصلہ جارہا ہے یعنی اس میں اور قرآن میں کوئی فاصلہ موجود نہیں ہے۔

لغت کے اعتبار سے بھی لفظ تالی بلا فاصلہ کیلئے استعمال ہوتا ہے، کسی کے پیچھے جانے کو تالی کہتے ہیں یعنی آگے ایک شخص جارہا ہو اور کسی فاصلے اور وقفے کے بغیر ایک دوسرا شخص اس کے ساتھ متصل طور پر جارہا ہو البتہ پیچھے ہو لیکن فاصلے کے بغیر ہو تو اِس کو اُس کا تالی کہتے ہیں، اس کو تلُوّ بھی کہتے ہیں یعنی کسی کے پیچھے جانا، پیچھے چلنا، کسی کی پیروی کرنا، پیرویِ بلا فاصلہ یا بلا فصل پیروی کرنا، اگر بیچ میں کوئی شے حائل ہو جائے تو اس کو تالی یا تِلُوّ نہیں کہتے ہیں بلکہ تبع کہتے ہیں یا اس پر دوسرے الفاظ منطبق ہوتے ہیں، پس تالیٔ قرآن کون ہے؟ اول مخاطبِ قرآن دلِ انسان ہے پس تالیٔ قرآن دلِ انسان ہے یعنی قرآن آگے جارہا ہے اور انسان اس کے پیچھے جارہا ہے، دلِ انسان قرآن کے پیچھے ہو یعنی جہاں جہاں قرآن جارہا ہے وہاں وہاں دلِ انسان جارہا ہو۔

ہم تلفظ کرنے والے کو تالیِ قرآن کہتے ہیں اور ادائے الفاظ کرنے کو تلاوتِ قرآن کہتے ہیں حالانکہ تالی کا معنیٰ ہوتا ہے بغیر وقفے کے متصلاً کسی شے کے ساتھ لگ کر رہنا اور اس سے جدا نہ ہونا اور اسکے پیچھے بھی رہنا، اُس کے بعد بھی رہنا یعنی آگے کوئی ہو اور اس کے پیچھے بغیر فاصلے کے ہم

ہوں تو ہمیں اس کا تالی کہا جائے گا، وہ ہمارے آگے چل رہا ہے، وہ مقدم ہے اور ہم تالی ہیں، یہ اصطلاح اہلِ منطق نے معنیٔ لغوی سے لی ہے، اہل منطق اسے قیاسِ استثنائی میں یا جملۂ شرطیہ میں استعمال کرتے ہیں، جملۂ شرطیہ کے دو جزو کو مقدم اور تالی کہتے ہیں، اس کی وجۂ تسمیہ یہی ہے کہ جزوِ دوم بعد از جزوِ اول ہے، متصل بہ جزوِ اول ہے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، قضیۂ منطقیہ میں جزا کو تالی کہتے ہیں اور شرط کو مقدم کہتے ہیں لہٰذا تالیِ قرآن بھی اسی طرح سے ہونا چاہئے، جس طرح سے تالیٔ منطقی ہے اسی طرح سے تالیٔ قرآن بھی ہے، تالیٔ قرآن یعنی قرآن آگے ہو، قرآن امام ہو اور انسان متصل بہ قرآن اور بعد از قرآن ہو، جہاں جہاں قرآن ہو وہاں وہاں انسان ہو تو یہ تالیٔ قرآن انسان ہے، انسان کس حصے سے تلاوت کرے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ گلے کے ذریعے سے، حلق کے ذریعے سے، مخارج کے ذریعے سے، لبوں کے ذریعے سے، تالو کے ذریعے سے، سانس کے ذریعے سے ہی تلاوت ہوتی ہے، یہی تلاوت جو اس وقت رائج ہے، بعض نے اس شعبے میں تخصص کی حد تک ترقی کی ہے، ہم اسی کو سمجھتے ہیں کہ یہ تلاوت ہے، بلکہ تلاوت فعلِ قلب ہے نہ کہ فعلِ زبان ہے یعنی دل ہمراہِ قرآن ہونا چاہئے نہ کہ فقط زبان اور گلا ہمراہِ قرآن ہو۔ پس ایسا تالیٔ قرآن کہ اس کا دل نزولِ قرآن کے لئے آمادہ ہو تو قرآن اس کے لئے مجد دالانزال ہے۔

نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

۹) نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

☆ ونسبة القلب الى نزوله، نسبة العرش الى استواء الرحمن......

قلب اور قرآن کا ناتا اور رشتہ آپس میں ایسے ہی ہے جیسے رحمان اور عرش کا آپس میں رشتہ یا رابطہ ہے، جس طرح رحمان متمکن بر عرش ہے اور عرش محلِ استوائے رحمان ہے اسی طرح سے دلِ انسان قرآن کے لئے عرش ہے اور قرآن بعنوانِ سلطان اور بحیثیت رحمٰن عرشِ انسان پر یعنی دلِ انسان پر نازل ہوتا ہے،

☆ و بحسب مایکون القلب علیه من الحالات یکون ظهور القرآن و نزوله علیه......

جیسا دل ہوگا، جیسے قلبی حالات ہوں گے تو نزولِ قرآن بھی ویسا ہی ہوگا یعنی نزولِ قرآن تابعِ حالاتِ دل ہے، جب دل آمادہ ہو جائے، عرشِ قرآن واقع ہو جائے تو پھر قرآنی صفات دل کے اندر آجاتی ہیں، پہلے قرآن کے نزول کے لئے دل آمادہ ہوتا ہے اور جب دل آمادہ ہوا اور قرآن آجائے تو پھر قرآنی صفات سے دلِ انسان متصف ہو جاتا ہے، قرآن خُلقِ انسان و صفاتِ انسان بن جاتا ہے۔

نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

ایک گروہ ایسا ہے کہ جس کا جیسا دل ہوتا ہے ویسا ہی قرآن اس کے اندر آتا ہے اور ایک گروہ ایسا ہے کہ جیسا قرآن ہے تو قرآن ان کا دل اپنے جیسا بنا لیتا ہے مثلاً بسا اوقات ہم کسی چیز کے اندر پانی ڈالتے ہیں تو پانی کی شکل وہی ہو جاتی ہے کہ جو برتن کی شکل ہے، پانی کا رنگ بھی وہی ہو جاتا ہے کہ جو برتن کا رنگ ہے لیکن بعض اوقات پانی کا رنگ برتن کے اوپر چڑھ جاتا ہے، اگر پانی رنگین اور صاف و شفاف ہو اور اسے شیشے کے صاف شفاف، بلّوری برتن کے اندر ڈالا جائے تو برتن

پانی کو رنگ نہیں دیتا ہے بلکہ پانی برتن کو رنگ دیتا ہے، اگر اس کے اندر آپ سبز پانی ڈالیں تو برتن بھی سبز ہو جائے گا، اگر اس کے اندر سرخ پانی ڈالیں تو برتن بھی سرخ ہو جائے گا، اگر اس کے اندر سیاہ پانی ڈالیں تو برتن بھی سیاہ ہو جائے گا لیکن رنگین برتن میں اگر صاف پانی ڈالیں تو پانی کے اوپر برتن کا رنگ چڑھ جاتا ہے، اسی طرح آپ بعض اہل معرفت سے نقل کرتے ہیں کہ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی کہا کہ پانی کا رنگ وہی ہے کہ جو برتن کا رنگ ہے۔ یعنی قرآن جب انسان کے دل میں جاتا ہے تو جو دل کی حالت ہوتی ہے وہی قرآن کی حالت بھی بن جاتی ہے لہٰذا دل کی حالت موزوں ہو، متناسب ہوتا کہ قرآن اس کے اوپر آ کر مستوی ہو جائے چونکہ استوائے قرآن کے لئے محل کا مناسب ہونا ضروری ہے۔

نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

جس طرح تخت کے اوپر استوائے سلطان ہے کہ اگر یہ تخت نہ ہو یا یہ تخت ہموار نہ ہو، مناسب نہ ہو، موزوں نہ ہو اور خالی نہ ہو تو ہرگز سلطان اس پر متمکن نہیں ہوسکتا ہے، سلطان اس پر نہ بیٹھ سکتا ہے نہ ٹک سکتا ہے، اسی طرح سے اگر انسان کا دل آمادہ نہ ہو، تیار نہ ہو تو ہرگز قرآن اس دل میں داخل نہیں ہوتا ہے، قرآن ایسے دل میں متمکن نہیں ہوسکتا ہے، انسان کا دل اگر ہموار نہ ہو تو دل میں قرآن سرے سے اترتا ہی نہیں ہے پس اس طرح انسان محروم رہ جاتا ہے، لہٰذا فرماتے ہیں کہ قرآن مجدّد دالانزال ہے یعنی نزولِ قرآن مجدد ہے، ایسا نہیں ہے کہ فقط ایک دفعہ نزول ہو گیا اور ہمیں نزول یافتہ قرآن سے سروکار ہے۔ آغازِ کتاب میں معنیٰ کیا تھا کہ نزول کا معنیٰ فہمِ قرآن ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے اسے ہماری فہم کی دسترس میں قرار دیا ہے اور فہم چونکہ دل کا کام ہے لہٰذا جتنا دل

آمادہ ہوگا اتنا نزولِ قرآن کا تجدد ہوتا رہے گا، تجدد در نزول ہوتا رہے گا، متناسب بہ قرآن، متناسب بہ دل قرآن نازل ہوتا رہے گا اور پھر قرآن کی صفات دل پر چڑھ جائیں گی اور اس طرح دل قرآنی ہو جاتا ہے اور یہ انسان، انسانِ قرآنی بن جاتا ہے۔

عرشِ دل اگر بہت ہی آمادہ ہے تو قرآن اس طرح سے نازل ہوگا، اگر دل تھوڑا آمادہ ہے تو قرآن اسی طرح نازل ہوگا چونکہ قلب کو قلب تقلب کی وجہ سے کہتے ہیں، تقلب یعنی جس میں ٹھہراؤ نہ ہو، ایک حالت سے دوسرے حال میں بدلتا رہتا ہو، اسی پہلو بدلنے کو، کروٹیں بدلنے کو، ایک حال سے دوسرے حال میں جانے کو تقلب کہتے ہیں اور خداوند تبارک وتعالیٰ کے اسماء و صفات میں بھی ہے کہ وہ مقلب القلوب ہے یعنی جب دل کے حالات بدلتے ہیں تو ان قلوب کا کوئی مقلب بھی ہے یعنی کوئی حالات بدلنے والا بھی ہے، چونکہ دل کے حالات بدلتے رہتے ہیں اس وجہ سے اس کو دل کہتے ہیں، جوں جوں حالات بدلتے رہتے ہیں تو نزول بھی بدلتا رہتا ہے، جیسی حالت ہوگی ویسا نزول ہوگا، دلِ انسان کی طرح ذہنِ انسان بھی ہے، ذہنِ انسان کے بھی حالات بدلتے رہتے ہیں اور فہم بھی بدلتی رہتی ہے، بعض اوقات انسان کو وہی کچھ سمجھ میں آتا ہے اور بعض اوقات وہی نکتہ سمجھ میں نہیں آتا ہے، بعض اوقات انسان پیچیدہ ترین مطالب سمجھ رہا ہوتا ہے اور بسا اوقات سادہ ترین مطلب بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہوتا، چونکہ فہم تابعِ ذہن ہے۔

ذہن جس حال میں ہوگا فہم بھی ویسی ہی ہوگی، یوں تو نہیں ہوسکتا ہے کہ ذہن خواب آلودہ ہو اور فہم تر و تازہ ہو مثلاً انسان سوئے ہوئے ذہن سے سمجھنا چاہے اور پھر بھی انسان کی سمجھ بہت ہی

عالی سمجھ ہو جائے تو یہ ممکن نہیں ہے، لہٰذا نماز میں بھی منع کیا گیا ہے کہ سستی کے ساتھ نماز میں نہ جاؤ، سُکاریٰ کی حالت میں نماز کی طرف نہ جاؤ،، کسالہ وسکاریٰ یعنی سستی و کسالت کے ساتھ نہ جاؤ اس لئے کہ نماز بھی ایک قسم کا نزول ہے، نماز میں بھی انسان کا خداوند تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ایک ارتباط ہوتا ہے، ذاتِ حق کے ساتھ یہ اتصال وارتباط آپ کی حالت کے تابع ہے، اگر کسالہ ہو گے تو پھر یہ ارتباط بھی کسالہ ہو جائے گا، اگر سکاریٰ ہوئے تو وہ ارتباط بھی سکاریٰ وسکران کا شکار ہو جائے گا لیکن اگر انسان حاضر دل لے کر جائے تو حضور کی صورت میں انسان کا دل محضرِ نزولِ قرآن ومحضرِ نزولِ رحمتِ خدا بن جاتا ہے، پس بنا براین نزول قرآن یعنی دلِ انسان مانندِ عرش ہے اور قرآن مانندِ رحمٰن ہے کہ جو اس کے اوپر متمکن ہو گا لیکن جیسا دل ہو گا ویسا قرآن اس کے اوپر نازل ہو گا،

نزولِ قرآن بمناسبتِ دل

☆ **و ذلک فی حق طائفة......**

البتہ یہ ایک گروہ کے بارے میں ہے،

☆ **و اما فی حق طائفة اخری......**

لیکن ممکن ہے کہ دوسرے گروہ میں کچھ اور لوگ ہوں،

☆ **فیکون القرآن هو الاصل فی الصفة وعرش القلب، یظهر بتلک الصفة عند نزوله......**

ایک گروہ وہ ہے کہ جن کا دل جیسا ہو گا تو قرآن بھی ویسے ہو جائے گا اور ایک گروہِ دیگر وہ ہے کہ جیسا قرآن ہو گا ویسا ان کا دل بن جائے گا۔

صدر المتالھینؒ کی مراد یہ ہے کہ یہ حقیقت دو طرح سے رونما ہوتی ہے، ایک یہ کہ جب انسان اپنے دِل کو پاکیزہ کرے، تزکیہ کرے، اپنے دل کو آمادہ کرے، قرآن کیلئے تیار کرے اور ہر ہر آیہ قرآن سے متاثر ہو اور تاثیر قرآن اس کے اوپر انجام پائے یعنی قرآن دل کے لئے صفت بن جاتا ہے لیکن جیسا دل ہوتا ہے ویسے ہی قرآن ہوتا ہے، جس مرتبے میں دل ہوگا اسی حد تک قرآن بھی ہوگا، اگر دل کریم ہے تو قرآنِ کریم اس دل میں جائے گا، اگر دل مجید ہے تو قرآنِ مجید اس دل میں جائے گا، اگر دل عظیم ہے تو قرآنِ عظیم اس کے اندر جائے گا لیکن جب انسان قرآن کے اندر راسخ ہو جاتا ہے اور دل کو بالکل صاف و شفاف کر لیتا ہے، اس طرح سے کہ کوئی اور چیز دل کے اندر موجود نہیں رہتی ہے، انانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے حتیٰ خود وجودِ دل محو ہو جاتا ہے اور جب دل حالتِ محو و فنا تک پہنچ جاتا ہے تو اس وقت دل ایسے ہوتا ہے جیسے قرآن ہے یعنی بعض اوقات قرآن دل کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور بعض اوقات دل ہے کہ جو قرآن کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔

قرآن نے ذکر بھی کیا ہے کہ بعض ایسے ہیں کہ قرآن نازل ہوتا ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ قرآن نازل ہوتا ہے تو ان کے کفر و نفاق میں اضافہ ہوتا ہے، یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ قرآن جن کے دل کے تابع ہے، جیسا دل ہوگا ویسا قرآن ہوگا، ہوسکتا ہے کہ دل نجس برتن کی طرح ہو یا ہوسکتا ہے کہ دل پاک برتن کی طرح ہے، اگر پاک برتن میں پاک چیز ڈالیں تو اگر وہ شے برتن کے تابع ہے تو پاک رہے گی لیکن اگر ایک پاک چیز نجس برتن میں ڈالیں تو اگر وہ شے برتن کے تابع ہے تو نجس ہو جائے گی۔

۱۰)دل کب تابعِ قرآن ہوتا ہے؟

بعض اوقات انسان ناپاک اور پاک کے مرحلے سے گزر کے، دل کی تطہیر اور تزکیہ کی ایک ایسی منزل پہ جا پہنچتے ہیں کہ اب دل تابعِ قرآن ہو جاتا ہے، ظرف تابعِ مظروف ہو جاتا ہے یعنی جیسا قرآن ہے ویسا دل بن جاتا ہے، انسان دل کو ایسی حالت پر پہنچائے۔

لوگوں یا تالیٔ قرآن کا ایک گروہ ایسا ہے کہ

☆ **فیکون القرآن هو الاصل فی الصفة......**

درحقیقت قرآن اصل ہے،

☆ **و عرش القلب، یظهر بتلک الصفة عند نزوله......**

اور دلِ انسان یا عرشِ دل ویسا ہی بن جاتا ہے کہ جیسا قرآن ہوگا، دل تابعِ قرآن ہو جاتا ہے،

☆ **و ذلک......**

اور ایسا کب ہوتا ہے کہ انسان کا دل تابعِ قرآن ہو جائے؟ کہ اصل حالت یہی ہے،

☆ **لغایة صفائه ......**

یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب دل بالکل صاف اور شفاف ہو جائے، تزکیہ شدہ ہو جائے، صفائے محض آ جائے، غایہ یعنی نہایتِ صفا، اس کے اندر نہایتِ صفا پیدا ہو جائے، نہایتِ پاکیزگی آ جائے، اس طرح سے کہ اس سے بڑھ کر آپ کیلئے ممکن نہ ہو یعنی دل تمام آلودگیوں سے پاک و

دل کب تابعِ قرآن ہوتا ہے؟

صاف ہوجائے، شیشے کی طرح ہوجائے،

☆ **و انمحاء صفاته......**

اور دل کی اپنی صفت ختم ہوجائے یعنی دل اپنی صفات کو ختم کر بیٹھے، اپنا رنگ ختم کردے تو اس وقت مظروف کے رنگ سے رنگین ہوجائے گا مثلاً جیسے پانی اور برتن کی مثال دی تھی کہ آپ شفاف پانی رنگین برتن میں ڈالیں تو پانی کا بھی وہی رنگ ہوجائے گا، اگر ہم چاہتے ہیں کہ برتن پر پانی کا رنگ چڑھے تو اس کے لئے آپ کو برتن کو شفاف کرنا پڑے گا یعنی برتن کا رنگ ختم ہو، جب تک برتن رنگین ہے تو پانی اپنا رنگ برتن پر نہیں چڑھا سکتا ہے، برتن کو اپنا رنگ ختم کرنا پڑے گا، اسی طرح سے دلِ انسان جب تک بہت سارے رنگوں سے رنگین ہے، بہت ساری صفات سے متصف ہے، بہت سارے حالات موجود ہیں تو جب تک اس کی اپنی صفاتِ قلبیہ موجود ہیں اس وقت تک قرآنی صفات اس پر طاری نہیں ہوں گی بلکہ قرآن تابعِ دل ہوگا۔

دل میں اگر اچھا رنگ رنگا ہوا ہو تو قرآن کے اوپر بھی اچھا رنگ چڑھ جاتا ہے لیکن اگر دلِ انسان اچھے رنگ سے رنگا ہوا نہ ہو بلکہ کسی منحرف اور تحریف شدہ رنگ سے رنگا ہوا ہو، کسی ملاوٹ والے رنگ سے رنگا ہوا ہو تو قرآن پر بھی وہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ جیسے اس وقت یہی نظر آتا ہے مثلاً تمام افراد، تمام اہلِ قرآن، تمام مذاہب، تمام فرق اپنے نظریات، اعتقادات اور سب کچھ قرآن سے استفادہ کرتے ہیں، درحقیقت قرآن نے ان پر اثر نہیں کیا ہے بلکہ ان کے دلوں نے قرآن پر اثر کیا ہے، جو مشرک ہے اس کو قرآن سے شرک نظر آتا ہے، جو موحد ہے اس کو قرآن میں توحید نظر آتی

ہے، جو غالی ہے اس کو قرآن میں غلو نظر آتا ہے، جو افراطی ہے اس کو قرآن میں افراط نظر آتا ہے اور جو تفریطی ہے اس کو قرآن میں تفریط نظر آتی ہے لہٰذا ہر ایک کو قرآن میں وہی چیز نظر آتی ہے کہ جیسا اس کا دل ہے، اس کے معانی یہ ہیں کہ دل صاف نہیں ہے، اگر انسان اپنے دل کو آمادہ کرے تو دل قرآن کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، قرآن کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ سارے دل اگر اس طرح سے ہوں اور آمادہ و صاف و شفاف ہوں اور قرآن کا رنگ سارے دلوں پر چڑھ جائے تو پھر اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور دل جب قرآنی ہو جائیں تو انسان کا وجود قرآنی ہو جاتا ہے، انسان کی ساری ہستی قرآنی ہو جاتی ہے، انسان کی سوچ و فکر قرآنی ہو جاتی ہے اور ایسے قرآنی انسانوں کا معاشرہ بھی ایک قرآنی معاشرہ بن جاتا ہے۔

دل کیسے تابع قرآن ہوتا ہے؟

یعنی اگر دل صاف و شفاف ہو جائے، اپنی صفات چھوڑ دے اور محض قرآن کے تابع ہو جائے تو جیسا قرآن ہوگا ویسا دل ہوگا مثلاً اگر ابھی ہم فہم کے لحاظ سے تفاسیر کو دیکھیں تو مختلف تفاسیر ہیں، ہر تفسیر ایک نیا مطلب بیان کر رہی ہے، کیوں بیان کر رہی ہے؟ قرآن اس مرحلے میں مفسرین کے تابع ہے، فہمِ قرآن، نزولِ قرآن مفسرین کے تابع ہے، جیسا مفسر کا ذہن تھا ویسا قرآن بن گیا، ایک نے قرآن سے جبر استفادہ کیا، ایک نے قرآن سے اختیار استفادہ کیا، ایک نے قرآن سے شرک استفادہ کیا، ایک نے قرآن سے توحید استفادہ کی، ہر ایک نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق استفادے کیے یعنی قرآن اسی رنگ میں رنگا گیا کہ جس رنگ میں ان کا ذہن رنگا ہوا تھا لیکن جن کے دل صاف و شفاف ہیں، ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے، اپنا کوئی نظریہ و مفروضہ نہیں ہے لہٰذا

جب قرآن ان کے دلوں میں جاتا ہے تو یہ دل قرآنی ہو جاتے ہیں، یہ نفوس قرآنی ہو جاتے ہیں، قرآن نے انسانی شکلیں وانسانی روپ بہت اپنائے ہیں لیکن انسان نے قرآنی شکل وروپ کم اپنایا ہے۔ انسان نے رنگِ قرآن کم اپنایا ہے، انسان نے خدائی رنگ کم چڑھایا ہے بلکہ دین کو رنگ دیا ہے، دین انسانی رنگوں میں رنگا گیا ہے لیکن انسان دینی رنگ میں بہت کم رنگا گیا ہے۔ یہ فرقے، گروہ، حزب، مختلف ہفتاد ودو ملت اور یہ سب ٹکڑے ٹکڑے کیوں ہیں؟ اس وجہ سے کہ دین کو اپنے رنگ میں رنگا ہے، خود دین کے رنگ میں نہیں رنگے گئے ہیں۔

پس قرآن کی خدمت میں جانے کے آداب میں سے یہ ہے کہ انسان دل کو پاک وصاف کر کے جائے، آراء ونظریات، افکار وخرافات، من گھڑت مفروضوں، رجحانات، خواہشات، آرزوؤں، توہمات، تخیلات، اور گناہوں سے پاک کر کے جب انسان شفاف آئینہ اور شفاف ظرف لے کر قرآن کے پاس جائے گا تو قرآن کے پاس بقدرِ کافی رنگ موجود ہے، الٰہی وربّانی رنگ موجود ہے، صبغۃ اللہ موجود ہے، صبغۂ خدا یعنی رنگِ خدا قرآن کے اندر موجود ہے، ایسے صاف دلوں کے اوپر رنگِ قرآن طاری ہو جاتا ہے۔

١١) جیسا عارف ویسی معرفت

☆ لما سئل الجنید عن المعرفة والعارف......

جب جنید سے معرفت اور عارف کے بارے میں پوچھا گیا کہ معرفت کیا چیز ہے اور

عارف کیا چیز ہے؟ جنیدِ بغدادی معروف اہلِ معرفت اور عرفاء میں ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ معرفت کیا ہے اور عارف کون ہوتا ہے؟ پہلے بھی بیان ہوا ہے کہ عارف یعنی جس کو معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہو، بارہا عرض ہوا ہے کہ اس وقت مذہبی شکلوں میں سے کہ جو منحرف ہوئی ہیں اور جن کے اندر تحریفات ہوئی ہیں اور لوگوں نے جن کی غلط صورتیں تیار کی ہیں ان میں سے ایک زیادہ مبتلا بہ مسئلہ یہی عرفان ہے کہ عرفان کے نام پر انحرافی شکلیں بہت پیدا ہوئی ہیں، آئے دن اس کی کوئی نہ کوئی شکل ظاہر ہوتی ہے اور اس وقت ایک فتنے کے طور پر یعنی جیسے لوگوں کے دین کی آزمائش کہہ لیں، بعض افراد کے لئے خصوصاً جوان طبقہ جو ان چیزوں سے متاثر بھی ہوتا ہے یہ دین کا ایک قسم کا امتحان ہے، عرفان سے مراد معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، معرفتِ اصولی اور معرفتِ حضوری دونوں معرفتیں عرفان ہی ہیں البتہ معرفت کے بھی درجات ہیں اور بقدرِ معرفت انسان مقربِ خدا ہے، قربِ خدا بقدرِ معرفتِ انسان ہے، جنیدِ بغدادی سے پوچھا گیا کہ معرفت کیا ہے اور عارف کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ

☆ فقال: لون الماء لون انائه.

پانی کا رنگ وہی ہوگا جو برتن کا رنگ ہے، یعنی معرفت وہی ہوگی جیسا عارف ہے، اگر اس تشبیہ کے اندر ہم عارف کو اِناء کی جگہ لے لیں اور معرفت کو ماء کی جگہ لے لیں، لیکن اگر ہم یوں کہیں کہ لون الماء لون انائہ یعنی ہم اِناء کی جگہ معروف کو لیں، ظاہراً جنابِ جنید کی مراد بھی یہی تھی، ہم اِناء کی جگہ یعنی برتن کی جگہ معروف کو لیں۔ کہا کہ جیسا معروف ہے ویسا عارف ہے، یعنی آپ کس کی

جیسا عارف ویسی معرفت

معرفت چاہتے ہیں؟ خدا کی، تو عارف متصف بہ اوصافِ خدا ہو جائے گا، کیوں؟ کیونکہ

☆ **لون الماء لون انائه.**

اور معرفتِ عارف ایسی معرفت ہوگی کہ معروف کی صفات سے معرفت بھی متصف ہو جائے گی، معرفت پر معروف کا رنگ چڑھا ہوا ہوگا لہٰذا عارف پر بھی رنگِ معروف چڑھا ہوگا۔

۱۲) مکاشفۂ قرآنی

☆ **واعلم: ان الله نعت العرش بما نعت، به القرآن......**

خداوند تبارک وتعالیٰ نے جن صفات سے قرآن کو متصف کیا ہے اور جو توصیف قرآن کی بیان کی ہے اسی طرح کی توصیف عرش کی بھی کی ہے، فرماتے ہیں کہ یہ ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ یہ بصیرتِ کشفیہ ہے، ہمارے لئے یہ مطلب کہاں سے کشف ہوا ہے؟ اسی قرآن سے ہی کشف ہوا ہے، قرآن انسان کے لئے الہام بخش ہے، قرآن منبعِ مکاشفاتِ انسان ہے، اگر انسان قرآن کے اندر غور کرے، تدبر کرے کہ جیسے پہلے بیان ہوا ہے تو قرآن منبعِ مکاشفاتِ انسان ہے، بہت کچھ کشف ہوتا ہے، اسرار کشف ہوتے ہیں، دنیا کشف ہوتی ہے، قرآن کے اسرار نہ ختم ہونے والے ہیں، صرف انسان دلِ آمادہ لے کر قرآن کی خدمت میں جائے پھر دیکھے کہ قرآن کس طرح اپنا صندوق کھولتا ہے، خزانے کھولتا ہے اور انسانِ عارف کو اپنی طرف کشش و جذب کرتا ہے۔

اسی ادبِ ہشتم کے ذیل میں گزرا تھا کہ قرآن کے اندر درحقیقت عالمِ ملکوت کی ایک

مقناطیسیت ہے، ملکوتی مقناطیسیت ہے، اگر دلِ انسان آمادہ ہوتو قرآن اس دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے لیکن اگر دل زنگ خوردہ ہوتو زنگ والی چیز کو مقناطیس اپنی طرف نہیں کھینچتا ہے، قرآن کے اندر جاذبہ ہے لیکن اس جاذبے میں مجذوب ہونے کے لئے انسان کو صاف وشفاف وآمادہ ہونے کی ضرورت ہے، یہ ہمیں کہاں سے پتہ چلا؟ فرماتے ہیں کہ قرآن رحمان کی طرح ہے اور دلِ انسان عرش ہے، فرماتے ہیں کہ خود قرآن نے راہنمائی کی ہے، ہمارا یہ مکاشفہ قرآنی مکاشفہ ہے چونکہ قرآن مجید نے کچھ صفات عرش کے لئے ذکر کی ہیں اور وہی صفات قرآن کے لئے بھی ذکر کی ہیں، جن صفات سے عرش کو متصف کیا ہوا ہے انہی صفات سے قرآن کو متصف کیا ہے، پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش میں اور قرآن میں ایک نسبت ہے،

☆ **فكل قرآن مستو لعرشه ......**

پس کل قرآن درحقیقت عرش پر مستوی، متمکن اور مستقر ہے،

☆ **بالصفة الجامعة لهما......**

کس طرح سے مستقر ہے؟ ایسی صفات کے ذریعے سے کہ جو دونوں کے اندر موجود ہیں یعنی عرش اور قرآن دونوں کے اندر موجود ہیں، یعنی دل عرش ہے اور قرآن بعنوانِ سلطان اس کے اوپر متمکن ہے لیکن یہ تمکن اس صفت میں ہے کہ جو دونوں کی صفت ہے یعنی وہی دل کی صفت ہے اور وہی قرآن کی بھی صفت ہے،

☆ **فقرآن كريم لعرش كريم......**

مکاشفۂ قرآنی

قرآنِ کریم میں قرآن کو کریم سے متصف کیا گیا ہے،

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌo(۱۱)

پس قرآنِ کریم کہاں ہوگا؟ قرآنِ کریم عرشِ کریم میں ہوگا،

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِo(۱۲)

قرآن میں بھی عرش کے ساتھ لفظِ کریم استعمال ہوا ہے۔عرشِ کریم یعنی دلِ انسان جب کریم ہوگا۔ یہ دو طرح سے ہے یا دلِ انسان کریم ہوتا کہ قرآنِ کریم اس میں اترے یا پھر دل اس طرح سے ہے کہ جب قرآن آئے گا تو جس طرح سے قرآن کریم ہے دل کو بھی کریم بنا دے گا۔

☆ وقرآن مجید لعرش مجید......

اسی طرح سے قرآن ماجد ہے یعنی بزرگی رکھتا ہے لہٰذا یہ قرآن بھی دلِ مجید کے لئے ہے، عرشِ مجید کے لئے ہے،

وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِo(۱۳)

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌo(۱۴)

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُo(۱۵)

قرآن میں عرش کیلئے مجید کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔قرآنِ مجید غیر مجید مکان پر نہیں اترتا ہے، غیر مجید محل پر نہیں اترتا ہے، اگر دلِ انسان میں مجد نہ ہو تو اس صورت میں اس کے دل میں قرآن مجید اترنے نہیں آئے گا۔قرآنِ نحوی آئے گا، قرآنِ صرفی آئے گا، قرآنِ لغوی آئے گا، قرآنِ عربی

آئے گا، قرآنِ لفظی آجائے گا لیکن قرآنِ مجید نہیں آئے گا، وجد و بزرگی قرآن انسان کے دل کے قریب نہیں آئے گی،

☆ وقرآن عظیم لعرش عظیم......

قرآنِ عظیم عرشِ عظیم کے لئے ہے،

وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ٥(١٦)

وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ٥(١٧)

اگر قرآن عظیم ہے، باعظمت ہے تو قرآن محلِ باعظمت میں آسکتا ہے، مگر محل باعظمت نہ ہو تو قرآنِ باعظمت اس عرش پر نازل نہیں ہوگا۔

☆ والدرجات الرفیعه لذی العرش کالایات والسور للقرآن......

عرش کے لئے درجات و مقامات ہیں یعنی سیڑھیاں ہیں کہ جو اس کے درجے ہیں۔ پہلا درجۂ عرش، دوسرا درجۂ عرش، تیسرا درجۂ عرش، یہ سیڑھیاں کیسی ہیں؟ فرماتے ہیں کہ یہ مانندِ آیات و سورہ ہای قرآن ہیں، یہ عرش کے درجات اور سیڑھیاں ہیں۔

☆ ولهذا ورد فی الحدیث:......

اسی لئے حدیث کے اندر آیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے فرزند محمد ابن حنفیہ سے یہ جملہ بیان فرمایا تھا کہ

☆اقراء وارق کما کنت تقرأ......

اقراء یعنی پڑھ اور ارق یعنی ارتقاء کر، ارتقاء یعنی اوپر، ترقی کرتا جا تکامل کرتا جا، جیسے جیسے تلاوت کرتے جاؤ سیڑھی بہ سیڑھی اوپر چڑھتا جاؤ، پس درحقیقت قرآن کی آیات اور قرآن کی سورتیں درجے ہیں، یہ سیڑیاں ہیں اور ہم نے کس طرح سے پڑھنا ہے؟ پڑھنا ہے اور آگے ارتقاء کرنا ہے، یعنی جس طرح تو آیہ بہ آیہ پڑھتا ہے اسی طرح سے آیہ بہ آیہ، سورہ بہ سورہ ترقی بھی کرتا جا مثلاً انسان ایک سورہ پڑھتا ہے تو ایک سورۂ قرآن سے متصف ہو جائے، اب دوسرا سورہ پڑھتا ہے تو دوسری سورہ سے متصف ہو جائے؛ اسی طرح ایک آیہ پڑھتا ہے تو اس آیہ سے متصف ہو اور دوسری آیہ پڑھتا ہے تو اس آیہ سے متصف ہو۔ ہم انشاء اللہ فصلِ ادبِ نہم کے اندر اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

۱۳) قرآنِ مجید خُلقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے

☆ **فاذا نزل القرآن علی قلب عبد و ظهر فيه حكمه، و استوى عليه بجميع ماهو عليه مطلقا......**

قرآن جب قلب پر نازل ہو جاتا ہے تو جو کچھ قرآن کے اندر ہے وہ دل میں آ جاتا ہے، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

☆ **و كان خلقا لهذا القلب......**

قرآن خُلق بن جاتا ہے، اس دل کے لئے صفت بن جاتا ہے، اس دل کے لئے مَلَکہَ

راسخہ و صفتِ راسخہ بن جاتا ہے،

☆ **كان هذا القلب عرشا له......**

جب قرآن صفت بن کر مقرر و مستقر ہو جائے تو اس وقت انسان کا دل قرآن کا عرش بن جاتا ہے، دلِ انسان میں قرآن کا اتنا نزول ہو کہ قرآن صفتِ انسان بن جائے نہ کہ فقط تلفظِ انسان و قرآن، نہ فقط سماعتِ انسان و قرآن، نہ فقط عقیدۂ انسان و قرآن، نہ فقط مفہومِ قرآن، نہ فقط صوت و لحن کے طور پر بلکہ جب قرآن صفتِ دلِ انسان بن جائے تو اس وقت انسان کا دل قرآن کا عرش بن جاتا ہے۔

☆ **كما قيل عندما سئل عن خلق رسول الله صلى الله عليه و آله: ......**

یہ زوجۂ رسول ﷺ سے پوچھا گیا تھا کہ خُلقِ رسول ﷺ کیسا ہے؟ اخلاقِ رسول ﷺ کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ

☆ **كَانَ خُلُقُهُ الْقُرآنَ......**

خُلقِ رسول ﷺ قرآنِ مجید ہے، قرآن صفتِ پیغمبر اکرم ﷺ ہے اور وہی صفت عمل میں آتی ہے یا اعضاء و جوارح میں وہی آتا ہے کہ جو خُلقِ انسان ہے، یہ اخلاقیات ہیں کہ جو عمل میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اس لئے کہتے ہیں کہ قرآن مہجور ہے، جب تک یہاں نہیں پہنچتا ہے، قرآن مستقر بر دل نہیں ہو جاتا ہے، دل عرشِ قرآن نہیں بن جاتا ہے اور خُلق نہیں بن جاتا ہے تو اس وقت تک قرآن مہجور ہے،

قرآن مجید خُلقِ رسول ﷺ ہے

☆ **فما من آیۃ الا ولها حکم فی قلب هذا العبد......**

ہر آیہ کہ جو دل کے اندر موجود ہے تو اس دل کے اوپر اس آیہ کی حکومت اور اقتدار ہے۔

پس قرآن جب انسان کی صفتِ راسخ بن جائے تو اسی کو خُلق کہتے ہیں اس طرح قرآن انسان کا اخلاق، تفکر، سیرت، عمل اور راستہ بن جاتا ہے اور انسان ایک مجسم و متحرک قرآن بن جاتا ہے، صفاتِ قرآن، معالمِ قرآن و معارفِ قرآن وجودِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں راسخ تھے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہمارے لئے اسوہ ہے۔ اس فصل کے اگلے حصے میں انشاءاللہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ تلاوت بھی درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۸۲)

(۲)......(سورۂ مبارکہ شمس، آیہ ۷)

(۳)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۲۹)(سورۂ مبارکہ فصلت، آیہ ۱۱)

(۴)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۵۴)(سورۂ مبارکہ یونس، آیہ ۳)(سورۂ مبارکہ رعد، آیہ ۲)
(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ ۵۹)(سورۂ مبارکہ سجدہ، آیہ ۴)(سورۂ مبارکہ حدید، آیہ ۴)

(۵)......(سورۂ مبارکہ طٰہٰ، آیہ ۵)

(۶)......(تفسیر نمونہ - جمعی از فضلا)

(۷)......(سورۂ مبارکہ القلم، آیہ ۴)

(۸)......(الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰہِ المُنزَل - الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظلہ، الجزء ۱۸، صفحہ ۵۲۹)(تفسیر مجمع البیان - امین الاسلام أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ، الجزء ۱۰، صفحہ ۵۷)(تفسیر نور الثقلین، الجزء ۵، صفحہ ۳۲۰)(بحار الأنوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ۱۶، صفحہ ۲۱۰)(میزان الحکمۃ - الریشھری، الجزء ۳، صفحہ ۱۰۸)(اخلاق از دیدگاہ قرآن، پیامبرؐ و عترتؑ، الجزء ۲، صفحہ ۲)(الأخلاق عنوان الایمان ومنطلق التقدم، الجزء ۱، صفحہ ۱۳)(اخلاق در قرآن، الجزء ۳، صفحہ ۸) (مفاهیم القرآن - العلامۃ جعفر السبحانی مدظلہ) (رسالہ سیروسلوک بحرالعلومؒ)
(معراج السعادۃ)(مکارم الأخلاق)

(۹)......(سورۂ مبارکہ تین، آیہ۴)

(۱۰)......(کان خلقه القرآن)(الاکلیل فی استنباط التنزیل - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی، الجزء ۱، صفحه ۲۷۱)(مباحث فی علوم القرآن - صبحی الصالح، الجزء ۱، صفحه ۲۰)(بصائر ذوی التمییز فی لطائف - الکتاب العزیز مجد الدین أبوطاهر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی، الجزء ۲، صفحه ۵۶۸)(نزول القرآن والعنایة به فی عهد النبیؐ - عبد الودود مقبول حنیف، الجزء ۱، صفحه ۱۶۸)(فضائل القرآن للقاسم بن سلام - أبو عُبید القاسم بن سلام بن عبد الله الهروی البغدادی، الجزء ۱، صفحه ۱۱۱)(بیان المعانی مرتب حسب ترتیب النزول عبد القادر بن ملّا حویش السید محمود آل غازی العانی، الجزء ۱، صفحه ۷۷)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ۷۷)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ مؤمنون، آیہ۱۱۶)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ ق، آیہ۱)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ بروج، آیہ۲۱)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ بروج، آیہ۱۵)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ حجر، آیہ۸۷)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ توبہ، آیہ۱۲۹)

فصلِ ادبِ ھشتم

﴿تاثر و وجد﴾

(حصّہ پنجم)

١)رسولِ اکرم ﷺ کا طریقۂ تلاوت

٢)عینِ تدبر و فہمِ قرآن

٣)عرشِ دل پر قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ

٤)فقط ظواہرِ قرآن پہ توجہ مطلوب نہیں

٥)فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے

٦)حقیقتِ تقویٰ اور اس کے آثار

٧)قرآن اور انسان میں تشابہ،کب اور کیسے؟

٨)فہمِ حقیقی،مرادِ متکلم کا حصول

٩)قرآن کو خودمتکلم سے سمجھیں

۱)رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ تلاوت

صدر المتالھین رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اس کتاب میں فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن پڑھنے کا طریقہ کار یہ تھا،

☆ **وكان رسول الله صلى الله عليه و آله فى تلاوته......**

یعنی سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسلسل، مرتب، بغیر کسی وقفے کے اور بغیر کسی خلل کے سیرت یہ تھی کہ

☆ **اذا مر بآية نعيم......**

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی آیہ پر گزرتے تھے کہ جو نعمت کا تذکرہ کر رہی ہوتی تھی،

☆ **يسئل الله من فضله......**

تو آیتِ نعمت پر خداوند تبارک وتعالیٰ کا تفضّل وفضل طلب فرماتے تھے یعنی جب کسی قوم پر، کسی ماجرے میں، کسی نبی پر، کسی انسانِ صالح پر یا کسی شخص پر بھی خدا نے کوئی نعمت نازل کی ہوتی تھی تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فضلِ الٰہی سے اس کو طلب فرماتے تھے،

☆ **واذا مر بآية عذاب و وعيد يستعيذ منه......**

اور جب کسی عذاب و وعید کی آیت پر گزرتے تھے تو وہاں پر خداوند تبارک وتعالیٰ سے استعاذہ فرماتے تھے یعنی پناہ مانگتے تھے۔

۲)عینِ تدبر و فہمِ قرآن

جیسے گزشتہ فصل میں عرض کیا تھا کہ یہ حالت انسان پر اس وقت طاری ہوتی ہے کہ جب انسان اپنے آپ کو مخاطَبِ قرآن قرار دے، اگر مخاطبِ قرآن واقع نہ ہو سکے تو ہرگز تاثیر و تاثر و وجد یہ حالات انسان پر طاری نہیں ہوتے ہیں، انسان پہلے ہر آیہ کا مخاطب بنے کہ ہر آیہ مجھ سے خطاب کر رہی ہے، ہر آیہ مجھے کچھ پیغام دینا چاہتی ہے یعنی یوں گمان کرے کہ قرآن فقط میرے لئے نازل ہوا ہے، فقط میری ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اس کا کلمہ کلمہ، جملہ جملہ مجھ سے خطاب کر کے مجھے کچھ نہ کچھ پیغام دے رہا ہے، اس وقت انسان ہر نعمت کی آیت میں خداوند تبارک وتعالیٰ سے کچھ طلب کرتا ہے، یہی نعمتیں کہ جو خدا نے دوسروں کو دی ہیں مثلاً اگر خداوند تبارک وتعالیٰ نے تذکرہ کیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو فضیلت عطا کی ہے تو انسان خدا سے طلب کرتا ہے کہ یہ فضیلت ہمیں بھی ملنی چاہئے، اگر ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکِ عظیم عطا کیا ہے تو انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے طلب کرتا ہے کہ یہ ملکِ عظیم اور یہ دولتِ کریمہ ہمارے عصر میں بھی ہو، اگر خداوند تبارک وتعالیٰ نے کسی کی دنیوی نعمتیں اور اخروی نعمتیں ذکر کی ہیں مثلاً اگر لقمان علیہ السلام یا دیگر عبادِ صالح کیلئے خداوند نے فرمایا کہ ہم نے انہیں حکمت عطا کی ہے تو انسان خدا سے طلب کرے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکمت ہمیں بھی عطا ہو۔ جب عذاب اور وعید کے تذکرے آتے ہیں کہ ہم نے قومِ عاد و قومِ ثمود و قومِ لوطؑ پر عذاب نازل کیا ہے تو انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے پناہ مانگے کہ یہ عذاب ہم پر نازل نہ ہو،

☆ واذا مر بآية قصص يعتبر......

وہ آیات جن میں قصص ہیں، جن میں سابقہ امتوں کے یا بعض افراد کے قصے اور داستانیں بیان کی گئی ہیں تو ان سے عبرت حاصل کرے ہے یعنی ہر انسان عبرت حاصل کرے،

☆ و هذا عين التدبر لايات القرآن و الفهم......

اور یہ عینِ تدبر در آیاتِ قرآن اور عینِ فہمِ قرآن مجید ہے، یعنی جب انسان آیاتِ نعمت میں پہنچے تو وہاں سے طلبِ فضلِ خداوند تبارک وتعالیٰ کرے اور جب انسان آیاتِ عذاب و وعید پہ پہنچے تو بارگاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ میں پناہ مانگے چونکہ یہ سوچتا ہے کہ یہ آیات مجھے کہہ رہی ہیں، مجھے یہ سب کچھ سنایا جارہا ہے، جب کسی آدمی کو مستقیم خطاب کیا جائے تو اسے کہا جاتا ہے کہ تم یوں کرو، تم ایسا کرو، قرآن کے خطابات بہت سارے لوگوں کی طرف مستقیم ہیں لیکن خطاب غیر مستقیم انداز میں ہے یعنی انڈائریکٹلی (Indirectly) خطاب ہے۔

لوگوں کی اکثریت سے قرآن نے غیر مستقیم خطاب کیا ہے اور اقلیت سے مستقیم خطاب کیا ہے۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے چونکہ اکثریت حاضر نہیں ہوتی ہے لہٰذا اکثریت سے غیر مستقیم خطاب کیا جاتا ہے یعنی اس طرح سے کہ مستقیم بات کسی اور سے ہو رہی ہوتی ہے لیکن مقصود کوئی اور ہوتا ہے، سنایا کسی اور کو جاتا ہے لیکن سنانا کسی اور کو مقصود ہوتا ہے۔ غیر مستقیم خطاب یہ ہے کہ اگر آپ کسی شخص کو کسی نکتے کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو ایک داستان، کہاوت، محاورہ یا ضرب المثل اس کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ غیر مستقیم سمجھانا ہے یعنی آپ انہیں ان غیر مستقیم طور طریقوں سے تفہیم

کرتے ہیں تا کہ یہ شخص متوجہ ہو جائے، جتنے بھی قصے قرآن مجید نے ذکر کیے ہیں ان قصوں سے مقصود فقط ان قوموں کے حالات سے ہمیں آگاہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان قوموں کے تذکروں سے ہمیں غیر مستقیم طریقے سے کچھ سمجھانا ہے مثلاً محاورہ یا ضرب المثل ایسے ہی استعمال ہوتی ہے، یہ ایک غیر مستقیم خطاب ہوتا ہے، غیر مستقیم تعریف ہوتی ہے، غیر مستقیم سرزنش ہوتی ہے، غیر مستقیم طور پر انسان کوئی نہ کوئی نکتہ دوسرے کو تفہیم کرتا ہے۔

عرشِ دل پر قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ

۳)عرشِ دل پر قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ

☆ فاذا لم یکن العبد فی تلاوته کذلک......

اگر عبد کا تلاوت میں یہ حال نہ ہو یعنی قرآن پڑھتا جاتا ہے لیکن آیاتِ نعمت میں تفضلِ الٰہی طلب نہیں کرتا، آیاتِ وعد میں استعاذہ نہیں کرتا، آیاتِ قصص سے عبرت نہیں لیتا ہے، یہ آیات اس کی صفت نہیں بنتی ہیں، انسان کے وجود میں نہیں اترتی ہیں اور خُلقِ انسان نہیں بنتی ہیں یعنی تلاوت کر رہا ہے لیکن اگر انسان پر یہ حالت طاری نہیں ہے تو

☆ فما نزل علی قلبه القرآن......

اس کے دل پر قرآن ابھی نازل نہیں ہوا،

☆ ولا کان عرشاً لاستوائه......

اور قرآن کے استوا کے لئے اس کا دل عرش بھی نہیں ہے، درحقیقت جیسے ابھی حدیث میں

بیان کریں گے کہ یہ وہ انسان ہے کہ جو صرف تلفظِ الفاظِ قرآن کر رہا ہے،

☆ **لانه ما استوی علیه بهذه الاحکام......**

چونکہ قرآن اپنے ان احکام کے ذریعے سے اس کے دل پر محیط و مستقر نہیں ہوا ہے،

☆ **وکان نزوله علی قلبه احرفاً ممثلة فی خیاله......**

درحقیقت اس نے حروفِ قرآن کو اپنے تخیل میں تجسم دیا ہوا ہے، جیسے یہ عمومی حالت ہے، انسان عام علوم میں بھی اسی مشکل سے دوچار ہے جیسے قرآن کے بارے میں ہے یعنی انسانوں کی اکثریت اسی مشکلِ فہم سے دوچار ہے اور یہیں پر ہمیں کچھ گمان ہونے لگتا ہے کہ گویا ہم کچھ جانتے ہیں درحالیکہ کچھ بھی نہیں جانتے ہیں۔

مثلاً اگر ہم سے چاہا جائے کہ آپ ایک عدد ذہن میں تصور کریں، ایک عدد کو درک کریں تو ہم فوراً جواب دیتے ہیں کہ میں نے درک کر لیا ہے مثلاً آپ سو (۱۰۰) کا عدد اپنے ذہن میں تصور کرتے ہیں، سب انسان تصور کر لیتے ہیں اور فی الفور ذہن میں سو آ جاتا ہے، اب ان سے پوچھیں کہ جو ذہن میں تصور کیا ہے وہ دکھائیں کہ آپ نے ذہن میں کیا تصور کیا ہے؟ تو لکھ کر دکھائیں گے کہ یہ عدد سو (۱۰۰) ہے، وہی سو کا عدد کہ جس کی ہمارے ذہن میں تصویر ہے، یہ وہی ہے جو بلیک بورڈ پر، وائٹ بارڈ پر، کتاب پر یا کاغذ پر لکھا ہوا ہے یعنی ایک کھڑی لائن ہے اور اس کے آگے دو نقطے ہیں، یہ ہمارا سو ہے، لیکن یہ تو لائن، نقطے اور سیاہی ہیں، یہ علامتیں ہیں یہ تو سو نہیں ہیں، یہ سو کی علامت ہے، یہ کتابتِ سو ہے نہ کہ خود عددِ سو ہے، عدد ایک کمیت کا نام ہے، ایک کوانٹٹی (Quantity) کا نام

ہے، عدد ایک حقیقت واقعیت اور ماہیت ہے، ہمیں اس واقعیت کی کوئی خبر نہیں ہے، یہ اس واقعیت کے لئے ایک علامت ہے کہ جو ہم نے مقرر کی ہوئی ہے تا کہ اس کی طرف متوجہ ہوں، یہ کیا ہوا ہے؟ ہم نے علامتِ سو کو نہ کہ خودِ سو کو ذہن میں تجسم دیا ہے۔

اسی طرح سے جتنے بھی حقائق ہیں مثلاً ہم فرشتہ تصور کریں تو ذہن میں کس طرح لاتے ہیں؟ ف ر ش ت ہ، یہ ہمارے ذہن میں فرشتہ ہے یعنی ہم لفظِ فرشتہ کو ذہن میں مجسم کر لیتے ہیں نہ کہ حقیقتِ فرشتہ ذہن میں لاتے ہیں، نہ اس کی تصویر و حقیقت ہمارے ذہن میں آتی ہے اور نہ ہم ادراکِ فرشتہ پر قادر ہیں، اسی طرح جنّ کیا چیز ہوتی ہے؟ ج ن، یہ ہمارا جنّ ہے یعنی لفظِ جن کو ہم ذہن میں تصور کر لیتے ہیں درحالیکہ اس کی حقیقت کچھ اور ہے یعنی ہم کوئی نہ کوئی لفظ ذہن میں تجسم کر لیتے ہیں اور تجسمِ الفاظ کر کے گمان کرتے ہیں کہ یہ علم و معرفت اور حقیقت ہے، اسی طرح سے خدا کے نام پر کیا چیز ہمارے ذہن میں ہے؟ خود لفظِ خدا یعنی خ د ا، یا اللہ مثلاً ا ل ل ہ، اس کو ہم نے اللہ سمجھا ہوا ہے، ہمارے ذہن میں تجسمِ لفظِ خدا ہے، تجسمِ لفظِ اللہ ہے، ذہن میں قیامت کا تجسم کریں یا حقیقتِ قیامت کو درک کریں تو خود لفظِ قیامت کو ہم ذہن میں مجسم کر لیتے ہیں اور اسی طرح سے باقی تمام معارف کو بھی قیاس کریں، قرآن بھی اسی مشکل سے دو چار ہے، تمام علوم و معرفت کہ جو انسان کے لئے ضروری ہیں اس معرفت میں انسانوں کی اکثریت اسی مشکل میں دو چار ہے کہ معرفت کے بجائے، حقائق کے بجائے، ان حقائق کی وضع شدہ علامتوں کو ذہن میں تجسم کر کے گمان کرتے ہیں کہ یہ علم ہے۔

قرآن جو ہدایت و حقیقت ہمیں پیش کرتا ہے، جو نوع ہمیں پیش کرتا ہے اور ہمارے لئے لے کر آیا ہے اور جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو الفاظِ قرآن کو ذہن میں تجسم دے کر، تخیل میں مجسم کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو سمجھ لیا ہے، مثلاً

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ......

یا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ o

یہ صرف آیات ہیں کہ جو ہمارے ذہن میں، ہمارے تخیل میں مجسم ہیں، کیا دلیل ہے کہ فقط الفاظِ قرآن کو ہم نے ذہن میں مجسم کیا ہے اور حقیقتِ قرآن ہمارے ذہن میں نہیں آئی ہے؟ دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن کی حقیقت ہمارے دل میں ہوتی نہ کہ فقط الفاظ تو قرآن ہمارا اخلق بن گیا ہوتا، قرآن ہمارے لئے صفت بن گیا ہوتا، قرآن کا رنگ ہمارے دل پہ چڑھ گیا ہوتا، قرآن ہمارا عمل بن گیا ہوتا، قرآن ہمارا تفکر بن گیا ہوتا، ہماری زندگی اور حیات ساری کی ساری قرآنی و نورانی ہو جانی چاہئے تھی درحالیکہ ہم قرآنی الفاظ سے سروکار رکھنے کے باوجود بھی قرآنی صفات سے یا قرآنی ملکات سے خالی ہیں، اس وجہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے اوپر نزولِ قرآن نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے فقط حروفِ قرآن کو اپنے تخیل میں مجسم کیا ہوا ہے،

☆ و کان له فی تلاوته اجر الترجمة......

اس شخص کو فقط تلاوت کرتے ہوئے ترجمے کا اجر ملے گا یعنی فقط عبارتوں کا اجر ملے گا،

عربی دل پر قرآن نازل نہ ہونے کی وجہ

معانی کا اجر نہیں ملے گا، حقائق کا اجر نہیں ملے گا، فرض کریں کہ اگر ہم تاثیر کے قائل ہو جائیں مثلاً الفاظ کی بھی تاثیر ہو، معانی کی بھی تاثیر ہو، حقائق کی بھی تاثیر ہو، قرآن کی جگہ اگر ہم دنیوی مثال لیں مثلاً پیسہ یا سرمایہ لفظ ہیں، روپیہ ایک لفظ ہے، یہ لفظ ایک حقیقت کے لئے ہے، اگر انسان کے پاس یہ حقیقت نہ ہو لیکن انسان نے ذہن میں فقط لفظ تجسم کیا ہوا ہو یعنی انسان صرف لفظِ پیسہ یا لفظِ سرمایہ ذہن میں مجسم کر لے اور اپنے آپ کو مالدار سمجھنا شروع کر دے، اپنے آپ کو سرمایہ دار انسان سمجھنا شروع کر دے، لفظِ پیسہ سے تو انسان پیسوں والا نہیں ہو جاتا ہے، لفظِ مال سے یعنی مال کے لفظ کو ذہن اور تخیل میں لانے سے تو انسان مالدار نہیں ہو جاتا ہے، لفظِ سرمایہ کو ذہن میں مجسم کرنے سے تو انسان سرمایہ دار نہیں ہو جاتا ہے، انسان سرمایہ دار اس وقت ہوتا ہے کہ جب اس لفظ کے پیچھے وہ حقیقت بھی ہمارے پاس موجود ہو کہ جس حقیقت کی طرف یہ لفظ ہماری راہنمائی کرتا ہے، اسی طرح سے اور دنیوی الفاظ اور قرآن کے الفاظ بھی ہیں، جتنی تاثیر الفاظ کی ہے اتنی تو ہو گی لیکن الفاظ جن حقائق کی طرف ہماری راہنمائی کر رہے ہیں اگر وہ حقائق نہ ہوئے تو ہرگز ہم اجرِ حقیقتِ قرآن و اجرِ معانیٔ قرآن حاصل نہیں کر پائیں گے۔

فقط ظواہرِ قرآن پہ توجہ مطلوب نہیں

٤) فقط ظواهرِ قرآن په توجه مطلوب نهیں

☆ کما قال صلی اللّٰہ علیہ وآلہ فی حق قوم من حفاظ حروف القرآن:......

وہ قوم، وہ لوگ کہ جو قرآن کے الفاظ، قرآن کے حروف اور قرآن کے کلمات کو حفظ کرتے ہیں یا حافظِ قرآن بنتے ہیں ان میں سے بعض کے بارے میں کہ جو اس کے مصداق ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

☆ یقرؤن القرآن ولا یجاوز حناجرھم......

یہ قرآن پڑھتے ہیں لیکن قرآن ان کے حُنجرے سے نیچے نہیں جاتا ہے یعنی ان کے گلے سے نیچے نہیں جاتا ہے چونکہ ادائے الفاظ کے مخارج گلے سے اوپر اوپر ہیں، ایک دو مخرج گلے کے نچلے حصے میں ہیں لیکن باقی سب کے سب منہ میں ہیں، مثلاً کچھ تالو میں، کچھ گلے کے ابتدائی حصے میں، کچھ لبوں میں یعنی جتنا بھی تلفظ کا شعبہ ہے وہ سارا گلے اور حلق سے اوپر اوپر اور باہر ہے، حنجرہ اس گلے کو کہتے ہیں کہ جہاں سے انسان کی آواز نکلتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بعض قرآن پڑھتے ہیں لیکن یہ قرآن ان کے حنجرے سے نیچے نہیں جاتا ہے بلکہ گلے کی حد تک رہتا ہے یعنی قرآن ان کے مخارج میں ہی گھوم رہا ہے اور گلے سے گھوم کر باہر آجاتا ہے، آنکھوں سے اندر جاتا ہے یعنی آنکھوں سے قرآن کو دیکھتے ہیں، آیتِ قرآن کو دیکھتے ہیں اور آنکھوں سے گلے میں گھما کے باہر پھینک دیتے ہیں۔

تلفظ پھینکنے کو کہتے ہیں، لفظ کا لغوی معنیٰ پھینکنا ہے اور لافظ یعنی پھینکنے والا، لفظتُ یعنی میں نے پھینک دیا، بات کرنے کو لفظ اسی وجہ سے کہتے ہیں چونکہ انسان پھینکتا ہے، زبان سے الفاظ، کلمات اور حروف پھینکتا ہے اس وجہ سے اس کو تلفظ کہتے ہیں یعنی پھینکنا، یہ قرآن کو پھینکنا ہے یعنی

فقط ظواہرِ قرآن پہ توجہ مطلوب نہیں

آنکھوں یا کانوں سے قرآن اندر وارد ہوتا ہے لیکن گلے میں گھوم کر مخارج میں تبدیل ہوتا ہے اور بعض نے مخارج کی تمرین زیادہ کی ہوئی ہے اور ان کے دقیق تر مخارج سے قرآن پورے گلے سے گھوم کر پھر باہر آجاتا ہے یعنی قرآن کو پھینک دیتے ہیں، تلفظِ قرآن تو قرآن کو پھینکنا ہے، قرآن اندر جائے، قرآن انسان کے اندر منتقل ہو، ذہنِ انسان و قلبِ انسان میں منتقل ہو اور قرآن صفتِ انسان بن جائے، انسان اس طرح سے قرآن کے ساتھ محشور و مانوس ہو۔

☆ **ای لم یصل من مقدم الدماغ الا الی لسانهم وحناجرهم، لا الی صدورهم وقلوبهم......**

یعنی قرآن ان کے صدور و قلوب تک نہیں پہنچا ہے بلکہ فقط ان کی زبان تک پہنچا ہے، ان کے گلے تک پہنچا ہے، قرآن فقط حروف و مخارج کی حد تک ہے۔

فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے

۵) فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے

☆ **و لیس التالی فی الحقیقة الا من تلاه من قلبه ......**

فرماتے ہیں کہ تالیٔ قرآن حقیقتاً وہ شخص ہے کہ جس کا دل تالیٔ قرآن ہو، جس کا دل تابع و ہمراہِ قرآن ہو، جو اپنے دل کے ہمراہ قرآن کے پیچھے ہو، کونسا دل؟

☆ **المنشرح بنور القرآن......**

وہ دل جو نورِ قرآن سے منشرح ہے، وسیع ہوگیا ہے، اس میں شرحِ صدر اور نورانیت آگئی

ہے،

☆ وقلب المؤمن وسعه كالعرش الذى وسع استواء الرحمن......

درحقیقت دلِ مومن کے اندر قرآن کی گنجائش ہے، دلِ مومن ہی تالیِ قرآن بن سکتا ہے۔ جس طرح سے عرش کے اندر استوائے رحمان کی گنجائش ہے، جس طرح عرش فقط رحمان کے لئے محل واقع ہوسکتا ہے اسی طرح سے دلِ مومن محلِ قرآن واقع ہوسکتا ہے، عرش یعنی اقتدارِ الٰہی کہ درحقیقت خدا کا احاطہ، خدا کی قدرت اور خدا کا سارا نظام اسی مقام سے انجام پا سکتا ہے، اقتدارِ الٰہی بغیر عرش کے قائم نہیں ہے، اسی طرح دل کے بغیر قرآن جسم کے کسی اور حصے میں نہیں آسکتا ہے، نہ آنکھوں میں، نہ زبان میں، نہ مغز میں، نہ خلیات میں، نہ کسی اور حصے میں بلکہ قرآن فقط دلِ انسان میں سما سکتا ہے اور دل سے مراد مرکزِ فہم انسان ہے نہ کہ یہ پمپ (Pump) ہے جو پسلیوں کے اندر موجود ہے، یہ جسم ہے۔

☆ الذى هو رفيع الدرجات ذو العرش......

خداوند تبارک وتعالیٰ رفیع الدرجات ہے اور صاحبِ عرش ہے،

☆ وما احسن التنبيه على هذا بقوله:......

کس طرح سے زیبا اور خوبصورت قرآن نے ہماری توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی ہے، اس آیہ کریمہ میں کہ

☆ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اَلرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا۝

فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے

پھر عرش پر اقتدار قائم کیا، وہ رحمان ہے لہٰذا اس کے بارے میں کسی باخبر سے دریافت کرو۔

یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ نے جب زمین وآسمان کو بنالیا،

ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ اَلرَّحۡمٰنُ ......

یعنی کائنات بنانے کے بعد اب احاطہ بر کائنات، اقتدار بر کائنات اور تدبیر کائنات کا مرحلہ تھا لہٰذا اس وجہ سے رحمان مستوی بر عرش ہے،

فَاسۡئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا ۝

یہ سورہ مبارکہ فرقان کی آیہ ۵۹ ہے کہ آپ سوال کرو، عرشِ رحمان کے متعلق سوال کرو، استوئے رحمان بر عرش کے متعلق سوال کرو، کئی طرح سے اس کا معنیٰ کیا گیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ بہٖ بمعنیٰ عنہ ہے، فَاسۡئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا یعنی ذاتِ خدا خبیر ہے آپ خداوند تبارک وتعالیٰ سے سوال کریں، یعنی یہ اس بہ کی ضمیر کے لئے حال ہے،

فَاسۡئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا ۝

یعنی درحالیکہ آپ خبیر ہو لیکن سوال کرو، استخبار کے لئے، پوچھنے کے لئے کہ رحمان کیا ہے؟ عرش کیا ہے؟

☆ ای المسئول الذی هو بهذه الصفة من الخبرة یعلم الاستواء......

وہ مسئول کہ جس سے آپ نے اس صفت کے بارے میں سوال کرنا ہے وہ اہلِ خبرہ ہے

فقط دلِ مومن میں قرآن کی گنجائش ہے

اور علم رکھتا ہے، اس سے استوا کے بارے میں پوچھیں تو وہ آپ کو بتا دے گا کہ استوائے رحمان بر عرش کیا ہے؟"

☆ كما يعلم العرش كيفية استواء الرحمن......

کہ جس طرح سے اس کو عرش کا بھی پتہ ہے اور کیفیتِ استوائے رحمان کا بھی علم ہے،

پس جس طرح سے عرش فقط رحمان کے لئے محل واقع ہو سکتا ہے اسی طرح سے دلِ مومن محلِ قرآن واقع ہو سکتا ہے اور اس نکتے کی راہنمائی خود قرآن نے کی ہے۔

٦) حقیقتِ تقویٰ اور اس کے آثار

☆ وما اعجب تعليم الله عباده المتقين......

اور خداوند تبارک وتعالیٰ نے عبادِ متقین کو کیا خوبصورت تعلیم دی ہے،

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا......

سورۂ مبارکہ انفال کی اس آیہ ۲۹ میں ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو خدا تمہیں فرقان عطا کرے گا، فرقان یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ تمہیں ایسی معرفت عطا کرے گا کہ جس کے ذریعے سے تم حق و باطل میں فرق کو درک کر پاؤ گے، خوب اور بد کے درمیان فرق کر سکو گے، صحیح اور ناصحیح کے درمیان فرق کر سکو گے کہ یہی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، انسان جس عالم میں رہتا ہے اس میں حق و باطل مخلوط ہے، اس میں خوب و بد مخلوط ہے، اس میں خالص اور ناخالص مخلوط ہے، اس

میں ہر چیز مخلوط ہے، اگر انسان کے پاس فرقان ہو تو وہ حق تلاش کر سکتا ہے۔

اس وقت لوگ دین کی رغبت وشوق رکھتے ہیں، دین سے محبت رکھتے ہیں لیکن فرقان نہیں رکھتے ہیں لہٰذا اس وجہ سے ملاوٹ والا دین قبول کر لیتے ہیں، فرض کریں کہ انہیں کھانے کا شوق ہے لیکن فرقان نہیں رکھتے ہیں، یہ اچھے اور برے کھانے میں فرق نہیں کر سکتے ہیں لہٰذا ملاوٹ والی چیزیں کھاتے پیتے ہیں، اگر ان کے اندر خواہش بھی ہو اور فرقان بھی ہو، طلب بھی ہو اور فرقان بھی ہو مثلاً اتنی جمعیتِ عظیم تحصیلِ علوم میں مشغول ہے، اس کے معانی یہ ہیں کہ ان کو علوم کے اندر رغبت ہے لیکن اگر ان کے پاس فرقان بھی ہو یعنی انہیں معلوم ہو کہ ہمیں کیا پڑھنا ہے اور کیا نہیں پڑھنا ہے؟ کونسی معرفت حاصل کرنی ہے اور کونی معرفت حاصل نہیں کرنی ہے؟ تو یہ مَغشُوش، ملاوٹ شدہ اور غیر خالص چیزوں کے پیچھے نہ جاتے بلکہ فقط خالص چیزوں کے پیچھے جاتے،

☆الذین قال فیھم:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا......

اگر تم تقویٰ الٰہی اختیار کرو گے تو وہ تمہیں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کر دے گا......

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ......

اور اللہ سے ڈرو، اور اللہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے......

سورۂ بقرہ کی اس آیہ ۲۸۲ میں علم حاصل کرنے اور آگاہ ہونے کا ایک طریقہ بتایا ہے، علم

حاصل کرنے سے مراد ڈگری لینا نہیں ہے، اس وقت ہم باقاعدہ کسی مدرسے میں داخلہ لے کر اور وہاں عمر صرف کرنے کو کہتے ہیں کہ یہ تحصیلِ علم ہے اور علم حاصل ہو رہا ہے باا ینکہ داخلہ لینے کے بعد وہ بے شک سوتا رہے اور بے کار گھومتا رہے لیکن ایک شخص اگر باقاعدہ داخلہ لے کر نہیں پڑھے بلکہ کسی جگہ بھی بیٹھ کر مشغولِ حصولِ تعلیم ہے تو اس کے لئے یہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ تحصیلِ علم کر رہا ہے، یہاں پر مراد یہ ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں آگاہی مل جائے گی، تمہیں علم حاصل ہو جائے گا، جس طرح سے سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیہ ۳۱ میں ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم دی،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا......

اور خدا نے آدمؑ کو تمام اسماء کی تعلیم دی......

یعنی تمام حقائق آدم علیہ السلام کو تعلیم دے دیئے درحالیکہ آدم علیہ السلام کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوئے تھے، یہ ایک معمول کا طریقہ ہے لیکن معمول کے طریقوں میں سے یہ ہے کہ اگر انسان تزکیہ کرے، تقویٰ اختیار کر کے آلودگیوں سے پرہیز کرے تو خداوند تبارک وتعالیٰ کی جانب سے آگاہی آجاتی ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ متقی اس کو کہتے ہیں جو بے فائدہ بات زبان سے ادا نہ کرے۔ گالی، بہتان اور تہمت وغیبت تو بہت دور کی بات ہے جو لایعنی بات نہ کرے، لایعنی یعنی بے فائدہ بات نہ کرے، جیسے کسی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں مثلاً چوک میں کسی کی کوئی گفتگو چھڑ جاتی ہے اور طرفین کے لئے کوئی مفید گفتگو نہیں ہوتی ہے، یہ فقط وقت ضائع کرنا ہے، یہ لایعنی بات ہے اور تقویٰ

کے خلاف بات ہے، گفتگو ایسی ہو کہ جس کے اندر کچھ نہ کچھ بولنے والے کا، سننے والے کا یا کسی تیسرے کا فائدہ ہو، ایسی نتیجہ بخش گفتگو کریں کہ اس گفتگو سے قوم کو، معاشرے کو یا بالآخر کسی کو تو فائدہ ہو۔

☆ ای امحو صفات النفس عن قلوبکم......

تقویٰ اختیار کرو سے کیا مراد ہے؟ تقویٰ بھی ایک مُجمل مفہوم ہے، ایسا مفہوم کہ اس کا نام اور چرچا تو بہت ہے لیکن تقویٰ کی حقیقت یا تقویٰ کا معنیٰ متشابہات میں سے بنا ہوا ہے، تقویٰ کے نام پر جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ بہت ابتدائی سا اور سادہ سا آتا ہے، تقویٰ سے کیا مراد ہے؟ فرماتے ہیں کہ تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ اپنی صفاتِ نفس کو محو کرو، دل کو بالکل پاک اور صاف کرو، شفاف کرو مثلاً ایک شیشے کا برتن ہے لیکن وہ آلودہ ہے، اس کے اندر میل کچیل ہے، داغ دھبّہ ہے اور اس کے اندر آلودگیاں موجود ہیں تو تقویٰ کیا ہے؟ یعنی اس شیشے کے برتن کا تقویٰ، اس کا تقویٰ یہ ہے کہ اس کو خالص کر دو، جتنی بری صفات، جتنی آلودگیاں اور جتنے عوارض اس پر طاری ہیں ان سب کو دھو کر اسے بالکل خالصِ محض کر دو تو یہ تقویٰ ہے۔

یہ دل جو پہلے سے بہت ساری صفات سے متصف ہے لہٰذا ان صفاتِ نفسانیہ اور صفاتِ رذیلہ سے دل کو پاک کر دو،

☆ لیصیر مصورة بصورة القرآن وصفاته......

یعنی پہلے جو نقاشی کی ہوئی ہے، پہلے جو تصویریں دل میں بنی ہوئی ہیں ان کو پاک کرو تا کہ تصویرِ قرآن اس کے اندر اپنی تصویر بنا سکے، پہلے سے جس نے غیر قرآنی تصویریں اپنے دل میں

بنائی ہوئی ہیں، دل کی شفافیت کو آلودہ کیا ہوا ہے، دل کو میلا کیا ہوا ہے اور قرآن بھی ساتھ پڑھتا ہے تو قرآن کس طرح سے ان بنی ہوئی تصویروں کے اوپر ایک نئی تصویر بنا دے؟ یہ مخلوط ہو جائیں گی،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ......

اور اللہ سے ڈرو، اور اللہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے......

تقویٰ اختیار کرو یعنی دل کو تمام ان نفسانی کدورات اور صفات سے پاک کرو، ملکاتِ رذیلہ سے پاک کرو، صفاتِ بد سے پاک کرو، کینہ و حسد و تنگ نظری و عُجب سے پاک کرو تا کہ قرآن آ کر اپنی صفات اس دل کے اندر ایجاد کرے۔

۷) قرآن اور انسان میں تشابہ، کب اور کیسے؟

☆ كما في قول الشاعر:......

جس طرح سے بعض عارفانہ شعر ہیں، ان میں سے ایک مصرع اپنے مطلب کے شاہد کے طور پر یہاں پر نقل کر رہے ہیں کہ

☆ رق الزجاج و رقت الخمر　　فتشابها و تشاكل الامر

زُجاج یعنی شیشہ، پیمانہ، یہ تمثیلات ہیں اور شعری زبان ہے، ان کی اپنی خاص اصطلاحات ہیں اور ان اصطلاحات کو اسی معنیٰ میں لینا چاہئے کہ جن معانی کے لئے ان لوگوں نے اپنی اصطلاحات مقرر کی ہیں، ہم ان کے معانی ڈکشنریز (Dictionaries) میں جا کر تلاش نہیں

کریں، مثلاً زُجاج کا معنیٰ ڈکشنری میں جا کر دیکھیں یا خمر کا معنیٰ ڈکشنری میں دیکھیں۔ ان کی مراد کچھ اور ہے، عرفان کے اس مسلک کے اندر بہت ساری اصطلاحات ہیں کہ جو یہ ان معارف اور معانی کے لئے استعمال کرتے ہیں،

☆ رق الزجاج و رقت الخمر

خمر کو آپ معرفت کہہ لے، خمر یعنی معرفتِ خداوند تبارک وتعالیٰ اور زُجاج یعنی انسانِ عارف یا نفسِ انسان و دلِ انسان۔ دلِ انسان ہے اور اسکے اندر خمر ہے، عموماً آپ دیکھیں کہ خصوصاً عرفانی شعراء نے عرفان کو زیادہ تر نظم میں بیان کیا ہے، عرفان زیادہ تر شعر کی زبان میں بیان ہوا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں کہ کیوں ان لوگوں نے نثر کے بجائے زیادہ تر شعر استعمال کئے ہیں؟ مثلاً جہاں جہاں بھی عارفانہ کلام ہے چاہے کسی بھی زبان میں ہو، عربی، فارسی، اردو یا کسی اور زبان میں بھی ہو تو وہ غالباً شعری زبانوں میں ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شعری زبان بہت فصیح اور وسیع زبان ہوتی ہے، بجائے نثر کے شعر میں انسان بہت کچھ بیان کر سکتا ہے، اس لئے انہوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ پیمانہ وظرف بھی رقیق ہوا، شفاف ہوا اور خمر بھی رقیق تھا یا شفاف تھا، جس جام کے اندر یہ مے پڑی ہوئی ہے، مے یعنی شراب، شراب بھی بہت شفاف ہے اور جام بھی بہت شفاف ہے،

☆ فتشابها......

دونوں رقیق ہیں، اتنے شفاف ہیں کہ امر مشتبہ ہو گیا ہے اور

☆ **و تشا کل الامر......**

پتہ نہیں چل رہا ہے کہ ان میں شراب کونسی ہے؟ اور پیمانہ کونسا ہے؟ یعنی دونوں اسطرح سے ہم رنگ ہیں یا دونوں بے رنگ ہیں کہ انسان تمیز نہیں کر سکتا ہے کہ زُجاج کون ہے اور شراب کونسی ہے؟

قرآن نے بھی قصہ ٔ ملکہ ٔ سبا میں بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ ٔ سبا کے استقبال کے لئے جو دالان بنایا تھا وہ شیشے کا تھا اور اس طرح سے بنایا گیا تھا کہ نہر نظر آتا تھا یعنی پانی سے بھرا ہوا حوض نظر آتا تھا لہٰذا یہ عورت جب آئی تو اس نے اپنا لباس اوپر اٹھا لیا کہ تر نہ ہو جائے، بھیگ نہ جائے حالانکہ وہ خشک زمین تھی لیکن معماری کا اتنا خوبصورت نمونہ تھا یعنی اس ہنر اور زیبائی کے ساتھ اس کو بنایا گیا تھا کہ اسے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ پانی ہے یا زمین ہے، بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ظرف و مظروف دونوں اتنے شفاف ہوتے ہیں کہ آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں اور امر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ پیمانہ کونسا ہے؟ اور مے کونسی ہے؟ اسی طرح سے اس شعر میں جو لفظِ خمر اور زُجاج استعمال ہوا ہے اس میں خمر سے مراد قرآن اور زُجاج سے مراد نفسِ انسان و دلِ انسان ہے۔ قرآن بھی نور ہے اور دلِ انسان بھی نور ہو جائے، جب دل نور ہو جاتا ہے،

☆ **فتشابها و تشا کل الامر......**

یعنی ان کے اندر تشابہ ہو جاتا ہے، امر مشکل ہو جاتا ہے اور اب یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ قرآن کونسا ہے؟ اور انسان کونسا ہے؟ انسان قرآن ہو جاتا ہے اور قرآن عینِ انسان بن جاتا ہے،

کما اینکہ انسانِ کامل ایسے ہیں، جب قرآن خُلقِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن جاتا ہے تو یہ تشابہ ہوا ہے، یعنی قرآن قلبِ نورانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اترا ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل قرآن ہے اور قرآن دلِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن گیا ہے،

☆ وقوله تعالی: یعلمکم الله......

سورۂ بقرہ کی اس آیۂ کریمہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ

یُعَلِّمُکُم اللّٰہُ......

یعنی خدا آپ کو علم دے گا تو اس یُعَلِّمُکُم اللّٰہُ سے کیا مراد ہے؟

☆ ای یفهمکم معانی القرآن......

اس سے مراد یہ ہے کہ ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ تمہیں معانی اور مفاہیمِ قرآن عطا فرمائے گی،

☆اشارة الی فهم مقاصد المتکلم......

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کہ جو متکلم ہے اور قرآن جو کلامِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے تو حق تعالیٰ یعنی متکلم تمہیں اپنے مقاصد اس وقت بتائے گا کہ جب تم تقویٰ اختیار کرو یعنی اپنے دل کو شفاف کرو تو مقاصدِ متکلم تمہارے دل میں اترنا شروع ہو جائیں گے،

☆ لان فهم کلامه ......

چونکہ فہمِ کلام اس سے حاصل ہوتا ہے۔

۸) فہمِ حقیقی، مرادِ متکلم کا حصول

☆ ان یعلم ما ینحصر فی ما تواطأ علیه اهل ذلک اللسان......

زبانیں، الفاظ، قراردادی ہیں یعنی لوگوں نے آپس میں طے کئے ہوئے ہیں کہ یہ لفظ ہم اس معنیٰ کے لئے استعمال کریں گے یعنی اہلِ زبان نے ان الفاظ کے بارے میں جو اتفاق و اجماع کیا ہوا ہے کہ ہم یہ یہ الفاظ کن کن معانی میں استعمال کریں گے؟ تو انسان وہی سمجھتا ہے کہ جس پر اہلِ زبان نے اتفاق کیا ہوا ہے،

☆ وهذا لیس بفهم حقیقی......

اہل زبان کا اتفاق کہ فلاں لفظ فلاں معنیٰ پر دلالت کرتا ہے یہ فہمِ حقیقی نہیں ہے، فہمِ حقیقی یہ ہے کہ انسان کو مرادِ متکلم و مقصدِ متکلم معلوم ہو جائے،

☆ والمطلوب هو الفهم عن المتکلم......

اہلِ لسان نے جس بات پر اتفاق کر رکھا ہے وہ معرفت نہیں ہے، مقصودِ متکلم کیا ہے؟ یہ مہم ہے مثلاً فرض کریں کہ ایک شاعر ایک شعر کہتا ہے اور ہم اہلِ لسان سے جا کر پوچھتے ہیں کہ شعر کے اندر جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان الفاظ کے بارے میں آپ نے کیا اتفاق کیا ہے؟ یہ الفاظ کیا بتا رہے ہیں؟ اور وہ آپ کو بتا دے کہ یہ الفاظ ان ان معانی پر دلالت کرتے ہیں تو آپ اہلِ لسان کے اتفاق سے کلام کے معانی سمجھ گئے لیکن آپ کو یہ یقین نہیں ہے کہ متکلم بھی یہی مقصود رکھتا ہے کہ جو اہلِ لسان و اہلِ کلام نے آپ کو بتایا ہے، اگر آپ خود متکلم سے جا کر پوچھیں مثلاً اس وقت بڑے

فہمِ حقیقی، مرادِ متکلم کا حصول

بڑے شعراء کے دیوان کہ جن کی تشریح اور تفسیر کی جاتی ہے، فرض کریں علامہ اقبالؒ کے اشعار کہ جن کی تشریح کی جاتی ہے اور بڑے نامی اور عالمی شہرت کے حامل شعراء بھی ہیں مثلاً جس طرح سے مولانا روم، حافظِ شیرازی اور شیخ سعدی ہیں یا دیگر زبانوں کے شعراء ہیں، شارحین نے جو کچھ ان کے کلام کے معانی بیان کیے ہیں اور ان کے کلام کی تشریح کی ہے تو اگر خود مولانا روم آ جائیں اور کہیں کہ مثنوی میں میری کیا مراد تھی؟ تو کاملاً کچھ اور مراد ہو گی مثلاً دوسروں نے آ کر کہا کہ مثنوی کی ابتداء میں جو کلام ہے کہ

بشنو از نی چون حکایت می کند
از جدایيہا شکایت می کند

اس شعر میں انہوں نے دیکھا کہ ''نی'' کیا ہوتی ہے؟ حکایت کیا ہوتی ہے؟ شکایت کیا ہوتی ہے؟ ان لوگوں نے دیکھا کہ فارسی الفاظ ہیں اور فارسی اہلِ زبان نے ان الفاظ کو ان معانی کے لئے استعمال کیا ہے، ''نی'' فلاں چیز ہوتی ہے، نہستان فلاں چیز ہوتی ہے، اس کو نہستان سے کاٹ کر لے آئیں تو اس سے بانسری بجاتے ہیں، ''نی'' یعنی بانسری، مولانا روم سے کوئی جا کر پوچھے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس بانسری سے کیا مراد ہے؟ یہ کونسی بانسری ہے؟ وہ آپ کو جواب دیں گے کہ یہ نفسِ انسان ہے، یہ روحِ انسان ہے، بانسری یعنی روحِ انسان بول رہی ہے، کیا بول رہی ہے؟ یہ بول رہی ہے کہ مثلاً بانسری جو تم سنتے ہو اور اس سے بڑا غمگین نغمہ نکلتا ہے تو یہ غمگین نغمہ اس کا مرثیہ ہے، کس بات کا مرثیہ ہے؟ اس بات کا کہ اس کو نہستان سے کاٹ کر اپنے وطن سے دور کر دیا گیا ہے،

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند

از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق

تا بگویم شرح دردِ اشتیاق

یعنی اس لئے رو رہی ہے کہ چوں کہ اس کو نہستان سے کاٹ کر یہاں لے آئے ہیں، یہ اس کی جگہ نہیں تھی، یہ اس کا وطن نہیں تھا، جدائی و فراق پر رو رہی ہے یعنی روحِ انسان ہے جو رہی ہے، ہر چند ڈکشنری میں کچھ اور لکھا ہوا ہے لیکن مقصودِ متکلم کچھ اور ہے، اسی طرح سے خداوند تبارک وتعالیٰ نے الفاظ کے ذریعے سے کچھ مطالب قرآنی شکل میں، الفاظ کی شکل میں بیان کئے ہیں، ہمیں الفاظ کے معانی ڈھونڈنے ہیں یا متکلم کی مراد کشف کرنی ہے؟ دراصل ہمیں متکلم کی مراد کشف کرنی ہے الفاظ ذریعہ ہیں، کلام ذریعہ ہے تا کہ ہم مرادِ متکلم تک پہنچیں۔

۹) قرآن کو خود متکلم سے سمجھیں

مطلوب یہ ہے کہ ہم کلام کے بجائے خود متکلم سے سمجھیں۔

☆ **لا الفهم عن الكلام......**

یہ تو طے نہیں ہے کہ ہمیں کلام سے ہی سب کچھ سمجھنا ہے، خود متکلم سے جا کر سمجھیں کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے؟

☆ وذلک لا یعلمه الا من نزل الکلام علی قلبه......

کون متکلم سے سمجھتا ہے؟ مقصودِ متکلم خودِ متکلم سے وہی سمجھ سکتا ہے کہ جس کے دل پر قرآن نازل ہوا ہے، جس کے دل پر قرآن اترا ہو یعنی جس کے حُنجرے سے اس کے دل پہ پہنچ گیا ہو، فقط حنجرے میں، مخارج میں اور ان چیزوں میں نہ گھومو مثلاً،

☆ والفهم عن المتکلم یختص بالخاصة......

متکلم سے قرآن سننا اور متکلم سے قرآن سمجھنا یہ خاصہ کے لئے ہے یعنی خواص کے لئے ہے، عوام کے لئے نہیں ہے، عام افراد فقط کلام سے مراد سمجھتے ہیں متکلم سے نہیں سمجھتے ہیں،

☆ و فهم الکلام للعامة......

متکلم سے سمجھنا خواص کا کام ہے اور کلام سے سمجھنا عوام کا کام ہے،

☆ و من فهم عن المتکلم، فهم الکلام دون العکس......

جو متکلم سے مراد سمجھ لے وہ کلام کی مراد کو بھی سمجھ جاتا ہے لیکن جو کلام کی مراد سمجھتا ہو تو ضروری نہیں ہے کہ متکلم کی مراد بھی سمجھتا ہو، صدر المتالھینؒ فرماتے ہیں کہ

☆ وقد حققنا لک سابقاً معنی الکلام الحقیقی......

چونکہ ہمارے پیشِ نظر آدابِ فہمِ قرآن مقصود ہیں لہٰذا ہم نے اس کتاب کی ایک فصل انتخاب کی ہے، اس سے پہلے ایک اور فصل انہوں نے حقیقتِ کلام کے بارے میں بیان کی تھی کہ کلام ہوتا کیا ہے؟ جو حصہ ہم نے بیان نہیں کیا، اس کی طرف اشارہ فرما کر کہتے ہیں کہ پہلے میں نے

قرآن کو خود متکلم سے سمجھیں

حقیقتِ کلام آپ کی سامنے بیان کی ہے،

☆ وانه لاینفک عن الفهم......

فرماتے ہیں کہ کلام ہوتا ہی وہی ہے کہ جس سے کچھ سمجھا جائے اگر نہ سمجھا جائے تو سرے سے کلام نہیں ہے،

☆ فقد نبهتک علی ما ان علمته کنت علی خیر کثیر واوتیت الحکمة......

فرماتے ہیں کہ جن چیزوں کی طرف میں نے آپ کی توجہ دلائی ہے اگر آپ نے انہیں درک کرلیا ہے، ان نکات کو جان لیا ہے تو پھر آپ یہ سمجھیں کہ صاحبِ خیرِ کثیر ہیں، مالکِ خیرِ کثیر ہیں، خیرِ کثیر یعنی حکمت آپ کو مل گئی ہے، معرفت کی چابی آپ کو مل گئی ہے۔

☆ فنزول القرآن علی القلب بهذا الفهم هی تلاوة الحق علی العبد......

فرماتے ہیں کہ قرآن کا دلِ انسان پر اس فہم کے طور پر نازل ہونا یعنی اس طرح کی فہم کہ انسان متکلم سے سنے، انسان خود متکلم سے مرادِ متکلم سن رہا ہو،

☆ و الفهم عنه فیه تلاوة العبد علی الحق......

حق تالی ہے، حق تلاوت کر رہا ہے، خدا تلاوت کر رہا ہے عبد کے اوپر۔

کلام کی تلاوت کرنا اور کلام سے کسی نکتے کو سمجھنا حق کے سامنے عبد کی تلاوت ہے لیکن متکلم سے سننا متکلم سے سمجھنا یہ عبد کے اوپر حق کی تلاوت ہے۔

آخر میں دعا فرماتے ہیں کہ اب جب کہ ہم نے ایک راز، حقیقتِ کشفیہ اور ایک بہت باریک نکتہ بیان کیا ہے، اس حقیقتِ کشفیہ میں اول یہ ہے کہ قرآن مجدّد النزول ہے، دوم قرآن دل کے اوپر اترتا ہے، دل پر نازل ہوتا ہے، سوم یہ کہ دلِ انسان عرشِ قرآن ہے، قرآن کے لئے عرش کی حیثیت رکھتا ہے، قرآن عرش کے اوپر مستقر ہوتا ہے اور دل اگر فارغ ہو، آمادہ ہو، خالی ہو تو قرآن آتا ہے ورنہ پہلے سے مفروضوں سے بھرا ہوا ذہن، خرافات سے بھرا ہوا ذہن اور من گھڑت اوٹ پٹانگ چیزوں سے بھرا ہوا ذہن ہے تو قرآن سرے سے اس کے گلے سے نیچے نہیں اترتا ہے۔ جب قرآن دل کے اوپر اترتا ہے تو قرآن صفت بن جاتا ہے، ملکہ بن جاتا ہے، خُلق انسان بن جاتا ہے اور دلِ انسان صفاتِ قرآنی سے، خصائلِ قرآنی سے متصف ہو جاتا ہے اور انسان عملاً انسانِ قرآنی بن جاتا ہے، انسان کا دل قرآنی بن جاتا ہے۔

☆ اللّٰھم اجعلنا ممن رزق الفھم عنک......

خداوندا! ہمیں یہ فہم عطا فرما، کونسی فہم؟ وہ فہم کہ جو عبد کو متکلم سے عطا ہوتی ہے، فقط کلام کی حد تک نہ ہو، سید الشہداء علیہ السلام نے بھی دعائے شریفِ عرفہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں جو مناجات کی ہیں ان میں یہی بیان فرمایا ہے کہ پروردگارا! مجھے خود اپنی ذات کی طرف راہنمائی فرما نہ کہ مجھے اپنے آثار، اپنے افعال، اپنی مخلوق اور اپنے معلولات کے سپرد کر دے کہ میں انہی میں بھٹکتا پھروں اور وہ تیری طرف میری راہنمائی کریں، بلکہ خود میرا ہاتھ تھام کے مجھے اپنی طرف راہنمائی فرما، اسی طرح سے یہ دعا بھی بہت عرشی دعا ہے، انہوں نے بڑی بلند دعا کی ہے، یہ عالی مضمون کی دعا

قرآن کو خود متکلم سے سمجھیں

ہے کہ خداوندا ہمیں وہ فہم عطا فرما کہ جس میں ہم متکلم سے قرآن سمجھیں نہ کہ فقط کلام سے سمجھیں یعنی کلام میں وارد ہوں تا کہ متکلم تک پہنچیں اور پھر ہم متکلم سے سمجھیں، جو متکلم سے سنے اس کو کلام بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور مقصودِ متکلم بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور یہ کہ

☆ انک علی کل شیء قدیر.

تیرے لئے یہ کوئی محال نہیں ہے، یہ تیری قدرت میں ہے کہ تو کسی بھی انسان کو جو چاہے دے سکتا ہے، جیسے دعائے کمیلؒ میں کہا گیا ہے کہ

فَاِنَّکَ فَعَّالٌ لِمَا تَشَاءُ......

بے شک تو جو چاہے وہ کرنے والا ہے......

لہٰذا انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہی دعا مانگے کہ ہمیں وہ فہم عطا فرما کہ ہم مقصودِ قرآن خود ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ سے سنیں اور دل کے اوپر اثر ہو اور قرآن ہمارے دل کا حصہ وصفت بنے، اس کے اندر قرآن راسخ ہو اور یہ دل صفاتِ قرآن سے متصف ہو۔ انشاءاللہ آئندہ فصل میں ادبِ فہم کی بحث درج کی جائے گی۔

فصلِ ادبِ نہم

﴿ترقی﴾

(حصّہ اول)

۱) تکامل کیلئے ترقی کا حصول

۲)ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں

۳)ترقی کے لا یقفی مراتب

٤)بے ادبوں سے عبرت

٥)دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے

٦)مرتبوں کی طلب میں اضافہ

۷)ارتقاء یا زوال، تیسری حالت محال

۸)باطنِ قرآن عمیق ہے

۹)تالیٔ قرآن ہی ارتقاء کرتا ہے

۱) تکامل کیلئے ترقی کا حصول

آدابِ فہمِ قرآن میں سے ادبِ فہم ترقی ہے،

☆التاسع الترقی......

انسانِ تالیٔ قرآن جب بارگاہِ قرآن میں حاضر ہوتا ہے تو دیگر آداب کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک صفت ارتقاء کی ہونی چاہئے یعنی مسلسل قرأت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ترقی بھی ہو، یعنی جب تالیِ قرآن وقاریِ قرآن بارگاہِ قرآن میں حاضر ہو تو اس کے اندر جمود نہ ہو بلکہ ارتقاء وترقی کے لئے آمادہ ہو، انسان قرأت اور تلاوت کے اثنا میں مسلسل درحالِ ارتقاء ہو، جس طرح سے حدیث میں بھی آیا ہے کہ

اِقْرَأْ وَارْقَ......(۱)

قرآن پڑھئے اور ترقی کریں......

قیامت میں تالیٔ قرآن اور حاملِ قرآن کو یہی کہا جائے گا اور احادیث بھی اس پر دلالت کرتی ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس مضمون کے ساتھ مرحوم کلینیؒ نے اصولِ کافی کے اندر بابِ فضیلتِ قرآن میں ان روایات کو نقل کیا ہے کہ قیامت میں جب انسانوں میں تالیٔ قرآن داخل ہوگا تو خداوند تبارک وتعالیٰ کی جانب سے اسے یہی خطاب ہوگا،

اِقْرَأْ وَارْقَ فَيَقْرَأُ ثُمَّ يَرْقٰى......(۲)

قرآن پڑھئے اور ترقی کریں (یعنی آگے بڑھیں) پس وہ (قرآن) پڑھے گا پھر ترقی

کرے گا (یعنی آگے بڑھے گا)......

امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ہے کہ

عَلَیْکُمْ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ فَاِنَّ دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ عَلٰی عَدَدِ آیَاتِ الْقُرْآنِ، فَاِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُقَالُ لِقَارِیءِ الْقُرْآنِ: اِقْرَأْ وَارْقَ......(۳)

تم ضرور قرآن کی تلاوت کیا کرو چونکہ جنت کے درجات قرآنی آیات کی تعداد کے برابر ہیں، جب قیامت کا دن ہوگا تو قرآن کی تلاوت کرنے والے سے کہا جائے گا: پڑھ اور اپنے درجات میں اضافہ کرتا جا......

تکامل کیلئے ترقی کا حصول

یعنی جس طرح سے تو قرأت میں، تلاوتِ قرآن میں اور پیرویٔ قرآن میں درجہ بہ درجہ آگے بڑھا ہے اسی طرح سے ابھی مقاماتِ بہشتی میں بھی درجہ بہ درجہ مقاماتِ عالیہ پر فائز ہوگا، چونکہ قرآن کے کئی پہلو ہیں اور انسان کی ترقی بھی ان سارے پہلوؤں کے لحاظ سے ہوتی ہے، فہمِ انسان کے بھی درجات ہیں اور اسے درجہ بہ درجہ اور رتبہ بہ رتبہ آگے بڑھنا چاہئے یعنی تالیِ قرآن جب قرآن کی بارگاہ میں حاضر ہوتو اس کا دل پیروئے قرآن اور ہمراہ با مراحلِ قرآن ہو، درجہ بہ درجہ جہاں قرآن جا رہا ہو وہیں انسان کا دل بھی جا رہا ہو، خواہ نہ خواہ تلاوت موقوف بر ترقی ہے چونکہ قرآن ایک جگہ پر موقوف نہیں ہے۔

قرآن الفاظ سے معانی کی طرف منتقل ہوتا ہے، معانی سے حقائق کی طرف اور اسی طرح سے دیگر درجاتِ قرآن ہیں جیسے ظاہرِ قرآن ہے اور ظاہر سے باطنِ قرآن ہے اور باطن سے مزید

باطن کی طرف اس کی وسعت ہے، خوانخواہ تالیِ قرآن جب ترقی نہ کرے یعنی درجاتِ قرآن و مراتبِ قرآن کے ساتھ ہمراہ نہ ہو اور آگے نہ بڑھے تو قرآن کہیں اور جارہا ہوتا ہے اور یہ انسان تالی نہیں کہلاتا ہے بلکہ واقف کہلاتا ہے، تالی یعنی جس کا قرآن سے فاصلہ نہ ہو اور اگر انسان ایک جگہ پر رک جائے مثلاً ایک ہی درجۂ قرآن پر توقف کرے اور ساری عمر اسی درجے کے ساتھ بسر کرے تو یہ انسان واقف ہے، قرآن سے دور ہے، متولی از قرآن ہے نہ کہ تالیِ قرآن ہے۔

۲)ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں

ارتقاء کے کئی پہلو ہیں اور انسان یہی ادب باقی تمام معاملات میں بھی مدنظر رکھے، یعنی تالیٔ قرآن اثنائے تلاوتِ قرآن میں بھی اور دیگر موارد میں بھی ترقی کو مدِنظر رکھے، یہی باعثِ رشدِ انسان ہے، اگر ارتقاء نہ کرے اور ایک ہی عمل پہ تکرار کرتا رہے، بار بار دہراتا رہے تو اس کو اس عمل سے ارتقاء حاصل نہیں ہوتا ہے، حتیٰ عبادتوں میں بھی انسان ارتقاء کرے چونکہ علم و معرفت کے، عبادتوں کے اور انسانوں کے بھی مرتبے و درجات ہیں لہٰذا انسان علم و معرفت میں بھی ارتقاء کی حالت میں رہے، اپنے انسانی مرتبوں میں بھی مرتبہ بہ مرتبہ آگے بڑھے اور عبادات میں بھی ایک ہی درجے کو مسلسل تکرار نہ کرتا رہے، اسی سے انسان کو تکامل حاصل ہوتا ہے۔

انسان کو درحقیقت دو تکامل حاصل کرنے ہیں یا ترقی کے دو زینوں پر چڑھنا ہے، ایک انسانی مراتب پر اور ایک معرفت کے مراتب پر کہ البتہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، جب

انسان معرفت کے مختلف زینوں پہ ترقی کرتا ہے، ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں پہنچتا ہے تو یہ مرحلہ اس کو ایک انسانی مرتبے سے اگلے انسانی مرتبے میں پہنچنے کیلئے مدد وتقویت دیتا ہے، پس یہ دونوں ارتقاء باہم ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ ہیں، اسی طرح سے انسان عبادی اعمال میں بھی ارتقاء کرے۔ غیر عبادی اعمال بلکہ تمام امور میں ارتقاء موجود ہے، یعنی ہر وہ چیز کہ جس کا ظاہر و باطن ہے اس کے اندر درحقیقت ارتقاء ہے اور جمود اس وقت ہو جاتا ہے کہ جب انسان اس ایک مرتبے کو لے کر اسی کو عمر بھر دہراتا رہے، تکرار کرتا رہے، اس دھرانے سے انسان ترقی نہیں کرتا ہے اور اس غایت ونہایتِ منزل تک نہیں پہنچتا ہے۔

وسائل اور ذرائع کے ذریعے سے بھی انسان ارتقاء کرتا ہے، اگر انسان ایک ہی وسیلے کو تھام کر اسی کو دہراتا رہے، تکرار کرتا رہے تو وسیلہ وذریعہ بات کہ جو انسان کو مرتبۂ دیگر تک پہنچاتا ہے اس تک انسان رسائی پیدا نہیں کر سکتا ہے، ترقی تعلیم وعبادت کا بھی ادب ہے اور قرآن کا بھی ادب ہے اور اسی کی طرف امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے فرزند جنابِ محمد ابن حنفیہ کی ہدایت وراہنمائی فرمائی کہ

اِقْرَأْ وَارْقَ......

یعنی آپ پڑھو، قرأت کرو لیکن اس قرأت کے اندر تکرار نہ کرتے رہو، ایک ہی مطلب نہ دہراتے رہو یعنی ایک درجے پر ہی نہ گھومتے رہو بلکہ ساتھ ساتھ تمہارا ارتقاء بھی ہو یعنی یہ قرأت تمہیں ارتقاء بھی عطا کرے۔

ترقی کیلئے دو بنیادی چیزیں

۳)ترقی کے لا یقفی مراتب

قرأت اور ارتقاء آپس میں لازم وملزوم ہوں یعنی قرآن پڑھواور قرآن پڑھ کر پھر قرآن کے ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے پر بھی پہنچو، دوسرے رتبے سے تیسرے مرتبے پر پہنچو، تیسرے مرتبے سے اگلے مرتبے پر اور جہاں تک تمہاری وُسعْ و طاقت موجود ہے، بعض مراحل ایسے ہیں کہ لامتناہی ہیں، انسان جتنا بھی ارتقاء کرتا جائے لیکن ارتقاء کی منازل اور مرتبے ختم نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ انسان کے بارے میں اہلِ معرفت کا بھی یہی کہنا ہے کہ انسان کی حد لا یقفی ہے، یہ عرفان کی اصطلاح ہے، حدِ لایقفی یعنی کوئی حد ایسی نہیں ہے کہ جہاں پر انسان جا کر متوقف ہو جائے اور کہے کہ اب یہاں سے آگے میں مزید ترقی نہیں کرسکتا ہوں، انسان کے تکامل کے سفر میں، تکامل کی دنیا میں اور تکامل کے مراحل میں کسی مرحلے پر وقفہ نہیں ہے، اگر آگے بڑھنے والا انسان موجود ہو، اگر آگے بڑھنے کیلئے انسان آمادہ ہوتو اس کیلئے لامتناہی، لامحدود اور نہ ختم ہونے والے مراتب موجود ہوتے ہیں، اکثر انسان جو رہ جاتے ہیں اور عدمِ بلوغ ہی کی حالت میں رہ جاتے ہیں، یہیں مرجاتے ہیں، یہیں ان کی ساری عمر ختم ہو جاتی ہے اور فرصتِ زندگی تمام ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ارتقاء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں اور ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا ہے کہ ہمیں اس زمین پر خداوند تبارک وتعالیٰ نے فقط ایک چیز کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ ارتقاء و ترقی ہے یعنی ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے میں پہنچنا ہے۔

٤) بے ادبوں سے عبرت

غزالی سے منقول ہے کہ ان سے پوچھا گیا یہ اخلاق وادب کہاں سے سیکھا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ بے ادبوں سے سیکھا ہے، بے ادب بھی عبرت کے لئے خوب ہیں اور انسان ان دنیاداروں سے سیکھے، بہت ساری چیزیں انسان دنیا داروں اور دنیا پرستوں سے سیکھ سکتا ہے، اس وقت بڑے سرمایہ داراور بڑے مالدار لوگ موجود ہیں کہ جن کی عالمی شہرت ہے یہ وہی لوگ تھے کہ جن کے اندر ارتقاء کی حس موجود تھی، جن کے اندر خواہشِ ارتقاء موجود تھی۔ وہ لوگ جو ایک، دو ہزار پہ گزارہ کر سکتے ہیں انہوں نے ہرگز مالی دنیا میں، دنیوی میدان میں اور مالی میدان میں ترقی نہیں کی ہے، ممکن ہے کہ معنویت میں، دین میں اور کمالات میں ترقی کی ہو لیکن دنیا ان کے ہاتھ نہیں آئی ہے بلکہ دنیا اُن کے ہاتھ آئی ہے کہ جنہوں نے دنیا میں ارتقاء کیا یعنی ان کی نظر میں اول سے تھا کہ ہمیں کسی ایک مرتبے پر نہیں رکنا ہے۔

دنیا میں ترقی کرنی چاہئے یا نہیں وہ ایک الگ موضوع ہے، ابھی ہمیں فقط یہ دیکھنا ہے کہ ہم ان دنیا داروں سے، ان بے ادبوں سے ہی ادب سیکھ لیں کہ یہ دنیا میں کسی وقفے کے قائل نہیں ہیں، ان کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں پھر بھی تحصیلِ دنیا میں مشغول رہتے ہیں اور جب ضرورتوں سے کئی گنا زیادہ مال ان کے پاس اکٹھا ہو جاتا ہے تو پھر بھی یہ طلبِ دنیا میں ہی مشغول رہتے ہیں حتیٰ اتنی دنیا کما لیتے ہیں کہ اگر ان کی کئی نسلیں بیٹھ کر اس کمائے ہو مال کو ہی بغیر زحمت و کوشش کے صَرف کرتی رہیں اور کھاتی رہیں تو وہ مال صدیوں تک ختم نہ ہوگا لیکن پھر بھی ان کی حسِ دنیا ختم نہیں ہوتی ہے اور

دنیا کے اندر مزید ارتقاء کی طرف راغب رہتے ہیں، انسان ان سے سیکھے کہ یہ جو اس طُعامِ دنیا اور لہو کے اندر ارتقاء کرتے ہیں تو کیوں نہ انسان کمالات کے اندر ارتقاء کرے۔

یہ مطلب شیخ رئیس بو علی سیناؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو ایک عبرت دکھائی، ایک جگہ پر معرکہ لگا ہوا تھا، جس طرح سے شعبدہ باز یا مداری ہوتے ہیں کہ بازار میں کسی جگہ کوئی کرتب دکھاتے ہیں تو لوگ ان کے ارد گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں، اسی طرح کا ایک مداری، ایک شعبدہ باز دو درختوں کے مابین باریک سی رسی باندھ کر اس کے اوپر چل رہا تھا، وہ حکیم اپنے شاگردوں کے ساتھ وہاں سے گزرا تو انہیں روک کر متوجہ کیا کہ دیکھو یہ رسی پہ چلنا آسان تو نہیں ہے، اس شخص نے کتنی محنت کی ہوگی؟ کہ اپنا توازن اس نے رسی کے اوپر برقرار رکھا ہوا ہے، سالہا سال اس نے محنت کی ہے، دن رات مشقت کی ہوگی لیکن ہم تو ہموار اور تنگ راستے پر بھی صحیح نہیں چل سکتے ہیں اور اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں لیکن یہ رسی کے اوپر بغیر کسی سہارے کے چل رہا ہے، اس کی زحمت، کوشش، محنت اور مشقت کی دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو یہاں تک پہنچایا ہے اور اپنا توازن برقرار رکھا ہے، یہ دنیا کے لئے ہے یعنی لوگوں کو خوش کرنے کے لئے، کرتب دکھانے کے لئے اور لوگوں سے چار پیسے بٹورنے کے لئے ہے، اس نے اتنی محنت اور مشقت کی ہے اور ہم کمال و معرفت کی راہ میں کام نہیں کرتے۔

مثلاً ایک عالمِ دین، حکیم یا فیلسوف رسی پر نہیں چل سکتا ہے جب تک وہ اسی جیسی مشق نہ کرے، نہایتاً اس کوشش اور زحمت کا نتیجہ یہ تھا کہ چند لوگ اس کو دیکھ کر محظوظ ہوں، جب یہ شخص اتنے

مداریوں سے عبرت

سادہ سے کام کے لئے اتنی محنت کرسکتا ہے تو کیوں نہ انسان اپنے ارتقاء کے لئے ، اپنے تکامل کے لئے محنت کرے اور اس درجے تک پہنچے کہ انسان کے اندر مہارت پیدا ہو جائے ، ایسی مہارت جو معنوی مہارت ہو کہ جس سے انسان کی عاقبت بنتی ہو۔ ایسے مناظر سے انسان عبرت و درس لے سکتا ہے، خداوند نے اسی لئے مختلف حالتوں میں بعض دنیاداروں کے، بعض دنیا پرستوں کے اور بعض بے ادبوں کے یہ مناظر بنائے ہیں کہ انسان ان سے سیکھے کہ یہ اپنی دنیا میں کیا کچھ کر رہے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ یہی کام اپنی معنویت اور علم کی دنیا میں عملی کریں۔

بے ادبوں سے عبرت

دنیا داروں کو دیکھیں کہ یہ کام عملاً ہوا ہے یعنی بعض لوگ نمونہ بھی ہیں، حالانکہ دنیا میں مالدار ہیں اور سب کچھ ہیں لیکن پھر بھی گرمی کے اندر اور سخت دشوار موسم کے اندر اپنا خون اور پسینہ بہا کر دنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، دن رات میں وہ کم ترین وقت میں سوتے ہیں اور بیشتر اوقات کام کاج کرتے ہیں، انہیں دیکھ کر اہلِ معنیٰ اور اہلِ تکامل کو عبرت لینی چاہئے کہ یہ دنیا میں اس گرمی کے عالم میں اس قدر اپنا خون پسینہ بہانے میں لگے ہوئے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ معنویت اور تکامل میں یہ کام کریں۔

اسی طرح سے انسان دیکھے کہ دنیا داروں کی حسِ ارتقاء کبھی بھی سیر نہیں ہوتی ہے، ان کا جی نہیں بھرتا ہے بلکہ حرص بڑھتی ہی رہتی ہے مثلاً انہیں پہلے ہزار کی ضرورت ہوتی ہے، جب ہزار تک پہنچتے ہیں تو ان میں پانچ ہزار کی طلب شروع ہو جاتی ہے، پانچ ہزار پر جب پہنچتے ہیں تو دس ہزار کی طلب پیدا ہوتی ہے، دس ہزار پہ جب پہنچتے ہیں تو بیس ہزار کی طلب شروع ہو جاتی ہے اور ہزاروں

میں جب پہنچتے ہیں تو لاکھوں کی طلب پیدا ہوتی ہے، لاکھوں کے بعد کروڑوں، عربوں، کھربوں کی طلب اور نہ مٹنے والی طلب پیدا ہو جاتی ہے، یہ طلب درحقیقت اہلِ معنیٰ کے اندر اور اہلِ تکامل کے اندر پیدا ہونی چاہئے تھی، ناسیری، ناپذیر اور نہ مٹنے ہونے والی طلب انسان کے اندر پیدا ہوا اور یہی حدیث کا بھی مضمون ہے یعنی یہ صرف دنیا داروں اور دین داروں کا سادہ سا مقایسہ نہیں ہے بلکہ حدیث میں بھی ہے۔

۵) دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے

یہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ

مَنهُومَانِ لَا یَشْبَعَانِ طَالِبُ دُنیَا وَطَالِبُ عِلْم...... (۴)

دو بھوکے ایسے ہیں کہ ہرگز سیر نہیں ہوتے ہیں، طالبِ علم بھی کبھی سیر نہیں ہوتے اور طالبِ دنیا بھی کبھی سیر نہیں ہوتے، یعنی ایک کمال ہے اور ایک کمال نہیں ہے، کمال اور مال دونوں کی حس کبھی سیر نہیں ہوتی ہے لہٰذا ہم نے نہ طالبِ کمال کو سیر ہوتے دیکھا ہے اور نہ طالبِ مال کو سیر ہوتے دیکھا ہے، انسان اگر طلبِ دنیا میں سیر ہو جائے تو سمجھو کہ یہ طالبِ دنیا نہیں تھا بلکہ یہ تارکِ دنیا تھا، یہ دنیا سے بیزار ہے، اس کو دنیا کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں ہے، جو دنیا سے سیر ہو جائے تو سمجھو وہ سرے سے دنیا دار ہی نہیں ہے۔

جس طرح سے امیر المومنین علیہ السلام اصلاً دنیا سے سیر ہیں اور انہیں دنیا کی ضرورت نہیں ہے،

مستغنی از دنیا ہیں لیکن دنیادار کی علامت یہ ہے کہ کبھی بھی سیر نہیں ہوگا، اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں، اس کی نسلوں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں اور اس کے پاس اتنا مال آجائے کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے لیکن اس کی طلب ہرگز تمام نہیں ہوتی ہے، اسی طرح سے طالب العلم ہے، مال اور کمال دونوں کی حس دونوں کے طلبگاروں کے اندر یکساں ہوتی ہے یعنی انسان سیر نہیں ہوتا لہٰذا اگر انسان کمالات کی دنیا میں آتا ہے تو اپنے اندر ایسی حس پیدا کرے کہ جو سیر نہ ہونے والی ہو، دنیا میں بھی ان لوگوں نے ترقی کی ہے کہ جن کے اندر یہ حس موجود تھی، انہوں نے سیر نہ ہونے والی حس سے اپنی دنیا بنائی ہے اور کمالات کی دنیا کے اندر بھی وہ لوگ ترقی کریں گے، کسی مقام تک پہنچیں گے کہ جن کے اندر نہ ختم ہونے والی اور نہ سیر ہونے والی حس موجود ہو، ورنہ ادبیات پڑھ کر، عربی پڑھ کے وہیں احساسِ استغناء کر دے کہ ہم عالمِ دین ہو گئے، حجۃ الاسلام ہو گئے، آیت اللہ ہو گئے، صرف صَرف ونحو پڑھ کر مرجعِ خلائق بننے کے قابل ہو گئے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ طالبِ کمال نہیں تھا، یہ آیت کسی اور چکر میں آئی تھی، یہ طالبِ کمال نہیں تھا اور نہ کمال کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک درجۂ کمال دوسرے درجۂ کمال کی طلب میں اضافہ کر دیتا ہے کہ جس طرح سے مال کا ایک مرتبہ دوسرے مرتبے کی طلب میں اضافہ کر دیتا ہے۔

مرتبوں کی طلب میں اضافہ

٦) مرتبوں کی طلب میں اضافہ

کمال کا ایک مرتبہ دوسرے مرتبے کے لئے طلب کو شدید تر کر دیتا ہے یعنی انسان جب

ادبیات پڑھتا ہے، عربی لٹریچر پڑھ لیتا ہے تو پھر اگلے علم کے لئے طلب زیادہ بڑھ جاتی ہے، اُس مرحلے میں پہنچتا ہے تو اگلے علم کے لئے طلب مزید بڑھ جاتی ہے اور یہ طلب کبھی بھی ختم نہیں ہوتی ہے، یہ نہ ختم ہونے والی طلب ہے لہٰذا پیغمبر اکرم ﷺ کے اسی طلبِ کمال اور ترقی کی وجہ سے خدا نے بھی آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ہمیشہ پروردگار سے یہ دعا مانگیں کہ

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ٥(۵)

اور یہ کہتے رہیں کہ پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما۔

یعنی کہیں جا کر یہ احساس نہ کریں کہ اب مجھے مزید علم کی ضرورت، مزید ترقی کی ضرورت اور مزید ارتقاء کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا جب تک انسان کے اندر یہ ادب، یہ حس اور یہ صفت موجود نہ ہو تو نہ مال میں آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ کمال میں آگے بڑھ سکتا ہے البتہ مال تکامل نہیں ہے اور اسے کمال حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ دنیا ہے لیکن اگر انسان میں یہ ترقی کی حس کمالات کے لئے موجود ہو تو انسان کو با کمال تر بنا سکتی ہے۔

مرتبوں کی طلب میں اضافہ

پس تحصیل میں بھی انسان ایسے ہی ہو یعنی مترقی انسان ہو، حالتِ ترقی میں ہو، ارتقاء پذیر اور ارتقاء کا طلبگار ہو، عبادات میں بھی ایسے ہی اہلِ ترقی ہو اور قرآن میں بھی اہلِ ترقی ہو، اس انسان سے توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ کسی نقطے تک اور کسی مقام تک پہنچ جائے گا لیکن جس میں ارتقاء کا شوق ہی نہ ہو اور اپنے نفس کو اس نے نفسِ مترقی نہ بنایا ہو، ترقی پذیر نفس نہ بنایا ہو تو یہ کہیں بھی نہیں پہنچ سکتا ہے، یہ اصطلاحیں جو خالصتاً دینی تھیں اور دینی اقدار میں شمار ہوتی تھیں دین داروں سے دنیا داروں

نے لے لی ہیں لہٰذا آج سیاست کی دنیا میں یہ اصطلاح بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے مثلاً ترقی پذیر ممالک، ترقی پذیر گروہ، ترقی پذیر احزاب یا اس قسم کی دیگر اصطلاحیں کہ جو اَب مادی دنیا میں استعمال ہوتی ہیں جیسے بعض ترقی یافتہ ممالک ہیں، بعض ترقی پذیر ممالک ہیں یعنی ایسے ممالک جو حالتِ ترقی میں ہیں، اپنے اقتصاد کے لحاظ سے، معیشت کے لحاظ سے، سیاست کے لحاظ سے اور نظام کے لحاظ سے حالتِ ارتقاء میں ہیں، جن ممالک کے اندر ارتقاء کی خواہش ختم ہو جائے وہ زوال پذیر ہو جائیں گے۔

۷) ارتقاء یا زوال، تیسری حالت محال

ارتقاء اور زوال کے درمیان تیسری حالت نہیں ہے اور وہ یہ کہ انسان ایک جگہ رکا رہے کہ نہ ارتقاء و ترقی کر رہا ہو اور نہ زوال و انحطاط کا شکار ہو۔ فقط دو حالتیں ہیں، انسان چونکہ موجودِ ساکن نہیں ہے بلکہ موجود متحرک ہے، اس لئے یا تو بسوئے ارتقاء حرکت کر رہا ہے یا بسوئے زوال یعنی زوال پذیر ہے یا ترقی پذیر ہے۔ اس مطلب کو ہم مادی، دنیوی یا محسوس مثال کے ذریعے سے واضح کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں چونکہ دینی راستہ یا صراطِ مستقیم عمودی راستہ ہے، افقی راستہ نہیں ہے، عمودی راستہ یعنی یہ راستہ نیچے سے اوپر کی طرف جاتا ہے، تکامل کی طرف جاتا ہے، اب اردو زبان میں شاید ممکن ہے کہ بعض عمودی اور افقی کی اصطلاح نہ سمجھتے ہوں، افقی یعنی ہوریزونٹل (Horizontal) کہ جو چیز زمین سے زمین کی طرف پھیلی ہوئی ہو، جیسے افق اسے کہتے ہیں کہ جہاں سورج غروب ہوتا ہے اور طلوع ہوتا ہے، زمین سے زمین کا فاصلہ یا زمین سے زمین کا

خط افق کہلاتا ہے لیکن جو خط زمین سے آسمان کی طرف کھینچا جاتا ہے اس کو عمودی کہتے ہیں یعنی ورٹیکل (Vertical) خط یا ورٹیکل لائن جو زمین سے آسمان کی طرف بڑھتی ہے۔

صراطِ مستقیم ہوریزونٹل نہیں ہے، یہ راستہ زمین سے زمین تک نہیں ہے، افقی نہیں ہے بلکہ صراطِ مستقیم ورٹیکل ہے، اسفل سے اعلیٰ کی طرف ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی خلقت میں بھی یہی بیان فرمایا ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ٥ (٢)

بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے پست ترین حالت کی طرف پلٹا دیا۔

یعنی وجود اور ہستی کے سب سے نچلے مرتبے میں انسان کو خلق کر کے قرار دیا اور پھر وہاں سے اس کو دعوت دی کہ تَعَالَوْا یعنی اوپر آؤ، اسفل سافلین میں رکھ کر پھر اس سے کہا کہ اوپر آؤ، یہ نہیں کہا کہ تم اسفل سافلین کے ایک گھر سے نکل کر اسفل سافلین ہی کے دوسرے محلے میں چلے جاؤ، اسفل سافلین بہت ہیں، ساری دنیا اسفل سافلین ہے، اسفل سافلین کے کئی محلے، کئی گلیاں اور کئی اقلیم ہیں، انسان ایک اقلیم اسفل سے دوسرے اقلیمِ اسفل میں منتقل ہو جائے یا ایک محلۂ سفلاء سے دوسرے محلۂ سفلاء میں منتقل ہو جائے تو اس کو ارتقاء تو نہیں کہتے ہیں، انسان کا جغرافیائی و تاریخی سفر افقی سفر ہے یعنی زمین سے زمین کی طرف ہے، انسان کا دینی سفر زمین سے آسمان کی طرف ہے، یہ ارتقائی اور تکاملی سفر ہے۔ انسان آزمالے کہ اس وقت گھروں کے اندر جو ستون نصب ہیں اور جو فرش

گھروں کے اندر بچھے ہوئے ہیں یہ دونوں انہی دو چیزوں کا تجسم ہیں، گھر کے اندر جو فرش بچھا ہوا ہے اس کی جہت افقی ہے، زمین سے زمین پہ بچھا ہوا ہے، زمین کے ایک کونے سے زمین کے دوسرے کونے کی طرف گیا ہوا ہے لیکن ستون زمین سے اٹھا ہوا ہے، یہ زمین کی طرف نہیں جارہا ہے بلکہ آسمان کی طرف جارہا ہے، اب فرش پر چل کر دیکھیں، فرش پر کئی حالتیں ہوسکتی ہیں آپ چاہیں تو رک بھی سکتے ہیں، چاہیں تو حرکت بھی کرسکتے ہیں یعنی افقی راستے میں سکون اور حرکت دونوں متصور ہیں لیکن اگر آپ ستون کے اوپر چلیں تو دو ہی حالتیں متصور ہیں کہ یا تو آپ ستون سے اوپر جارہے ہیں یا ستون سے نیچے آرہے ہیں، ستون پہ رکنا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے، جمود ممکن نہیں ہے چونکہ ستون عمودی ہے اور نیچے سے اوپر کی طرف جارہا ہے، تکامل کا راستہ کہ جو صراطِ مستقیم ہے یہ خود انسان کے اپنے ارتقائی سفر کا نام ہے، تکاملِ انسان کا نام صراطِ مستقیم ہے، ایک محلے سے دوسرے محلے تک جانا، گھر سے مسجد تک جانا صراطِ مستقیم نہیں ہے بلکہ نقص سے کمال کی طرف آنا صراطِ مستقیم ہے، یہ عمودی راستہ ہے، اس راستے میں دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو انسان اوپر جارہا ہے یا نیچے جارہا ہے یعنی یا تو انسانیت کے مراحل طے کررہا ہے یا پھر مراحلِ حیوانی طے کررہا ہے۔ یہ انسان قرآن کی ان آیات کا مصداق ہے کہ

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا٥(٧)

یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ٥(٨)

اب ذلّت کے ساتھ بندر بن جائیں......

یا پھر یہ انسان اعلیٰ علین وملکوت اور عالم ربوبی کی طرف جا رہا ہے، اس وجہ سے یہاں ارتقاء ہے۔ یعنی بعض ایسے ہیں کہ ان سے صراطِ مستقیم چھوٹ گیا، صراطِ مستقیم پر گرفت مضبوط نہیں پڑی یا ان کے قدم مضبوط نہیں ہیں، جس طرح سے خود قرآن کا حکم ہے کہ

خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ......(۹)

جو چیز ہم نے تمہیں دی ہے اسے پوری قوت سے پکڑ رکھو......

یعنی دین کو مضبوطی سے لو، دین کے اوپر بہت مضبوط گرفت ڈالو، اس لئے کہ اگر ذرا سی گرفت ڈھیلی پڑی تو نہ صرف یہ کہ اوپر نہیں جاؤ گے بلکہ تم رک بھی نہیں سکو گے اور انحطاط وزوال کا شکار ہو جاؤ گے، اس وجہ سے انسان اگر ارتقاء نہ کر رہا ہو تو حتماً زوال وانحطاط کی طرف جا رہا ہے، اگر انسان عبادتوں میں ارتقاء نہ کر رہا ہو تو زوال کر رہا ہے، علم میں ارتقاء نہیں کر رہا ہے تو انحطاط کی طرف جا رہا ہے اور اگر قرآن میں ارتقاء نہ کر رہا ہو تو پس حتماً زوال وانحطاط کی طرف جا رہا ہے، پہلے سے ہی یہ انسان اسفل سافلین میں ہے اور اسلفل سافلین سے گر کر عالمِ حیوانی میں جا پہنچتا ہے یا عالم دیگر میں کہ جو انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ پس انسان کے اندر میادینِ ارتقاء فراواں ہیں، ان میادین میں ہمیشہ انسان حسِ ارتقاء کے ساتھ وارد ہو۔

۸) باطنِ قرآن عمیق ھے

ادبِ قرآن فہمی اور قرآنی شناسی یہ ہے کہ انسان ارتقاء کی حس لے کر اور ترقی کی صفت اپنے اندر ایجاد کر کے بارگاہِ قرآن میں وارد ہو چونکہ قرآن ارتقاء کا میدان ہے، ایسا میدان ہے کہ جس کے مرتبے ہیں یعنی قرآن کو آپ یوں کہہ لے کہ سیڑھیاں ہیں اور نہ ختم ہونے والی سیڑھیاں ہیں، جیسے زمین سے آسمان کی طرف ایک سیڑھی بنائی جائے اور اس کی آخری سیڑھی کہیں معلوم نہ ہو، مشخص نہ ہو کہ آخری سیڑھی کہاں ہے؟ اب یہ انسان کی ہمت پر منحصر ہے کہ انسان اس سیڑھی کے کون سے اسٹیپ (Step) پر پہنچا ہے، کونسے مرحلے، درجے اور مرتبے پر پہنچا ہے،

قرآن کے بارے میں ہے کہ

اِنَّ لِلْقُرآنِ ظَھراً وَ بَطْناً وَ لِبَطْنِہٖ بَطْنًا اِلٰی سَبعَۃِ اَبْطُنٍ اَوْ اِلٰی سَبعِیْنَ بَطْنًا......

بیشک قرآن کیلئے ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر باطن کیلئے باطن ہے، یہاں تک کہ سات باطن ہیں یا ستر باطن ہیں......(۱۰)

سبعین کثرت کی طرف اشارہ ہے نہ کہ قرآن کے فقط ستر باطن ہیں یعنی قرآن عمیق ہے، امیر المومنین علیہ السلام نے بھی شناختِ قرآن و توصیفِ قرآن میں فرمایا ہے کہ

ظَاھِرُہُ أَنِیقٌ وَ بَاطِنُہُ عَمِیقٌ......(۱۱)

اس قرآن کا ظاہر بہت خوبصورت اور اس کا باطن بہت گہرا ہے......

باطنِ قرآن عمیق ہے

واقعاً قرآن کا ظاہر بہت زیبا و خوبصورت ہے اور باطن انتہائی عمیق اور گہرا ہے مثلاً سمندر کی طرح ہے کہ انسان اس کی گہرائی میں جائے، غواصی کرے اور ارتقاء کرے، پس اگر ارتقاء نہ کرے اور فقط دہراتا رہے مثلاً قرآن کو حفظ کرلیا اور انہی الفاظ کو ساری عمر دہراتا رہا تو یہ ارتقاء نہیں ہے یا بعض معانی تک پہنچا ہے اور انہی معانی میں ساری عمر بسر کردے، سب کے سامنے بس انہی معانی کو ہمیشہ دہراتا رہے تو یہ بھی ارتقاء نہیں ہے، ارتقاء یہ ہے کہ انسان اس کے ظاہر سے باطن اور باطن سے آگے پہنچے، ارتقاء کے چند مرحلے ہیں، جیسے اشارہ کیا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے محمد ابن حنفیہ کو یہ جملہ بیان فرمایا کہ

اِقْرَأْ وَارْقَ......

قرآن پڑھیے اور ترقی کریں......

یعنی تم پڑھو لیکن اس قرأت میں تمہارے مدِ نظر ارتقاء بھی ہو، یوں نہیں ہے کہ ایک مطلب پڑھ کر یہ کہو کہ بس یہ آیہ تو میں نے حل کردی ہے جیسے بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت ہم نے کھنگال دی ہے، اس آیت کے اندر اب کوئی مطلب موجود نہیں ہے اور اب خالی از مطلب ہوگئی ہے چونکہ جو اس کے اندر تھا ہم نے لے لیا ہے، آپ کی خدمت میں اشارہ کیا تھا کہ بعض بزرگان نے اپنا تجربۂ شخصی نقل کیا ہے اور یہ تجربۂ شخصی تجربۂ نوعی بھی ہے یعنی یہ تجربہ دوسروں کے لئے بھی پیش آیا ہے۔

مرحوم آیت اللہ سید محسن الحکیم رضوان اللہ علیہ نے یہ واقعہ اپنی کتاب شرحِ کفایہ میں بیان کیا ہے، شرحِ کفایہ میں ''استعمالِ لفظ در اکثر از معنیٰ'' ایک بحث ہے، یہ عربی ادب و عربی لٹریچر

(Literature) کی ایک بحث ہے کہ آیا ہم ایک لفظ استعمال کر کے اس سے کئی معانی مراد لے سکتے ہیں یا نہیں، مثلاً فرض کر لیں کہ پانی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، پانی پانی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، مائع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، عزت و آبرو کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کہ مثلاً میں پانی پانی ہوگیا، اسی طرح سے پانی کا لفظ اردو میں بھی بہت سارے معانی میں استعمال ہوتا ہے تو آیا ہم ایک دفعہ لفظِ پانی استعمال کریں تو اس سے کئی معنیٰ مراد لیں یا نہیں؟ یعنی پانی کے جو بہت سارے معانی بنتے ہیں وہ سارے ایک ہی استعمال میں مراد لیں یعنی ہم یہ کہیں کہ میری یہ بھی مراد تھی، وہ بھی مراد تھی اور فلاں بھی مراد تھی۔

مثلاً لفظِ پیاس پانی کی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، علمی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، دنیا کی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، شہرت، شہوت، مال اور کمال کی پیاس میں بھی استعمال ہوتا ہے، اگر ایک انسان کہتا ہے کہ میں پیاسا ہوں اور یہ سارے معانی مراد لے یعنی علم کا بھی پیاسا ہوں، مال کا بھی پیاسا ہوں، شہرت کا بھی پیاسا ہوں، شہوت کا بھی پیاسا ہوں، نام و نمود کا بھی پیاسا ہوں اور کمال کا بھی پیاسا ہوں تو آیا ایک استعمال میں اتنے معانی مراد لئے جا سکتے ہیں یا نہیں، اس بحث میں مرحوم حکیمؒ اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہاں قرآن نے یہ کام کیا ہے، قرآن میں لفظ ایک استعمال ہوا ہے اور اس سے کئی معانی مراد ہیں، ظاہر بھی مراد ہے، باطن بھی مراد ہے، باطن کا باطن بھی مراد ہے، یوں تو نہیں ہے کہ یہ آیت کئی دفعہ استعمال کرے اور ہر استعمال میں ایک نیا معنیٰ مراد ہو، ایک ہی استعمال میں یہ سارے معانی مراد ہیں، یہ اپنے لحاظ سے ایک الگ ادبی بحث ہے۔

اس مناسبت سے انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے، آیت اللہ سید محسن الحکیم رضوان اللہ علیہ نجف کے اندر خود درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور بعض اسی درجے کے علماء بھی مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے بلکہ ہمارے بعض اساتیدِ بزرگوار کہ خدا ان پر رحمت کرے، حضرت آیت اللہ ستودہؒ کہ جن سے ہم نے یہی کتابِ کفایہ پڑھی یعنی علمِ اصول، جب وہ اسی مطلب پر پہنچے تو انہوں نے بیان کیا کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ ہم ایک بزرگ کے پاس پہنچے، پہلے دن پہنچے تو اس نے ہمارے سامنے ایک آیہ قرآن پڑھی اور اسکی تفسیر کی، یہ جماعتِ مجتہدین تھی جو اِن کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی نہ کہ معمولی اور مبتدی طلبہ، فرمایا کہ پہلے دن کی تفسیر سے ہم اش اش کر اٹھے کہ کتنی خوبصورت تفسیر کی ہے، دوسرے دن ہم پھر ان کی خدمت میں گئے تو پھر اسی آیت کو پڑھ کے اس کی تفسیر کی جو پہلے دن سے مختلف تھی اور ہم نے سمجھا کہ یہ مزید دقیق تر تفسیر تھی اور اس سے زیادہ لطف اندوز ہوئے، تیسرے دن پھر اسی آیت کی تیسری مختلف تفسیر کی اور اسی طرح تیس دن ہم مسلسل ان کے پاس جاتے رہے اور وہ ایک ہی آیہ کی ہر روز نئی تفسیر کرتے تھے اور ہر روز پہلے سے زیادہ عمیق تر اور دقیق تر تفسیر فرماتے تھے، حضرت آیت اللہ ستودہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے آغائے حکیمؒ کو خط لکھا کہ آپ نے جس شخص کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ کون تھے؟ تو انہوں نے جواب میں نام بھی لکھا کہ یہ فلاں بزرگوار تھے۔

۹) تالیٔ قرآن ھی ارتقاء کرتا ھے

غرضیکہ اگر انسان کے اندر حسِ ارتقاء موجود ہو تو انسان قرآن کی ایک ہی آیہ کی گہرائی کے

اندر جاسکتا ہے، کبھی یہ نہ کہے کہ میں نے اس آیت میں جو مطلب تھا وہ سارا بیان کر دیا ہے اور کھنگال لیا ہے، آپ نے ایک حد تک یہ کام کیا ہے لیکن آگے بھی ارتقاء کریں، آگے بھی ذرا غور کریں کیونکہ اس آیت کے اندر عمقِ دیگر موجود ہے، پس قرآن میں ارتقاء کئی لحاظ سے مفروض ہے، یہ انقاء کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے یعنی اب جو میادین ارتقاء در قرآن ہیں کہ جن میں قاریِ قرآن و تالیِ قرآن کو تلاوت کرنا ہے۔

تالیِ قرآن معانی ارتقاء کرتا ہے

فصلِ ادبِ ہشتم کے حصہ چہارم میں تحریر کیا تھا کہ تالیٔ قرآن کس کو کہتے ہیں یعنی وہ انسان تالیِ قرآن شمار ہوتا ہے کہ جو ہمراہِ قرآن اور پیرویٔ قرآن میں ہو اور اس میں اور قرآن میں فاصلہ نہ ہو، قرآن اگر الفاظ کی حد تک ہے تو یہ الفاظِ قرآن کے ہمراہ ہو لیکن قرآن تو الفاظ سے آگے بھی ہے، قرآن الفاظ پر تو منحصر و موقوف نہیں ہے، الفاظ سے آگے معانیٔ قرآن ہیں، مفاہیمِ قرآن ہیں، تالی اگر الفاظ پر رک گیا ہے اور قرآن کے معانی تک نہیں پہنچا ہے تو یہ تو تالی نہ ہوا چونکہ تالی اس کو کہتے ہیں کہ جو متصل ہو، قرآن کے پیچھے بغیر فاصلے اور بغیر وقفے کے جا رہا ہو اور وہ دلِ انسان ہے کہ جو تالیِ قرآن ہے، قرآن معانی تک پہنچ گیا اور انسان فقط الفاظ پہ رکا ہوا ہے، کیوں؟ کیونکہ اس کو قرآن کے معانی نہیں آتے ہیں، یہ ان کی بات ہو رہی ہے کہ جو فقط تلاوتِ قرآن یعنی تلفظِ قرآن جانتے ہیں، قرأتِ لفظیٔ قرآن جانتے ہیں اور قرأتِ لفظی کا نام تلاوتِ قرآن رکھا ہوا ہے، تلاوتِ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ آپ قرآن کے پیچھے ہیں اور قرآن آگے جا رہا ہے، آپ متصل بہ قرآن جا رہے ہیں، جہاں جہاں قرآن ہے وہاں وہاں آپ جا رہے ہیں۔

قرآن الفاظ کی شکل میں آیا ہے اور آپ نے یہ الفاظ تلفظ کر لئے ہیں لیکن قرآن تو آگے بڑھ گیا ہے اور معانی تک جا پہنچا ہے چونکہ ان الفاظ کے معانی ہیں، اس شخص کو تو قرآن کے معانی نہیں آتے ہیں، قرآن کا ترجمہ نہیں آتا ہے پس یہ تالیٔ قرآن نہیں ہے، یہ فقط واقفِ قرآن ہے، قرآن آگے بڑھ رہا ہے، قرآن مترقی ہے، یہ واقف ہے اور ایک جگہ پر رکا ہوا ہے، اس نے جمود اختیار کرلیا ہے۔ آپ کس طرح سے اپنے آپ کو کہہ سکتے ہیں کہ میں تالیِ قرآن ہوں؟ قرآن معانی سے آگے بڑھ گیا اور حقائق تک جا پہنچا، ظاہر سے باطن تک جا پہنچا لیکن یہ ظاہر پر ہی رکا ہوا ہے، پس یہ تالیٔ قرآن نہیں ہے، تالیٔ قرآن یعنی متصل بہ قرآن، پیروئے قرآن، الغرض قاریٔ قرآن رکا ہوا ہو اور قرآن آگے بڑھ جائے تو یہ قاریِ قرآن و تالیِ قرآن نہیں ہے۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تالیٔ قرآن ہیں، اہلبیت علیہم السلام تالیٔ قرآن ہیں اور اولیائے خدا علیہم السلام تالیٔ قرآن ہیں، اہلبیت علیہم السلام کے لئے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں اور قرآن میں کوئی فاصلہ نہیں ہے،

لَنْ یَّفْتَرِقَا......(۱۲)

یعنی جہاں قرآن گیا ہے یہ اس کے ہمراہ گئے ہیں، کسی جگہ بھی آپ اہلبیت علیہم السلام اور قرآن کے درمیان فاصلہ نہیں دیکھیں گے، اگر الفاظِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام ہمراہ با قرآن ہیں، اگر معانیٔ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام ہمراہ بہ قرآن ہیں، حقائق و مصادیقِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام اس کے ہمراہ ہیں، باطنِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام ہمراہ ہیں، باطنِ باطنِ قرآن ہوں تو اہلبیت علیہم السلام باطنِ باطنِ قرآن کے ہمراہ ہیں۔

آج کل تلاوت کا یہی معنیٰ و مفہوم لیا جاتا ہے یعنی بغیر ارتقاء کے قرأت کرنا یعنی ہم قدم ہونے کے بغیر اور پیرویٔ متصل کے بغیر اصلاً تلاوت ممکن نہیں ہے، متصور نہیں ہے لیکن ہم نے غلط نام رکھا ہوا ہے، ہم نے بہت سارے کاموں کے اچھے نام رکھے ہوئے ہیں اور یہ انسان کی عادت ہے کہ اپنا جو بھی کام کرے تو اس کو اچھا نام دیتا ہے۔ فرض کریں کہ ایک انسان شرک و کفر کہہ رہا ہے لیکن اس کا نام اس نے عقیدۂ توحید و ایمان رکھا ہوا ہے، شرک کا نام ایمان رکھا ہوا ہے یا بسا اوقات انسان لہو میں مشغول ہے اور اس کا نام اس نے مصروفیت و مشغولیت رکھا ہوا ہے اور اسی کا نام ممکن ہے کہ کوئی عبادت رکھا ہوا ہو درحالیکہ لہوِ محض ہے، ہم بعض لہو کو کہتے ہیں کہ یہ مستحبات ہیں اور بعض لہو کو کہتے ہیں کہ یہ خوش اخلاقی ہے اور انہی لہویات کو اپنے بہترین کارنامے میں شمار کرتے ہیں درحالیکہ یہ لہویاتِ محض ہیں، غلط کام، بے فائدہ کام، بے سود کام یا لایعنی کام ہیں۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام متقین کے اوصاف میں سے ایک یہ ذکر فرماتے ہیں کہ متقی اس کو کہتے ہیں کہ جو لایعنی کام نہیں کرتا ہے، جو لایعنی بات نہیں کرتا ہے، لایعنی یعنی بے فائدہ، یہ انسان ساری عمر لایعنی مسائل اور بے فائدہ کاموں میں بھی مشغول ہے اور ان کو اچھے اچھے نام بھی دیئے ہوئے ہیں، اس کے اوپر اچھے اچھے بینر بھی لٹکائے ہوئے ہیں، اس سے تو انسان تالیٔ قرآن و قاریٔ قرآن نہیں بن جاتا ہے، جس چیز کا بھی ہم نے کوئی مناسب نام نہیں رکھا ہوا ہے وہ درست نہیں ہے مثلاً قرآن آگے بڑھ گیا اور ہم پیچھے رکے ہوئے ہیں تو ہم اس کو کہتے ہیں کہ یہ تلاوتِ قرآن میں مشغول ہے، تلاوت تو ہمراہ جانے کو کہتے ہیں، پیرویٔ قرآن کو تلاوتِ قرآن کہتے ہیں،

تالیِٔ قرآن کی ارتقاء کرتا ہے

اب پیرویِ قرآن کہاں ہے؟ قرآن آگے بڑھ گیا اور آپ یہیں پہ رکے ہوئے ہیں، اسی طرح سے اقتداء بھی ہے مثلاً نمازِ جماعت میں کھڑے ہوں اور نیت بھی نہ کریں، جیسے امامِ جماعت نے تکبیر کہہ دی اور سورۂ حمد بھی پڑھ دی، رکوع میں بھی چلا گیا، سجدے میں بھی چلا گیا لیکن یہ کھڑا ہوا ہے اور اپنے دوست کے ساتھ باتیں کر رہا ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نمازِ جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اور کوئی شخص پیچھے موبائل پر اپنی باتیں کر رہا ہوتا ہے، یہ شخص جو موبائل کے ساتھ مشغول ہے تو یہ تو اقتداء نہیں کر رہا ہے، امام جماعت دوسری، تیسری رکعت میں پہنچ گیا ہے اور یہ ابھی فون پہ باتیں کر رہا ہے، اس کو اقتداء نہیں کہیں گے، بقول مولانا روم

هفت شهر عشق را عطار گشت

ما هنوز اندر خم یك کوچه ایم ......(۱۳)

عطار عشق کی ساتوں وادیاں طے کر گئے اور ہم عشق کے پہلے شہر، پہلے کوچے اور پہلے موڑ میں حیران و سرگرداں کھڑے ہوئے ہیں اور پھر ہم یہ بھی کہیں کہ ہم بھی مثلاً عاشق ہیں، قرآن ہفت شہر و ہفتاد شہر طے کر گیا ہے اور ہم

ما هنوز اندر خم یك کوچه ایم

ہم اس کے صَرف ونحو اور ادبیات میں الجھے ہوئے ہیں، ناظرہ میں الجھے ہوئے ہیں یا ابھی حفظ میں الجھے ہوئے ہیں اور اس سے آگے نہیں بڑھے ہیں، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ بعض ایسے ہیں کہ قرآن ان کے حُنجرے سے نیچے نہیں اترا ہے، ان کے ذہن میں بھی نہیں گیا ہے،

تاملِ قرآن ہی ارتقاء کرتا ہے

فقط گلے میں گھوم رہا ہے۔

پس اس سے پہلے کہ انسان ترقی کے مدارج طے کرے پہلے یہ دیکھ لے کہ تالی کہتے کس کو ہیں؟ اگر قرآن کی منزلیں ہیں اور مرتبے و درجات ہیں تو تالی اس وقت کہلائے گا کہ یہ بھی قرآن کے انہی مرتبوں میں ساتھ ساتھ جائے، ورنہ یہ رک جائے اور قرآن آگے بڑھ جائے تو یہ تالی نہیں ہے بلکہ واقفِ قرآن ہے کیونکہ اس نے فاصلہ ڈال دیا ہے، یہ قرآن کے بقول درحقیقت متولی از قرآن ہے یعنی قرآن سے دور ہے، اس نے قرآن سے منہ پھیر لیا ہے، اس نے قرآن کی نسبت پیٹھ پھیر لی ہے، یہ نابذِ قرآن ہے یعنی اس نے پشت کے پیچھے قرآن کو پھینک دیا ہے، مہجوریتِ قرآن اسی وجہ سے ہے، اس وقت قرآن کو گلوں میں گمانے والے بہت ہیں، قرآن کو کاغذ پر چھاپنے والے بہت ہیں، قرآن کو آنکھوں سے نگاہ کرنے والے بہت ہیں حتیٰ معانیٔ قرآن تک پہنچنے والے بھی بہت ہیں لیکن اس کے باوجود بھی قرآن خود مدعی ہے کہ قرآن ابھی مہجور ہے، مہجور کیوں ہے؟ چونکہ قرآن کے ہمراہ کوئی بھی نہیں آتا ہے، اکثریت تلفظ سے آگے بڑھتی ہی نہیں ہے، جہاں قرآن جاتا ہے اور لے جانا چاہتا ہے لوگ ان میادین میں نہیں جاتے ہیں۔ پس ارتقاء کیلئے انسان کو پہلے تالی قرآن بننا ہوگا ورنہ اس کے بغیر ارتقاء کا سفر ممکن نہیں ہے۔ اس فصل کے حصۂ دوم سے ارتقاء کے مختلف پہلو ذکر کئے جائیں گے۔

تالیٔ قرآن ہی ارتقاء کرتا ہے

حوالہ جات

(۱)......(الانسان الکامل فی نهج البلاغة، الجزء ۱، صفحه ۱)(شرح نهج البلاغة-عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبی الحديد، أبو حامد، عز الدين، الجزء ۸، صفحه ۲۷۸)(شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحديد، الجزء ۱ ، صفحه ۲۴۱۰)(نهج السعادة-الشيخ المحمودی، الجزء ۸، صفحه ۱۹۸)(مسند الامام علیؑ)

(۲)......(المرشد الوجيز لقراء كتاب اللّٰه العزيز، الجزء ۲ ، صفحه ۴)(انسان و قرآن الجزء ۴، صفحه ۱۶)(كيف نقرأ القرآن)(الكافی - الكلينیؒ، الجزء ۲، صفحه ۸۱۵)(شرح أصول الكافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ) (نهج السعادة - الشيخ المحمودی، الجزء ۸، صفحه ۲۱۵)

(۳)......(البيان فی تفسير القرآن،الجزء ۱ ،صفحه ۱۱)(تسنيم تفسير قرآن كريم - آية اللّٰه جوادی آملی مدظله(وسائل الشيعة-الفقيه المُحدّثِ الشيخ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ،الجزء۶ ،صفحه ۱۹۰)(بحار الأنوار - علامه محمد باقر المجلسیؒ،الجزء۸۹ ،صفحه۱۹۷)

(۴)......(الكافی-الكلينیؒ،الجزء ۱ ،صفحه۲۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ طہٰ، آیہ۱۱۴)

(۶)......(سورۂ مبارکہ تین، آیہ۴،۵)

(۷)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ۴۴)

(۸)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۶۵)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۶۶)

(۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۶۳)(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۹۳)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۷۱)

(۱۰)......(تفسیر المیزان - العلامة الطباطبائیؒ)

(۱۱)......(تفسیر المیزان - العلامة الطباطبائیؒ، الجزء ۱، صفحه۶)(التفسیر و المفسرون، الجزء ۴، صفحه ۲۰)(المرشد الوجیز لقراء کتاب اللّٰه العزیز)(باطن و تأویل قرآن)(غرر الحکم و درر الکلم، الجزء ۱، صفحه ۵۶)(ترجمه نهج البلاغه - انصاریان)(هدایة العلم فی تنظیم غرر الحکم للامام علي بن أبی طالبؑ، الجزء ۱، صفحه ۱)

(۱۲)......(البیان فی تفسیر القرآن، الجزء ۱، صفحه۵)(مراجعات قرآنیة)(بحار الأنوار -علامه مجلسیؒ، الجزء ۲، صفحه ۲۲۶)(مناقب أمیر المؤمنین (ع) - محمد بن سلیمان الکوفی، الجزء ۲، صفحه ۱۴۵)(مسند الامام علیؑ، الجزء ۳، صفحه ۱۹۵)(مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء ۷، صفحه۲۵۵)(المسترشد -محمد بن جریر الطبری، الشیعی، الجزء ۱، صفحه ۶۷۴)(دعائم الاسلام، الجزء ۱، صفحه ۲۸)(حیاة أمیر المؤمنینؑ عن لسانه - الشیخ محمد محمدیان، الجزء ۲، صفحه۹۴)(وسائل الشیعة - الفقیه المُحدِّثِ الشیخ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملی، الجزء ۱، صفحه۶۷)

(۱۳)......(مولانا روم)

فصلِ ادبِ نہم

﴿ترقی﴾

(حصّہ دوم)

١)قرآن میں ارتقاء کے مختلف پہلو

☆ارتقاء کا پہلا پہلو

(الف)پہلا درجہ

(ب)دوسرا درجہ

(ج)تیسرا درجہ

٢)ظہورِ ذات برائے ذات

٣)پوری کائنات تجلیٔ الٰہی

٤)خود بینی،خدا بینی میں مانع

٥)مشاہدۂ متکلم میں استغراق

٦)سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

٧)مقربین کیلئے امام صادق علیہ السلام کا فرمان

٨)عظمت کا اثر

٩)عبادات وتلاوتِ قرآن میں حلاوت

١٠)توحیدِ خالص سے مراد

اب ان قرآنی میادین کی طرف آتے ہیں کہ جہاں پر تالیِ قرآن کو ہمراہِ قرآن آگے بڑھتے جانا ہے، البتہ ہر ایک کی تفصیل ہے لیکن ہم صرف فہرست وار ان مطالب کی طرف اشارہ کریں گے کہ قرآن کے اندر تالیِ قرآن کے ارتقاء کا ایک سلسلہ ہے کہ جہاں پر درجاتِ قرآن ہیں اور انسان کو آگے بڑھنا ہے۔

۱)قرآن میں ارتقاء کے مختلف پہلو

☆ارتقاء کا پہلا پہلو

☆وهو ان يترقى الى ان يسمع الكلام من الله لا من نفسه......

صدر المتألھینؒ فرماتے ہیں کہ تالیِ قرآن اتنی ترقی کرے کہ خود خدا سے کلام سنے نہ کہ کلامِ خدا کو کاغذ پہ پڑھے یا خود ہی قاری ہو اور خود ہی سامع ہو بلکہ یہ سامع ہو اور خدا سے سنے،

☆ وقد مر معنى سماع الكلام من الله مراراً، والغرض هاهنا الاشارة الى درجات القرائة وهى ثلاث......

خدا سے کلام سننے سے مقصود قرأت وتلاوت کے تین درجے بیان کرنا ہے۔

(الف)پہلا درجہ

☆ ادناها ان يقدر العبد كأنه يقرأ على الله واقفاً بين يديه......

یعنی پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اس طرح پڑھے کہ بندہ خدا کے سامنے قرآن پڑھ رہا ہے،

☆ وهو ناظر اليه......

اور ذاتِ خدا کلام سن رہی ہے،

☆ و مستمع منه......

انسان پڑھ رہا ہے، جیسے معلم کے سامنے شاگرد پڑھ رہا ہوتا ہے اور اس کی اپنی علامتیں ہوتی ہیں،

☆ فيكون حاله عند هذا التقدير السؤال و التملق و التضرع و الابتهال.

جب انسان خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور تَمَلُّق وحمد وثنا شروع کرتا ہے تو گریہ وزاری شروع کر دیتا ہے اور اس کے اندر ابتھـــال یعنی خضوع وخشوع اور جھکاؤ آجاتا ہے کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ میں کس کے سامنے پڑھ رہا ہوں۔

پہلا درجہ

مثلاً جب بچہ اسکول سے گھر آتا ہے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے سامنے اپنی کتاب پڑھتا ہے تو ٹیچر (Teacher) بن کر پڑھتا ہے، عموماً چھوٹے بچے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے ٹیچر بن کر پڑھتے ہیں لیکن یہی بچہ جب اسکول میں معلم کے سامنے پڑھتا ہے تو اتنا خاضع اور جھکا ہوا ہو جاتا ہے کہ اصلاً اس کو جرأت نہیں ہوتی ہے کہ یہ نگاہیں اٹھائے اور معلم کی نگاہوں میں نگاہ ڈال کر پڑھے، کیوں؟ کیونکہ اس کو یقین ہے کہ میرا کلام معلم سن رہا ہے لیکن ہم قرآن ایسے نہیں پڑھتے ہیں چونکہ ہمیں یقین ہے کہ خدا نہیں سن رہا، ہم تو مُردے کو سنا رہے ہیں نہ کہ خدا کو سنا رہے ہیں، ہم تو جس نے تبرک پکایا ہوا ہے، دیگ پکائی ہوئی ہے اس کو سنا رہے ہیں، مقابلہ ہو رہا ہے تو ہم ججز (Judges) کو سنا رہے ہیں، ہمارا قرآن جج صاحبان سن رہے ہیں نہ کہ خدا سن رہا ہے، اگر خدا

ہمارا کلام سنے تو ہم اس طرح سے پڑھیں گے کہ جیسے مقابلوں میں قرآن پڑھا جاتا ہے، پھر انسان ایسے پڑھتا ہے جیسے معلم کے سامنے بچہ پڑھتا ہے، بیٹھ کر بھی نہیں پڑھتا بلکہ کھڑے ہو کر پڑھتا ہے، مؤدب ہو کر، سر جھکا کر آداب کے ساتھ پڑھتا ہے۔

(ب) دوسرا درجہ

☆ الثانية: ان يشهد بقلبه كأن ربه يخاطبه بالطافه و يناجيه بانعامه و احسانه......

دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اس طرح سے خدا کے سامنے قرآن پڑھے کہ خدا اس سے مخاطب ہے، لیکن کس طرح سے مخاطب ہے؟ اپنے لطف وعنایت ورحمت وکرم کے ذریعے سے، خدا اپنی نعمتوں کے ذریعے، اپنے احسانات کے ذریعے انسان کے ساتھ مناجات کر رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ ہمیں خدا کی نوازشیں، خدا کی شفقت، خدا کی مہربانی محسوس ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے؟ ہمیں انسانوں کی نوازش بہت معلوم ہوتی ہے، اگر کوئی ہم سے ہاتھ ملائے تو اس ہاتھ کے اندر اپنائیت، رحم دلی اور ہمدردی محسوس کرتے ہیں، اس کی جلد سے محسوس کرتے ہیں، لمس کرتے ہیں کہ اس نے واقعاً دوستانہ ہاتھ ملایا ہے، بعض ہاتھ ملاتے ہیں تو انسان اس میں منافقت محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ اس کا دل نہیں چاہتا ہے کہ مجھ سے ہاتھ ملائے، بادلِ نخواستہ ہاتھ ملا رہا ہے یعنی وہ جلد خود لمس کرتی ہے کہ آدمی بادلِ نخواستہ ہاتھ ملا رہا ہے، یہ چیزیں انسان لمس کرتا ہے لیکن آیا انسان خدا کی نوازشیں اور

دوسرا درجہ

بندہ نوازیاں محسوس کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہیں؟ غفلت اسی چیز کو کہتے ہیں، انسانوں کی نوازشیں محسوس ہوتی ہیں لیکن خدا کی نوازشیں محسوس نہیں ہوتیں۔

☆ **ان یشهد بقلبه کأن ربه یخاطبه......**

اپنے دل کے ساتھ مشاہدہ کرے کہ خدا اس سے مخاطب ہے اور اب خدا اپنے لطف و کرم کے ذریعے اس کے ساتھ مناجات کر رہا ہے، یہ مطلب مناجاتِ شعبانیہ میں بھی موجود ہے، ارتقاء کا ایک مرحلہ ایسا تھا کہ انسان خدا کے ساتھ مناجات کرتا ہے اور جب انسان مناجات میں بہت آگے چلا جاتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ خدا انسان کے ساتھ مناجات کرتا ہے یعنی نجوۂ خدا با انسان، مناجاتِ شعبانیہ میں ہے کہ اے خدا مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جن کے ساتھ تو نے نجوہ کیا ہے،

اِلٰهِیْ وَاجْعَلْنِیْ مِمَّنْ نَادَیْتَهٗ فَاَجَابَکَ وَلَا حَظْتَهٗ فَصَعِقَ لِجَلَا لِکَ فَنَاجَیْتَهٗ سِرّاً......

میرے خدا! مجھے ان لوگوں میں رکھ جن کو تو نے پکارا تو انہوں نے جواب دیا، تو نے ان پر توجہ فرمائی تو انہوں نے تیرے جلال کا نعرہ لگایا، ہاں تو نے انہیں باطن میں پکارا......

جس کے ساتھ تو نے نجوہ کیا ہے، تو نے بات کی ہے اور وہ تیرا سننے والا تھا۔ انسان خدا کی مناجات سنے، یہ عبد کی طرف سے سفر ہے اور قرب اسی کو کہتے ہیں، عرفان اسی کو کہتے ہیں، عرفان گھوڑے دوڑانا، دیواریں دوڑانا، پانی پہ چلنا اور کرتب دکھانا نہیں ہے۔

☆ **و یناجیه بانعامه و احسانه، فمقامه......**

دومر اورجہ

اس مقام پر کیا حالت طاری ہوتی ہے؟ مثلاً جب کوئی ہمارے سر پر دستِ نوازش پھیرتا ہے، دستِ شفقت پھیرتا ہے، کوئی بچے کو اپنی آغوش میں لیتا ہے تو اس وقت کیا حالت طاری ہوتی ہے؟

☆ **الحیاء والتعظیم و الاصغاء......**

انسان کے اوپر حیا طاری ہو جاتی ہے، انسان کا سراپا وجود حیائے محض بن جاتا ہے۔ سراپا تعظیم بن جاتا ہے۔ اصغاء یعنی توجہ، انسان کان دھرتا ہے اور توجہ محض بن جاتا ہے، جب خدا مخاطِب ہو اور انسان مخاطَب ہو تو غفلت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے،

☆ **و الفھم.......**

اور انسان الطافِ الٰہیہ و رحمت الٰہیہ میں اور جو کچھ خدا کہہ رہا ہے اس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کو سمجھنے میں محو ہو جاتا ہے، اس وقت انسان کو اگر کاٹ بھی دیا جائے تو توجہ نہیں ہوتی ہے، جیسے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی نماز کے بارے میں واقعہ نقل کیا تھا اور حقیقتاً ایسے ہی ہے، امیر المومنین علیہ السلام کا مقام تو بہت ارجمند ہے بلکہ معمولی شہداء نے بھی جب راہِ خدا میں قربانیاں دی ہیں تو ان کے اوپر بھی یہ حالت طاری ہوئی ہے یا شہدائے کربلا میں سے غیرِ معصوم ایسے شہداء بھی تھے کہ انہوں نے گہرے زخم کھائے لیکن درد کا احساس تک نہیں تھا، نہ یہ کہ درد ہی نہ تھا، درد ہو رہا تھا لیکن وہ اس وقت محو دربارگاہِ خدا تھے اور جب انسان بارگاہِ خدا میں محو ہو تو نہ اپنی طرف توجہ ہوتی ہے اور نہ درد کی طرف۔

(ج) تیسرا درجہ

☆ الثالثة: ان یری فی الکلام المتکلم......

تیسرا درجہ یہ ہے کہ کہ تالیٔ قرآن اس طرح سے ارتقاء کرے کہ کلام کے اندر متکلم کو دیکھے،

☆ و فی الکلمات الصفات......

اور کلماتِ قرآن کے اندر صفات کو دیکھے نہ کہ الفاظ و معانی کو دیکھے کیونکہ یہی صفات ہیں کہ جو اس کے اندر منتقل ہوں گی، یہ کونسی صفات ہیں؟ یہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی صفات ہیں، ہر آیت کے اندر اور ہر لفظِ قرآن کے اندر ایک صفتِ خدا متجلی ہے، یہ اپنی جگہ پر قانون ہے، خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے اسماء وصفات کے ذریعے سے یہ ساری کائنات بنائی ہے، خود اسماء وصفات بھی تجلیاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں۔

۲) ظہورِ ذات برائے ذات

جیسا کہ اصحابِ معرفت بیان کرتے ہیں کہ تجلیٔ ذات بر ذات ہے یعنی ذات کا ظہور ذات کے لئے ہوا ہے، جس طرح سے قرآن میں ہے کہ

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ......(۱)

یعنی خداوند نے جبل کے لئے تجلی کی، اسی طرح سے تجلی ہر شے کیلئے ہے، ایک تجلی ذات کی خود ذات کیلئے ہے نہ کہ غیر کیلئے ہے یعنی تجلّٰی ذاتهٗ لذاته، ذات کی تجلی ذات کے لئے ہے، ظہورِ

ذات برائے خودِ ذات ہے چونکہ ذاتِ خدا اپنے آپ سے غافل نہیں ہے، اپنے آپ کو خدا نے نسیاً منسیا نہیں کیا ہوا ہے، انسان خود فراموش ہے لیکن خدا خود فراموش نہیں ہے، خدا کے بارے میں جہل، فراموشی، نینداور اونگھ جیسی چیزیں صفاتِ سلبیہ میں سے ہیں، خدا کے ہاں غفلت نہیں ہے، خدا کی ذات اپنی ذات سے آگاہ ہے چونکہ ذاتِ حق اپنی ذات سے آگاہ ہے پس ذات ذات کے لئے ظاہر ہے، ذات ذات کے لئے متجلی ہے، ذات کی تجلی ذات پر ہوئی کہ جس سے اسماء وصفات پیدا ہوئے، اسمائے صفات وہ کثرت ہیں کہ جو تجلیاتِ خدا ہیں یا تجلی کا نتیجہ ہیں، پھر ہر اسم کے اوپر ایک تجلیٔ دیگر ہوتی ہے اور اس تجلی کے نتیجے میں بہت سارے افعال، بہت سارے موجودات اور بہت ساری مخلوقات پیدا ہوتی ہیں مثلاً فرشتے خدا کی ایک تجلی کا نتیجہ ہیں، اس کو عرفاء نے یعنی اہلِ معرفت نے نظم کی زبان میں بہت اچھا بیان کیا ہے، حافظ شیرازی نے بھی کہا ہے کہ یہ جو آپ کثرت دیکھتے ہیں، یہ جو آپ موجودات دیکھتے ہیں، یہ جو آپ زمین اور آسمان دیکھتے ہیں یہ سب کہاں سے پیدا ہوئے ہیں؟ انہوں نے قرآن کی آیت کا ترجمہ کیا ہے کہ

وَمَا أَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ٥(٢)

اور ہمارا حکم پلک جھپکنے کی طرح کی ایک بات ہے۔

خدا کا ایک امر ہے، ایک تجلیٔ خدا ہے اور اس ایک تجلیٔ خدا سے یہ سب کچھ پیدا ہوا ہے۔

بقول حافظ شیرازی

این همه عکسِ می و نقشِ نگارین که نمود

ظہورِ ذات برائے ذات

یک فروغِ رُخِ ساقیست کہ در جام افتاد...... (۳)

یعنی یہ اتنی صورتیں جو آپ کو اوہام میں نظر آتی ہیں، یہ کیسے پیدا ہوئی ہیں؟ پہلے اپنے مقام پر بیان ہوا ہے کہ لفظِ ساقی علمِ عرفان کی اصطلاح میں خدا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رخِ ساقی ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کی ایک تجلی ہے "کہ در جام افتاد"، اس جام میں ساقی کی ایک تجلی ہوئی ہے اور اتنی کثرت، اتنی مخلوقات اور اتنی ساری چیزیں وجود میں آئی ہیں، ملائکہ بھی ایک تجلی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، انسان بھی ایک تجلی کے نتیجے میں پیدا ہوئے، زمین اور آسمان بھی ایک تجلی کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

۳) پوری کائنات تجلیٔ الٰہی

آیاتِ تدوینی اور آیاتِ تکوینی، موجوداتِ ملکوتی اور موجوداتِ ملکی یہ سب کے سب تجلیاتِ الٰہی ہیں اور ہر تجلی میں متجلی موجود ہے، انسان تجلیٔ آئینہ ہے اس لئے قرآن نے آیت استعمال کیا ہے، یہ آیات ہیں یعنی ایک لحاظ سے ان کا نام تجلیاں ہے اور ایک لحاظ سے آیات ہے، اس کو تجلی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ فاعل نے اس کے اندر جلوہ کیا ہے اور یہ فاعل کا ظہور ہے اور آیت اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ فعل، یہ موجود یا یہ مخلوق سوائے اپنے فاعل وسوائے اپنے خالق کے کسی اور چیز کی نشاندہی نہیں کرتی ہے۔

نابینا اور بینا یہیں پر مشخص ہوتے ہیں، اگر ہسپتال میں ایک ڈاکٹر کسی انسان کو دور

بٹھا کر اس کی ایک آنکھ پہ ہاتھ رکھ کر یہ کہے کہ سامنے لکھی ہوئی اے بی سی (ABC) پڑھو تو وہاں سے معائنہ کرا کے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ بینا اور نابینا کون ہے؟ ممکن ہے کہ انسان کی نگاہیں بالکل درست ہوں لیکن اسی انسان کو جب آئینے کے سامنے کھڑا کریں تو اس کو آئینے میں کچھ بھی نظر نہ آتا ہو لہٰذا یہ نابینا ہے، یہ جو قرآن نے فرمایا ہے کہ

لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ ۝ (۴)

درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

یعنی خدا نے ہمیں آئینوں کے سامنے کھڑا کیا ہوا ہے، تجلیوں کے سامنے کھڑا کیا ہوا ہے اور پھر اس کے بعد کہا تھا کہ

صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ ...... (۵)

یہ سارے اندھے، بہرے اور گونگے ہیں، سارے نابینا ہیں لیکن نابینائی قلبی ہے، ان کی بصیرت نابینا ہے، آئینوں کے سامنے کھڑے ہیں لیکن انہیں آئینے کے اندر کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے، تجلیوں کے سامنے ان کو متجلی نظر نہیں آتا ہے، آیات کے سامنے ان کو خدا نظر نہیں آتا ہے، پس یہ سارے نابینا ہیں، بقول مولانا روم

چشم باز و گوش باز و این ذُکا
خیرہ ام در چشم بندیِ خدا ...... (۶)

یہ خدا نے کیسی چشم بندی کر دی ہے؟ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ان کو کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے، کان کھلے ہوئے ہیں لیکن ان سے کچھ بھی نہیں سنتے ہیں یعنی صبح و شام تجلیاں دیکھتے ہیں لیکن انہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ سب عام لوگ نابینا ہیں اور امیر المومنین علیہ السلام بشریت میں بینا ترین انسان ہیں، بینا کون ہے؟ جس کو سب کچھ نظر آتا ہے اور حقیقت نظر آتی ہے،

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ...... (۷)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا......

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَ بَعْدَهُ...... (۸)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا، اس کے ساتھ بھی اور اس کے بعد بھی......

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ مَعَهُ...... (۹)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس کے ساتھ خدا کو دیکھا......

جس کو ان تجلیوں کے اندر خدا نظر آتا ہے، یہ بینا ترین انسان ہے لہذا انسان رویئت کرے، ایک شخص نے پوچھا کہ آیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا

لَمْ أَکُنْ أَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَهُ...... (۱۰)

میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی ہے جسے میں نے دیکھا نہ ہو......

مَا کُنْتُ لِأَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَهُ...... (۱۱)

یعنی میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا کہ جسے دیکھا نہ ہو، لیکن میں نے اپنے رب کو بصیرت سے دیکھا ہے، نورِ ایمان سے دیکھا ہے۔ پس انسان کلام میں متکلم کو دیکھے اور کلمات کے اندر صفات کو دیکھے۔

٤) خود بینی، خدا بینی میں مانع

☆ فلا ینظر الی نفسه......

اپنے آپ کو نہ دیکھے یعنی ایسا نہ ہو کہ جب قرآن پڑھ رہا ہو تو بھی اپنا نفس نظر آ رہا ہو، یہ خود خواہی و خود بینی ہے، خود بین خدا بین نہیں ہو سکتا ہے، خود خواہ خدا خواہ نہیں ہو سکتا ہے، خود طلب خدا طلب نہیں ہو سکتا ہے، خود پرست خدا پرست نہیں ہو سکتا ہے، جس کو قرآن پڑھتے ہوئے بھی خودی نظر آ رہی ہو کہ میں کتنا اچھا قرآن پڑھ رہا ہوں! میں کتنی اچھی تلاوت کر رہا ہوں! میں کتنی اچھی تفسیر بیان کر رہا ہوں! میں قرآن سے متعلق کتنے اچھے مطالب بیان کر رہا ہوں! یہ قرآن کے اندر خود بینی ہے، پس اپنے آپ کو نہ دیکھے اور یہ بھی نہ دیکھے کہ میں اس وقت قرآن پڑھ رہا ہوں چونکہ اپنی طرف یہ ادنیٰ سی توجہ بھی انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے،

☆ ولا الی تعلق الانعام به من حیث انه منعم علیه......

اور یہ بھی نہ دیکھے کہ میرے اوپر خدا کی بڑی نعمتیں ہیں، یہ آخری مرتبے میں ہے، پہلے مرتبے میں تو دیکھے گا، وہ وسطی مرتبہ ہے، متوسط لوگوں کا مرتبہ ہے، عالی مقام و مقامِ فنا میں انسان نہ

خودکو دیکھتا ہے، نہ نعمتوں کو دیکھتا ہے اور نہ یہ دیکھتا ہے کہ میں منعم علیہ ہوں چونکہ اس صورت میں اس کو ساری نعمتیں نظر آئیں گی، اس صورت میں اس کو اپنی ذات اور خدا نظر نہیں آئے گا۔

۵) مشاهدۂ متکلم میں استغراق

☆ بل یکون مقصور الهم علی المتکلم......

اپنی ساری ہمت اور ارادہ وتوجہ فقط متجلی کے اوپر گاڑ دے، ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کے اندر مبذول کردے،

☆ موقوف الفکر علیه......

اپنی ساری فکر کو فقط ذات کی رویئت میں متمرکز اور جمع کردے،

☆ کأنه مستغرق بمشاهدة المتکلم عن غیره......

یعنی اس طرح سے دیکھے کہ یہ مشاہدۂ ذات میں، مشاہدۂ متکلم میں غرق ہو اور غیر سے غافل ہو گیا ہو، غیر سے قطعِ تعلق کردیا ہو۔

پہلے بھی سابقہ آٹھویں ادب کی فصل میں بیان ہوا تھا کہ قرآن میں انسان کی ایک حالت تاثر ہے، تاثر کے نتیجے میں وجد ہے۔ وجد بھی اہلِ عرفان کی اصطلاح ہے نہ کہ شعبدہ بازوں کی کہ جو مرید باز لوگ ہوتے ہیں، جنہوں نے بنامِ تصوف وعرفان دکان بنائی ہوئی ہے، اس دکانِ عرفان کی بات نہیں ہو رہی ہے چونکہ عموماً ان دکانداروں کو مریدوں کے سامنے وجد آجاتا ہے، ایک نیم نگاہ

مشاہدۂ متکلم میں استغراق

سے ہر چیز دیکھ رہے ہوتے ہیں، ان کی نیم نگاہ نوٹوں پہ ہوتی ہے، جیب پہ ہوتی ہے، ان کے ہدیوں، شکرانوں اور تحفوں پہ ہوتی ہے لیکن بظاہر اپنے آپ پر حالتِ وجد طاری کی ہوئی ہوتی ہے وہ وجد نہیں ہے، وجدِ حقیقی وہ ہے کہ جو ہر ایک کا تجربۂ شخصی بھی ہے، ہر ایک پر یہ وجد طاری ہوتا ہے یعنی انسان کے پاس ایسے حالات ولمحات آتے ہیں کہ جس میں انسان کاملاً غافل و بے خود ہو جاتا ہے یعنی فقط ایک نقطے پر توجہ ہوتی ہے اور باقی ساری دنیا سے رابطہ کٹ جاتا ہے حتیٰ اپنے بدن، اپنے وجود اور اپنی ہر چیز سے رابطہ کٹ جاتا ہے۔

جس طرح وہ انسان کہ جو عمیق مطالعہ کرنے والے اور واقعاً اہلِ تفکر واہلِ تدبر ہیں ان پر مطالعہ کے وقت ایسی ہی حالت طاری ہوتی ہے نہ کہ جو بس اسٹاپ پہ مطالعہ کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات جب ان کے اوپر شعر کا ورود ہوتا تھا یا تدبر و تفکر میں مشغول ہوتے تھے تو دنیا و مافیھا سے غافل ہو جاتے تھے، انہیں پتہ نہیں ہوتا تھا کہ دن ہے یا رات ہے، میرے گرد کوئی ہے یا نہیں ہے، کوئی مجھے بلا رہا ہے، مجھ سے پوچھ رہا ہے یا متوجہ کر رہا ہے اور یہی حالات دوسروں کے بھی ہیں اور سب سے بڑی بات امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے کہ نماز کی حالت میں تیر نکال لیا گیا، یہی استغراق ہے، استغراق یعنی اس طرح سے غرق ہو جانا کہ باقی کسی چیز کی طرف توجہ نہ رہے، جس طرح سے انسان پانی میں غرق ہوتا ہے، غرق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان پانی میں اس طرح سے ڈوبا کہ اب باقی ساری دنیا سے ناتا کٹ گیا، ورنہ اگر رسی بھی انسان کے ہاتھ میں ہو، کشتی بھی انسان کے پاس ہو اور ساری چیزوں سے رابطہ ہو تو اس کو غرق ہونا نہیں کہتے

مشاہدہ، منظم میں استغراق

ہیں، غرق ہونا یعنی کسی چیز کے اندر راسخ ہو جانا، کسی چیز کے اندر محو ہو جانا، اس طرح سے محو ہو جانا کہ دوسری چیزوں سے انسان کا رابطہ کٹ جائے،

☆ كأنه مستغرق بمشاهدة المتكلم عن غيره......

یہ متکلم کو دیکھنے سے غرق ہوا ہے اور غیر سے اس کا رابطہ کٹ گیا ہے، یہی مناجاتِ شعبانیہ میں طلب کرتے ہیں کہ

اِلٰهِیْ هَبْ لِیْ کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ......

میرے رب مجھے کمالِ انقطاع عطا فرما، یعنی مطلقاً غیر سے میرا رابطہ کاٹ کے فقط اپنی ذات کی طرف متوجہ فرما۔ غرق ہونے، محو ہونے اور فنا ہونے میں سب سے بڑا حاجب، سب سے بڑا حجاب خود انسان ہے، ہمیں خدا کیوں نظر نہیں آتا ہے؟ چونکہ ہم خود اپنے آپ کو نظر آتے ہیں، ہم ہر آئینے میں خود کو دیکھتے ہیں، خود پسندی اسی وجہ سے ہے، جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا، جیسے میں بول سکتا ہوں ایسے کوئی نہیں بول سکتا، جیسے میں پوچھتا ہوں ایسے کوئی نہیں پوچھتا، جیسے میں جواب دیتا ہوں ایسا کوئی جواب نہیں دیتا، جو میرا مقام ہے وہ کسی اور کا نہیں، جو میری طرف توجہ ہے وہ کسی اور کی طرف نہیں، ہم ہر چیز میں خود کو دیکھتے ہیں کیونکہ ہم خود حجاب ہیں، بعض اہلِ معرفت کے بقول

بَیْنِکَ وَ بَیْنِیْ اِنِّیْ یُنَازِعُنِیْ،

یعنی خدا کو خطاب کر کے کہہ رہے ہیں کہ اے پروردگار تیرے اور میرے درمیان فقط ایک

مشاہدۂ متکلم میں استغراق

حجاب رہ گیا ہے اور وہ میں ہوں، میری انانیت ہے،

فَارْفَعْ بِفَضْلِکَ اِنِّیْ مِنَ الْبَیْنِ،

اب ایک لطف اور فرما یعنی اس حجاب کو، میری انانیت اور میری انیت کو بھی برطرف فرما کہ میں اپنے آپ کو نہ دیکھوں، میں خود بین نہ بنوں، خود بینی سب سے بڑا مانع ہے، انسان کے تکامل میں سب سے بڑا مانع خود بینی ہے، اس طرح انسان کبھی بھی تکامل نہیں کر سکتا ہے، خود بین غرور و حسد میں مبتلا ہوتا ہے، حسود ہوتا ہے، اگر خود بین نہ ہو تو انسان کے اندر حسد بھی پیدا نہیں ہوتا ہے، انسان کے اندر بہت ساری بیماریاں خود بینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں از جملہ محرومیت از مشاہدہ، محرومیت از رویئتِ خدا بھی خود بینی کی وجہ سے ہے، ہمیں تجلی میں متجلی نظر نہیں آتا ہے چونکہ تجلی میں بھی ہم اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

٦) سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

☆ و ھذہ درجة المقربین......

فرماتے ہیں کہ یہ مقربین کا درجہ ہے، یہ فنا پہ آ جانا مقربین کا درجہ ہے،

☆ وما قبله فھو درجات اصحاب الیمین......

اور جو درجہ اس سے پہلے ہے یعنی خدا کی نعمتیں دیکھنا، خدا کو نعمتوں کے ساتھ دیکھنا اور اپنے آپ کو منعم علیہ دیکھنا وہ درجۂ ابرار اور اصحابِ یمین کا درجہ ہے، یہ تقسیم و درجہ بندی قرآنی ہے۔

سورۂ واقعہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کے جو درجات بیان کئے ہیں، ان درجات ومراتب کے اندر خداوند تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہیں کہ

وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ o أُولٰئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ o (۱۲)

اور سبقت کرنے والے تو سبقت کرنے والے ہی ہیں۔ وہی اللہ کی بارگاہ کے مقرب ہیں۔

سورۂ واقعہ میں انسانوں کے درجات

کچھ مقربون ہیں، کچھ اصحابِ یمین ہیں اور کچھ کو کہا کہ یہ اصحابِ شمال واصحابِ مشأمہ ہیں یعنی منحوس لوگ ہیں۔ انسانوں نے دنوں کو، پرندوں کو اور دوسری چیزوں کو منحوس سمجھا ہوا ہے درحالیکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ خود منحوس ہیں، مشأمہ یعنی شوم لوگ، اصحاب المشأمہ یعنی صاحبِ نحوست لوگ اور اصحابِ یمین یعنی صاحبِ یمن و برکت، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو صاحبِ یمن و برکت ہیں یعنی کچھ لوگ اپنے اعمالِ منحوس کی وجہ سے منحوس ونحس ہیں، اصحابِ مشأمہ واصحابِ شمال ہیں اور کچھ اصحابِ یمین ہیں یعنی ابرار ہیں اور کچھ مقربین ہیں، یہ قرآنی تقسیم بندی کے درجات ہیں، پہلا درجہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو منعم علیہ دیکھے اور خدا کی نعمتوں کو دیکھے یہ درجۂ ابرار ہے یا درجۂ اصحابِ یمین ہے یعنی یہ متوسط درجہ ہے، ایک مقربین کا درجہ ہے، مقربین کون ہیں؟ قرآن میں اصحابِ یمین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جنت میں جائیں گے اور جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ انہیں کون کونسی نعمتیں عطا ہوں گی، آغازِ سورہ مبارکہ واقعہ میں ہے کہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ○ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ○ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ○ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ○ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ○ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ○ وَّكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ○

جب قیامت برپا ہوگی۔ اوراس کے قائم ہونے میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ وہ الٹ پلٹ کر دینے والی ہوگی۔ جب زمین کو زبردست جھٹکے لگیں گے۔ اور پہاڑ بالکل چور چور ہو جائیں گے۔ پھر ذرات بن کر منتشر ہو جائیں گے۔ اور تم تین گروہ ہو جاؤ گے۔

فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ○

پھر داہنے ہاتھ والے اور کیا کہنا داہنے ہاتھ والوں کا۔

یہ اصحاب یمین ہیں یعنی اصحابِ میمنہ

وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ○

اور بائیں ہاتھ والے اور کیا پوچھنا ہے بائیں ہاتھ والوں کا۔

یہ شوم لوگوں کا گروہ ہے،

وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ ○

اور سبقت کرنے والے تو سبقت کرنے والے ہی ہیں۔

یعنی تیسرا گروہ سابقون کا ہے،

أُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ○

وہی اللہ کی بارگاہ کے مقرب ہیں۔

فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ○ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ○ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ○

نعمتوں بھری جنتوں میں ہوں گے۔ بہت سے لوگ اگلے لوگوں میں سے ہوں گے۔ اور کچھ آخر دور کے ہوں گے۔

یہ لوگ نعمتوں کے اندر ہوں گے، اصحابِ یمین، اصحابِ میمنہ سب کے سب نعمتوں کے اندر ہوں گے، ان کیلئے یہ نعمتیں ہیں کہ

عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ○ مُّتَّكِئِیْنَ عَلَیْهَا مُتَقٰبِلِیْنَ○

موتی اور یاقوت سے جڑے ہوئے تختوں پر۔ ایک دوسرے کے سامنے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔

ان کے بستر ایسے ہوں گے، ان کے سریر ایسے ہوں گے، پلنگ ان کے ایسے ہوں گے، چارپائیاں ایسی ہوں گی، کمرہ ایسا ہوگا، سردی گرمی میں ٹمپریچر ایسا ہوگا، یہ سارے نعمتوں کے اندر اور ایک آسائش کے ماحول میں ہوں گے،

یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ○ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِیْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ○

ان کے گرد ہمیشہ نوجوان رہنے والے بچے گردش کر رہے ہوں گے۔ پیالے اور ٹونٹی دار کنٹر اور شراب کے جام لئے ہوئے۔

لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ○ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ○

جس سے نہ دردِ سر ہوگا نہ ہوش و حواس گم ہوں گے۔ اور ان کی پسند کے میوے لئے ہوں

گے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ٥ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ٥ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ٥ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْمًا ٥

اور ان پرندوں کا گوشت جن کی انہیں خواہش ہوگی۔ اور کشادہ چشم حوریں ہوں گی۔ جیسے سربستہ موتی۔ یہ سب درحقیقت ان کے اعمال کی جزا اور اس کا انعام ہوگا۔ وہاں نہ کوئی لغویات سنیں گے اور نہ گناہ کی باتیں۔

یعنی بہترین ماحول ہوگا اور اس میں لغویات ولایعنی باتیں نہیں ہوں گی،

اِلَّا قِيْلًا سَلَامًا سَلَامًا ٥

ہر طرف صرف سلام ہی سلام ہوگا۔

یعنی سلامتی ہی سلامتی ہوگی، امن ہی امن ہوگا،

وَأَصْحَابُ الْيَمِيْنِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِيْنِ ٥ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ٥ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ٥ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ٥ وَّمَاءٍ مَّسْكُوْبٍ ٥ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ٥ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ٥ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ٥ اِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ اِنْشَاءً ٥ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ٥ عُرُبًا أَتْرَابًا ٥ لِّأَصْحَابِ الْيَمِيْنِ ٥ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ ٥ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِيْنَ ٥

اور داہنی طرف والے اصحاب! کیا کہنا ان اصحابِ یمین کا۔ بے کانٹے کی بیر۔ لدے گتھے ہوئے کیلے۔ پھیلے ہوئے سائے۔ جھرنے سے گرتے ہوئے پانی۔ کثیر تعداد کے میووں کے درمیان

ہوں گے۔جن کا سلسلہ نہ ختم ہوگا نہ ان پر کوئی روک ٹوک ہوگی۔اوراونچے قسم کے گدے ہوں گے۔ بیشک ان حوروں کو ہم نے ایجاد کیا ہے۔تو انہیں نت نئی بنایا ہے۔یہ کنواریاں اور آپس میں ہمجولیاں ہوں گی۔یہ سب اصحابِ یمین کے لئے ہے۔جن کا ایک گروہ پہلے لوگوں کا ہے۔اور ایک گروہ آخری لوگوں کا ہے۔

اور اصحابِ شمال کا محلِ وقوع کیا ہوگا؟ ان کی رہائش گاہ کیسی ہوگی؟ ان کے بارے میں فرمایا کہ

وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ ۝ فِي سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝

اور بائیں ہاتھ والے تو ان کا کیا پوچھنا ہے۔گرم گرم ہوا کھولتا ہوا پانی۔کالے سیاہ دھوئیں کا سایہ۔جو نہ ٹھنڈا ہو اور نہ اچھا لگے۔

یہ سخت ترین فضا میں ہوں گے،

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝

یہ وہی لوگ ہیں جو پہلے بہت آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔

عیاش وہاں ہوں گے،

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا أَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ أَوَ آبَاؤُنَا الْأَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْأَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝

اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کر رہے تھے، اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ اولین و آخرین سب کے سب ایک مقررہ دن کی وعدہ گاہ پر جمع کئے جائیں گے۔

اور اس طرح سے ان سب کے مقام وغیرہ بیان کرنے کے بعد پھر فرمایا کہ

فَأَمَّا اِنۡ کَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ۝

پھر اگر مرنے والا مقربین میں سے ہے۔

اسی سورۂ واقعہ میں تینوں گروہوں کے مقامات، ان کی نعمتیں، عذاب اور سب کچھ بیان کرنے کے بعد آخر میں آیہ (۸۸) میں جا کر پھر مقربین کو استثنا کیا، مقربین نعمتوں میں نہیں ہوں گے۔ اصحابِ یمین دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اصحابِ نعمت ہیں، منعم علیہ ہیں لیکن مقربین کیا ہیں، مقربین مافوقِ نعمت ہیں،

فَرَوۡحٌ وَّرَیۡحَانٌ وَّ جَنَّتُ نَعِیۡمٍ ۝

یعنی یہ خود جنت ہوں گے، یہ خود ریحان ہوں گے، اصحابِ یمین جنت میں ہوں گے لیکن مقربین خود جنتِ نعیم ہیں،

وَاَمَّا اِنۡ کَانَ مِنۡ اَصۡحَابِ الۡیَمِیۡنِ ۝ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنۡ اَصۡحَابِ الۡیَمِیۡنِ ۝

اور اگر اصحابِ یمین میں سے ہے۔ تو اصحاب یمین کی طرف سے تمہارے لئے سلام ہے۔

پس قرآن پڑھنے والے تالینِ قرآن کے بھی درجات ہیں۔ بسا اوقات جو قرآن پڑھ رہے ہیں وہ اصحابِ یمین ہیں یعنی اصحابِ نعمت ہیں لیکن مقربین جب قرآن پڑھتے ہیں تو ان کی نگاہ فقط ذاتِ خدا پر ہوتی ہے اسی لئے ان کو مقربین کہا گیا ہے، ان کو مقربین نہیں کہا گیا ہے کہ جو حوروں کے ساتھ باغوں میں ٹہل رہے ہوں گے، جو کھانے پینے میں مشغول ہوں گے، جن کا ایک طشت ختم ہوتا ہے تو دوسری ٹرے ان کے سامنے لا کر رکھیں گے کیونکہ ان کو تو فرصت نہیں ہے کہ خدا کی طرف توجہ کریں، یہ سارے اصحابِ یمین نعمتوں میں ہوں گے کیونکہ ان کے اعمال اچھے تھے لہٰذا ان اعمال کے نتیجے میں انہیں یہ ساری نعمتیں ملی ہیں، یہ خود ان کی اپنی زحمت اور کوشش ہے کہ جو آج نعمتوں کی صورت میں ظاہر ہوگی لیکن مقربین جو قربِ خدا رکھتے ہیں وہ قریب بہ خدا ہیں اور ان کا مقام و منزلت ایسی ہے،

☆ وما خرج عن هذا......

اور جو نہ اصحاب یمین میں سے ہو، نہ مقربین میں سے ہو اور قرآن پڑھتا ہو،

☆ فهو درجات الغافلين......

یعنی جو انسان قرآن پڑھے اور اس قرآن کھولتے ہوئے خدا کی نعمتوں کی طرف توجہ نہ کرے یا پھر قرآن پڑھے اور اس قرآن میں مشاہدۂ ذاتِ خدا نہ کرے تو یہ غافل انسان ہے۔ یہ قاری اور تالیِ قرآن غافل قاری ہے اور اس کے بارے میں ہے کہ

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... (۱۳)

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... (۱۴)

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... (۱۵)

یعنی بہت سارے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر خود قرآن لعنت کرتا ہے۔

۷)مقربین کیلئے امام صادق علیہ السلام کا فرمان

☆ و عن الدرجة الثالثة اخبر الامام ابوعبدالله جعفر الصادق عليه السلام......

اور آخری مقام والوں یعنی مقربین کے مقام کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ

☆ فقال: والله لقد تجلى الله لخلقه في كلامه،ولكنهم لايبصرون......

خدا کی قسم! خدا اپنے کلام کے اندر اپنی مخلوق کے لئے، خَلق کے لئے متجلی ہے لیکن خلق دیکھتے نہیں ہیں، کیوں نہیں دیکھتے ہیں؟ چونکہ خلق حجاب میں ہے مثلاً اس وقت ہمیں سورج نظر نہیں آتا ہے، سورج نظر نہیں آتا ہے تو کیا ہم یہ کہتے ہیں کہ سورج پردے میں ہے؟ جبکہ ہم کمرے کے اندر ہیں نہ کہ سورج پردے میں ہے، سورج تو فضا میں اپنے مقام پر ہے، سورج کو کوئی چیز بھی چھپا نہیں سکتی ہے لیکن ہمیں بہت ساری چیزیں چھپا لیتی ہیں، ایک محاورے میں کہتے ہیں کہ انگلی کے پیچھے سورج چھپانا، انسان اگر اپنی آنکھ کھول کے اس کے سامنے انگلی رکھے تو سورج نظر نہیں آتا ہے، آیا

انگلی سے سورج چھپ رہا ہے یا انگلی سے آپ نے آنکھ چھپائی ہے؟ آنکھ پردے میں ہے نہ کہ سورج پردے میں ہے، آنکھ انگلی جتنی ہے لہٰذا چھپ جاتی ہے، پس ہم حجابوں میں ہیں اور سب سے بڑا حجاب خودخواہی وخود بینی کا حجاب ہے، ہم اس خود بینی سے باہر نہیں آتے ہیں کہ ہمیں کچھ اور چیز بھی نظر آئے، کوئی دوسرا بھی نظر آئے، کوئی عالمِ ہستی نظر آئے، کوئی حقیقت نظر آئے، ہم خود کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں،

☆ **وقد سألوه عن حالة......**

اور امام صادق علیہ السلام سے ہی پوچھا گیا،

☆ **لحقته فی الصلوة حتی خر مغشياً عليه......**

جب امام صادق علیہ السلام کی نماز کے اندر ایک حالتِ مخصوص طاری ہوئی، ایک غشی کی حالت طاری ہوئی حتیٰ کہ مدہوش ہو کر نماز میں گر گئے، خر مغشیاً یعنی امام صادق علیہ السلام گر گئے،

☆ **فلما سری......**

اور جب اس حالت سے افاقہ ہوا تو بعد میں لوگوں نے آکر پوچھا،

☆ **عنه قيل له فی ذلک......**

آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ نماز میں ایسے کیوں ہوا؟

☆ **فقال عليه السلام: مازلت اردد هذه الاية......**

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اس آیہ کو اتنا تکرار کیا، مــازلــت اردد یعنی

میں اس کو مسلسل تکرار کرتا رہا۔ ظاہراً آیت یہ تھی،

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ٥

☆حتی سمعتهامن المتكلم بها......

حتیٰ کہ میں نے خود خدا سے اس آیت کو سنا۔ بسا اوقات انسان نماز کے اندر ایسی تلاوت کرتا ہے کہ خود پڑھتا ہے اور خدا کو سناتا ہے لیکن ایک نمازِ غافلانہ یہ ہے کہ انسان پڑھ رہا ہے اور مقتدیوں کو سنا رہا ہے، یہ جو خوب مخارج نکالتے ہیں، دوہرے دوہرے اور گاڑھے مخارج نکالتے ہیں، یہ اسپیکر آن کر کے متاثر کر رہے ہوتے ہیں کہ مقتدی سنیں اور محلے والے بھی سنیں، خدا کو سنانا مقصود بھی نہیں ہے چونکہ انسان جب خدا کے سامنے پڑھتا ہے تو پھر حالت اور ہو جاتی ہے جیسے مثال بھی دی تھی کہ معلم کے سامنے جب انسان پڑھتا ہے تو انسان کے اندر عاجزی آجاتی ہے، خضوع آجاتا ہے اور آواز خود ہی دھیمی ہو جاتی ہے، جب انسان بڑے کے سامنے، عظمت کے سامنے جاتا ہے تو آہستہ آہستہ آواز رک جاتی ہے اور انسان بول نہیں سکتا ہے۔

عظمت کا اثر

۸)عظمت کا اثر

قم میں ایک بہت ہی جالب اتفاق ہوا تھا کہ جب مقامِ معظمِ رہبری حضرت آیت اللہ خامنہ ای مدظلہ صدرِ مملکت تھے اور قم میں آئے تھے کہ جہاں ان کی طلابِ غیر ایرانی یعنی خارجی طلاب سے ایک نشست تھی، سارے طلابِ غیر ایرانی کو اکٹھا کیا گیا کہ جو اس وقت تھوڑے ہوتے تھے، آج

بہت زیادہ ہیں، اُس وقت ظاہراً سب کو ملا کر ڈیڑھ دو ہزار کی تعداد تھی۔

بہرکیف سب حسینہ میں اکٹھے ہوئے اور وہاں پر آقا تشریف لائے۔ جب وہ اسٹیج (Stage) پر بیٹھے تو مرکزِ جہانی نے سپاس نامہ پیش کرنے کیلئے پہلے سے کچھ طلاب کو آمادہ کیا ہوا تھا، ایک فرانسیسی طالب علم تھے کہ جو بعد میں محاذِ جنگ پہ شہید ہو گئے، وہ ایشیائی فرانسیسی نہیں تھے بلکہ وائٹ یورپین فرانسیسی تھے، ان کو اس وجہ سے کھڑا کیا گیا کہ یہ یورپ سے ہیں تو ان کے اندر ایک انفرادیت تھی، بہرکیف بہت پاکیزہ جوان طالب علم تھے، ان کی معصومیت اور پاکیزگی ان کے چہرے سے محسوس ہوتی تھی، ان کو انہوں نے فارسی میں سپاس نامہ دیا کہ پریذیڈنٹ (President) کے سامنے سپاس نامہ پڑھے، یہ آکر اسٹیج پر کھڑے ہوئے، ظاہر ہے کہ جس ملک سے آئے تھے وہاں تو ایسی شخصیات سے نہیں مل سکتے تھے، وہ اپنے وزیرِ داخلہ کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے چہ جائیکہ پریذیڈنٹ کو دیکھتے، یہ صرف ٹی وی پہ یا اخبارں میں دیکھتے ہیں اور اس طرح سے بالمُشافِہَہ ملنا ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے اور خصوصاً پھر ایک شخصیت کا تقدس وعظمت بھی ہو، ایک شخصیت کا پہلے سے ذہن بنا ہوا ہو اور انسان خود کو ناگہاں اس کے پہلو میں پائے تو حواس ٹھکانے نہیں رکھ سکتا ہے، واقعاً ایسا ہی ہوا، یہ بزرگوار اٹھ کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے سپاس نامہ کی چند سطریں بیان کیں اور پھر اس کے بعد رک گئے، ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور کوئی آواز نہیں آرہی تھی، جس نے سپاس نامہ لکھا تھا وہ پیچھے سے لقمے دے رہا تھا، وہ سمجھا کہ شاید پڑھ نہیں سکتے تھے یا کوئی مشکل پیش آگئی ہے، بہرکیف جب دو تین دفعہ اس نے دیکھا تا نا تو وہ بول ہی نہیں سکتے ہیں،

آخر کیا ہوا تھا؟ وہی خــر مـغشیاً، وہ مدہوش ہو گیا تھا یعنی وہ جلوہ دیکھ کر، وہ روپ، مقام اور عظمت دیکھ کر اس کے دل پر اثر ہوا، آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور مدہوش تھا، قریب تھا کہ وہ اسٹیج سے گر جائے، دو آدمیوں نے اٹھ کر اسے سنبھالا اور اسٹریچر (Stretcher) پر اٹھا کر حال (Hall) سے باہر لے گئے۔ بسا اوقات انسان جب کسی بھی عظمت کے سامنے جا کر واقع ہو تو اپنے آپ کو کھو بیٹھتا ہے۔ بے خودی اسی کو کہتے ہیں، لیکن جو کہے کہ یہ پریذیڈنٹ کیا ہے؟ میں تو ان سے زیادہ پڑھا ہوا ہوں، میرا نالین اس سے زیادہ قیمتی ہے، میرا جوتا ان سے زیادہ قیمتی ہے، میں نے ان سے زیادہ موٹا عمامہ باندھا ہوا ہے تو وہ ایسے متاثر نہیں ہوتا ہے۔

بہر حال جب امام صادق علیہ السلام کو افاقہ ہوا تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا تھا؟ فرمایا کہ میں نے اس آیت کو اتنا تکرار کیا، حتیٰ کہ میں نے خود متکلم سے سننا شروع کر دیا یعنی بولنے میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آغاز میں نے کیا، خدائے حاضر کے سامنے عبادت شروع کی اور اتنا پڑھا کہ پھر خدا نے بولنا شروع کیا اور میں نے سننا شروع کیا، قرآن کی اس صورت میں انسان پر اثر ہوتا ہے یعنی اس وقت اس آیت کے ذریعے سے امام علیہ السلام پر خدا کی تجلی ہوئی،

☆ **فلم یثبت جسمی لمعاینة قدرته......**

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے جسم میں قدرتِ خدا کے ساتھ مُواجَہہ ہونے کی طاقت ختم ہوگئی، قدرتِ خدا کا سامنا کرنے کی طاقت ختم ہوگئی یعنی عبادت کی حالت میں وہ تجلی پُر ہیبت ہوئی کہ میرے جسم میں طاقت ختم ہوگئی اور جسم ناتواں ہو گیا، وہی حالت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی

تھی۔

وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا......(۱۶)

اور موسیٰ بیہوش ہوکر گر پڑے......

۹) عبادات و تلاوتِ قرآن میں حلاوت

☆ و فی مثل هذه الدرجة يعظم الحلاوة و لذة المناجاة......

حلاوت بہت عظیم ہوجاتی ہے، عبادت کی لذت قابلِ توصیف نہیں رہ جاتی ہے، یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو انسان بیان نہیں کرسکتا ہے، کس طرح سے بیان کرے کہ کیا لذت محسوس ہوتی ہے؟ اور وہ بھی مناجات کی لذت اور قرآن کی لذت۔ یہ مطلب کلامِ حضرت امام صادق علیہ السلام سے متخذ ہے کہ جب انسان ہر تجلی میں متجلی کو دیکھتا ہے تو اس وقت انسان کو قرآن اور عبادتوں کے اندر لذت و حلاوت محسوس ہوتی ہے،

☆ و لذلک قال بعض الحکماء:......

بعض حکماء سے منقول ہے کہ انہوں نے یہ کہا کہ

☆ کنت اقرأ القرآن فلا اجد له حلاوة......

میں نے قرآن پڑھا لیکن کوئی لذت محسوس نہیں ہوئی، جیسے کہ اکثر کو لذت محسوس نہیں ہوتی ہے، فقط ثواب کے لئے پڑھتے ہیں، ثواب کا قرآن لذت نہیں دیتا ہے چونکہ لذت ساری ثواب میں

ہے لہٰذا خود قرآن میں نہیں ہے یعنی جس طرح سے مزدوروں کو لگا دیتے ہیں کہ آپ یہ کام کرو بعد میں تنخواہ دیں گے تو ساری لذت تنخواہ میں ہوتی ہے کام میں نہیں ہوتی ہے، کام انسان کو خستہ کرتا ہے، اجارے کا قرآن پڑھنا، اجارے کی عبادتیں انسان کو تھکا دیتی ہیں اور ان میں لذت نہیں ہوتی، بعض لوگ دوسروں کی اجارے کی نمازیں پڑھتے ہیں لیکن ہم اپنی اجارے کی نمازیں پڑھتے ہیں کہ یہ ملے گا اور وہ ملے گا۔ نمازِ شب پڑھتے ہیں تا کہ فقیر نہ ہو جائیں، یہ اجارے کی نماز ہے، انسان خود اپنی اجارے کی نمازیں پڑھ رہا ہے، اپنی نمازوں کا اپنے آپ کو ٹھیکہ دیا ہوا ہے کہ یہ نماز پڑھو تو تمہیں یہ ملے گا، ان نمازوں میں لذت نہیں ہے لہٰذا لذت امیر المومنین علیہ السلام کو محسوس ہوتی ہے، امام صادق علیہ السلام کو محسوس ہوتی ہے۔ بعض حکماء میں سے کسی نے کہا کہ میں قرآن پڑھتا تھا اور لذت محسوس نہیں ہوتی تھی،

☆ حتی تلوته......

حتیٰ کہ میں نے تلاوتِ قرآن کی یعنی تلاوتِ قلبیٔ قرآن، قرأتِ قرآن سے تلاوتِ قرآن پر آیا یعنی پھر میں نے ارتقاء شروع کیا اور قرآن کی وہی منزلیں طے کیں،

☆ کأنی اسمعه من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله یتلوه علی اصحابه......

میں نے قرآن شروع کیا تو پہلے قرآن کے الفاظ کے پیچھے گیا، تلاوت یعنی پس رفتن، پیچھے جانا، پے گیری یعنی پیروی، انسان قرآن کا پیش رو نہ بنے بلکہ قرآن کا پیرو بنے، قرآن کے پیچھے چلنے

والا بنے، جس کو ہم عموماً تلفظِ سادہ میں پیرو کہتے ہیں، کہا کہ میں پیروئے قرآن ہوا، پیروئے قرآن اس طرح سے ہوا کہ پہلے الفاظِ قرآن تک پہنچا پھر معانئ قرآن تک پہنچا، پھر حقائقِ قرآن تک پہنچا اور پھر میں نے اس طرح سے قرآن کی پیروی کی کہ قرآن مجھے لے کر آگے بڑھتا رہا، قرآن نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ارتقاء کرواتا رہا حتیٰ کہ میں قرآن پڑھتا تھا لیکن اب میں نہیں پڑھتا تھا بلکہ اب میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سنتا تھا، جب میں قرآن پڑھتا تھا تو اس طرح سے منظر نظر آتا تھا کہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے سامنے پڑھ رہے ہیں،

☆ **ثم رفعت الی مقام فوقه......**

پھر میں نے اس کے مافوق مقام پہ تلاوت کی یعنی پھر میں آگے بڑھا اور تلاوتِ قرآن کی،

☆ **فكنت اتلوه كأنى اسمعه من جبرئيل عليه السلام يلقيه على رسول الله صلى الله عليه و آله......**

پھر مجھے یوں لگا کہ اب جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن پڑھ رہے ہیں یعنی جبرئیل علیہ السلام سے قرآن سنا،

☆ **ثم جاء بمنزلة اخرى......**

پھر اس کے بعد ایک منزلِ دیگر آئی

☆ **فانا الان اسمعه من المتكلم......**

یہ وہ مقام تھا کہ جہاں پر میں نے صاحبِ کلام سے قرآن سنا یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ

سے،

☆ فعندها وجدت لذة ونعيما لا اصبر عنه......

یہ وہ لذت تھی، یہ وہ ذوق اور نعمت تھی کہ جس سے میں کبھی بھی پیچھے نہیں رہ سکتا تھا یعنی صبر نہیں کر سکتا تھا کہ اس سے دور رہوں،

☆ و کذلک قال بعضهم......

بعض دیگر حکماء اور عرفاء نے یہ کہا کہ

☆ کابدت......

کابدت یعنی زحمت، تکلیف، مشقت، میں نے مشقت کی،

☆ القرآن عشرين سنة......

میں نے بیس سال قرآن میں محنت کی،

☆ و تنعمت به عشرين سنة......

اور میں بیس سال قرآن کی نعمت سے محظوظ ہوا، متنعم ہوا، میں نے قرآن سے لذت محسوس کی،

☆ وعند ذلک یکون العبد ممتثلا بقوله:......

اور یہاں پر اب انسان درحقیقت اس قول کا امتثال اور اطاعت کر رہا ہوتا ہے،

☆ ففروا الی الله......

کہ تم خدا کی طرف فرار کرو، آیۂ قرآن میں ہے کہ

فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ...... (۱۷)

یہ سورۂ ذاریات میں ہے، یعنی اللہ کی طرف رجوع کرو، فرار الی اللہ یعنی انقطاع الی اللہ، تم ہجرت بسوئے خدا کرو یا نہج البلاغہ میں بھی ہے کہ

فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہ،

تم خدا سے خدا کی طرف جاؤ یعنی ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے کی طرف جاؤ،

☆ ولقوله: ولا تجعلوا مع اللّٰه الها اخر..

اور یہاں انسان پر وہ مقام صدق کرتا ہے کہ

لَا تَجْعَلُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَرَ...... (۱۸)

خبردار اپنے پروردگار کے ساتھ کوئی دوسرا خدا قرار نہ دینا......

یعنی خدا کے ساتھ کسی اور کو الٰہ نہ قرار دو، جس کی طرف بھی ہم توجہ کرتے ہیں وہ یہ نہ ہو کہ ہمارا الٰہ ہو،

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ...... (۱۹)

کیا آپ نے وہ شخص دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟

جو چیز ہماری توجہ کا مرکز بن جائے وہ ہمارے لئے الٰہ ہے اور اکثر خود پرست ہیں، اکثر کا الٰہ خود ہے، خواہشات الٰہ ہیں، ہمارا معبود ہماری خواہشات ہیں چونکہ ہماری ساری توجہ ان چیزوں کی

طرف ہے، یہ خود خدا بنا ہوا ہے اس لئے ہم خدا تک نہیں پہنچتے ہیں۔

۱۰)توحیدِ خالص سے مراد

☆ بل التوحید الخالص ان لا یری فی کل شیء الا اللّٰہ الواحد القھار.

توحیدِ خالص کیا ہے؟ توحیدِ عملیٔ خالص کیا ہے؟ دیدِ توحیدی کیا ہے؟ قرأت وتلاوتِ توحیدی کیا ہے؟ قرأتِ توحیدی و توحیدِ خالص یہ ہے کہ خدائے واحد کو دیکھیں اور وہ بھی وحدتِ قہاریٔ خدا یعنی وحدتِ غالبۂ خدا کو دیکھیں،

قُلْ اِنَّمَا اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ٥(۲۰)

آپؐ کہہ دیجئے: میں تو صرف تنبیہ کرنے والا ہوں اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو واحد، قہار ہے۔

يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ٥(۲۱)

جس دن سب نکل کر سامنے آجائیں گے اور خدا پر کوئی بات مخفی نہیں رہ جائے گی، آج کس کا ملک ہے بس خدا وحدۂ قہار کا ملک ہے۔

جب یہ وحدت رونما ہوتی ہے تو ساری چیزیں چھپ جاتی ہیں یعنی وحدتِ قہارہ اور ایک وحدت وہ ہے جو کثرت کے ساتھ کثرت کو ختم نہیں کرتی اور کثرت کے ساتھ مل بیٹھتی ہے، جس طرح

سے عموماً عامیانہ توحید یہ ہے کہ اس دنیا میں خدا بھی ہے، اوپر خدا ہے، نیچے خدا ہے، اِدھر خدا ہے کہ جس طرح سے مختلف موجودات دائیں بائیں ہیں لہٰذا کسی ایک سائیڈ (Side) میں خدا بھی ہے، یعنی خدا بھی ہے اور باقی سب بھی ہیں، ایک جگہ خدا کے لئے ہے کہ جو انسان کی دسترس سے باہر ہے، وہاں کوئی قبضہ نہیں کر سکا لہٰذا وہ خدا کے لئے چھوڑ دی ہے، کہیں فضاؤں میں اور آسمانوں میں خدا ہے، زمین پر کہیں بھی نہیں ہے یہ ایک توحید ہے یعنی خدا بھی ہے اور غیرِ خدا بھی ہے لیکن جب توحیدِ وحدتِ قہار، وحدتِ غالبہ ظہور کرے تو تمام کے تمام موجودات مغلوب ہو جاتے ہیں، چھپ جاتے ہیں، پنہاں ہو جاتے ہیں۔ اِس وقت جو ہمیں کثرت نظر آتی ہے یہ کیوں نظر آتی ہے؟ اس وجہ سے کہ ہم موحّدِ حقیقی نہیں ہیں، ہم وحدتِ خدا، توحیدِ خدا کے قائل ہیں لیکن نہ توحیدِ غالبہ وقہارہ کے بلکہ توحیدِ سازگار، توحیدِ جامع با کثرت، توحیدِ مجتمع با کثرت کے قائل ہیں ورنہ اگر ہم وحدتِ قہارہ کے قائل ہو جائیں گے یا اس تک پہنچ جائیں گے تو اس وقت ماسوا اللہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بقول شیخ سعدی

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست

بر عارفان جز خدا ہیچ نیست...... (۲۲)

عقل نے ہمیں الجھایا ہوا ہے، پیچ وخم میں الجھایا ہوا ہے، ورنہ راستہ بہت سادہ سا اور بات بالکل سیدھی سی ہے، عرفان اسے کہتے ہیں کہ انسان وحدتِ قہارۂ خدا تک پہنچ جائے، مثلاً مرید کیا ہوتا ہے؟ بیعت کیا ہوتی ہے؟ خرقہ کیا ہوتا ہے؟ کرتب کیا ہوتا ہے؟ دیوار کیا ہوتی ہے؟ تا کہ اس کو

توحیدِ خالص سے مراد

دوڑائے، زمین کیا ہے؟ تا کہ اس کو طے کرے اصلاً اس کیلئے "ھیچ نیست"۔

توان گفتن این با حقایق شناس

ولی خردہ گیرند اهل قیاس

حقیقت شناس کو تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ مدرسے والے اعتراض کرتے ہیں، یہ بات ان کو سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ

توحیدِ خالص سے مراد

که پس آسمان و زمین چیستند

بنی آدم و دام و دد کیستند؟

پھر اگر خدا ہے اور کچھ بھی نہیں ہے تو یہ زمین و آسمان و بنی آدم اور یہ سب کیا ہیں؟

همه هر چه هستند از آن کمترند

که با هستیش نام هستی برند

یہ سب کچھ ہیں لیکن موجود نہیں ہیں، خدا کے مقابلے میں نہیں ہیں،

یہ اس ہستی کی وجہ سے موجود ہیں نہ کہ اس کے مقابلے میں موجود ہیں اور پھر اس مصرع میں اس شیخ اجل نے انتہا کر دی اور یہی مطلب بیان کر دیا جو یہاں توحیدِ خالص ہے کہ

☆ ان لا یری فی کل شیء الا اللّٰہ الواحد القهار.......

چو سلطان عزت علم بر کشد

جهان سر بجیب عدم در کشد

جب اسمِ عزیزِ خدا تجلی کرے گا، چونکہ ابھی سلطنت، سلطانِ خالق اور سلطانِ رازق سے منسوب اسماء کی ہے لیکن جب سلطانِ عزت اپنا علم برپا کرے گا تو ساری دنیا معدوم ہو جائے گی۔اسی کا نام قیامت ہے، عارف وہ ہوتا ہے کہ جو اس منظر کو ابھی دیکھ لے یعنی سلطانِ عزت و سلطانِ وحدتِ خدا و سلطانِ قہاریتِ خدا کو ابھی دیکھے، یعنی ابھی پرچم وحدتِ قہاریتِ خدا بلند ہے اور کچھ بھی نہیں ہے، یہ سب سراب ہے، جس طرح سے صحرائی سفر میں انسان دیکھتا ہے تو پانی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رہوتا ہے لیکن جب قریب جاتا ہے تو کچھ بھی نہیں ہوتا ہے، یہی کچھ ہوگا جب

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَائَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌo (۲۳)

تو ہم نے تمہارے پردوں کو اٹھا دیا اور اب تمہاری نگاہ بہت تیز ہوگئی ہے۔

تمہاری آنکھیں تیز ہو جائیں گی، آج نگاہیں کند ہیں، بصیرت سکس بائی سکس (6x6) نہیں ہے، آج اس کو عینک کی ضرورت ہے، آج ہر چیز نظر آتی ہے، یہ سارا سراب ہے لیکن جب انسان اس حقیقت تک پہنچے گا تو دیکھے گا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا، پھر یہ ساری کثرت کیا تھی؟

ہمہ ہر چہ ہستند از آن کمترند

کہ با ہستیش نام ہستی برند

جو بھی ہے، بالآخر ہے لیکن اسی کی تجلیاں ہیں اور یہ ساری چیزیں اس کے مقابلے میں نہیں ہے، یہ توحیدِ خالص ہے۔عارف اس کو کہتے ہیں کہ جو اس نقطے تک پہنچ جائے، عارف اس کو کہتے ہیں کہ جسے ہر چیز میں خدا نظر آئے، عارف اس کو کہتے ہیں کہ جو اس سارے جہان کو فقط تجلی دیکھے، عارف

اس کو کہتے ہیں کہ جو خود کو نہ دیکھے، عارف خود خواہ اور خود بین نہیں ہوتا ہے، عارف اصلاً کسی ملک کا نہیں ہوتا ہے۔ فقہاء قوم پرست ہو سکتے ہیں، نحوی قوم پرست ہو سکتے ہیں، سائنس دان قوم پرست ہو سکتے ہیں، فیلسوف بھی قوم پرست ہو سکتا ہے لیکن عارف کبھی بھی قوم پرست نہیں ہو سکتا، اصلاً عارف کو پرواہ نہیں ہے کہ وہ ایرانی ہے یا غیر ایرانی ہے؟ اصلاً عارف زمین کا نہیں ہے، عارف کا کہنا ہے کہ

من ملک بودم و فردوس برین جایم بود

آدم آورد درین دیر خراب آبادم...... (۲۴)

اصلاً میں ادھر کا نہیں ہوں، میں یہاں پر مسافر ہوں، میں فرشتہ تھا، عرشِ بریں میرا مسکن تھا، اس خراب آباد میں مجھے آدم علیہ السلام لے آیا، وہ دانا کھایا اور یہاں تک پہنچا دیا، میں اصلاً اس علاقے کا نہیں ہوں۔ اگر ہم کسی اجنبی علاقے میں ہوں اور کوئی پوچھے کہ آغا کیا آپ یہاں کے رہنے والے ہو؟ کہتے ہیں نہیں یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں، اسی طرح سے کوئی پوچھے کہ کیا زمین کے ہو؟ کہیں گے نا بابا ہم زمین کے کہاں ہیں؟ ہم عرش بریں کے رہنے والے تھے۔

پس صدر المتالہینؒ کے مطابق تالیٔ قرآن ارتقاء کے ان درجات پر عمل پیرا ہو کر کمال کی لامتناہی منازل پر اپنے الٰہی سفر کو جاری رکھ سکتا ہے۔ اس فصل کے حصہ سوم میں ارتقاء کے مزید پہلو فہرست وار بیان کیے جائیں گے۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۴۳)

(۲)......(سورۂ مبارکہ قمر، آیہ ۵۰)

(۳)......(دیوان حافظ شیرازی، از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی، غزل ۱۱۱، صفحہ ۸۸)

(۴)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ ۴۶)

(۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۸)(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ ۱۷۱)

(۶)......(مثنوی معنوی، بہ تصحیح: رینولد ا. نیکلسون، دفتر سوم، صفحہ ۳۸۷)

(۷)......(تفسیر المیزان - العلامة الطباطبائیؒ، بحث روائی) (شرح نهج البلاغه - جعفری)(مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ، الجزء ۱۰، صفحه ۳۹۱)

(۸)......(مفاهیم القرآن الجزء السادس)

(۹)......(شرح نهج البلاغه - جعفری)

(۱۰)......(ارشاد القلوب، الجزء ۴۶، صفحه ۲)

(متشابه القرآن، الجزء ۱، صفحه ۱۱۶)(مختصر بصائر الدرجات - الحسن بن سلیمان الحلی، الجزء ۱، صفحه ۱۲۷)(مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة الله الشیخ علی النمازی، الجزء ۳، صفحه ۴۴۰)

(۱۱)......(أهل البیت فی تفاسیر أهل السنة)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ واقعہ، آیہ ۱۱،۱۰)

(۱۳)......(تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظلہ)
(تفسیر القرآن الکریم - السید مصطفی الخمینیؒ، الجزء ۲، صفحہ ۱۸۹)
(بحار الأنوار - العلم العلامة الحجة فخر الامة المولی الشیخ محمد باقر المجلسی "قدس اللہ سرہ"، الجزء ۸۹، صفحہ ۱۸۴) (مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللہ الشیخ علی النمازی، الجزء ۸، صفحہ ۴۶۱) (میزان الحکمة - الریشهری، الجزء ۸، صفحہ ۲۱۰)

(۱۴)......(فی رحاب القرآن) (مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ، الجزء ۴، صفحہ ۲۵۰)
(سنن النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(۱۵)......(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی، الجزء ۱۱، صفحہ ۳۶۵)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ ۱۴۳)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ ذاریات، آیہ ۵۰)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ ۲۲)

(۱۹)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ ۴۳)

(۲۰)......(سورۂ مبارکہ ص، آیہ ۶۵)

(۲۱)......(سورۂ مبارکہ غافر، آیہ ۱۶)

(۲۲)......(کلیات سعدی، بر اساس نسخه محمد علی فروغی، صفحه ۲۸۰)

(۲۳)......(سورۂ مبارکہ ق، آیہ۲۲)

(۲۴)......(دیوان حافظ شیرازی، از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامه محمد قزوینی، غزل ۳۱۷، صفحه ۲۴۷)

فصلِ ادبِ نہم

﴿ترقی﴾

(حصّہ سوم)

١)ارتقاء کا دوسرا پہلو

☆پہلا مرحلہ

☆دوسرا مرحلہ

☆تیسرا مرحلہ

٢)ارتقاء کا تیسرا پہلو

٣)ارتقاء کا چوتھا پہلو

٤)ارتقاء کا پانچواں پہلو

٥)ارتقاء کا چھٹا پہلو

☆پہلا مرحلہ

☆دوسرا مرحلہ

☆تیسرا مرحلہ

٦)ارتقاء کا ساتواں پہلو

٧)ارتقاء کا آٹھواں پہلو

٨)ارتقاء کا نواں پہلو

قرآن میں ارتقاء کے متعدد پہلو ہیں کہ جن میں سے ایک پہلو اور اس کے درجات کی وضاحت اس فصل کے حصہ دوم میں کی گئی ہے، ذیل میں ارتقاء کے مزید پہلو مختصر وضاحت کے ساتھ فہرست وار درج کئے جا رہے ہیں۔

۱) ارتقاء کا دوسرا پہلو

☆پہلا مرحلہ

ترقی کے دوسرے پہلو کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان قرأتِ لسانیٔ قرآن کی حد تک آئے لیکن اسی میں نہ رک جائے کہ ساری عمر قرأتِ لسانیٔ قرآن میں بسر کر دے، اگر قاریٔ قرآن بن گیا مثلاً ناظرہٴ قرآن پڑھ لیتا ہے، تلفظِ قرآن ادا کر لیتا ہے، حروفِ قرآن کو اچھے طریقے سے یا جس طریقے سے بھی ادا کر لیتا ہے تو یہ پہلا قدم ہے، یہ مکمل ارتقاء نہیں ہے، پہلی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ کر یہ خیال نہ کرو کہ ارتقاء حاصل ہو گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ ساری عمر اسی سیڑھی پر بسر کر دو، اگر آپ کو چھت پہ جانا ہے اور سیڑھی لگی ہوئی ہے لیکن پہلی سیڑھی پر ہی دن بھر بیٹھ کر آپ یہ کہیں کہ میں اس سیڑھی کے ذریعے چھت پر جانا چاہتا ہوں، اگر آپ سیڑھی کے ذریعے چھت پر جانا چاہتے ہیں تو ابھی آپ پہلی سیڑھی پر پہنچے ہیں، پہلی سیڑھی اس لئے ہے کہ آپ کو دوسرے سیڑھی کے قابل بنائے، پہلی سیڑھی ہوتی ہی دوسری سیڑھی کے لئے ہے، پہلی سیڑھی چھت کے لئے نہیں ہوتی ہے، پہلی سیڑھی دوسری سیڑھی کا مقدمہ ہے لہٰذا اب آپ دوسرے درجے پر قدم رکھیں۔

پس پہلا مرتبہ قرأتِ لسانیٔ قرآن ہے یعنی زبان سے قرآن کو پڑھنا،

ارتقاء کا دوسرا پہلو

اِقْرَأْ وَارْقَ......(۱)

قرآن پڑھئے اور ترقی کریں......

یعنی پڑھو پھر آگے بڑھو، قرأتِ قرآن یعنی جو کام قاری کرتے ہیں، یہ رائج طریقہ قرأت ہے، جس کو پڑھنے والے اہلِ تجوید، اہلِ صوت و اہلِ قرأت کہلاتے ہیں، قرأت کا رائج نام ترتیل پڑ گیا ہے، ترتیل یا صوت سے پڑھنا رائج قرأتِ قرآن ہے۔ اب ہم آگے کہاں بڑھیں؟

☆دوسرا مرحلہ

دوسرا مرحلہ تدبر و فہم در معانیٔ قرآن ہے، قرأتِ لسانی سے فہمِ معانی کی طرف ارتقاء کریں، ساری عمر اسی پہلی سیڑھی پر بسر نہ کریں ورنہ تالیٔ قرآن نہیں سمجھا جائے گا چونکہ قرآن الفاظ سے معانی پر آ گیا ہے لہٰذا تالی بھی ساتھ ساتھ آئے، تالی کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے پیچھے آئے اور متصل آئے پس دوسرا مرحلہ فہمِ معانیٔ قرآن ہے، یہ دوسرا مرحلہ مفسرین نے طے کیا ہے یعنی قرأتِ لسانی سے معانی و مفاہیمِ قرآن کی طرف آئے ہیں۔ ساری عمر اسی میں بھی بسر نہ کر دیں کہ ہم قرأت سے تفسیر تک آ گئے تو مقصود حاصل ہو گیا، ساری عمر اسی دوسری سیڑھی پر بیٹھے رہے تو پھر بھی تالیٔ قرآن نہیں ہیں، فرق نہیں پڑتا ہے کہ ایک آدمی صبح سے پہلی سیڑھی پر بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا صبح سے دوسری سیڑھی پر بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا یہ فخر کرے کہ میں مقصد تک پہنچ گیا ہوں اور دوسرا نہیں پہنچا ہے۔ دونوں منزل تک نہیں پہنچے ہیں کیونکہ وہ پہلی سیڑھی پہ بیٹھا ہوا ہے اور آپ دوسری سیڑھی پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن مقصود تک

کوئی بھی نہیں پہنچا ہے، اگر مقصد تک پہنچنا ہے تو ساری سیڑھیاں طے کرنی ہوں گی، جس طرح سے پہلے قرأت سے معانی تک آئیں ہیں لہٰذا اب معانی سے ذرا آگے بھی بڑھو، معانی سے آگے کیا ہے؟

☆تیسرا مرحلہ

☆تیسرا مرحلہ

اس پہلو کا تیسرا مرحلہ تاثرِ قلبی ہے کہ جس کی آٹھویں ادب کی فصل میں بحث ہوئی ہے، تاثرِ قلبی کیلئے خلاصتاً یہ کہیں کہ انسان جب الفاظ سے معانی تک پہنچتا ہے، معارفِ و معالمِ قرآن تک پہنچتا ہے تو قرآنی آیات اور ان کے مضامین و معارف انسان کے دل کے اوپر تاثیر کریں، انسان کا دل متاثر ہو، قبول کرے، کس طرح سے قبول کرے؟ نہ اس طرح سے کہ انسان قرآن کی تصدیق کرے یعنی ساتھ ساتھ سر دھنتا جائے، جیسا کہ ایک آدمی تقریر کر رہا ہوتا ہے اور سامنے بیٹھے ہوئے سر ہلا رہے ہوتے ہیں، تاثر سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس طرح متاثر ہو رہے ہیں، متاثر ہونا عام اردو میں اسی لئے استعمال ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے کوئی بات کی ہے اور دوسرے اس سے بہت متاثر ہوئے، اس کی علمیت سے بہت متاثر ہوئے، اس کی خطابت سے بہت متاثر ہوئے، اس کے بیانات سے بہت متاثر ہوئے، یہ متاثر ہونا نہیں ہے، متاثر ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآنی آیات اور قرآنی مضامین انسان کی صفات بن جائیں، انسان کا خُلق بن جائیں، قرآن صفاتِ انسان میں بدل جائے، پس الفاظ سے معانی تک آئے اور معانی سے تاثر تک آئے یعنی تاثرِ قلبی تک، زبان کا کام پڑھنا ہے، ذہن کا کام سمجھنا ہے اور دل کا کام متصف ہونا ہے یعنی انسان قرآنی صفات سے

متصف ہو، قرآنی اخلاق سے متخلق ہو، ادبِ قرآن سے متادب و مؤدب ہو، تہذیبِ قرآن سے مہذب ہو، قرآن انسان کی صفتِ راسخ بن جائے، ملکہٗ انسان بن جائے، اخلاقِ انسان بن جائے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرآنَ......(۲)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق قرآن تھا، پس انسان قرأتِ لسانی سے فہمِ معانی اور فہمِ معانی سے تاثرِ قلبی تک آئے کہ ہر ایک کا اپنا ایک معنیٰ ہے، ہر ایک اپنی جگہ ارتقاء کا ایک میدان ہے۔

ارتقاء کا تیسرا پہلو

۲) ارتقاء کا تیسرا پھلو

ایک میدانِ ارتقائے دیگر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان الفاظ کی مدد سے معانئ قرآنی تک جائے اور معانی قرآن سے حقائقِ قرآن کی طرف جائے یعنی قرآن کے الفاظ کے پیچھے معانی ہیں اور معانی کے پیچھے حقائق ہیں تو انسان ان حقائق تک بھی پہنچے یہ بھی ایک میدانِ ارتقاء ہے، یہ نہ ہو کہ معانی پر ہی رک جائے جیسے اشارہ کیا تھا کہ زمخشری کی طرح معانی پر رک جائیں، بہت ساری تفاسیر ہیں کہ جن کے لکھنے والوں کا نام مفسر ہے لیکن انہوں نے تفسیر نہیں کی ہے فقط الفاظ، قواعد، نحو، صرف اور ادبیات وغیرہ پر رکے ہوئے ہیں، جیسے قاریانِ قرآن فقط قرأتِ لسانی پہ رکے ہوئے ہیں اور ساری عمر اسی میں بسر کر دیتے ہیں، یہ ارتقاء نہیں ہے، آپ معانی تک آئے ہیں تو فقط معانی پر ہی نہ رک جائیں بلکہ اب معانی سے آگے حقائقِ قرآن تک آئیں، حقائق کی دنیا میں قرآن کا اپنا ایک

نظام ہے، قرآن کی اپنی ایک دنیا ہے، قرآن کا اپنا ایک عالم ہے، معانی انسان کو اس قرآنی عالم میں پہنچا دیں مثلاً قرآنی معاشرہ، قرآنی انسان، قرآنی حیات، قرآنی ماحول، قرآنی اعتقاد، قرآنی دین، قرآنی فضیلتیں، قرآنی فکر اور قرآنی اخلاق یہ ساری قرآنی دنیا ہے کہ جس کے اندر انسان اتر جائے۔

۴) ارتقاء کا چوتھا پہلو

انسان کے ارتقاء کے لئے ایک چوتھا پہلو بھی موجود ہے، یہ ایک ہی جیسے میدان نہیں ہیں یعنی ان کے درمیان طُولیت نہیں ہے، ان میدانوں میں مختلف پہلو ہیں، ارتقاء کا ایک پہلو وہ تھا کہ جس میں تین مرتبے ذکر کئے ہیں یعنی قرأتِ لسانی سے فہمِ معانی اور فہمِ معانی سے تاثرِ قلبی، ارتقاء کے دوسرے پہلو میں یہ ہے کہ انسان الفاظ سے معانی اور معانی سے حقائق تک پہنچے، ارتقاء کا تیسرا پہلو قرآن کے اندر مختلف پہلوؤں سے موجود ہے اور روایات میں بھی ہے، روایت میں ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کو ذووجوہ نازل کیا ہے، یعنی قرآن کی مختلف وُجوہ ہیں۔

روایاتِ شناختِ قرآن میں بھی یہی تعبیر آئی ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو ذوالوجوہ نازل کیا ہے یعنی قرآن کے کئی پہلو ہیں، قرآن انسان کے سامنے کئی دروازے کھولتا ہے نہ کہ ایک در اور وہ بھی تنگ، اگر انسان داخل ہو تو واقعاً کئی دروازے ہیں، جس طرح کعبہ میں جائیں تو مسجد الحرام کے متعدد دروازے ہیں اور ہر دروازے کا ایک خاص نام ہے اور انسان ان سارے دروازوں سے جائے تو الگ الگ منظر دکھائی دیتے ہیں، اسی طرح سے قرآن مجید کے مختلف پہلو اور

مختلف بود ہیں، ہر پہلو سے انسان کو قرآن کی طرف جانا چاہئے، یہ مطلب اس لئے عرض ہو رہا ہے کہ ارتقاء میں دخیل ہے، بعض اوقات انسان قرآن کے ایک ہی پہلو سے سروکار رکھتا ہے اور اگر ارتقاء و ترقی کرے بھی تو اسی ایک پہلو سے ترقی کرتا ہے اور دیگر پہلوؤں سے غافل ہوتا ہے، انسان ہر پہلو سے قرآن کے اندر ارتقاء کرے۔

اگرچہ قرآن مجید کے مختلف پہلو ہیں لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں، پہلے دن جو بات سن لی اسی کو پلے باندھ لیتے ہیں لہٰذا یہ ارتقاء نہیں کر سکتے ہیں، لکیر کا فقیر کبھی ارتقاء نہیں کر سکتا ہے، کبھی بھی اس طرح کا فقیر نہ بنیں کہ دوسرے افراد ہمارے لئے لائن کھینچ دیں اور ہم ساری عمر اسی لائن کے ہی پابند ہو جائیں، ممکن ہیں کہ وہ ہمارے آباء ہوں، بزرگانِ علمی ہوں، بزرگانِ مذہبی ہوں، بزرگانِ اجتماعی ہوں یا بزرگانِ سیاسی ہوں، جو بھی بزرگان ہوں وہ ایک خط کھینچ دیں اور ہم اسی کے فقیر بن جائیں، مقلدِ محض بن جائیں، ان کا کہا پتھر پہ لکیر ہو اور ہم لکیر کے فقیر ہوں۔ اب کوئی یہ نہ سوچے کہ یہ زمین پر پڑے ہوئے کسی پتھر پہ لکیر ہے، پتھر پہ لکیر یعنی ان مٹ نقوش، اگر کسی استاد کی زبان سے ایک مطلب نکل گیا ہے تو وہ پتھر پہ لکیر نہیں ہے بلکہ اس سے بالاتر مطالب بھی موجود ہیں،

وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ٥ (۳)

اور ہر صاحبِ علم سے برتر ایک صاحبِ علم ہوتا ہے۔

خدا نے ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک بڑا عالم بنا کر رکھا ہوا ہے، آپ ایک کے پاس گئے

ہیں، کسی دوسرے کے پاس بھی جائیں اور دیکھیں کہ شاید وہ آپ کے لئے مطلبِ دیگر بیان کر رہا ہو، پس ان کے لئے راہنمائی خوب ہے لیکن کسی کی بات کو حرفِ آخر نہ سمجھے کہ ان کا کہنا یہ ہے، ممکن ہے کہ اس کے علاوہ بھی نظریات واقوال ہوں، ممکن ہے کہ ان سے عمیق تر نکتہ بھی موجود ہو، ہمیشہ ایسا نہ سوچیں کہ یہ غلط ہے اور یہ صحیح ہے یعنی اگر وہ صحیح ہے تو ان کی بات غلط ہے۔ بعض اوقات ہوتا ہے کہ ایک آدمی سطحی بات کرتا ہے اور یہ سطحی بات بھی ٹھیک بات ہے لیکن دوسرا ذرا عمیق تر بات کرتا ہے تو وہ عمیق بھی ٹھیک بات ہے، ایک بہت سطحی اور سرسری بات کرتا ہے، دوسرا ذرا دقیق بات کرتا ہے اور تیسرا دقیق تر بات کرتا ہے لیکن تینوں درست ہیں چونکہ ایک سطحی حد تک درست ہے دوسرا دقیق حد تک درست ہے اور تیسری بات دقیق تر حد تک درست ہے۔ جس طرح آپ تجزیہ کرتے ہیں مثلاً ڈاکٹر سے پوچھتے ہیں کہ یہ بیماری کیوں ہوئی؟ یہ حادثہ کیوں رونما ہوا؟ اور وہ آپ کو ایک سرسری سی نظر بتا دیتا ہے تو اس نے درست کہا ہے لیکن سطحی بات کی ہے، دوسرے ڈاکٹر کے پاس جائیں تو وہ اسی بات کو ذرا عمیق تر کر کے بیان کر رہا ہے لہٰذا اس نے بھی درست کہا ہے، تیسرے ڈاکٹر کے پاس جائیں تو وہ اس سے بھی زیادہ دقیق تر بات کرے گا لیکن اس نے بھی درست کہا ہے، یہ باتیں ایک دوسرے کو نقض نہیں کرتی ہیں، رد نہیں کرتی ہیں۔

پس قرآن کی ہر آیت اپنے اندر معانی کا عظیم سمندر لئے ہوئے ہے ضروری نہیں ہے کہ اگر کسی نے ایک آیت کی تفسیر کر دی ہے تو اس آیہ میں اس سے دقیق تر معانی موجود نہ ہوں، اگر ہم فقط کسی ایک معنیٰ پر اکتفاء کر لیں تو ہرگز اس آیہ کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکیں گے اور یوں ارتقاء کی راہ

مسدود ہو جائے گی۔ یوں نہ ہو کہ ہم سطحی بات کرنے والے کے فقیر و مقلد بن جائیں اور دوسرے دقیق تر بات کرنے والے کی طرف رجوع نہ کریں یعنی سطحی بات پتھر کی لکیر ہو جائے اور ہم اس لکیر کے فقیر ہو جائیں اور ہرگز عمیق تر بات کی طرف جانے کی کوشش نہ کریں، کسی بڑے کی طرف جانے کی آرزو ہی نہ ہو۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اسی لئے بیان فرمایا تھا کہ انسان اپنی ہمتوں سے پہچانا جاتا ہے، قیمتِ انسان اس کی ہمت کے برابر ہے، یعنی عزم کہ انسان نے کتنا بڑا عزم کیا ہے؟ چھوٹے انسان چھوٹے چھوٹے ارادے کرتے ہیں، جن کے چھوٹے چھوٹے مقصود ہیں، جن کی بہت محدود آرزوئیں ہیں کہ مثلاً ہمیں ایک مجلس مل جائے، یہی ان کی آرزو ہے یا ایسے ہو جائیں کہ مثلاً کہیں جا کر پڑھا سکیں، یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، یہ چھوٹا انسان ہے کہ جس نے اتنی چھوٹی سی آرزو کی ہے، انسان کی قیمت اس کی ہمت کی حد تک ہے، عزم و ارادے کی حد تک ہے، جتنا بڑا ارادہ کرے اتنا بڑا انسان ہے اور بڑے انسان بڑے ارادے کرتے ہیں، بڑے انسان بڑی سوچ سوچتے ہیں، بڑے انسان بڑی ہمت دکھاتے ہیں اور بڑی ہمتوں کے نتیجے ہمیشہ بڑے اور عظیم ہوتے ہیں، آج اگر ہمارے سامنے علمی اور عملی کارنامے ہیں تو یہ کارنامے بڑے لوگوں نے انجام دیئے ہیں، چھوٹے لوگ ہمیشہ مارکیٹ کی حیثیت رکھتے ہیں، چھوٹے لوگ مصرف کنندہ ہیں، یہ کچھ بھی ایجاد نہیں کر سکتے ہیں، بڑے لوگ ایجاد کرتے ہیں اور چھوٹے لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں، انسان یوں نہ ہو کہ استعمال کرنے والوں میں سے ہو، پیچھے چلنے والوں میں سے ہو، بڑی ہمات کریں

ارتقاء کا چوتھا پہلو

نہ کہ سرسری حد تک کہ بس یہی سطحی بات ہماری ہمت ہے اور یہ ہمارے لئے کافی ہے، اس لئے قرآن نے طبقات ذکر کئے ہیں۔

قرآن نے ابرار کا ذکر کیا ہے، اصحابِ یمین کا ذکر کیا ہے اور مقربین کا ذکر کیا ہے، بعض بزرگان ایسے ہیں کہ جنہوں نے قرآن کی انہی آیات کی تفسیر ذکر کی ہے اور ان مراتب و منازل کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی بتایا ہے کہ مثلاً یہ درجۂ ابرار ہے، یہ درجۂ اصحابِ یمین ہے اور یہ درجۂ مقربین ہے پھر اس کے بعد خدا سے دعا یہ کی کہ ہمیں سب سے نچلا درجہ عطا فرما، یہ بہت کم ہمت انسان ہے۔ جنت کے مراتب ہیں اور ان درجات میں سے سب سے عالی جنت جنت اللقاء ہے، جنتِ ذات ہے، انسان جنت پڑھ پڑھا کے، سمجھ کے آخر میں آرزو کرے کہ یہی درختوں والی، نہروں والی اور حوروں والی جنت میرے لئے کافی ہے تو یہ بہت چھوٹا انسان ہے، اس انسان نے بہت ہلکی ہمت اور ارادہ کیا ہے، اگر بڑا انسان ہو تو بڑا ارادہ کرتا ہے۔ شخصیتِ امیر المومنین علیہ السلام کتنی عظیم ہے یہ امیر المومنین علیہ السلام کے ارادوں سے دیکھیں، انسان امیر المومنین علیہ السلام کی ہمت سے دیکھتا ہے کہ آپؑ کی شخصیت بہت عظیم ہے، فرمایا کہ اصلاً اگر جنت نہ بھی ہو تو بھی کوئی پرواہ نہیں ہے چونکہ میری ہمت تیری ذات کیلئے ہے، میرا ارادہ تیری ذات کی طرف ہے، میں نے تیری ذات کا عزم کیا ہوا ہے نہ کہ تیری نعمتوں کا عزم کیا ہوا ہے، میرا عزم اور میری مراد تو ہے، مجھے تیری ذات کی طرف جانا ہے۔ لہٰذا انسان اپنی ہمت بلند رکھے اور ہمراہِ قرآن اپنے ارتقاء کے سفر کو جاری رکھے۔

٤)ارتقاء کا پانچواں پہلو

ارتقاء کا پانچواں پہلو یہ ہے کہ کلام کا مقصود سمجھنے کے بعد اب متکلم کا مقصود سمجھو کہ متکلم کیا کہہ رہا ہے؟ البتہ انسان اسی کلام کی ہی مدد سے متکلم کا مقصود سمجھے گا لیکن متوجہ ہو کہ میں مرادِ خدا سمجھنا چاہتا ہوں کیونکہ ایک مرحلے میں تالیٔ قرآن یا قاریٔ قرآن کلام کا مطلب سمجھتا ہے اور کلام کا مقصود قواعدِ کلام کے رہینِ منت ہے چونکہ کلامِ خداوند تبارک وتعالیٰ زبانِ عربی میں ہے، عربی زبان کو ظہورات اور دلالات کے ذریعے سے اور لغتِ عربی کے قواعد کے ذریعے سے یعنی جو قواعد اہلِ زبان نے مقصود واضح کرنے کے لئے یا مقصود سمجھنے کے لئے مقرر کئے ہیں ان قواعد کی مدد سے کلام کا مقصود سمجھ جاتا ہے، ممکن ہے کہ کلام کا مقصود متکلم کا بھی مقصود ہو اور ممکن ہے کہ متکلم کا مقصود کچھ اور ہو اور ظاہری کلام کا مقصود کچھ اور ہو، یہ بحث انہی علومِ ادبی میں کی جاتی ہے، مخصوصاً اصولِ فقہ میں یہ بحث موجود ہے۔

اگرچہ قاعدتاً دیگر علوم میں بھی یہ بحث ہونی چاہئے لیکن زیادہ تر حضراتِ اصولی یعنی اصولِ فقہ کے علماء اس بحث کو چھیڑتے ہیں، ہر زبان کے قاعدے ہیں یہ صرف عربی کے نہیں ہیں یا زبانِ خاص کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں مثلاً، فارسی، اردو یا انگلش زبان بولنے والوں کے لئے بھی ہیں، یہ قاعدے مطلق ہیں کہ جب ہم کہیں سے بھی الفاظ سنتے ہیں، پڑھتے ہیں یا دیکھتے ہیں تو فی الفور بعض معانی ہمارے ذہن میں منتقل ہو جاتے ہیں، انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ الفاظ کے مدلولِ تصوری ہیں یعنی معانیٔ تصوریہ ہیں، یہ الفاظ ہم کسی آگاہ اور بیدار و باشعور انسان سے سنیں تو بھی ہمارے ذہن میں

کچھ نہ کچھ مطلب منتقل ہوتا ہے، اگر کسی سوئے ہوئے انسان سے یہی الفاظ سنیں کہ جو خواب کے عالم میں بول رہا ہے تو بھی ان الفاظ کا یہی مطلب ہوتا ہے اور اگر ہم کسی بے جان چیز سے مثلاً ٹیپ پر یہ الفاظ سن رہے ہوں یا ٹی وی پر یہ الفاظ سن رہے ہوں، ریکارڈ شدہ الفاظ کہیں سے سن رہے ہوں یا دو چیزوں کے ٹکرانے سے یہ آواز وصوت پیدا ہو رہی ہو تو بھی یہی معانیٔ تصور یہ فی الفور ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں، یہ اس بات کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ گفتگو کرنے والا شخص آگاہانہ طور پر قصد کر کے، ارادہ کر کے یہ بات کر رہا ہے یا اصلاً سرے سے کوئی ذی شعور موجود نہ بھی ہو اور کسی بے شعور موجود سے ہم یہ الفاظ سنیں جیسے عموماً بعض جانوروں کو سکھا دیئے جاتے ہیں یعنی تقلیدِ صوت، جیسے طوطا آواز نکالتا ہے تو اس سے بھی ذہن میں معانیٔ تصویہ پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً فرض کر لیں کہ اگر ہم کسی باشعور انسان سے سنیں یعنی متوجہ انسان سے کہ جو غافل نہ ہو اور آگاہانہ طور پر بات کر رہا ہو، شعور کے ساتھ جب وہ پانی کہتا ہے تو بھی ہمارے ذہن میں اس کا معنیٔ تصوری آجاتا ہے، سویا ہوا آدمی پانی کہے تو بھی ہمارے ذہن میں معنیٰ آجاتا ہے، کسی پتھر یا لکڑی سے ہم لفظِ پانی سنیں تو بھی ہمارے ذہن میں معنیٰ آجاتا ہے، اگر کسی ٹیپ سے یہ مطلب سنیں تو بھی ہمارے ذہن میں یہ معنیٰ آجاتا ہے، پس تصوری معانی ہمارے ذہن کے اندر الفاظ اور معانی کے رابطے کا نتیجہ ہیں چونکہ ہمارے ذہن میں الفاظ اور معانی کے مابین تلازم موجود ہے۔

جب سویا ہوا آدمی یہی پانی کا لفظ کہتا ہے کہ مجھے پانی دو تو اسے ہم پانی نہیں دیتے ہیں یا ٹیپ سے آواز آرہی ہو کہ مجھے پانی دو، ٹی وی سے آواز آرہی ہو کہ مجھے پانی دو تو کوئی بھی نہیں اٹھتا

ہے کہ جگ بھر کے ٹیپ یا ٹی وی کے سامنے لے جائے، کیوں نہیں لے جاتے ہیں؟ اس لئے کہ اگر چہ ان الفاظ کے تصوری معانی ہیں لیکن یہ تصوری معانی کسی متکلم کا ارادہ نہیں ہیں، کسی شخص نے ان معانی کا ارادہ وقصد نہیں کیا ہے، چونکہ یہ آدمی سویا ہوا ہے لہٰذا سوئے ہوئے کہہ رہا ہے کہ مجھے پانی دو یا ٹی وی میں کہہ رہا ہے کہ مجھے پانی دو یا ٹیپ میں کہہ رہا ہے کہ مجھے پانی دو، ہمیں معلوم ہے کہ اس لفظ کی ادائیگی کے پیچھے قصد وارادہ موجود نہیں ہے اس وجہ سے ہم ان معانی کو اگر چہ سمجھتے ہیں لیکن ان پر کوئی اثر مترتب نہیں کرتے ہیں، ان معانی کے مقابلے میں کوئی عکس العمل نہیں دکھاتے ہیں، فرض کریں کہ اگر ٹیپ میں کوئی کسی کو برا بھلا کہہ رہا ہو یا خدانخواستہ العیاذ باللہ کوئی گالی دے تو کسی کو برا نہیں لگتا ہے چونکہ اسے معلوم ہے کہ یہ ٹیپ شدہ آواز ہے یا سویا ہوا آدمی کسی کو گالی دے رہا ہے یا ایسا آدمی کہ جو اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو کیونکہ بسا اوقات بیمار لوگ ہوتے ہیں یا ایسی مدہوشی و بے ہوشی کے عالم میں چلے جاتے ہیں کہ ہذیان کہنا شروع کر دیتے ہیں، ہذیان کے عالم میں جو کچھ ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو کوئی اس سے برا نہیں مانتا ہے، کیوں برا نہیں مانتے ہیں؟ آیا ان الفاظ کے معانی نہیں ہیں؟ ان الفاظ کے معانی ہیں لیکن پھر بھی کسی کو برا نہیں لگتا ہے چونکہ یہ شخص جو معانیٔ الفاظ ادا کر رہا ہے اس نے ان معانی کا قصد وارادہ نہیں کیا ہے، ہمیں گالی اس وقت بری لگتی ہے کہ جب ایک انسان کی زبان سے غلط کلمہ نکلے اور یہ غلط بات بھی وہ قصد اور ارادے کے ساتھ کرے اور ہمیں یہ بھی پتہ ہو کہ اس نے اس معنیٰ کا ارادہ کیا ہے اور ہمیں یہ معنیٰ منتقل کرنا چاہتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ بعض اوقات ہم کلام کا مقصود سمجھ جاتے ہیں لیکن اس میں متکلم کا مقصد

موجود نہیں ہوتا ہے، جیسے سویا ہوا شخص جب بات کرتا ہے تو اس کے کلام میں معنیٰ ہے لیکن یہاں پر متکلم کی کوئی مراد نہیں ہے۔ پس یوں نہیں ہے کہ جہاں بھی الفاظ موجود ہوں اور الفاظ جو معانی ادا کر رہے ہوں یقیناً وہی متکلم کی بھی مراد ہوتی ہو اور متکلم بھی انہی معانی کا ارادہ کرتا ہے، بعض اوقات متکلم اصلاً سرے سے ارادہ نہیں کرتا ہے، الفاظ اس سے ادا ہو جاتے ہیں اور متکلم کا کوئی قصد و ارادہ نہیں ہوتا ہے، جیسے سویا ہوا شخص، مدہوش انسان اور ہذیان کہنے والا انسان ہے۔

بعض اوقات متکلم الفاظ بیان کرتا ہے اور ان الفاظ کے معانی ہوتے ہیں اور یہ معانی جو متکلم کے الفاظ میں ہیں یہی اس کی مراد بھی ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ ایسے ہی ہو کہ یہ معانی جو الفاظ کے ذریعے سے ہمارے ذہن میں آئے ہیں تو متکلم کی مراد بھی یہی ہے مثلاً جب ایک شخص مذاق کر رہا ہوتا ہے، کوئی مزاحیہ یا طنزیہ جملہ یا کوئی ایسا مطلب بیان کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت کچھ الفاظ ادا کرتا ہے لیکن یہی الفاظ اگر سنجیدگی کے ساتھ ادا کرے مثلاً انسان عموماً مذاق مذاق میں ایک دوسرے کو بہت کچھ کہہ جاتا ہے، جیسے فرض کریں کہ اردو یا پنجابی بولنے والوں کے مابین مزاحیہ ماحول ہے، خصوصاً جب لاہوری مذاق کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ ایسے الفاظ ادا کرتے ہیں کہ اگر کوئی سنجیدگی سے وہ الفاظ ادا کرے تو بہت بڑی تہمت، گالی اور کیا کیا چیزیں بن جاتی ہیں لیکن چونکہ مذاق میں، مزاح میں سب کچھ کہتے ہیں تو سننے والے کو معلوم ہے کہ ان الفاظ کے یہ معانی بنتے ہیں لیکن برے اس لئے نہیں لگتے کہ یہ صرف الفاظ کے معانی ہیں متکلم کے معانی نہیں ہے، جِدّی نہیں ہے، متکلم نے یہ ارادہ نہیں کیا ہوا ہے اور وہ یہ بات منتقل کرنا نہیں چاہتا ہے بلکہ مذاق کر رہا

ہے۔

پس متکلم کی مراد کبھی وہی ہوتی ہے کہ جو کلام ادا کرتا ہے اور کبھی متکلم کی مراد کچھ اور ہوتی ہے مثلاً جہاں پر مجاز استعمال ہوتا ہے، استعارہ استعمال ہوتا ہے، تشبیہات استعمال ہوتی ہیں وہاں پر الفاظ کے معانی کچھ اور ہوتے ہیں اور متکلم کی مراد کچھ اور ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص مجازگی میں کہتا ہے کہ مجھے پیاس لگی ہے، الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کو پانی چاہئے لیکن متکلم کہہ رہا ہے کہ مجھے علم چاہئے، اس نے یہ لفظ مجازاً استعمال کیا ہے یا مثلاً آپ کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑا شیر ہے، لفظِ شیر بتاتا ہے کہ اس کی دُم بھی ہوگی، پنجہ بھی ہوگا، چار ٹانگیں بھی ہوں گے، یہ غُرّ اتا بھی ہوگا، دھاڑتا بھی ہوگا، یہ درندہ چیرتا، پھاڑتا بھی ہوگا، شیر کا لفظ یہ سب بتا رہا ہے پس یہاں سے بھاگنا چاہئے، لفظ کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگو یہ شیر ہے لیکن انسان نہیں بھاگتا ہے، کیوں؟ کیونکہ جس کے منہ سے یہ لفظ ادا ہوا ہے اس کی مراد کچھ اور ہے، لفظ کچھ اور کہنا چاہتا ہے اور متکلم کچھ اور کہنا چاہتا ہے، لفظ کہہ رہا ہے کہ یہ درندہ ہے لیکن متکلم کہنا چاہتا ہے کہ یہ بہادر ہے لہٰذا کثرت سے ایسے ہوتا ہے کہ الفاظ کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں اور متکلم کچھ اور ارادہ رکھتا ہے۔

اگر ہم معمول کے کلام میں بحث کریں تو فرض کریں کہ ایک مقرر لوگوں سے خطاب کر رہا ہے اور لوگ اس کے کلام کے معانی سمجھ رہے ہیں، کلام میں جن معانی کی طرف الفاظ دلالت کر رہے ہیں وہ معانی لوگوں کے ذہنوں میں آرہے ہیں لیکن متکلم جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ مطلب حاضر لوگوں کے ذہنوں میں منتقل نہیں ہو رہا ہے، وہ صرف الفاظ پہ توجہ کئے ہوئے ہیں اور کلام کا

مقصود سمجھ رہے ہیں، متکلم کا مقصود نہیں سمجھ رہے ہیں لہٰذا پھر دہراتا ہے، تکرار کرتا ہے، مثال دیتا ہے چونکہ اس کو پتہ چل رہا ہے کہ یہ کلام کا مقصود تو سمجھ گئے ہیں لیکن ابھی میرا مقصود نہیں سمجھے ہیں مثلاً جب انسان کسی کو طعنہ دے کر بات کرتا ہے تو طعنہ ایک غیر مستقیم حملہ ہوتا ہے، ایک غیر مستقیم سرزنش ہوتی ہے۔

بعض سادہ لوح لوگ کلام کا معنیٰ سمجھ جاتے ہیں لیکن متکلم کا معنیٰ نہیں سمجھتے ہیں، فرض کریں کہ متکلم نے کسی کو کہنا ہے کہ تم بہت بڑے بخیل ہو تو وہ کہتا ہے کہ تم نے حاتم طائی کی قبر پہ لات ماری ہے، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی شخص کی ایک قبر ہے بنامِ حاتم اور تم اس پر گئے ہو اور تم نے اس کو ٹھڈا مارا ہے، یہ کلام کا معنیٰ ہے، وہ انکار کرتا ہے کہ میں نے آج تک حاتم کی قبر پر لات نہیں ماری اور مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی قبر کہاں ہے؟ لیکن متکلم یہ کہنا نہیں چاہ رہا ہے کہ آپ نے کسی مدفون مردے کی قبر پہ جا کر لات ماری ہے، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم خسیس ہو، تم بخیل ہو اور بخیل آدمی اگر تھوڑی سی بخشش کر دے تو وہاں پر کہتے ہیں کہ تم نے حاتم کی قبر پر لات ماری ہے یعنی متکلم حسّت بیان کر رہا ہے اور اس کا کلام کچھ اور بیان کر رہا ہے، اگر انسان سادہ ہو اور متکلم اور مرادِ متکلم نہ سمجھتا ہو تو فقط کلام پر اکتفا کر لیتا ہے، اسی طرح سے انسان اگر قواعدِ عربی کی مدد سے قرآن کی بارگاہ میں آئے اور مقصودِ کلام سمجھ بھی جائے کہ آیات کیا کہہ رہی ہیں، الفاظِ قرآن کیا کہہ رہے ہیں تو یہ فہم کا ایک درجہ ہے لیکن اس پر اکتفا نہ کریں۔

اِقْرَأْ وَارْقَ......

یعنی پڑھو اور پھر درجۂ بالا پر قدم رکھو، ابھی ایک سیڑھی پر قدم رکھا ہے یعنی تم نے کلام کا مقصود سمجھا ہے اب متکلم کا مقصود سمجھو۔

بعض لوگ جان بوجھ کر بھی قرآن کے الفاظ کے وہ معانی کرتے ہیں کہ جو مقصودِ متکلم نہیں ہوتے، اگر ہم عملاً دیکھیں تو دین دار لوگوں کے اندر یہ چیز موجود ہے یا جو لوگ قانون سے سروکار رکھتے ہیں ان کے یہاں بھی یہ عام معاملہ ہے اور رائج چیز ہے مثلاً آپ عدالتوں میں جائیں تو وکلاء جب قاضی کے سامنے، جج کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور جرح کرتے ہیں، وہاں انہیں معلوم ہے کہ قانون کے الفاظ یہ کہہ رہے ہیں لیکن قانون ساز یہ نہیں کہنا چاہتا ہے بلکہ قانون ساز کی کچھ اور مراد ہے لیکن وکیل کو اس سے سروکار نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ الفاظ یہ کہہ رہے ہیں، اب اسے بیشک یہ بتاتے رہیں کہ یہ الفاظ کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو قانون بنانے والے کا مقصد نہیں تھا، وہ کہتا ہے کہ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ قانون بنانے والے کا مقصد کیا تھا؟ مجھے صرف اسی سے غرض ہے کہ قانون کی عبارت یہ کہتی ہے، عبارت فقط یہ کہہ رہی ہے یعنی جان بوجھ کر وکیل اپنا کیس (Case) جیتنے کے لئے فقط الفاظ کی حد تک اکتفا کرتا ہے اور وکیل کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ قانون ساز کی یہ مراد نہیں ہے فقط الفاظ اس طرف اشارہ کررہے ہیں۔

اسی طرح ہم دینداروں کی دنیا میں آجائیں، قانونِ الٰہی میں آجائیں تو یہاں بھی ایسے ہی ہے، توضیح المسائل اٹھا کر کہتے ہیں کہ فتویٰ کی عبارت یہ ہے، مثلاً چاند نظر آنے میں فتویٰ کی عبارت یہ ہے، خمس دینے میں فتویٰ کی عبارت یہ ہے، مرجعِ تقلید کے الفاظ یوں کہتے ہیں، جہاں پر جان

چھڑانی ہو اور حکمِ شرعی سے بھاگنا ہو، حدودِ الٰہی سے فرار کرنی ہو تو وہاں پر فقط ان الفاظ کا سہارا لیتے ہیں، اگر انہیں کہہ دو کہ مرجعِ تقلید کی یہ مراد نہیں تھی، معصوم علیہ السلام کی یہ مراد نہیں تھی، خداوند تعالیٰ کی یہ مراد نہیں تھی تو وہ کہتا ہے کہ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ ان کی مراد کیا ہے؟ الفاظ یہ کہہ رہے ہیں، فتویٰ یوں کہتا ہے، عبارت سے یوں استفادہ ہوتا ہے باقی مجھے معلوم نہیں ہے، بسا اوقات لوگ یہ کام کرتے ہیں کہ فقط الفاظ کے معانی دریافت کر لیتے ہیں اور متکلم کے مقصود کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے، اس کو ترقی نہیں کہتے ہیں، یہ قرآن پڑھنے کا ادب نہیں ہے، قرآن پڑھنے کا ادب یہ ہے کہ اگر الفاظِ قرآن سے آپ کو ایک مطلب سمجھ میں آیا ہے تو اب ان الفاظِ قرآن اور ان معانیٔ الفاظ کو مرادِ متکلم سمجھنے کے لئے ذریعہ قرار دیں کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی مراد کیا ہے؟ چونکہ متکلمِ کلام ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

۵) ارتقاء کا چھٹا پہلو

☆پہلا مرحلہ

تالیٔ قرآن اور قاریٔ قرآن کے لئے ارتقاء کے چھٹے پہلو کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان قرآن پڑھتے ہوئے، تلاوت کرتے ہوئے یہ سمجھے کہ خود اپنے لئے تلاوت کر رہا ہے یعنی انسان ہی تالی ہے اور انسان ہی سامع ہے۔ اس میں وہ تلاوتیں شامل نہیں ہیں کہ جو مُردوں پر کی جاتی ہیں، جو ختمِ قرآن میں کی جاتی ہیں، جو تراویح میں کی جاتی ہیں، پیسے لے کر کی جاتی ہیں یا قرآن کے مقابلے

میں کی جاتی ہیں، وہ اصلاً اس موضوع سے خارج ہیں، وہ نہ اپنے لئے ہوتی ہیں، نہ خدا کے لئے ہوتی ہیں اور نہ کسی اور کے لئے ہوتی ہیں۔ انسان نماز میں جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے، فاتحہ پڑھتا ہے، سورہ پڑھتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ پیسے کے لئے نہیں کرتا ہے، کسی مردے کے ایصالِ ثواب کے لئے نہیں کرتا ہے، کسی انعام کو جیتنے کے لئے نہیں کرتا ہے، انسان خود تلاوتِ قرآن کرتا ہے اور خود سنتا ہے یعنی اپنے لئے تلاوت کرتا ہے، یہ ایک مرحلۂ تلاوت ہے اور رائج تلاوت یوں ہی ہوتی ہے مثلاً فرض کریں کہ انسان قرآن پڑھ رہا ہے، صبح و شام کسی وقت بھی توفیق میسر ہو تو آ کر قرآن کھولتا ہے اور اس کا مطالعہ کرتا ہے، قرآن میں غور و تدبر کرتا ہے، خود ہی قرآن پڑھتا ہے، خود ہی سنتا ہے اور خود ہی سمجھتا ہے، عام عوام الناس ایسا ہی کرتے ہیں، یہ قرآن خوانی یا تلاوت کا ایک ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔

☆ دوسرا مرحلہ

☆دوسرا مرحلہ

چھٹے پہلو کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں قرآن پڑھے یعنی خدا کے سامنے قرآن پڑھے، جس طرح سے شاگرد کبھی خود کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے، درس دہرا رہا ہوتا ہے، خود سنتا ہے، خود سمجھتا ہے اور کبھی استاد کے سامنے جا کر سناتا ہے، اپنا آموختہ سناتا ہے کہ میں صحیح پڑھ رہا ہوں یا غلط پڑھ رہا ہوں۔ اپنے طور پر کتاب کا مطالعہ کرنا یہ بھی مطالعہ ہے اور استاد کے سامنے جا کر اپنا آموختہ اور درس سنانا بھی ایک مطالعہ ہے، یہ بھی قرأت ہے، پس پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے

لئے پڑھتا ہے، خود ہی سنتا ہے، خود ہی ناظر ہے لیکن ایک دفعہ قرآن پڑھتا ہے تو مُستمِع اور سامع ذاتِ خداوندِ تبارک وتعالیٰ ہے جیسے انسان دعا کرتا ہے اور سامع ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

ان دونوں قسم کی قرأتِ قرآن میں بہت فرق ہے مثلاً انسان جب اپنے لئے کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے اور جب معلم کے سامنے کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے تو ان دونوں قسم کے مطالعوں میں بہت فرق ہے، حتیٰ انسان کے جسمانی حالات میں بہت فرق ہوتا ہے کہ جب خود پڑھ رہا ہے تو لیٹا ہوا ہے اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھی ہوئی ہے، کہنی سر کے نیچے رکھی ہوئی ہے اور جیسی مرضی ہے ویسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، جیسی مرضی ہے بیٹھا ہوا ہے اور کوئی انداز نہیں ہے، کوئی خوبصورت لحن نہیں ہے بلکہ آزادی سے پڑھ رہا ہوتا ہے لیکن جب معلم کے سامنے جاتا ہے تو ادب سے دوزانوں ہوکر بیٹھتا ہے یا کھڑے ہوکر پڑھتا ہے یعنی جسمانی طور پر بھی اس کے حالات میں فرق آجاتا ہے اور روحانی وقلبی طور پر بھی اس کے حالات میں فرق آجاتا ہے کہ اب میں جس کے سامنے پڑھ رہا ہوں وہ ناظر ہے، وہ حاضر ہے، وہ میرا کلام اور میری بات سن رہا ہے، میری ادنیٰ سی غلطی، خطا اور میرا معمولی سا اشتباہ بھی اس کی گرفت اور نظر میں ہے، جب انسان اس طرح سے خدا کے سامنے قرآن پڑھ رہا ہو تو ظاہر ہے کہ اس وقت انسان کم غلطیاں کرتا ہے لیکن جب خود پڑھتا ہے تو نظر انداز زیادہ کرتا ہے، چشم پوشی زیادہ کرتا ہے، بے ادبی زیادہ کرتا ہے۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ قرآن کتابِ خدا ہے، کلامِ خدا ہے اور میں کلامِ خدا خود خدا کے سامنے پڑھ رہا ہوں تو بے ادبی کس طرح سرزد ہوسکتی ہے۔ پس قرأتِ قرآن خدا کی ذات سنے یہ بھی ارتقاء کا ایک مرحلہ ہے۔

☆تیسرا مرحلہ

اس سے اگلا تیسرا مرحلہ بھی ہے، پہلا مرحلہ یہ ہے کہ خود اپنے لئے پڑھے، دوسرا یہ ہے کہ انسان خدا کیلئے پڑھے اور مرحلۂ دیگر یہ ہے کہ تالیٔ قرآن اس طرح سے قرآن پڑھے کہ خدا کلام ادا کرے اور انسان سنے، یہ بھی ارتقاء وترقی در تلاوت ہے، تالیٔ قرآن اس طرح سے قرآن کے ہمراہ جائے کہ یہ کلام جو پہلے کاغذ سے پڑھ رہا تھا اب پڑھتے پڑھتے خود متکلم سے سن رہا ہے، متکلم پڑھے اور انسان سنے، اس میں بعض احادیث کی طرف اشارہ فرماتے ہیں مثلاً حضرت امام صادق علیہ السلام کی یہ روایت سب نے نقل کی ہے، اہلِ سنت نے بھی نقل کی ہے اور ہمارے یہاں تشیع میں بھی موجود ہے کہ امام صادق علیہ السلام کی حالتِ نماز میں ایک کیفیتِ عجیب طاری ہوئی، پہلے کپکپی طاری ہوئی، جسم پر لرزہ طاری ہوا اور پھر کچھ دیر کے بعد حضرت علیہ السلام نماز میں مدہوش ہو کر گر پڑے، لوگوں نے آکر اٹھایا اور جب افاقہ ہوا تو پوچھا گیا کہ کیا اتفاق رونما ہوا تھا؟ ذرا غور کریں کہ جب ہم نماز پڑھتے ہیں اور اس میں فاتحہ پڑھتے ہیں تو اپنے لئے پڑھتے ہیں اور خود سن رہے ہوتے ہیں جبکہ نماز اس طرح سے پڑھنا چاہئے کہ خدا سن رہا ہو اور آپ پڑھ رہے ہیں لیکن حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے بعض قرآن کے حصوں کو، آیات کو اتنا تکرار کیا مثلاً سورہ فاتحہ کے بعض حصوں کو اس طرح سے تکرار کیا، ایسا ارتقاء کیا کہ آخر کار یہ ہوا کہ پہلے میں خدا کے سامنے پڑھ رہا تھا لیکن پھر خدا نے قرآن پڑھنا شروع کیا، خدا کا کلام خود خدا سے ادا ہونا شروع ہوا اور میں سننے لگا، وہ عالم ایسا تھا کہ مجھ سے تحمل نہیں ہو سکا لہٰذا وہ کیفیت جو نماز کے اندر مجھ پر طاری ہوئی یہ کیفیت تھی۔ یعنی یہ بھی خداوند تبارک وتعالیٰ کی ایک تجلی

☆ تیسرا مرحلہ

تھی، یعنی تجلی متکلم در کلامِ خود۔ امام صادق علیہ السلام سے یہ حدیث بھی منقول ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ اپنے کلام میں متجلی ہے لیکن لوگ غافل ہیں، توجہ نہیں کرتے ہیں، خود امام صادق علیہ السلام متجلی کو دیکھ رہے ہیں اور متجلی سے یہ جلوہ سن رہے ہیں جس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند تبارک وتعالیٰ سے کلام سنا،

وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا......(۴)

یعنی موسیٰ علیہ السلام مدہوش ہو کر گرے، اس لئے کہ یہ منظر ہر ایک سے تحمل نہیں ہوتا ہے، جیسے اشارہ ہوا تھا کہ جب ہم اپنے لئے نماز پڑھتے ہیں تو خود ہی نمازی ہیں، خود ہی سن رہے ہیں، اس وقت ہماری یہ کیفیت ہو رہی ہوتی ہے کہ کہیں خارش ہو رہی ہوتی ہے، کہیں حساب کتاب میں لگے ہوتے ہیں، توجہ کہیں اور ہوتی ہے اور نماز میں حواس نہیں ہوتے ہیں لیکن جب کوئی کتاب معلم کے سامنے پڑھ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ہم سارے حواس اکٹھے کر کے معلم کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، ادنیٰ حرکت بھی ہم سے سرزد نہیں ہوتی ہے، معمولی سی بے ادبی بھی ہم سے سرزد نہیں ہوتی ہے، ادب خود ہی خود آجاتا ہے مثلاً جب ہم خود لائبریری میں بیٹھے ہوئے، اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے پڑھ رہے ہوتے ہیں تو کسی ادب کا خیال نہیں رکھتے ہیں لیکن جب کلاس میں معلم کے سامنے پڑھتے ہیں تو ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں، پہلے بن سنور کر جاتے ہیں، مناسب لباس پہنتے ہیں، مناسب حلیہ بناتے ہیں، اپنا جسمانی انداز بناتے ہیں اور پھر اس معلم کے سامنے جاتے ہیں اور قرأت کرتے ہیں اور یہی چیز جو انسان پڑھ رہا ہے اگر معلم سے سن رہا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا درجہ کچھ

اور ہوتا ہے یعنی اگر انسان خود ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہ کلمات سن رہا ہو تو تحمل کرنا آسان نہیں ہے، ہم پڑھیں اور وہ سنے یہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے چہ جائیکہ خدا کی ذات کلام کرے اور انسان سنے، بس اس وجہ سے یہ بھی قرأت کا ایک مرتبہ ہے کہ انسان اقراء اور ارتقاء میں وہاں تک جا پہنچے۔

٦) ارتقاء کا ساتواں پہلو

ایک پہلوئے دیگر یعنی ساتواں پہلو بھی ہے، اب جب کہ انسان خدا سے کلام سنتا ہے یعنی جب انسان قرآن پڑھ رہا ہے تو یہ گمان کرے کہ خدا پڑھ رہا ہے اور میں سن رہا ہوں نہ کہ اپنے آپ کو خدا سمجھے چونکہ کلام میں خدا متجلی ہے اور یہ کلامِ خدا ہے، اس کو ایک مثال کے ساتھ تحریر کرتے ہیں، مثلاً آپ ڈراموں، فلموں میں ایک منظر دیکھتے ہیں کہ دور بیٹھا ہوا ایک آدمی کسی کو خط لکھتا ہے، عموماً یہ منظر ہر جگہ اور ہر زبان کی فلم میں موجود ہوتا ہے، فرض کر لیں کہ جو تاریخی مذہبی فلمیں ہیں جیسے اصحابِ کہف، مریمؑ مقدس یا امام علی علیہ السلام کی فلم ہے، ان فلموں میں ہم دیکھتے ہیں یا فلم ڈائریکٹر (Director) بہت خوبصورتی سے اس منظر کو فلماتا ہے کہ مثلاً امیر المومنین علیہ السلام مالکِ اشترؒ کو خط لکھتے ہیں، پہلے مالکِ اشترؒ اس خط کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو مالکِ اشترؒ کی آواز ہوتی ہے لیکن جب چند سطریں پڑھتے ہیں تو آواز بدلتی ہے اور امیر المومنین علیہ السلام کی آواز شروع ہو جاتی ہے، فلم ایک حقیقت کی نمائش ہے، یہ صرف فلم میں نہیں ہونا چاہئے بلکہ حقیقت میں ہونا چاہئے۔

جب فلم میں یہ اتفاق رونما ہوتا ہے تو نہج البلاغہ پڑھتے ہوئے کیوں نہیں ہوتا ہے؟ مثلاً ایک ماں اپنے بیٹے کو خط لکھتی ہے اور وہ فلم ڈائریکٹر اس فلم کو اس طرح سے فلماتا ہے کہ بیٹا جب ماں کا خط پڑھ رہا ہوتا ہے تو پہلے چند سطروں تک بیٹے کی آواز ہوتی ہے لیکن جوں ہی ذرا آگے جا کر احساساتی کلام شروع ہوتا ہے تو پھر وہی آواز بدل کر ماں کی آواز ہو جاتی ہے یعنی ماں خط میں بول رہی ہے اور بیٹا نسوانی آواز میں سن رہا ہے، یہ ایک حقیقت ہے اس کو فقط یوں نہ سمجھیں کہ یہ فقط ایک فلمی حربہ و ہتھکنڈا ہے کہ جو وہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جسے وہ فلم کی مصنوعی دنیا میں دکھاتا ہے، یہ حقیقی دنیا کی بات ہے کہ جو ہم مصنوعی و مجازی دنیا میں جا کر دیکھتے ہیں، مثلاً آپ دیکھیں کہ مریمؑ مقدس کی فلم میں جب وحی نازل ہوتی ہے تو پہلے چند سطریں جناب مریم علیہا السلام کی زبان سے ادا ہوتی ہیں اور پھر اس کے بعد فرشتہ، روح القدس بولنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر جس کا کلام ہے وہ بولنا شروع ہوتا ہے، لیکن جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو آخر تک خود ہی پڑھتے چلے جاتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ ارتقاء و ترقی نہیں کرتے ہیں، نہج البلاغہ پڑھتے ہیں لیکن نہج البلاغہ آخر تک خود ہی پڑھتے جاتے ہیں، انسان نہج البلاغہ پڑھتے ہوئے اتنی ترقی کرے کہ خود امیر المومنین علیہ السلام بولنا شروع کر دیں یعنی آوازِ امیر المومنین علیہ السلام انسان کے کانوں سے ٹکرانا شروع کر دے، البتہ دل کے کان سے نہ کہ جسمانی کان سے، دل کے کان میں امیر المومنین علیہ السلام کی آواز پڑے اور انسان یہ خطبے، یہ شکوے، یہ فریادیں اور یہ حزن خود امیر المومنین علیہ السلام سے سنے، اب جب کہ انسان خداوند تبارک وتعالیٰ سے یہ کلام سنتا ہے تو اس کے بھی مراتب و درجات ہیں۔

۷) ارتقاء کا آٹھواں پہلو

بعض اوقات ذاتِ خدا کلام کے ذریعے سے عبد سے مخاطب ہے اور فقط عبد خدا سے کلام سن رہا ہے یعنی اتنا ارتقاء کر گیا کہ ذاتِ خدا سے مستقیماً کلام سن رہا ہے، یہ فقط کلام کی حد تک ہے لیکن اس سے بھی آگے ساتواں پہلو بھی موجود ہے، مرحلۂ بالاتر یہ ہے کہ انسان جب قرآن مجید میں وارد ہوتا ہے، خدا مخاطِب ہوتا ہے اور ہم مخاطَب ہوتے ہیں تو خدا کی ذات بول رہی ہوتی ہے اور ہم سن رہے ہیں تو نہ فقط کلام بلکہ خدا کی نعمتیں اور جو کچھ خدا کے عطایا ہیں وہ بھی انسان کو نظر آرہے ہوتے ہیں یعنی جو کچھ خدا نے ہمارے لئے مقرر و نازل کیا ہے، جن نعمتوں سے خدا نے ہمیں نوازا ہے وہ ساری نعمتیں مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں یعنی خدا مجھ سے کس زبان میں کلام کر رہا ہے؟ وہ نہ صرف مجھ سے بات کر رہا ہے بلکہ اپنی نعمتوں کی زبان سے بھی مجھ سے مخاطب ہے، خدا نہ صرف الفاظ کی زبان سے ہمارے ساتھ ہم کلام ہے بلکہ اپنے فعل، اپنے اثر اور اپنے وجود کی زبان سے ہم سے کلام کر رہا ہے یعنی انسان پہلے خدا کو کلام میں دیکھ رہا ہوتا ہے اور اب نعمتوں میں دیکھ رہا ہوتا ہے، انسان جتنا بھی قرآن پڑھتا ہے تو وہ ایک ایک نعمت کو دیکھتا ہے کہ خدا کی ذات مجھ سے اپنے فعل کے ذریعے سے مخاطِب ہے۔

جس طرح سے ایک والد بسا اوقات بچے کو زبانی وصیت کرتا ہے، شفاہی نصیحت کرتا ہے اور بچہ اس کی آواز کو سنتا ہے، کان دھرتا ہے لیکن یہی والد اب ایک دفعہ خاموش ہے یا یوں کہیں کہ بات بھی کر رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کے افعال بھی ہیں، جیسا کہ کہا بھی گیا ہے کہ آپ بچوں کے

ساتھ ایسے ہی مخاطب ہوں، جب آپ بچوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو صرف زبان سے مخاطب نہ ہوں بلکہ اِن سے اعضاء و جوارح سے بھی خطاب کریں، اپنی آنکھوں سے بھی خطاب کریں، اپنے ہاتھوں سے بھی خطاب کریں، اپنے وجود سے بھی خطاب کریں، مثلاً نوازش کرنا، شفقت کا ہاتھ پھیرنا، جیسے کہا گیا ہے کہ یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرو، یہ بھی ایک نوعِ خطاب ہے، اس میں مفہوم ہے، یتیم سمجھتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مثلاً آپ اس کے ساتھ اچھی زبان بھی استعمال کریں مثلاً اس کو بیٹا کہیں، اپنا پیارا کہیں، اپنا عزیز کہیں، اپنا فرزند کہیں لیکن جب اٹھا کر اس کو گود میں بٹھا دیں تو یہ گود میں بٹھانا بات کرنے سے زیادہ مؤثر ہے، یہ گود میں بٹھانا نوازش ہے، انسان جب خداوند تبارک وتعالیٰ سے کلام سنتا ہے تو ساتھ ہی خدا کی ساری نعمتوں کا احساس بھی کرتا ہے، وہ نوازشِ خدا، بندہ نوازیٔ خدا، کرمِ خدا اور رحمانیتِ خدا کا بھی احساس کرتا ہے۔

۸) ارتقاء کا نواں پہلو

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر ایک نواں پہلو ہے کہ جسے ہم تالیٔ قرآن کا آخری مرحلہ کہہ سکتے ہیں، البتہ پہلے عرض کیا تھا کہ ارتقاء کی کوئی حد نہیں ہے، انسان لامتناہی حد تک ارتقاء کر سکتا ہے، کمالات کی دنیا میں غیر محدود ترقی کر سکتا ہے اور معرفت کی دنیا میں ایسی جگہ پہنچ سکتا ہے کہ جہاں کوئی حد نہ ہو، انسان لایقفی حد تک جا سکتا ہے، جہاں وقفہ نہیں ہے، جہاں وقوف نہیں ہے، جہاں انسان کے لئے کوئی آخری اسٹاپ (Stop) نہیں ہے۔

انسان کی تلاوت کا ایک مرحلہ یہ آتا ہے کہ انسان کلام میں پہلے خدا سے سنتا ہے، پھر خدا کی نعمتوں کو دیکھتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور نہایتاً ان ساری چیزوں سے غافل ہو جاتا ہے، وہ جو گزشتہ فصل میں تاثر اور وجد بیان کیا تھا کہ انسان کے اندر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، وجد یہ ہے کہ خودِ ذاتِ خدا مجھ سے ہم کلام ہے، یہ کلامِ خدا ہے اور میں مخاطب ہوں لیکن نہایتاً اب کلام بھی نہیں سن رہا ہے بلکہ خود خدا کا مشاہدہ کر رہا ہے، جس طرح سے امیر المومنین علیہ السلام سے اس شخص نے پوچھا کہ آیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ کہا کہ

لَمۡ أَكُنۡ أَعۡبُدُ رَبّاً لَمۡ أَرَهُ...... (۵)

میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی ہے جسے میں نے دیکھا نہ ہو......

مَا كُنتُ لِأَعۡبُدُ رَبّاً لَمۡ أَرَهُ...... (٦)

یعنی میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا کہ جسے دیکھا نہ ہو،

لیکن خدا کو نورِ بصیرت سے اور ایمان کی بصیرت سے دیکھا جا سکتا ہے نہ کہ آنکھ سے دیکھتا ہوں۔

جیسا کہ امام صادق علیہ السلام کی روایت اور دیگر روایات و مضامین میں بھی ہے کہ

لَقَدۡ تَجَلَّى اللّٰهُ لِخَلۡقِهِ بِكَلَامِهِ وَلٰكِنَّهُمۡ لَا يُبۡصِرُوۡنَ...... (۷)

خدا کی ذات اپنے کلام کے اندر متجلی ہے لیکن مخلوق چونکہ حجابوں میں ہے لہٰذا ان حجابوں کی وجہ سے مخلوق کو متجلی دکھائی نہیں دیتا ہے اور یہ قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ درحقیقت تمام عالم تجلی گاہِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے، ان تجلیاتِ الٰہی میں ہماری زندگی کی صبح و شام بسر ہو رہی ہے اور

قرآن نے بھی کہا ہے کہ یہ سب تجلیاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہیں، دن کا رات ہونا، رات کا دن ہونا، سردی کا گرمی ہونا، گرمی کا سردی ہونا، رات کے اپنے مناظر، دن کے اپنے مناظر، ہواؤں کا چلنا، سمندروں کا چلنا، پانی کا اتنا عظیم مجموعہ اوراس کے اندر کشتیوں کا چلنا اور پرندوں کا ہواؤں میں اڑنا، ہر چیز ایسی ہے کہ جو تجلی گاہِ ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام چونکہ غافل انسان نہیں ہیں، امیر المومنین علیہ السلام خود بھی فرماتے ہیں کہ

لَوْ کُشِفَ الْغِطَاءُ مَاازْدَدْتُ یَقِیناً......(۸)

اگر (میرے سامنے سے) پردے ہٹادیئے جائیں تو بھی میرے یقین میں (اور) اضافہ نہیں ہوگا......

چونکہ میں ابھی بھی حجابوں کو نہیں بلکہ حجابوں سے پرے موجود حقیقت کو دیکھتا ہوں، میں تجلیات کے اندر موجود متجلی کو دیکھتا ہوں چونکہ میرے سامنے پردے نہیں ہیں، میری شخصیت حجاب میں نہیں ہے، نہ حجابِ نفسانی ہے، نہ حجابِ ظلمانی ہے، نہ حجابِ نورانی ہے، میں ان ساری آلودگیوں سے منزہ اور پاک انسان ہوں، اس وجہ سے

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ......(۹)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا......

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَ بَعْدَهُ......(۱۰)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس سے پہلے خدا کو دیکھا، اس کے ساتھ بھی اور اس کے

بعد بھی......

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰہَ مَعَہُ......(۱۱)

میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر اس کے ساتھ خدا کو دیکھا......

اسی طرح سے قرآن بھی تجلی عظمتِ خدا ہے، قرآن مجید تجلیٔ اکبر خداوند تبارک و تعالیٰ ہے، یہ قانونِ عام ہے یعنی یہ فقط ایک ذوقی مطلب نہیں ہے کہ جس طرح سے انسان دلیل و برہان سے دیکھتا ہے لیکن تجربے سے ثابت نہ کر سکے بلکہ یہ قانونِ عرفی و قانونِ عقلائی ہے کہ ہر فاعل اپنے فعل کے اندر متجلی ہوتا ہے، فعل درحقیقت فاعل کا ایک حصہ ہوتا ہے، فعل فاعل کا آئینہ ہوتا ہے، اس آئینے میں تمام فاعل موجود ہوتا ہے، فاعل اس فعل کی صورت میں درحقیقت اپنی ہستی اور حسن و جمال کا اظہار کرتا ہے، مثلاً ایک خوبصورت خطاط جب خطاطی کرتا ہے تو درحقیقت یہ الفاظ، سطروں اور خطوط کی بناوٹ نہیں ہے بلکہ یہ جمالِ دَرُوْنی کاتب ہے کہ جو اس نے کتابت کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

مثلاً جب ایک معمار عمارت بناتا ہے تو اس عمارت کی خوبصورتی میں وہ درحقیقت اپنے جمالِ ذاتی اور وجودی کا اظہار کرتا ہے، آج بھی لوگ انسان کے ہاتھ کے بنے ہوئے شاہکار مثلاً احرامِ مصر کو دیکھتے ہیں تو اتنی احرامِ مصر پر توجہ نہیں ہوتی ہے کہ جتنی ان کے بنانے والوں پر ہوتی ہے چونکہ بنانے والوں نے اپنا تمام ہنر، زیبائی اور عظمت ان احرام کے اندر منتقل کی ہے، یہ ان لوگوں کا فعل ہے لہٰذا انسان آج تک انگشت بدنداں ہے، تمام بشریت کو حیرت ہے کہ ہزاروں سال پہلے انسانوں نے کس طرح اتنی عظیم عمارتیں کھڑی کی ہیں؟ کس ٹیکنالوجی کی مدد سے؟ کس ہنر کی مدد

ارتقاء کا نواں پہلو

سے؟ کس علم کی مدد سے؟ کس جیومیٹری اور ہندسے کی مدد سے؟ یہ عظیم الجثہ اور عجیب تعمیرات انجام دی ہیں، اسی طرح سے اور بھی جتنے مشابہ شاہکار ہیں کہ جو انسانوں نے تعمیر کئے ہیں تو لوگ انہیں دیکھ کر ان کے بنانے والوں کی صنائع کی تعریف کئے بغیر نہیں رہتے ہیں۔

اسی طرح جب شاعر ایک نظم لکھتا ہے تو اس نظم کے اندر اپنی روح کا حسن منتقل کرتا ہے، اس لئے شعر جذاب ہو جاتا ہے یعنی شعر در حقیقت تجلیٔ خودِ شاعر ہے، تجلیٔ روحِ شاعر ہے اور جب ایک پاکیزہ شاعر مثلاً اقبالؒ جیسا شاعر شعر لکھتا ہے تو اسی لئے شعر بھی عظیم ہوتا ہے، یہ در حقیقت تجلیٔ روحِ اقبالؒ ہے، لیکن دوسرے شاعر بھی ہیں کہ جنہوں نے شہوانی اور شہوت رانی کے اشعار لکھے ہیں، انہوں نے بھی اپنی شہوتوں کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے، ان کا اظہار شہوت ہے، البتہ لفظِ تجلی شہوتوں کے لئے استعمال نہ ہو، لیکن ان کا بھی ایک اظہار ہے، در حقیقت انہوں نے اپنے اس کام میں اپنی روح اور فاعلیت کا اظہار کیا ہے۔

اگر کسی سے کوئی برا فعل سرزد ہوتا ہے تو در حقیقت یہ فاعل کی برائی ہے کہ جو فعل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اگر کسی سے اچھا فعل سرزد ہوتا ہے تو یہ فاعل کی اچھائی اور حسن ہے کہ جو فعل کی صورت میں انسان کے سامنے ظاہر ہوتی ہے، پس یہ ایک قانونِ عام ہے اور فعل کسی فاعل سے خود بخود سرزد نہیں ہو سکتا ہے، انسان مشین نہیں ہے بلکہ انسان کا فعل ارادی و اختیاری فعل ہے، یہ اس کی روح کا فعل ہے، انسان تفکر کے ساتھ فعل انجام دیتا ہے، انسان کا ارادہ اس کے وجود، اس کی روح اور اس کے نفس سے اٹھتا ہے لہٰذا تمام وجودِ انسان در حقیقت اس فعل کے اندر موجود ہوتا ہے، اس وجہ

سے تناسب بھی ہوتا ہے، قرآن کی آیت بھی ہے کہ

كُلٌّ يَّعۡمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ...... (۱۲)

یعنی ہر فاعل اپنا ہم شکل کام کرتا ہے،

اسی طرح ہر انسان اپنا ہم شکل فعل انجام دیتا ہے، فعل و فاعل کے اندر مشاکلت، مناسبت اور تناسب اسی باب سے ہے کہ فعل خود فاعل کا حصہ ہوتا ہے اور کلام خود متکلم کا فعل اور حصہ ہوتا ہے، قرآنِ مجید فعلِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے اور ذاتِ خدا اس کلام کے اندر متجلی ہے۔

یہی حال عبادتوں کا بھی ہے کہ انسان جب عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ کا مشاہدہ کرے، شہود کرے لیکن بصیرت کے ساتھ نہ کہ بصر کے ساتھ، یہ نہ کہے کہ میں نے خداوند تبارک وتعالیٰ کو آنکھ سے دیکھا ہے بلکہ انسان چشمِ بصیرت سے، دل سے اور نور سے خداوند تبارک وتعالیٰ کو دیکھتا ہے، پس انسان خدا کو دیکھے، عبادت میں بھی ارتقاء یہی ہے کہ انسان خدا کو دیکھے، پس خدا کو پائے پھر عبادتِ خدا کرے، اس وقت ہمارا ایمان کیا ہے کہ

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا...... (۱۳)

پروردگار ہم نے اس منادی کو سنا جو ایمان کی آواز لگا رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے......

یعنی سنا ہے تو ایمان لے آئے عموماً کہتے ہیں کہ کیسے ثابت کریں کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے؟ تو کہتے ہیں کہ تواتر سے یعنی متواتر نقل ہوا ہے کہ یہ کتاب خدا کی ہے، جس طرح یہ ہے کہ ہمیں

کیسے پتہ چلے کہ بانگِ دراعلامہ اقبالؒ کی کتاب ہے؟ ہمارے سامنے تو اقبالؒ نے نہیں لکھی ہے لیکن ہم سب کو یقین ہے کہ یہ علامہ اقبالؒ کی کتاب ہے، ہمیں کہاں سے یقین ہے؟ تواتر سے یعنی لوگوں نے اتنا زیادہ نقل کیا ہے کہ اب اس میں احتمالِ خطا نہیں ہے، اس کے اندر احتمالِ کذب نہیں ہے، صد در صد علامہ اقبالؒ کی ہی کتاب ہے، تواتر مفید ہے، افادہ یقین پیدا کرتا ہے، اسی طرح سے تواتر سے ہمارے لئے ثابت ہے کہ قرآن کلامِ خدا ہے یعنی ہم نے بہت سارے لوگوں سے سنا ہے کہ یہ کلامِ خدا ہے، اس طرح سے ہمارے نزدیک یہ کلامِ خدا ہے یعنی بہت سارے لوگ نے کہا کہ یہ کلامِ خدا ہے تو ہم نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے جب اتنے سارے لوگ کہتے ہیں تو کلام خدا ہی ہوگا۔

انسان اس طرح ارتقاء کرے کہ خود متکلم سے سنے اور متکلم کو دیکھے اور پائے، کلام ذریعہ ہے، خدا متجلی در کلامِ خود ہے، جب متجلی در کلامِ خود ہے تو ہم جلوہ کے ذریعے سے متجلی کو دیکھیں، تجلیات متجلی کو دیکھنے کا ذریعہ ہیں، جس طرح سے قرآن تجلیٔ خدا ہے اسی طرح سارا عالم تجلیٔ خدا ہے، سارا جہان تجلیٔ خدا ہے اور جب انسان کی بصیرت دیکھنا شروع کرے تو انسان ان تجلیاتِ الٰہی میں متجلی کو دیکھتا ہے،

قرآن نے پہلے کہا ہے کہ

لَا تَعْمَی الْأَبْصَارُ...... (۱۴)

یعنی ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں،

وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوبُ الَّتِی فِی الصُّدُورِ ۝

بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

یہ دل کے اندھے ہیں، ان کی بصیرت کی آنکھ نہیں ہے بلکہ صرف جسمانی آنکھ کھلی ہوئی ہے، تجلیاں نظر آتی ہیں لیکن بصیرت کی آنکھ سے تجلّی کے اندر متجلّی نظر آتا ہے، جیسے عرض کیا کہ امام علیؑ کی فلم دیکھتے ہیں، مریمِؑ مقدس کی فلم دیکھتے ہیں اور اس فلم میں ایک نامہ پڑھا جاتا ہے، چند سطروں تک پڑھنے والے کی آواز آتی ہے لیکن اس کے بعد لکھنے والے کی آواز آنا شروع ہو جاتی ہے، یہاں سے بھی آگے ایک مرحلہ ہے، وہ یہ کہ اسی نامے کے اندر، بسا اوقات اسی خط کے اندر وہ خط ہٹ جاتا ہے اور خود متکلم آجاتا ہے، صاحبِ نامہ خود نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

عموماً شہداء کے بارے میں جو فلمیں بنی ہیں ان میں یہ منظر بھی فلمایا گیا ہے، ہنرمندی اسی کو کہتے ہیں، سارا ہنر فلموں اور سینماؤں میں جا کر منحصر ہو گیا ہے اور معاشرے سے نکل گیا ہے، علمی جگہوں سے نکل گیا ہے، علماء نے ہنر چھوڑ دیا اور اِنہوں نے ہنر کو بغیر علم و معرفت کے حاصل کر لیا، جہاں ہنر ہے وہاں معرفت نہیں ہے اور جہاں معرفت ہے وہاں ہنر نہیں ہے، یہ ہنر نماز میں ہونا چاہئے تھا مثلاً شہداء کی فلم بناتے ہیں اور اس میں شہید کی ماں جب اپنے شہید بیٹے کی تصویر کو دیکھتی ہے تو آپ دیکھیں کہ ایک منٹ کے اندر یا چند منٹ کے اندر اندر آہستہ آہستہ اس تصویر میں سے زندہ شہید نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر مجسم ہو کر ماں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ماں کے ساتھ بات کرنا شروع کر دیتا ہے، کیا یہ فقط فلموں میں ہے؟ اس فلم بنانے والے کے ذہن میں یہ بات کہاں سے آئی ؟ کہ تصویر میں صاحبِ تصویر بھی دیکھا جا سکتا ہے یعنی ماں جب شہید کی تصویر کے اندر اتنی

منہمک اور غرق ہو جاتی ہے تو بیچ میں سے تصویر ہٹ جاتی ہے۔

یعنی جب آپ اس ظاہری آنکھ سے دیکھ رہے ہیں تو شہید کی تصویر نظر آتی ہے لیکن شہید کی ماں تو فقط اس آنکھ سے نہیں دیکھتی ہے بلکہ وہ دل کی آنکھ سے دیکھ رہی ہے، فلم ڈائریکٹر اس طرح فلم کی نمائش کرتا ہے کہ وہ دونوں آنکھوں کی روئیت بتا رہا ہوتا ہے، وہ یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ شہید کی ماں باطنی آنکھ سے تصویر دیکھ رہی ہے، بصیرت سے خود شہید کو دیکھ رہی ہے، اگر انسان بصیرت سے دیکھے تو شہید کی تصویر میں شہید نظر آتا ہے اور واقعاً نظر آتا ہے، اسی طرح سے قرآن تجلیٔ خدا ہے، اگر انسان بصیرت سے دیکھے تو تجلی میں متجلی نظر آتا ہے لیکن چونکہ بصیرتیں نابینا، اندھی اور اعمیٰ ہیں،

لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝

درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

اس وجہ سے تجلیاں دیکھتے ہیں لیکن متجلی نہیں دیکھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں لیکن ان کو خدا نظر نہیں آتا ہے، انسان خدا کو دیکھے اور پائے، قرآن کے اندر متکلم کو پائے، یہ بھی ارتقاء ہے اور قرأتِ قرآن کا درجۂ دیگر ہے۔

ارتقاء انہی حدود میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس سے بھی ماورا ارتقاء موجود ہیں اور ان تجلیات کے لئے حدودِ دیگر بھی ہیں کہ اس کے لئے فرصتِ دیگر کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ آخری دسواں ادب اگلی فصل میں درج کیا جائے گا۔

حوالہ جات

(۱)......(الانسان الکامل فی نہج البلاغة، الجزء ۱، صفحہ ۱)(شرح نہج البلاغة-عبد الحمید بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسین بن أبی الحدید، أبو حامد، عز الدین، الجزء ۸، صفحہ ۲۷۸)(شرح نہج البلاغة - ابن ابی الحدید، الجزء ۱، صفحہ ۲۴۱۰)(نہج السعادة - الشیخ المحمودی، الجزء ۸، صفحہ ۱۹۸)(مسند الامام علیؑ)

(۲)......(الاکلیل فی استنباط التنزیل - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی، الجزء ۱، صفحہ ۱۷۲)(مباحث فی علوم القرآن - صبحی الصالح، الجزء ۱، صفحہ ۲۰)(بصائر ذوی التمییز فی لطائف - الکتاب العزیز مجد الدین أبو طاهر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی، الجزء ۲، صفحہ۵۶۸)(نزول القرآن والعنایة بہ فی عہد النبیؐ - عبد الودود مقبول حنیف، الجزء ۱، صفحہ۶۸) (فضائل القرآن للقاسم بن سلام - أبو عُبید القاسم بن سلام بن عبد اللّٰه الهروی البغدادی، الجزء ۱، صفحہ ۱۱۱)(بیان المعانی - عبد القادر بن ملّا حویش السید محمود آل غازی العانی، الجزء ۱، صفحہ ۷۷)(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی - شہاب الدین محمود بن عبد اللّٰه الحسینی الألوسی، الجزء ۱۵، صفحہ ۲۹)

(۳)......(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۷۶)

(۴)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۴۳)

(۵)......(ارشاد القلوب،الجزء۶۴،صفحه ۲)(متشابه القرآن،الجزء ۱ ، (مختصر بصائر الدرجات -الحسن بن سليمان الحلى،الجزء ۱ ،صفحه۱۶۷) (مستدرک سفينة البحار - العلامة آية اللّٰه الشيخ على النمازى،الجزء۳،صفحه ۴۴۰)

(۶)......(أهل البيت فى تفاسير أهل السنة)

(۷)......(فى رحاب القرآن)(الامثل فى تفسير كتابِ اللّٰهِ المُنزَل-الشَيخ نَاصِر مَكارم الشِيرازيمدظله، الجزء۸،صفحه۳۲۴)(النظام القرآنى)(التفسير و المفسرون)(فى رحاب القرآن)(التفسير الصافى - الفيض الكاشانىؒ،الجزء ۱ ، صفحه۷۷)(بحار الأنوار،الجزء ۸۹،صفحه۱۰۷)(مستدرک سفينة البحار، الجزء ۲ ،صفحه ۸۳)

(۸)......(آشنایی با قرآن - متفکر شهید استاد مرتضی مطهریؒ)(تسنيم تفسير قرآن كريم - آية اللّٰه جوادى آملى مدظله)(تفسير نور- حجة الاسلام و المسلمين حاج شيخ محسن قرائتى مدظله)(شرح أصول الكافى- مولى محمد صالح المازندرانىؒ، الجزء ۵، صفحه۳۲۳) (بحار الأنوار- علامه مجلسىؒ، الجزء ۶۶، صفحه ۲۰۹)(غرر الحكم و درر الكلم، الجزء ۱، صفحه ۶۳)

(۹)......(تفسير الميزان - العلامة الطباطبائىؒ،بحث روائى)(شرح نهج البلاغه - جعفرى)(مرآة العقول فى شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسىؒ،الجزء ۱۰ ،صفحه ۱۳۹)

(۱۰)......(مفاهيم القرآن الجزء السادس)

(۱۱)......(شرح نهج البلاغه - جعفری)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ اسراء، آیہ ۸۴)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ آلِ عمران، آیہ ۱۹۳)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ حج، آیہ ۴۶)

فصلِ ادبِ دهم

﴿تبری﴾

١)تبری کا معنٰی

٢)تولا وتبراء انسانِ سالك کے دو پَر

٣)عبادات میں سفرِ قربی و سفرِ بُعدی

٤)انسان هجرت کیوں نهیں کرپاتا؟

٥)تولا و تبرا کی وسعت

٦)اپنی حول و قوت سے تبرا

٧)قارونِ علمی نه بنیں

٨)جسے خدا اپنے حال په چھوڑدے وه مغضوب هے

٩)برائت کا دوسرا مرتبه

١٠)انسان اپنی معرفت پیدا کرے

١١)انبیاء علیہم السلام انسان کو انسان بنانے آئے هیں

١٢)انسان ترقی پذیر هے

١٣)موجوده حالت پر راضی نه هونا،ترقی کی ضمانت

١٤)کون لوگ مطمئن هیں؟

۱)تبری کا معنیٰ

العاشر: التبری......

آدابِ فہم قرآن میں ادبِ دہم تبری ہے۔ جب تالیٔ قرآن درجاتِ قرآن کے ساتھ ساتھ اپنا سفر طے کرتا ہے اور پیرویٔ قرآن کرتا ہے یعنی قرآن کے ایک ہی مرتبے اور منزل پر نہیں رکتا تو اس کو بہت ساری آیات اور بہت سارے مضامینِ قرآن سے سروکار پڑتا ہے کہ جن میں آیاتِ نعمت ہیں، آیاتِ رحمت ہیں، آیاتِ بشارت ہیں، آیاتِ تحسین اور آیاتِ مدح ہیں، جیسا کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے بہت سارے طبقات کا ذکر کیا ہے، ان کیلئے دنیوی اور اخروی نعمتوں کا ذکر کیا ہے، شہداء، صدیقین، نبیین، صالحین، مرسلین اور مقربین کا ذکر ہے اور ہر ایک کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے الگ مقام ذکر کیا ہے لہٰذا تبری سے مراد یہ ہے کہ تالیٔ قرآن جب ہمراہ بہ قرآن ان مقامات پر پہنچتا ہے تو اپنے نفس کو ان چیزوں سے بری سمجھے، یہ نہ کہے کہ یہ آیات میرے لئے ہیں اور خود کو ان امور کا مصداق جانے۔

ایسا نہ ہو کہ جب انسان صالحین کے مقام کو پڑھ رہا ہے تو اپنے آپ کو صالحین میں سے شمار کرنا شروع کر دے یا جب مقربین کے مقام کا مطالعہ یا قرأت کر رہا ہے تو اپنے آپ کو زمرۂ مقربین میں شامل کرنا شروع کر دے یا جب ابرار کا تذکرہ آیا ہے تو اس گمان کے ساتھ اور اس احساس کے ساتھ قرآن پڑھے کہ میں ابرار میں سے ہوں یا شہداء، صدیقین، نبیین اور صالحین کا تذکرہ آتا ہے تو یہ سمجھے کہ میں اسی گروہ میں سے ہوں، بلکہ برائت کرے، تبری کرے اور دوری اختیار کرے کہ میں

تبری کا معنیٰ

ان کا مصداق نہیں ہوں لیکن ان مقامات تک پہنچنے کی آرزو کرے اور خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعا کرے کہ خدا مجھے ان مقامات میں سے قرار دے، حتیٰ وہ ہستیاں کہ جو یقیناً مقربین کا مصداق ہیں وہ بھی جب ان آیاتِ مقربین پر پہنچتی ہیں تو فقط دعا کرتی ہیں کہ خدایا ہمیں مقربین و صالحین میں سے قرار دے مثلاً معصومین علیہم السلام سے منقول ہے باوجودیکہ حضراتِ معصومین علیہم السلام صالحین کا مصداقِ کامل اور اتم ہیں لیکن معصومین علیہم السلام بھی جب قرآن پڑھتے ہوئے ان آیات پر پہنچتے ہیں تو وہیں پر خداوند تبارک وتعالیٰ سے دعا اور آرزو کرتے ہیں کہ خدایا ہمیں صالحین میں سے شمار فرما۔

اس کے برعکس جب انسان آیاتِ وعید اور آیاتِ عذاب پر پہنچتا ہے تو وہاں پر بھی تبری کرے یعنی اپنے آپ کو اس عذاب سے مامون اور امن میں نہ سمجھے، یہ نہ کہے کہ یہ آیات دوسروں کے لئے آئی ہیں مثلاً سرزنش کی آیات ہیں، مذمت کی آیات ہیں اور دنیا و آخرت کیلئے آیاتِ وعید ہیں مثلاً قرآن کے بیان کردہ عذاب یعنی عذاب النار، عذابِ الیم، عذابِ مھین، عذابِ عظیم، عذابِ شدید، عذاب الحریق، عذابِ مقیم، عذاب الھُون، عذاب الخلد، عذاب الخزی، عذابِ غلیظ، عذاب السعیر، عذابِ واصب، عذاب الجحیم، عذاب الحمیم، عذاب السموم اور عذابِ مستقر کی آیات ہیں یا نفاق وکفر وشرک کے بارے میں آیات ہیں، یہاں پر اپنے آپ کو تبریہ نہ کرے، یہ نہ کہے کہ میں ان چیزوں سے بری ہوں اور میں ان کا مصداق نہیں ہوں بلکہ یہ کہے کہ یہ مجھ سے مخاطِب ہیں اور اپنے اندر غور وفکر کرے کہ جن چیزوں کی قرآن مذمت کر رہا ہے، نفی کر رہا ہے اور جن پر عذابِ دنیوی، عذابِ اخروی وخزیِ اخروی کا تذکرہ ہے کہیں میں تو ان کا مصداق نہیں ہوں یعنی اپنے آپ کو ان

آیات کا مخاطَب سمجھے کہ یہ میرے لئے آئی ہیں۔

بعض بزرگان سے منقول ہے کہ وہ قرآن پڑھتے ہوئے باآینکہ توحید میں ایک مقامِ رسوخِ عظیم تک پہنچے ہوئے تھے، متبلغ اور متولغ در توحید تھے لیکن اس کے باوجود جب وہ آیاتِ شرک میں پہنچتے تھے تو خدا سے آرزو کرتے تھے کہ خدایا مجھے شرک سے بچانا اور اگر میرے دل میں کہیں لامحسوس شرک کا شائبہ بھی ہے تو اسے میرے دل سے خارج فرما۔ اسی طرح سے اگر کہیں منافقین کی مذمت میں آیت آجاتی ہے تو انسان اپنے آپ کو مخاطَب سمجھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفاق کا کوئی شائبہ یا نفاق کا کوئی اثر میری ذات میں موجود ہو، خداوند تبارک وتعالیٰ سے آرزو اور دعا کرے کہ اگر نفاق میرے دل میں ہے تو اس کو میرے دل سے نکال دے، اسی طرح سے قرآن نے بعض مصادیق کے ساتھ اور بعض افراد کے ساتھ یا بعض قوموں کے قصص اور حالات کے ضمن میں بہت ساری اخلاقی پستیوں اور رذائل کا ذکر کیا ہے، ان اخلاقی پستیوں اور رذائل کے تذکرے میں اپنے آپ کو مُخاطَب سمجھے کہ کہیں ان کا مصداق میں نہ ہوں اور اگر خدانخواستہ میں ہوں تو خداوند تبارک وتعالیٰ مجھے ان رذائل اور ناپاکیوں سے منزہ فرمائے۔

۲) تولا و تبرا، انسانِ سالک کے دو پَر

درحقیقت جس طرح تولی ہے اسی طرح سے تبری بھی ہے یا تولّا و تبرّا دونوں باہم ہیں، تولّا کسی چیز کی قربت کو کہتے ہیں اور تبرّا کسی شے سے دوری کو کہتے ہیں یعنی دور ہونا تبرا ہے اور قریب ہونا

تولا ہے۔قرآن بھی مطلقاً ایسے ہے، انسان بارگاہِ قرآن میں ہو یا نہ ہو، عبادت کے اندر ہو یا نہ ہو لیکن ہر حال میں یہ دونوں چیزیں باہم انسان کے پاس ہیں، گویا ارتقاء وتکامل کے لئے انسان کے پاس تولا وتبرا دو پَر ہیں یعنی ایک طرف سے قرب اور دوسری طرف سے دوری، یہ لازم وملزوم ہیں، چونکہ انسان جب کسی کے قریب ہوتا ہے تو خوانخواہ کسی سے دور ہوتا ہے مثلاً اگر ہم حرم کے قریب ہورہے ہیں تو گھر سے یقیناً دور ہورہے ہیں، اگر گھر کے قریب ہورہے ہیں تو حرم سے دور ہورہے ہیں۔

جب ہم ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے ہیں تو عملاً تولا وتبرا کررہے ہوتے ہیں، فرض کریں اگر ہم مشہد جارہے ہیں اور مشہد کے قریب تر ہورہے ہیں تو اپنے دیار ووطن سے دوری اختیار کررہے ہیں، یہ عملی تبرا اور تولا ہے چونکہ اس کے بغیر سفر ممکن نہیں ہے، جب تک انسان کسی سے دور نہ ہو تو کسی اور کے قریب نہیں ہوسکتا ہے، خداوند تبارک وتعالیٰ کی قربت بھی بہت ساری چیزوں کی دوری پر موقوف ہے، اگر ہم بہت سارے امور سے دور نہ ہوں تو خداوند تعالیٰ کے قریب نہیں ہوسکتے ہیں یعنی جب تک ہم نے ہوئی کے وہ بت جو اپنے اندر یا باہر بنا رکھے ہیں انہیں مسمار نہ کریں، ان سے دوری اختیار نہ کریں تو قربِ خدا ممکن نہیں ہے، شرک کے اوپر اسی لئے قرآن کی حساسیت ہے کہ شرک تولا نہیں ہونے دیتا ہے بلکہ انسان کو تبرا کی طرف لے جاتا ہے یعنی خدا سے دور کردیتا ہے اور اسی لئے خداوند نے فرمایا کہ خدا بھی مشرکین سے دور ہے۔ یہ بُعدِ طرفینی ودوری طرفینی ہے۔

۳)عبادات میں سفرِ قربی و سفرِ بُعدی

جب انسان راہِ خدا و سبیلِ خدا میں جاتا ہے تو یہاں بھی تولا اور تبرا ہے، سبیلِ خدا میں جانے کے لئے بہت سارے راستے ترک کرنا پڑتے ہیں، کئی راستے یعنی سبل ہیں جو سبلِ شیاطین ہے، قرآن مجید کی تعبیر اور اصطلاح کے مطابق خطواتِ شیاطین ہیں، ان سارے خطوات کو، ان ساری گلیوں، کوچوں کو ترک کرنا پڑتا ہے اور فقط ایک گلی و سبیلِ خدا انتخاب کرنا پڑتی ہے، جب انسان دوسری گلیوں کو چھوڑتا ہے تو اس وقت تبرا کرتا ہے اور جب سبیلِ خدا پر آجاتا ہے تو اس وقت تولا کرتا ہے۔ عبادتوں کے اندر بھی ایسے ہی ہے، عبادت بھی ہم قربۃً اِلی اللہ انجام دیتے ہیں، ہم فقط ایک حرکتِ قربی انجام دیتے ہیں جبکہ حرکتِ قربی کے لئے حرکتِ بُعدی انجام دینا بہت ضروری ہے، اگر ہم بعدی حرکت انجام نہ دیں تو قربی حرکت ہم سے سرزد نہیں ہوسکتی ہے یعنی ہم دیگر چیزوں سے دور ہوئے بغیر نماز میں آکر کھڑے ہوجاتے ہیں، تبرا کے بغیر تولا کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے قرب حاصل نہیں ہوتا ہے لہٰذا نماز کی حالت میں بھی انسان ذہنی طور پر انہی چیزوں میں مشغول و مصروف رہتا ہے کہ جہاں خارج از نماز ذہنی طور پر مشغول تھا۔ ذہنی طور پر گھر میں ہے، ذہنی طور پر معمولات میں ہے، ذہنی طور پر دکان میں ہے، ذہنی طور پر حساب و کتاب میں مشغول ہے، ذہنی طور پر اپنی پریشانیوں، مشکلات اور اپنی ذات میں مشغول ہے، اسی لئے ہم ہجرت نہیں کرپاتے۔

٤)انسان هجرت کیوں نهیں کرپاتا؟

خداوندِ تبارک تعالیٰ کی طرف سفر یعنی تولا کا سفر ہجرت کہلاتا ہے۔ ہجرت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان دوسری ساری چیزوں کو ترک و مہجور کردے اور پھر خدا کی طرف متوجہ ہو ورنہ ممکن نہیں ہے کہ انسان تبرا کئے بغیر تولا حاصل کرلے۔ بعض نے تبرا اور تولا کو بہت رسوا کر دیا ہے اور ان کو بہت ہی ادنیٰ اور گھٹیا سطح پر اتار دیا ہے کہ جیسے دیگر معارفِ دینی کے ساتھ بھی یہی اتفاق ہوا ہے کہ انہیں اپنے مقامِ شامخ سے گرا کر بہت نیچے لے آئے ہیں اور ان کو بہت ہی پست و گھٹیا معانی کے اندر یا گھٹیا مصادیق کے اندر استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح سے تولا اور تبرا کے ساتھ بھی یہ کام کیا ہے، درحالیکہ تولا و تبرا بہت ہی عالی و شامخ معارف دینی میں سے ہیں اور تمام معارفِ دینی متصف بہ تولا و تبرا ہیں، قرآن پڑھنے میں تبرا و تولا ہیں، کسبِ معرفت میں تولا و تبرا ہیں، توحیدِ عملی میں تولا و تبرا ہیں، سلوکِ عرفانی میں تولا و تبرا ہیں اور حقیقت شناسی میں تولا و تبرا ہیں۔

جب تک انسان باطل سے برائت نہ کرے تو حق کے قریب نہیں ہوسکتا ہے، ممکن نہیں ہے کہ ایک فیلسوف اور ایک حقیقت شناس تولا و تبرا کے بغیر درست جہان بینی تک پہنچ سکے یعنی باطل سے دور ہو اور حق تک پہنچے، انسان حق تک اس وقت پہنچتا ہے کہ جب باطل سے تبرا کرے اور اسی طرح سے معاشرت میں بھی تولا و تبرا ہیں کہ جب تک انسان معاشرتی مسائل میں برائیوں سے تبرا نہ کرے تو اس وقت تک خوبیوں کی طرف تولا نہیں ہوتا ہے، اچھائیوں کے قریب نہیں ہوسکتا ہے، ہمیں آرزوئیں بہت ہیں یعنی امانی بہت ہیں، قرآن کی تعبیر کے مطابق ہماری امانی ہیں، آرزوئیں ہیں کہ

ہم اچھے ہو جائیں لیکن اچھے ہوتے نہیں ہیں، کیوں نہیں ہوتے؟ چونکہ تبرا نہیں کرتے ہیں، یعنی چہ؟ یعنی برائیوں سے دور نہیں ہوتے ہیں، برائیوں میں رہتے ہوئے اچھا ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اس غلاظت میں رہتے ہوئے پاک ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جہالت میں رہتے ہوئے عالم ہونے کی کوشش کرتے ہیں، گمراہی میں رہتے ہوئے ہدایت کی کوشش کرتے ہیں درحالیکہ ہدایت تولا وتبرا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۵)تولا و تبرا کی وسعت

پس یہ ایک وسیع چیز ہے، انسان کی زندگی میں، ہدایت میں، علم میں، عمل میں، معرفت میں، عبادت میں، قرآن پڑھنے میں اور ہر میدان میں تولا وتبرا انسان کے سلوک کا حصہ ہے یعنی تولا و تبرا انسان کے سلوک کی صفات ہیں، کسی بھی سلوک کے اندر بالآخر یہ دو صفات ہونا بہت ضروری اور لازم وملزوم ہیں یعنی تولا بلا تبرا فقط ایک فرضِ محض ہے اور تبرا بلا تولا بھی ایک فرضِ محض ہے، قربِ خدا ان کے بغیر ممکن نہیں ہے یعنی قرب اس وقت ہوتا ہے جب بُعد بھی ہو، کسی سے دوری باعث بنتی ہے کہ انسان کسی کے قریب ہو مثلاً جب انسان زمین سے زمین کا سفر کرتا ہے تو وہاں یہ دونوں صفات کاملاً روشن ہوتی ہیں مثلاً آج ہم حوزۂ علمیہ میں ہیں تو کہیں سے دور ہوئے ہیں اسی لئے یہاں سے قریب ہوئے ہیں اور جب حوزے سے دور ہوں گے تو کسی اور جگہ کے قریب ہوں گے، یہ تمام انسانوں کی زندگی میں ہے۔

منتہیٰ جو چیز انسان کے لئے مہم ہے اور اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان یہ تعین کرے کہ مجھے قرب کے لئے کن کن چیزوں کو چھوڑنا چاہئے مثلاً عالم بننے کے لئے مجھے تولا چاہئے یعنی مجھے اجتہاد کے قریب ہونا ہے، مجھے دین شناسی کے قریب ہونا ہے، مجھے ایک اچھا قرآن شناس بننا ہے اور مجھے ایک اچھا خداشناس بننا ہے تو اس کے لئے مجھے بہت ساری چیزوں سے تبرا کی ضرورت ہے۔

اکثر لوگ اپنی عمریں حوزوں میں صرف کردیتے ہیں، دینی مدارس میں صرف کردیتے ہیں لیکن کسی مقامِ عالی علمی تک فائز نہیں ہوتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تولا و تبرا کے بغیر یہ کام کرتے ہیں یعنی مقاماتِ اعلیٰ علمی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں درحالیکہ جو موانع ہیں ان سے تبرا نہیں کرتے ہیں، ان موانع کے نزدیک ہیں، ان کے تعلقات بھی ہیں، ان کی مشغولیاتِ غیر علمی بھی ہیں، ان کے غیر علمی دغدغے اور کھٹکے بھی ہیں، مادیت پرستی بھی ان کے اندر موجود ہے، جہاں طلبی، شہرت پرستی، عوام زدگی بھی موجود ہیں اور درعین حال یہ بھی چاہتا ہے کہ میں ایک اچھے علمی مقام پر بھی پہنچ جاؤں لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں آپس میں جمع ہوسکیں۔

٦) اپنی حول و قوت سے تبرا

پس ہر تولا کے لئے ایک تبرا کی ضرورت ہے، تالیِ قرآن جب اپنا ہاتھ قرآن کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور پھر قرآن انسان کا ہاتھ تھام کر اس کو خدا کی طرف لے جاتا ہے تو اس کے لئے بھی تبرا کی ضرورت ہے، یہاں تبرا کیا ہے؟ یعنی انسان اب یہ نہ کہے کہ میں صالحین میں سے ہوں، پس

صالحین میں سے ہوں لہٰذا انسان کو ضرورت نہیں ہے کہ کوئی حرکت کرے اور آگے بڑھے، اس چیز سے تبرا کرے کہ میں ابھی کامل ہوں، انسان اپنے آپ کو کامل نہ سمجھے البتہ تبرا کے کئی میدان ہیں، یہ فقط قرآن میں ہی نہیں ہے بلکہ ہر میدان میں ہے ان میں سے سب سے پہلا میدان یہ بیان فرماتے ہیں کہ اپنی حول وقوت سے سب سے پہلے تبرا کرے مثلاً ادبِ قیامِ نماز کے اندر بتایا گیا ہے کہ کہے

بِحَوْلِ اللّٰہِ وَقُوَّتِہٖ اَقُوْمُ وَ اَقْعُدُ،

یعنی میرا یہ قیام اور قعود اللہ کی دی ہوئی قوت سے ہے، البتہ یہ بعنوانِ نمونہ ہے نہ کہ فقط قیام وقعود کیلئے ہے بلکہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ٥(١)

کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری عبادتیں، میری زندگی، میری موت، سب اللہ کے لئے ہے جو عالمین کا پالنے والا ہے۔

اپنی حول وقوت سے تبرا

یعنی میری پوری زندگی، حرکات وسکنات اور میری ہر چیز میں میری اپنی کوئی حول وقوت نہیں ہے، اپنے حول وقوت پر اعتماد نہ کریں، حول وقوت یعنی اپنی طاقت، اپنی توانائی، اپنی زحمت اور اپنی کوشش کو کبھی موثر نہ سمجھے بلکہ اس سے برائت کرے، اگر چاہتا ہے کہ کسی مقامِ اعلیٰ معنوی تک پہنچے تو سب سے پہلے اپنے حول وقوت سے اظہارِ برائت کرے کہ میں ان سے اظہارِ بیزاری کرتا ہوں اور حول وقوۃِ خداوند تبارک وتعالیٰ پر بھروسہ کرے، عملاً بھروسہ کرے نہ کہ فقط زبان میں تلفظ کرے یعنی نماز کی حالت میں فقط زبان سے یہ الفاظ ادا کر دے کہ

بِحَوْلِ اللهِ وَقُوَّتِهِ اَقُوْمُ وَ اَقْعُدُ،

بلکہ عملی زندگی میں بھی ایسا ہی ہو کہ انسان اپنے حول وقوۃ پر بھروسہ اور تکیہ نہ کرے، روایات میں وہ قسم کہ جس کے خلاف ممکن نہیں ہے کہ کوئی چیز ثابت ہو سکے وہ اسی کے بارے میں ہے، اول تو قسم تک نوبت نہ پہنچے لیکن بالفرض اگر ایسا مُعانِدْ موجود ہے اور قسم تک نوبت آ گئی ہے تو بسا اوقات ہوتا ہے کہ لوگ سادگی سے اللہ کی قسم کھا لیتے ہیں، قرآن کی قسم کھا لیتے ہیں یا مقدسات میں سے کسی اور چیز کی قسم یاد کر لیتے ہیں لیکن روایات کے مطابق اگر کسی کو قسم دینی ہے اور پھر عملاً اس قسم کا اثر بھی دیکھنا چاہتے ہو تو اس کو یہ قسم دو یعنی اسے کہو کہ اگر میں نے یہ کام کیا ہے یا اگر میں ایسا ہوں کہ جیسے آپ کہہ رہے ہیں تو تم یہ قسم کھا کر کہو کہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ کی حول وقوۃ سے بری ہوں یعنی خدا کی حول وقوۃ مجھ سے سلب ہو جائے اور میں اپنے حول وقوۃ پر اعتماد کروں گا، پھر ممکن نہیں ہے کہ یہ قسم رد ہو جائے اور اس کا نمونہ بھی موجود ہے۔

الٰہی حول وقوت سے تبرا

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو جب اپنے ہی قریبیوں میں سے بعض نے متہم کیا، ان کی جاسوسی کی اور دربار میں جا کر ہارون سے کہا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہارون کو برا بھلا کہا ہے تو اس نے امام علیہ السلام کو دربار میں بلانے کے لئے غلام بھیجا اور پوچھا کہ فلاں نے آپؑ کی شکایت کی ہے، امام علیہ السلام نے جو کچھ کہنا تھا سامنے ہی کہہ دیا، کہا کہ مجھے تیری پیٹھ پیچھے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ابھی بھی تجھے صحیح انسان نہیں سمجھتا ہوں، تو عادل حکمران نہیں ہے اور یہ تیرا حق نہیں ہے، اور بھی جو کچھ کہنا تھا منہ پہ کہہ دیا پھر فرمایا کہ میں نے اس طرح سے نہیں کہا ہے کہ جیسے اس شخص نے تجھے

خبر دی ہے، وہ شخص بھی موجود تھا چونکہ وہ ہارون کا قرب چاہتا تھا، ہارون نے اس کو بلایا اور کہا کہ گواہی دیتے ہو کہ موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہمارے بارے میں یہ بات کی ہے؟ اس نے فوراً جھوٹ کہہ دیا کہ ہاں میں شہادت دیتا ہوں، میں گواہ ہوں کہ انہوں نے یہ بات کی ہے، حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ سچ کہہ رہا ہے تو قسم کھائے، اس کو تھوڑا سا تردد ہوا لیکن اُدھر سے جان کا خوف بھی تھا اور اگر قسم نہیں کھاتا تو جھوٹا کہلاتا لہٰذا حاضر ہو گیا اور اس نے فوراً کوئی رائج قسم کھالی، اس کے بعد ہارون نے کہا کہ اب تو اس نے قسم بھی کھالی ہے، امام علیہ السلام نے فرمایا کہ جس طرح سے میں اس کو قسم دوں گا یہ وہ قسم کھائے، امام علیہ السلام نے اس کو قسم دی اور قسم یہی تھی کہ تم یہ قسم کھاؤ کہ اگر میں اس گواہی اور شہادت میں کہ جو میں نے دی ہے جھوٹ بول رہا ہوں تو خدا اپنی حول وقوۃ مجھ سے سلب کردے اور میں اپنی حول وقوۃ سے اٹھوں اور بیٹھوں گا، چونکہ اس جھوٹے اور کاذب شخص کو بھی معلوم تھا کہ اس نے امام علیہ السلام پر جھوٹ اور اختراع باندھا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے سوچا کہ شاید پہلے والی قسم کی طرح اس کا اثر بھی زائل ہو جائے گا اور اس کو ہارون کی شمشیر کا بھی خطرہ تھا لہٰذا اس نگوں بخت نے یہ قسم کھالی، اب ہارون نے کہا کہ جو قسم آپ نے دی تھی اس نے وہ بھی کھالی ہے۔

اپنی حول وقوت سے تبرا

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اب مجھے قبول ہے، اب آپ اسے یہاں سے لے جائیں، ہارون نے اسے حکم دیا کہ چلے جاؤ لیکن وہ نہیں ہلا، بالآخر وہ شہنشاہی اور پادشاہی جلال میں آیا اور زیادہ سختی کے ساتھ کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، بعد میں غصے میں آکر اس نے درباریوں کو بلایا اور کہا کہ اسے لے جا کر باہر پھینک دو، انہوں نے جتنا زور لگایا لیکن وہ اسے وہاں سے اٹھا ہی نہ سکے، وہ وہیں پر

خشک ہوگیا تھا، نہ اس کے ہاتھ پاؤں ہلتے تھے، نہ اس کے جسم میں کوئی حرکت تھی اور نہ ہی اسے کوئی ہلا سکتا تھا، کیوں؟ چونکہ خدا نے اپنی حول وقوۃ اس سے وہیں سلب کر لی تھی، اب اسے اپنے حول وقوۃ سے چلنا تھا، اپنے حول وقوۃ سے حرکت کرنی تھا، پس انسان حول وقوۃِ خدا پر بھروسہ کرے اور اپنے حول وقوۃ سے برائت کا اعلان کرے ورنہ یہ قارونیت ہے۔

۷)قارونِ علمی نہ بنیں

قارون سے جب لوگوں نے کہا کہ تجھے خدا نے اتنا مال دیا ہے لہٰذا اسے خدا کی راہ میں خرچ کرو، اِس وقت بھی ہزاروں لاکھوں قارون موجود ہیں کہ جن کے پاس خدا کا دیا ہوا فراواں مال موجود ہے اور اگر انہیں کہا جائے کہ خدا کا دیا ہوا خدا کے لئے خرچ کرو تو یہ حاضر نہیں ہیں، قارون نے کیا جواب دیا؟

قَالَ اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ...... (۲)

قارون نے کہا کہ مجھے یہ سب کچھ میرے علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے......

یعنی یہ میری اپنی کوششوں، میری اپنی مشقتوں، میری اپنی زحمتوں اور خون پسینے بہانے کا نتیجہ ہے، یہ میرے اپنے حول اور قوۃ کا نتیجہ ہے، یہی قارونیت ہے، اگر ایک شخص کے پاس مال ہو اور پھر کہے کہ یہ میری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے تو یہ قارون ہے، یہ متبری انسان نہیں ہے، اس نے اپنے حول وقوۃ سے برائت نہیں کی ہے، اگر عالم ہے اور اس سے پوچھو کہ آپ اس مقامِ علمی تک کیسے پہنچے

تو وہ بتانا شروع کر دیتا ہے، میں چھوٹا سا تھا، میں بہت ذہین تھا اور اسکول میں اول آیا کرتا تھا، پھر کالج میں اول آیا کرتا تھا، مدرسے میں اول آتا تھا، میں بہت محنت کرتا تھا، میں یہاں بھی پڑھتا تھا وہاں بھی پڑھتا تھا یعنی سب میں ''میں'' ہے کہ میں ایسا تھا، میں ویسا تھا لیکن کہیں بھول کے بھی اس کی زبان سے ادا نہیں ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اگر کوئی شخص پوچھتا کہ اس عظیم مقام تک کیسے پہنچ گئے؟ تو ایک دفعہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ میں غاروں میں بیٹھتا تھا، میں محنتیں، ریاضتیں اور عبادتیں کرتا تھا اور اس طرح یہاں پر پہنچ گیا بلکہ خداوند تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر کسی کو بتانا ہے تو کیا بتاؤ؟

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ (۳)

کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر پناہ دی؟ اور اس نے آپ کو ناواقف پایا تو آپ کو راستہ دکھایا؟ اور آپ کو تنگدست پایا تو مالدار کر دیا۔ لہٰذا اب یتیم کی توہین نہ کریں۔ اور سائل کو جھڑکی نہ دیں۔ اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کریں۔

لوگوں کو یہ بتاؤ کہ میں کیسے اس مقام تک پہنچا، یعنی میں کچھ بھی نہیں تھا، میں فقیر تھا اور خدا نے مجھے غنی بنا دیا، میں یتیم تھا اور خدا نے مجھے نبی بنا دیا، میں کچھ بھی نہیں تھا اور خدا نے مجھے سب سے افضل بنا دیا، لوگوں کو یہ بات بتاؤ کہ یہ خدا نے مجھے بنا دیا ہے۔

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کریں۔

نہ کہ اپنے کمالات، اپنی محنتیں، اپنی زحمتیں اور اپنی کوششیں لوگوں کو بتاؤ کہ یہ عینِ شرک ہے، قارونِ علمی وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں کہ یہ سب ہمارا اپنا حاصل کیا ہوا ہے، یہ متبری انسان نہیں ہیں، یہ متولی بھی نہیں ہیں، ان کے اندر تولا بھی نہیں ہے یعنی یہ کبھی بھی قریب نہیں ہو سکتے ہیں، یہ لوگ معرفت کے ذریعے اور عمل کے ذریعے بھی خدا کے قریب نہیں ہو سکتے ہیں، قرآن مجید نے اس مطلب کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جب تک انسان تبری نہ کرے تو وہ کہیں بھی نہیں پہنچ سکتا ہے، سورۂ مبارکہ یوسفؑ میں اگرچہ بزبانِ حضرت یوسف علیہ السلام اس کو ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ مطلب عمومی ہے، سورۂ مبارکہ یوسفؑ میں ہے کہ

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ إِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۴)

اور میں اپنے نفس کو بھی بری قرار نہیں دیتا کہ نفس بہر حال برائیوں کا حکم دینے والا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے کہ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ......

یعنی میں اپنے نفس کو منزہ نہیں سمجھتا ہوں، یعنی یہ نہیں کہتا ہوں کہ میں پاک انسان ہوں، میں بڑا پرہیزگار انسان ہوں، میرے اندر کوئی نقص نہیں ہے،

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ......

یعنی نفسِ امارہ ہمیشہ انسان کو سوء کی طرف مائل رکھتا ہے، ہمیشہ انسان کو غلطی کی طرف، انحطاط و پستی کی طرف مائل رکھتا ہے،

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ......

مگر یہ کہ جو مرحوم ہو، جو مصداقِ رحمتِ خدا ہو، رحمتِ خدا جس کے شاملِ حال ہو جائے، ورنہ اگر خدا نے کسی سے اپنی رحمت لے لی اور اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، اپنے نفس کے حوالے کر دیا تو یہ انسان تباہ ہے۔

۸) جسے خدا اپنے حال پہ چھوڑدے وہ مغضوب ہے

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں دو شخص مبغوض ترین اور مغضوب ترین ہیں، ان میں سے ایک وہ شخص ہے کہ

رَجُلٌ وَ کَلَهُ اللّٰهُ اِلٰی نَفْسِه...... (۵)

ایسا مرد جسے خدا نے اس کے حال پہ چھوڑ دیا ہے......

جسے خدا نے اس کے نفس کے حوالے کر دیا ہے، اس کی ضمام اسی کو تھما دی ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ میں نے ایسا کیا، میں نے ویسا کیا تو پھر خدا اس کی ضمام اسی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور یہ اسی علم کے ذریعے سے جہاں طلبی و خواہش پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے چونکہ خدا نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے لیکن جو کہتے ہیں کہ نہیں میں کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے خدا نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے تو پڑھ

لکھ کر بھی خدا اس کا حافظ اور نگہبان ہوتا ہے چونکہ انسان ہے بالآخر انسان معرضِ خدا میں اگر خطا بھی کرنا چاہے تو ایسے اسبابِ غیبی پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسے خطا سے روک دیا جاتا ہے، اسے ہلاک ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔

قارونِ علمی، قارونِ عملی اور مختلف میدانوں کے قارون موجود ہیں، یہ نہ کہیں کہ ہم نے اپنے بھروسے پر اور اپنی حول وقوۃ سے یا اپنی ذہانت وفطانت سے یہ سب مقام ومنصب حاصل کیا ہے۔ یہ سب قارونیت ہے، سب سے برا انسان بھی وہی ہے کہ جس کو خدا نے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہو۔ جسے خدا اسی کے نفس کے حوالے کردے، جس سے خدا اپنی رحمت روک لے اس کا کوئی ہادی و رہنما بھی نہیں ہے،

مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَیَذَرُھُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِھِمۡ یَعۡمَھُوۡنَ٥(٦)

جسے اللہ گمراہ کرے کوئی اس کی ہدایت کرنے والا نہیں اور اللہ ایسے لوگوں کو ان کی اپنی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

خدا اگر کسی کو اپنے حال پر چھوڑ دے، اضلالِ خدا یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت چھوڑ دی، اپنے حال پر چھوڑ دیا کہ دیکھیں یہ اپنے حول وقوۃ سے کیسے ہدایت پاتا ہے؟ چونکہ ماسوا اللہ کوئی ہے بھی نہیں، جس کو خدا اپنے حال پر چھوڑ دے تو وہ شخص اس دنیا میں حیران وسرگرداں اور پاگلوں سے بدتر ہو جاتا ہے لہٰذا ہمیں کہا بھی گیا ہے کہ خدا سے یہی دعا مانگو کہ

رَبَّنَا لَا تَکِلۡنَا اِلٰی اَنۡفُسَنَا طَرۡفَةَ عَیۡنٍ اَبَدًا......(٧)

جسے خدا اپنے حال پر چھوڑ دے وہ مغضوب ہے

یعنی اے میرے رب مجھے پلک جھپکنے کی حد تک بھی میرے اپنے حال پر نہیں چھوڑنا، چونکہ مجھ میں کوئی حول وقوۃ نہیں ہے، انسان میں کوئی حول وقوۃ نہیں ہے بلکہ سب خدا کی طرف سے ہے، پس انسان قرآن پڑھتے ہوئے پہلی برائت اپنے حول وقوۃ سے کرے، مغروروں کی طرح قرآن نہ پڑھے کہ میں کتنا اچھا قرآن پڑھتا ہوں؟ میں کتنا اچھا قرآن سمجھتا ہوں؟ میں قرآن کی کتنی اچھی تفسیر کرتا ہوں؟ یہ سب ''میں میں'' بیچ میں سے ہٹا دے، اپنے حول وقوۃ پہ اعتماد چھوڑ کر فقط خداوند تبارک وتعالیٰ کے حول وقوۃ پر اعتماد کرے تا کہ یہ سفر طے کر سکے اور قرآن سے اس کو کچھ حاصل ہو، عبادتوں سے کچھ حاصل ہو، علم ومعرفت سے کچھ حاصل ہو، خواہ نہ خواہ غیر اللہ یعنی خدا کے علاوہ کسی اور پر بھی بھروسہ نہ کرے یعنی کسی غیرِ خدا کے حول وقوۃ پر اعتماد نہ کرے، یہ نہ کہنا کہ فقط میں خود پر اعتماد نہیں کرتا ہوں لیکن خدا کے علاوہ کسی اور پر بھی اعتماد کرتا ہوں، کسی اور کے حول وقوۃ پر بھی اعتماد کرتا ہوں بلکہ یہاں پر بھی برائت کی ضرورت ہے، فقط حول وقوۃِ خدا، فقط فرصت وتوفیق کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے حاصل ہوگی میں اسی کی بنا پر کسی مقام تک پہنچ سکوں گا۔

برائت کا دوسرا مرتبہ

۹) برائت کا دوسرا مرتبہ

برائت کا ایک اور مرتبہ یہ ہے کہ انسان جب قرآن میں درجہ بہ درجہ ہمراہ با قرآن جاتا ہے جیسے کہ اشارہ ہوا کہ انسان درجہ بہ درجہ مترقی ہے، الفاظِ قرآن سے معانیٔ قرآن تک، معانیٔ قرآن سے حقائقِ قرآن تک اور پھر صفاتِ قرآنی تک درجہ بہ درجہ قرآن کے ہمراہ جاتا ہے، قرآن میں

انسان کو بہت ساری آیات سے سروکار پڑتا ہے لہٰذا قرآن نے جو فضائل ذکر کئے ہیں ان فضائل سے تبریٰ اختیار کرے، یعنی اپنے آپ کو ان فضائل کا مصداق نہ سمجھے، مثلاً جب یہ آیہ پڑھے کہ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ...... (۸)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ ان انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے......

تو یہ نہ کہے کہ

وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقًا٥

اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

یعنی میں منعم علیہم میں سے ہوں۔ میں صالحین، صدیقین اور مرسلین میں سے ہوں، جب جنت کا تذکرہ آئے تو یہ مجھے کہا جا رہا ہے، یہ سارے مقامات میرے لئے ذکر کئے ہیں، بلکہ یہاں سے تبریٰ کرے کہ میں ان کا مصداق نہیں ہوں البتہ خواہش مند ضرور ہوں، خدا سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سب مجھے حاصل ہو جائے لیکن میں ایسا ہوں نہیں اور اس کے بجائے جو آیاتِ سرزنش، آیاتِ مذمت اور آیاتِ عذاب و وعید ہیں یہاں اپنے آپ کو کہے کہ میں ان کا مصداق ہوں۔

۱۰)انسان اپنی معرفت پیدا کرے

صدرالمتالھینؒ یہاں پراس کے لئے ایک بہت خوبصورت مقدمہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ کلید اگر انسان کے ہاتھ آجائے، یہ چابی یہ نکتہ کہ جو یہاں پر اشارہ ہو رہا ہے یہ اسی مطلب کو سمجھانے کے لئے ہے کہ انسان تبریٰ کیوں کرے؟ انسان قرآن کے اندر، عبادتوں کے اندر، علم کے اندر اپنے آپ کو یہ نہ کہے کہ میں ان بہترین لوگوں، بافضیلت لوگوں اور میں اشرف المخلوقین کا مصداق ہوں، اس لئے کہ اگر انسان پہلے خود اپنی پہچان وشناخت کرلے تو پھر یہ ساری چیزیں میسر آتی ہیں مثلاً ابھی ہم کسی کے سامنے جاکر ترقی وتولیٰ وتبریٰ اور یہ سارے آدابِ قرآن بیان کریں لیکن ابھی تک اس کو انسان ہی سمجھ میں نہ آیا ہو، خود فراموش ہو، اسے یہ ہی معلوم نہ ہو کہ انسان کیا ہے؟ اور میں کیا ہوں؟ تو اس کے لئے یہ سب چیزیں لایعنی ہیں، بے معنی وفضول باتیں ہیں، اگر انسان اپنے آپ سے باخبر نہ ہو، خود شناس نہ ہو بلکہ خود فراموش ہو تو یہ ساری چیزیں اس کے لئے لایعنی ہوجاتی ہے حتیٰ معاذ اللہ قرآن اس کے لئے بے فائدہ اور بے معنیٰ ہوجاتا ہے، اکثریت قرآن سے اس طرح سے بے اعتنائی وچشم پوشی کرتی ہے کہ انسان تعجب کرتا ہے کہ اس طرح سے تو لوگ ایک معمولی کتاب حتیٰ ایک نیوز پیپر (Newspaper) سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے،

نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ٥(۹)

تو اہلِ کتاب کی ایک جماعت نے کتابِ خدا کو پسِ پشت ڈال دیا گویا کہ اسے جانتے ہی

نہیں......

کتاب خدا کو پسِ پشت ڈالا ہوا ہے، اخباروں، ڈائجسٹوں، فلموں، ڈراموں، انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلز کو اہمیت دیتے ہیں لیکن قرآن کی آیات اور قرآن کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ اس عالم میں تو دینی بھی نہیں چاہئے یعنی ایک معمولی چیز کی حد تک بھی اہمیت نہیں دیتے ہیں اور نہیں دینی چاہئے، کیوں نہیں دینی چاہئے؟ اس لئے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے، کتابِ انسان ساز ہے یعنی انسان بنانے والی کتاب ہے اس لئے اس کے اندر ٹریکٹر بنانے، موٹر سائیکل بنانے، انجن بنانے، جہاز بنانے اور خلائی شٹل بنانے کا تذکرہ کہیں بھی نہیں ہے، سب انسان سازی کیلئے ہے، جو کچھ قرآن نے ذکر کیا ہے وہ انسان بنانے کیلئے ہے۔ بارہا عرض ہوا ہے کہ جیسے آدابِ فہمِ قرآن ہے اسی طرح سے شناختِ قرآن بھی اپنی جگہ پر ایک الگ موضوع ہے کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، ہدایت سے متعلقہ ہر کوع اس قرآن کے اندر موجود ہے، ہر صغیر و کبیر اس کے اندر موجود ہے لیکن جو چیز ہدایت سے ہٹ کر ہے اور ہدایت سے تعلق نہیں رکھتی ہے تو قرآن نے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔

شناختِ انسان کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آتا ہے، قرآن نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے اور وہ ہے انسان شناسی، قرآن نے انسان کو انسان سمجھایا ہے، جب انسان کو انسان سمجھ آئے گا تو قرآن سمجھ میں آئے گا اور اس وقت دین بھی سمجھ میں آئے گا، یہ قانون ہے اور اس قانون کو سمجھ لیں، یہ قاعدۂ عامہ سب کے لئے ہے، وہ یہ ہے کہ جو چیز بھی انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ چیز کبھی بھی سمجھ میں نہیں آئے گی، مثلاً جو قانون انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ قانون

سمجھ میں نہیں آسکتا ہے، جو ہدایت انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ ہدایت سمجھ میں نہیں آسکتی ہے، جو کتاب انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ کتاب سمجھ میں نہیں آسکتی ہے، جو ضابطہ انسان کے بارے میں ہو تو انسان سمجھے بغیر وہ ضابطہ سمجھ میں نہیں آسکتا ہے۔ پہلے ہمیں انسان سمجھنا پڑے گا، آغاز اسی خودشناسی سے کریں،

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......(۱۰)

جس نے اپنے آپ کو پہچانا بتحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا......

درحقیقت انسان خود نقطۂ آغازِ معرفتِ عالم ہے، خود اپنے آپ سے شروع کرے تو پھر اس کو ساری دنیا سمجھ میں آجائے گی، خداوند تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا......(۱۱)

جس نے زمین کے تمام ذخیروں کو تم ہی لوگوں کے لئے پیدا کیا ہے......

لیکن یہ سب کچھ تمہیں تب سمجھ میں آئے گا جب پہلے خود کو سمجھو گے،

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ○(۱۲)

اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی بھلا دیا اور وہ سب واقعی فاسق وبدکار ہیں۔

یعنی ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ کہ جو اپنے آپ کو بھول گئے ہیں، پھر سب چیزوں کو بھول گئے ہیں، اپنے آپ کو پہچانو پھر دیکھو کہ رازِ ہستی تمہیں کس طرح سے سمجھ میں آتا ہے، کس طرح

سے اسرارِ نظام اور اسرارِ نظامِ ہستی اور عالمِ ہستی کھل کھل کر تمہارے سامنے آئیں گے۔

آپ نقطۂ آغاز سے سمجھیں کہ جیسے بچوں کے لئے یا سب کے لئے ایک تعلیمی سلیبس ہوتا ہے، سب سے پہلے کیا پڑھیں؟ سب سے پہلے الف ب پڑھیں مثلاً مدرسوں میں سب سے پہلے کہاں سے پڑھیں؟ کیا عربی مقدمات سے پڑھیں؟ یہ آغاز ہے؟ نہیں، بلکہ انسان اپنا سفر اپنے آپ سے شروع کرے، اپنی شناخت سے شروع کرے۔

۱۱)انبیاء علیہم السلام انسان کو انسان بنانے آئے ہیں

وہ کام انبیاء علیہم السلام نے بھی نہیں کیے کہ جو کام بشر خود اپنے تجربے سے، علم سے، زحمت سے، محنت سے، انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر کرسکتا ہے مثلاً یہ انکشافات، یہ ایجادات انبیاء کا کام نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام اسی سرزمین پر رہے، اسی مشرقِ وسطیٰ، مڈل ایسٹ (Middle East) میں رہے لیکن انبیاءؑ نے تیل نہیں نکالا، اس مڈل ایسٹ میں اسی زمانے سے تیل موجود تھا لیکن انبیاء علیہم السلام کو تیل سے سروکار نہیں تھا، اصلاً خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو پٹرولیم نکالنے کے لئے مبعوث نہیں کیا تھا، کیوں نہیں کیا تھا؟ چونکہ پٹرولیم وہ چیز ہے کہ انسان علم ومہارت سے ترقی کرے گا اور ایک دن پٹرولیم نکال لے گا اور چلنے والی گاڑیاں اور مشینیں بھی بنا لے گا، وہ تجربہ کرتے ہوئے اجتماعی طور پر ایک دن یہاں پہنچ جائے گا لہٰذا جو کام چند آدمی مل کر کرسکتے ہیں اسی کام کو کرنے کے لئے آسمانوں سے بھی لوگ مبعوث کیے جائیں تو یہ کام عبث ہے اور خداوند نے فرمایا کہ ہمارا کوئی کام باطل اور عبث نہیں ہے۔

مثلاً ایک آدمی ایک کام کر رہا ہے، آپ اس سے کہیں کہ آغا مجھے دیں میں کرتا ہوں، حالانکہ آپ کو وہ کام کرنا چاہیئے جو وہ نہیں کر سکتا ہے، عموماً ہم ان ہی لوگوں کی مدد کرتے ہیں مثلاً کسی بڑی شخصیت نے ہاتھ میں کتاب اٹھائی ہوئی ہے تو کہتے ہیں کہ آغا یہ کتاب مجھے دے دیں میں اٹھالوں گا، ادھر ہی ساتھ ایک اپاہج اور معذور انسان بیٹھا ہوا ہے کہ جس کے پاس سامان ہے اور وہ روڈ کراس (Cross) کرنا چاہے تو اسے جا کر نہیں کہتا ہے کہ مجھے اپنا صندوق دے دیں، آپ زحمت میں ہو اسے میں اٹھا لیتا ہوں۔ کسی شخصیت کی کتاب اٹھالیں گے، انہیں کہیں گے کہ یہ پین (Pen) آپ کی جیب میں بھاری ہے، مجھے دیں یہ پین میں اٹھاؤں گا، جو کام وہ نہیں کر سکتا ہے آپ وہ کام کریں۔

خداوند تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام عبث نہیں بھیجے تھے یعنی ان کاموں کے لئے نہیں بھیجے تھے کہ جو کام انسان خود کر سکتا ہو، کسی نبی نے گھڑی نہیں بنائی، کسی نبی نے یہ مشینیں ایجاد نہیں کیں چونکہ خود بشر نے یہ کام کر لیا، بالآخر کھیتی باڑی انبیاء علیہم السلام نے نہیں سکھائی چونکہ بشر نے یہ کام خود کرنا ہے، آخر انسان کو مفت خورہ تو نہیں بنانا ہے کہ سب کام انبیاء علیہم السلام آ کر کر دیں اور یہ شہزادہ ہر تیار شدہ چیز سے لطف اٹھائے، ہر چیز اس کے منہ میں جائے بلکہ انسان یہ کام خود کرے، انڈسٹری خود لگائے، زراعت خود کرے، کھیتی باڑی خود کرے، تعلیم خود حاصل کرے اور اگر اس کے سامنے سب کچھ انجام شدہ لا کر رکھ دیں تو یہ ترقی نہیں کرے گا، علم حاصل نہیں کرے گا۔ حتماً اس کو صفر کی حالت میں چھوڑ دیں اور غیر منکشف دنیا بنا کر اس کے سامنے رکھ دیں تو یہ ترقی کر سکتا ہے۔

بچوں کی تربیت میں بھی یہ چیز اہم ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جو بچوں کے تسمے بھی باندھتے ہیں، بچوں کی شلواریں بھی باندھتے ہیں، بچوں کے بٹن بھی باندھتے ہیں، بچوں کے منہ میں کھانا بھی ڈالتے ہیں اور جب اسی بچے کی مونچھیں نکل آتی ہیں تو اس وقت .اس کو روٹی بھی توڑنا نہیں آتی ہے، اس وقت بھی اس کو کوئی کام نہیں آتا ہے، اس وقت بھی وہ بوٹ کا تسمہ نہیں باندھ سکتا ہے، یہ پتلون کی بیلٹ بھی نہیں باندھ سکتا ہے بلکہ ماں سارے کام کرتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام اس طرح کے لاڈلے، بے خاصیت، ارزاں اور بے ہنر افراد پالنا نہیں چاہتے تھے، انبیاء علیہم السلام نے کیا کیا؟ لوگوں کی تربیت کی، بچوں کی تربیت اس طرح کرو کہ ان میں خلاقیت پیدا کرو، بچے کو جوتا دے دو اور اسے کہو کہ خود پہنو، بچے کو لباس لا کر دے دو اور کہو کہ اس کو خود پہنو، بچے کے سامنے کھانا رکھ دو اور کہو کہ اس کو خود کھاؤ، بچے کے سامنے مجہول دنیا رکھ دو اور اسے کہو کہ اس مجہول دنیا کو تو نے خود کشف کرنا ہے، یہ بچے کے اندر خلاقیت پیدا کرنا ہے لیکن جن بچوں کو ہم خود ساری دنیا کشف کر کے دے دیتے ہیں وہ آخر تک والدین کے اوپر بوجھ رہتے ہیں، ان کو بڑھاپے تک کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے، بہت سارے ایسے ہیں کہ جن کو معمولی کام بھی کرنے نہیں آتے ہیں، چھوٹے موٹے کام، کچن (Kitchen) کے کام بھی کرنا نہیں آتے ہیں، کیوں نہیں آتے ہیں؟ اس لئے کہ یہ لاڈلے ہیں، لُوس ہیں، ان کو والدین نے سب کچھ کر کے دیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام انسانوں کو لوس بنانے نہیں آئے، انبیاء علیہم السلام انسانوں کو بے خاصیت بنانے نہیں آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام انسانوں کو متحرک کرنے کے لئے آئے اور ہنر مند بنانے کے لئے آئے، اس

لئے خدا نے مجہول دنیا ان کے سامنے رکھی کہ جا کر کوشش کرو، اس زمین کے اندر راز ہیں، اس زمین کے اندر بہت کچھ ہے، زمین کے اندر اور زمین کے باہر فضاؤں کو کشف کرو، اگر یہ سب کام ادیان کر کے دیتے تو انسان بے خاصیت ہوتا، پھر انبیاء علیہم السلام کس لئے آئے ہیں؟ انبیاء علیہم السلام اس کام کے لئے آئے ہیں کہ اگر جن وبشر، ساری کائنات اور سارا عالم حتیٰ ملائکہ علیہم السلام اور ساری دنیا مل کر بھی وہ کام کرنا چاہیں تو یہ نہیں کر سکتے ہیں اور وہ کام انسان سازی ہے۔

انبیاء علیہم السلام انسان کو انسان بنانے آئے ہیں

انسان انبیاء علیہم السلام کے بغیر نہیں بن سکتا ہے، اس وقت بھی نہیں بن سکتا تھا اور آج بھی اگر انسان بنے گا تو مکتبِ انبیاء علیہم السلام سے بنے گا، آسمانی کتب کے ذریعے سے بنے گا، تعلیماتِ الٰہی کے ذریعے سے بنے گا، یہاں بشر کی نا اہلی نہیں ہے، یہ اصلاً اس کے بس میں نہیں ہے، کوئی پوچھ سکتا ہے کہ یہ کام انسان خود کیوں نہیں کر سکتا ہے؟ ہاں انسان یہ کام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے بغیر نہیں کر سکتا ہے، قرآنی آیات کے لب ولہجہ کو دیکھیں، قرآن نے فرمایا ہے کہ

وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمْ...... (۱۳)

یعنی ہم نے تمہیں وہ چیزیں سکھائی ہیں کہ جو تم سیکھنے والے ہی نہیں تھے۔

نہ کہ ہم نے وہ چیزیں سکھائی ہیں کہ مالم تعلم، یعنی ہم نے آپ کو وہ باتیں بتائی ہیں کہ جو آپ نہیں جانتے تھے۔

ہمیشہ سب کے ساتھ ایسے ہی ہوتا ہے کہ انسان جو باتیں نہیں جانتا ہے اسے کوئی اور انسان سکھا دیتا ہے لیکن قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ علّمکم ما لم تعلم بلکہ قرآن کہہ رہا ہے

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ......

کہ ہم نے آپ کو وہ باتیں سکھائی ہیں کہ جو تم جاننے والے ہی نہیں تھے، جان ہی نہیں سکتے تھے، ان کو جاننے کی صلاحیت ہی تمہارے اندر نہیں تھی، اگر ہم نہ بتاتے اور اگر ہماری طرف سے وہ باتیں نہ ہوتیں تو تمہارے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ ان کو سیکھتے اور جانتے، وہ ساری چیزیں انسان سازی کے اندر منحصر ہو جاتی ہیں، پس شناختِ انسان ضروری ہے۔

۱۲)انسان ترقی پذیر ھے

انسان کی شناخت کے اندر ایک نکتہ کہ جو قرآن نے بھی بتایا ہے یا جب انسان اپنے آپ کو سمجھنا شروع کرتا ہے تو اسی فہم اور شناختِ خود میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جہاں پر انسان ایک بہت بڑے راز، حیرت انگیز راز اور شگفت انگیز راز سے آشنا ہوتا ہے، ایسا پر اسرار راز کہ انسان ساری عمر اسی راز میں حیرت میں گزار دے تو درست ہے اور انسان نے اس کے اندر عمر ضائع نہیں کی، وہ کونسا راز ہے؟ وہ راز جو ابھی ہم نے سنا ہوا ہے لیکن اس تک پہنچے نہیں ہیں، جیسے بہت سارے گنج ہیں، خزانہ کسی جگہ دفن ہے اور ہم نے سنا ہوا ہے لیکن ہم نے دیکھا نہیں ہے، آج تک اس خزانے تک پہنچے نہیں ہیں، اسی طرح ہم نے بہت سارے راز سنے ہوئے ہیں لیکن ان رازوں کا فقط تذکرہ سنا ہے ان تک پہنچے نہیں ہیں، وہ راز کونسا ہے؟ وہ یہ ہے کہ انسان موجودِ مستکمل ہے، انسان موجودِ تکامل پذیر ہے۔ جس طرح سے کہتے ہیں کہ فلاں ملک ترقی پذیر ہے ترقی یافتہ نہیں ہے اسی طرح انسان

کمال یافتہ پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ کمال پذیر پیدا ہوا ہے، یہ بہت بڑا راز ہے، اگر کسی کے اوپر کھل جائے، اگر معرفت کے اندر آجائے کہ انسان کمال پذیر ہے۔

اگر آسان الفاظ میں اور اصطلاحوں سے دور ہو کر بات کریں کہ سب کی سمجھ میں آجائے تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان بنا ہوا نہیں آیا ہے بلکہ بننے کے لئے آیا ہے، خدا نے انسان کو بنا کر پیدا نہیں کیا ہے بلکہ بننے کیلئے پیدا کیا ہے، اسی کو تکامل پذیری کہتے ہیں، انسان ناقص ہے، اسفل سافلین میں ہے، عالمِ ادنیٰ میں ہے اور کسی لحاظ سے اس کے اندر کمالات نہیں ہیں، یہاں سے اس کو آغازِ تکامل کرنا ہے، اس کو ایک ایک کر کے، دھیرے دھیرے نقطۂ عروج تک پہنچنا ہے، کہاں تک؟ کہ جب سارے کمالات کہ جو انسان کے لئے مقرر ہیں، وہ سارے اس کے اندر پیدا ہو جائیں۔ یہ بالکل خالی از کمال ہے اور اس کو وہاں پہنچنا ہے کہ جتنے کمالات اس کے لئے مقرر کئے ہوئے ہیں وہ سارے اس کے اندر آجائیں، یہ راز اگر کشف ہو تو معلوم ہو جائے کہ یہ بہت لمبا سفر ہے، انسان کے سامنے بہت دشوار سفر ہے،

اسی لئے خداوند نے فرمایا تھا

اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ۝(۱۴)

کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔

اس کو اصلاً خبر ہی نہیں ہے، نہ دشواری کا احساس ہے اور نہ اسے اطلاع ہے، یہ بے خبر ہے کہ کیا کر رہا ہے؟ کس راستے میں اس نے قدم رکھا ہے؟ اس کو کس طرف جانا ہے؟ یہ اپنے آپ سے

بھی آگاہ نہیں ہوگا؟ یہ اتنا جہول ہے کہ اپنی شناخت بھی نہیں کر پائے گا اور ظلوم اتنا ہے کہ یہ اس راہ کو طے کرنے سے بھی عاجز آئے گا، نتیجتاً بجائے انسان بننے کے ان آیات کے زمرے میں شمار ہوگا کہ

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ○ (۱۵)

اب ذِلّت کے ساتھ بندر بن جائیں......

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا○ (۱۶)

یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

یہ بجائے انسان بننے کے اَلْحِمار یا اَلْكَلْبُ بن جائے گا، بجائے انسان بننے کے پست از انسان بن جائے گا، یہ انسان ظلوم وجہول ہے، جن لوگوں نے اپنی شناخت کر لی اور جنہیں یہ راز مل گیا تو وہ اعلیٰ علیین تک جا پہنچے، وہ عالمِ ملکوت تک جا پہنچے گا، وہ راہنمائے قافلۂ بشریت بنے۔

۱۳) موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا، ترقی کی ضمانت

وہ لوگ کہ جنہیں یہ راز پتہ چل گیا ہے کہ انسان موجودِ مستکملِ کمال پذیر ہے، کمال یافتہ نہیں ہے پس جب کمال پذیر ہے تو انسان کو یہ احساس ہو کہ میری موجودہ حالت کہ جس حال میں ابھی میں موجود ہوں، اس سے مجھے نکلنا ہے اور نکل کر مجھے اپنی دوسری حالت کہ جو کمال کی حالت ہے اس تک جانا ہے، اس کے لئے انسان کو حرکت کی ضرورت ہے، حرکت اسی وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب انسان اپنی موجودہ حالت کو چھوڑ کر غیر موجود حالت یا مطلوب حالت کی طرف قدم بڑھائے

لیکن اس کے لئے ایک باریکی ہے، یہاں پر ایک لطافت موجود ہے، بالفرض انسان کو سمجھ بھی آجائے کہ میں تکامل پذیر ہوں، ناقص ہوں اور مجھے کمال حاصل کرنا ہے تو پھر بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کے اندر حرکتِ تکاملی پیدا ہو جائے یعنی انسان حرکت شروع کردے اور کمال کی طرف بڑھنا شروع کردے، یہ آگاہی کافی نہیں ہے، ایک اور چیز بھی ضروری ہے اور قرآن نے وہ نکتہ بھی ذکر کیا ہے یعنی وہ لطیف ترین مطلب قرآن نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان جب تک اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے تو کبھی بھی اس کے اندر حرکت پیدا نہیں ہوسکتی ہے، وہ انسان کبھی بھی حرکتِ تکاملی نہیں کرسکتا ہے کہ جب تک اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے۔

بالآخر ہم سب کی بلا استثنا ایک موجودہ حالت ہے، البتہ اس میں بھی فرق ہے، کسی کی موجودہ حالت بہت خراب ہے، کسی کی موجودہ حالت اس سے نسبتاً بہتر ہے، کسی کی موجودہ حالت اس سے بھی بہتر ہے، کسی کی موجودہ حالت بہت ہی ابتر ہے، انسانوں کی موجودہ حالت کا اگر آپس میں موازنہ کریں تو یہ ایک جیسی نہیں ہیں لیکن جو جس حالت میں بھی ہے وہ دوسروں کی نسبت بہتر حالت میں ہے یا ابتر حالت میں ہے، انسان اس وقت حرکت کرے گا کہ جب تک اپنی موجودہ حالت پر راضی نہ ہو۔

چہ بسا انسان کی حالت خوب نہیں ہے لیکن اسی ابتر حالت پر راضی ہے، بہت سارے ہیں کہ جو حالتِ پستی پہ راضی ہیں، عموماً کہتے بھی ہیں کہ راضی بہ رضائے خدا، خدا بھی اس پر راضی ہے اور میں بھی اس پر راضی ہوں، عموماً فقراء، نادار اور بے کس لوگ کہتے ہیں کہ ہم راضی ہیں، راضی بہ فقر ہیں

یہ کبھی بھی انسانِ غنی اور امیر نہیں ہو سکتے ہیں، یہ کیوں راضی ہیں؟ اور کون لوگ ہیں کہ جو مال کی طرف، دنیا کی طرف اور غنائے مالی وثروتِ مالی کی طرف بڑھتے ہیں اور ایک دن غنی ہو جاتے ہیں؟ یہ وہ ہیں کہ جو اپنی موجودہ فقر کی حالت پر راضی نہ تھے، کون لوگ عالم بن جاتے ہیں؟ جو اپنی موجودہ جہالت کی حالت پر راضی نہ ہوں بلکہ سخت ناراض و برہم ہوں کہ میں کیوں اس حالت میں ہوں؟

بعض ایسے ہیں کہ جو رنگت کے لحاظ سے مختلف ہیں، خصوصاً اگر زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ پیش آ جائے مثلاً شادی کا یا سفر کا تو اپنی رنگت پہ پشیمان ہوتے ہیں کہ میرا رنگ تھوڑا مدھم ہے، گندمی ہے یا سانولا ہے یا مثلاً سیاہ ہوں اور وہ اس رنگت پہ راضی نہیں ہیں تو دنیا جہان کی کریمیں اور پوڈر لے کر استعمال کرتے رہتے ہیں، سارے مشغلے چھوڑ چھاڑ کر فقط اپنی رنگت بدلنے پہ لگ جاتے ہیں لیکن جو اپنی رنگت پہ راضی ہیں کہ جیسا بھی رنگ ہے، جو خدا نے بنا دیا ہے تو بنا دیا ہے لہٰذا وہ کچھ بھی نہیں کرتے ہیں، کوئی کریم، کوئی پوڈر یا کوئی اور چیز استعمال نہیں کرتے ہیں چونکہ اس پر راضی ہیں، فرض کریں کسی کو ایک جھونپڑا ملا ہوا ہے اور وہ اسی جھونپڑے پہ راضی ہے تو یہ کبھی بھی کوٹھی، بنگلہ نہیں بنا سکتا، آپ اس کو عمر بھر کبھی بھی بنگلے میں نہیں دیکھیں گے چونکہ یہ اس پر راضی ہے، ایک انسان پیدل چلنے پر راضی ہے تو یہ کبھی بھی گاڑی نہیں لے گا، پیسے آ بھی جائیں تو بھی گاڑی نہیں لے گا چونکہ یہ اس حالت پر راضی ہے، اس کو کوئی تکلیف نہیں ہے، یہ ناراض نہیں ہے، انسان کی حالت خواہ ابتر ہو یا بہتر اگر یہ ابتر و بہتر پر راضی ہے تو یہ حالت کبھی بھی نہیں بدلے گی، یہ صرف اس وقت بدلے گی کہ جب انسان راضی نہ ہو، اس لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کو کہا ہے کہ جو اپنی اسی حالت پر راضی

موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا، ترقی کی ضمانت

ہیں یہ کبھی بھی لقاءِ پروردگار پر فائز نہیں ہو سکتے۔

سورۂ مبارکہ یونس میں ہے کہ جہنمی جہنم میں کیوں پہنچیں گے؟، جہنمیوں کے جہنم جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنی موجودہ حالت پر راضی ہیں۔اس کو ہم اجتماعیات، عائلی یا خاندانی مسائل، انفرادی دنیا، علمی، عملی وعبادی میادین میں بھی لاکر دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں؟ مثلاً ایک خاندان اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے لہٰذا بہتر نہیں ہوتا یا عوام اور خواص کی اکثریت جب ایک موجودہ سیاسی حالت پر راضی ہو تو کبھی بھی اپنی اصلی حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کرے گی لہٰذا ایسے ملکوں میں کبھی انقلاب نہیں آتا ہے۔

موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا ترقی کی ضمانت

پاکستان میں جتنے انقلابی کالم چھپتے ہیں اتنے انقلابی ترین ملکوں میں بھی نہیں چھپتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے، مثلاً اس وقت بھی آپ بہت بڑے انقلابی موجود ہیں از جملہ ایران ہے جو انقلابی ملک ہے، کیوبا ایک انقلابی ملک ہے یا اس طرح کے اور ممالک کہ جہاں انقلابی فضائیں پائی جاتی ہیں لیکن ان کے اندر بھی جا کر دیکھیں تو اتنے انقلابی مضامین نہیں چھپتے ہیں کہ جتنے پاکستان میں چھپتے ہیں، کالم نگار لکھتے ہیں لیکن یہ سب لکھ پڑھ کر ایک مثقال برابر بھی حالات کے اندر فرق نہیں آتا ہے، کیوں نہیں آتا ہے؟ اس لئے کہ کالم لکھنے سے تو کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے، موجودہ حالت پر ناراض رہنے سے، موجودہ حالت کو ناپسند کرنے سے تبدیلی آتی ہے اور وہ اس حالت پر راضی ہیں، کہتے بھی ہیں کہ الحمدللہ کہ یہ ہماری بہت بد حالت ہے، اس پر بھی راضی وشاکر ہیں، تبدیلی کہاں آتی ہے؟ جہاں انسان موجودہ حالت پہ راضی نہ ہو لہٰذا موجودہ حالت کو ترک کریں۔اس چیز کو آپ

عرفان وسلوک اور فلسفے میں بھی پرکھ سکتے ہیں، اخلاقی مسائل بھی ایسے ہی ہے، اگر ایک انسان اپنی اخلاقی حالت پر راضی ہے کہ میں جیسا بھی ہوں خوب ہوں تو یہ کبھی بھی تبدیل نہیں ہوگا، اگر یہ انسان آگاہ بھی ہوجائے کہ میں بد ہوں تو پھر بھی تبدیل نہیں ہوگا، کیوں؟ کیونکہ اپنی اسی بری حالت پر راضی ہے، جرائم پیشہ لوگ کہ انہیں بتا بھی دیا جاتا ہے کہ آپ غلط ہو اور وہ خود بھی اقرار کرتے ہیں کہ غلط ہیں لیکن پھر بھی غلط ہی رہتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ اپنی غلط حالت پر راضی ہیں، سورۂ مبارکہ یونسؑ میں ہے کہ

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآئَنَا...... (۱۷)

یقیناً جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہیں......

یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کو اصلاً آرزوئے لقاءِ خدا نہیں ہے، لقاءِ خدا وہی نقطۂ عروج ہے یعنی جہاں پر تمام مقررہ چیزیں انسان کو نصیب ہوجاتی ہیں، اسی کو لقاءِ پروردگار کہتے ہیں، حرکتِ تکاملی میں، حرکتِ استکمالی میں جب انسان اس نقطے پر جا پہنچتا ہے مثلاً جو اس نے حاصل کرنا تھا وہ حاصل کرلیا ہے تو اسی منزل کا نام لقاء اللہ ہے، کچھ ایسے ہیں کہ جن کو لقاء اللہ کی آرزو بھی نہیں ہے،

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ......

اصلاً اندر رجا نہیں ہے، امید نہیں ہے بلکہ لقاء خدا کی نسبت یاس و مایوسی موجود ہے، یہ کون لوگ ہیں؟

وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا......

یہ وہ لوگ ہیں کہ جولقاءِ خدا کی آرزو نہیں کرتے ہیں اور راضی ہیں، حیاتِ دنیوی پر راضی ہیں یعنی اپنی موجودہ حالت پر راضی ہیں، یہ لوگ اس سے نکلنا نہیں چاہتے ہیں،

وَاطْمَأَنُّوا بِهَا......

اور ان کو اطمینان بھی ہے، اصلاً سرے سے مضطرب بھی نہیں ہیں، جب اضطراب، پریشانی، کھٹکا، نا آرامی اور تکلیف ہو تو انسان موجودہ حالت پر راضی نہیں ہوتا ہے، مثلاً انسان بیٹھے ہوئے پہلو بدلتا ہے، سوئے ہوئے کروٹ لیتا ہے، کیوں؟ چونکہ ابھی جس پہلو پہ ہیں آپ اس میں ناراحت اور مضطرب ہیں، آپ ڈسٹرب (Disturb) ہیں، آپ کے اعضاء پریشر (Pressure) میں ہیں پس خوانخواہ اس اضطراب پر آپ راضی نہیں ہیں لہٰذا جب راضی نہیں ہیں تو آپ بیٹھے ہوئے پہلو بدل لیتے ہیں اور سوتے ہوئے کروٹ لے لیتے ہیں مثلاً چارزانوں ہیں تو دوزانوں ہو جاتے ہیں، دوزانوں ہیں تو چارزانوں ہو جاتے ہیں۔ یہی حالاتِ اخلاقی وحالاتِ اجتماعی کے ساتھ بھی ہے، انسانوں کے اندر کچھ ایسے لوگ ہیں کہ جو حیاتِ دنیوی پر راضی ہیں، حیاتِ دنیوی یعنی پست زندگی۔ یہ کون لوگ ہیں؟

موجودہ حالت پر راضی نہ ہونا ترقی کی ضمانت

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُوْنَ٥

یہ وہ ہیں کہ جو آیاتِ خدا سے غافل ہیں۔

أُولٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ٥(١٨)

یہ سب وہ ہیں جن کے اعمال کی بنا پر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

پس جہنم کن لوگوں کا ماوا ہے؟ کن لوگوں کی جگہ ہے؟ کہ جو موجودہ حالت پر راضی ہیں، پست و گھٹیا حالت پر راضی ہیں، ادنیٰ و ناقص حالت پر راضی ہیں، مثلاً جاہل ہے اور جہالت پر راضی ہے۔لوگ کیوں نہیں پڑھتے ہیں؟ کیوں مطالعہ نہیں کرتے ہیں؟ چونکہ راضی ہیں، اپنی جہالت پر راضی ہیں، جب تک کوئی جہالت پر راضی ہے تو وہ کبھی بھی ایک صفحہ بھی کھول کر نہیں پڑھے گا، جب تک انسان کو اپنی جہالت تکلیف نہ دے، جہالت اس کو ناراحت نہ کرے، جہالت اس کو مضطرب نہ کرے تو یہ کبھی بھی علم حاصل نہیں کرتا ہے، پست ترین اخلاقی حالت میں ہوتا ہے لیکن اس حالت کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کیوں؟ کیونکہ یہ حالت اس کو تکلیف نہیں دیتی ہے، یہ اس حالت پر مطمئن ہے اور غفلت کی وجہ سے مطمئن ہے۔

۱۴)کون لوگ مطمئن هیں؟

دو قسم کے لوگوں کو اطمینان ہوتا ہے، ایک بامعرفت لوگوں کو یقین کا اطمینان ہوتا ہے کیونکہ یقین اطمینان آور ہوتا ہے اور ایک غفلت ہے کہ جو اطمینان آور ہے لہٰذا غافل بھی مطمئن بیٹھا ہوتا ہے اور یقین والا بھی مطمئن بیٹھا ہوتا ہے مثلاً فرض کریں کہ دو آدمی مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں، ایک اپنا جوتا ساتھ لے آیا ہے اور ایک اپنا جوتا باہر رکھ آیا ہے، چور جوتا اٹھا کر لے گیا اور دونوں مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں، ایک اس وجہ سے مطمئن بیٹھا ہوا ہے کہ جوتا سامنے پڑا ہوا ہے، اسے یقین ہے کہ میرا تو گم نہیں ہوگا، اگر باہر اعلان بھی ہو رہا ہے کہ کسی کا جوتا غائب ہو گیا ہے تو دونوں مطمئن بیٹھے ہوئے

ہیں، جس کا جوتا گم ہو گیا ہے وہ بالکل مطمئن بیٹھا ہوا ہے چونکہ وہ غافل ہے، اس کو پرواہ نہیں ہے کہ یہ کس کا جوتا تھا لہٰذا وہ بھی مطمئن ہے اور یہ بھی مطمئن ہے یا مثلاً اگر کوئی گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور گاڑی چوری ہوگئی ہے تو اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہنس کھیل رہا ہے، یہ اطمینان غفلت و جہالت کا اطمینان ہے لیکن ایک دوسرا انسان ہے کہ جس کو یقین ہے، یہ یقین کی وجہ سے مطمئن ہے، غفلت اور یقین کے ان دونوں اطمینانوں میں فرق ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو پست ترین اور گھٹیا ترین دنیوی حالت پر ہیں اور اسی پر راضی و مطمئن ہیں،

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُوْنَ ○

یہ وہ ہیں کہ جو آیاتِ خدا سے غافل ہیں۔

کچھ اہلِ یقین ہیں لہٰذا اس وجہ سے وہ مطمئن ہیں۔ پس اگر انسان اپنی موجودہ حالت پر راضی ہے تو جس حال میں بھی ہو، جس پہلو میں بھی ہو، جس میدان میں بھی ہو وہ کبھی بھی اس حالت کو تبدیل نہیں کرے گا۔

کون لوگ مطمئن ہیں؟

لہٰذا انقلابی راہنماؤں کا ایک عمل یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے لوگوں کے اندر حسِ ناراضگی پیدا کرتے ہیں مثلاً آپ امام خمینیؒ کا طریقہ کار دیکھیں، شاہ کے خلاف امامؒ نے لوگوں کے اندر شدید ترین بغض و نفرت پیدا کی، پہلے لوگ اس حالت پر راضی تھے کہ ٹھیک ہے ایک شاہ ہے جو اپنی شہنشاہیت کر رہا ہے اور ہم اپنی زندگی گزار رہے ہیں لیکن امامؒ نے آ کر ان کے اندر احساس پیدا کر دیا کہ یہ حالت اچھی نہیں ہے، ان میں سے بہت ساروں کو یہ احساس تھا کہ یہ اچھی حالت نہیں

ہے لیکن اس پر راضی تھے،

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنيَا......

امامؒ نے آ کر ناراضگی پیدا کی کہ اس حالت پر میں راضی نہیں ہوں، اللہ راضی نہیں ہے، پھر امامؒ کے افکار سے اس ناراضگی نے معاشرے کے اندر سرائیت کی اور سب کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ ہم بھی راضی نہیں ہیں، اگر ہم راضی نہیں ہیں تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ اس حالت کو بدلنا چاہئے، اس حالت سے نکلنا چاہئے اور ایسی حالت پہ جائیں جو رضایت بخش ہو، ایسی حالت پہ جائیں جو اطمینان آور ہو کہ جس پر ہم راضی رہیں۔ اسی طرح سے فردی طور پر دیکھیں کہ ایک انسان کسی بھی حالت میں ہے لیکن راضی ہے، سست آدمی ہے اور سستی پر راضی ہے لہٰذا یہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا ہے، یہ کبھی بھی کوئی عمل نہیں کرسکتا ہے۔ سُستی پست اور گھٹیا دنیوی چیز ہے پس اس وجہ سے جو سستی پر راضی ہے وہ کبھی بھی کہیں نہیں پہنچ سکتا۔

پس انسان تکامل پذیر موجود ہے، یہ کمال یافتہ نہیں ہے مثلاً ایک ملک احساس شروع کردے کہ ہم ترقی یافتہ ممالک میں سے ہیں تو یہ ملک کبھی بھی ترقی نہیں کرے گا، صرف وہ ممالک ترقی کرتے ہیں کہ جنہیں پتہ ہو کہ ہم غیر ترقی یافتہ ہیں لیکن ترقی پذیر ہیں اور ترقی کرسکتے ہیں۔ انسان بھی تکامل یافتہ اور کمال یافتہ نہیں ہے بلکہ کمال پذیر ہے لہٰذا یہ کمال پذیر اس وقت کمال کی طرف جائے گا اور اس مطلوبہ حالت کی طرف قدم اٹھائے گا کہ جب موجودہ ناگوار حالت اس کو پسند نہ ہو اور اس پر راضی نہ ہو۔

حوالہ جات

(۱)......(سورۂ مبارکہ انعام، آیہ۱۶۲)

(۲)......(سورۂ مبارکہ قصص، آیہ۷۸)

(۳)......(سورۂ مبارکہ ضحیٰ، آیہ۱۱-۶)

(۴)......(سورۂ مبارکہ یوسفؑ، آیہ۵۳)

(۵)......(نہج البلاغہ، خطبہ۱۷)

(۶)......(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۸۶)

(۷)......(البلد الامین، صفحہ ۳۵۰)

(۸)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۶۹)

(۹)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۱۰۱)

(۱۰)......(مستدرک نہج البلاغة، الجزء ۱، صفحہ۴)(منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغة - الخوئیؒ)(نفحات الولایة فی شرح نهج البلاغة)(شرح نهج البلاغة - عبد الحمید بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسین بن أبی الحدید، أبو حامد، عز الدین، المتوفی : ۶۵۶ھ، الجزء ۲۰، صفحہ ۲۹۲)(جامعه علوی در نهج البلاغه، الجزء۸، صفحہ ۲)

(۱۱)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۲۹)

(۱۲)......(سورۂ مبارکہ حشر، آیہ۱۹)

(۱۳)......(سورۂ مبارکہ نساء، آیہ۱۱۳)

(۱۴)......(سورۂ مبارکہ احزاب، آیہ۶۷)

(۱۵)......(سورۂ مبارکہ بقرہ، آیہ۶۵)(سورۂ مبارکہ اعراف، آیہ۱۶۶)

(۱۶)......(سورۂ مبارکہ فرقان، آیہ۴۴)

(۱۷)......(سورۂ مبارکہ یونسؑ، آیہ۷)

(۱۸)......(سورۂ مبارکہ یونسؑ، آیہ۸)

فہرستیں

▼ فہرست آیات	607
▼ فہرست روایات	623
▼ فہرست دعاومناجات	626
▼ فہرست اشعار	628
▼ فہرست متفرقات	635
▼ فہرست منابع وماخذ	636

فہرست آیات

	آیت	صفحہ
سورۂ فاتحہ		
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَo	۶	343
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo	۳	356
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo	۱	356,441
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَo	۲	356,441
سورۂ بقرہ		
أُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَo	۲۷	32
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا......	۲۸۶	55
أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ......	۱۷۰	69,170
يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا......	۹	123
وَمِنْهُمْ أُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ......	۷۸	165,175,353,385
لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَo	۱۱۸	170
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ......	۳	173
وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَo	۴	173
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ......	۷	173,352
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ......	۷۴	178,277,295

	آیت	صفحہ
وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَo	۴۵	180,340
وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ......	۵۸	210
وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ......	۲۳۱	259
اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ......	۲۶۸	343
سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ......	۶	352
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ......	۱۴۸	389
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ......	۲۸۲	398,448,451
ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ......	۲۹	404
ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ......	۲	441
وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا......	۳۱	449
كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَo	۶۵	476,595
خُذُوْا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ......	۹۳،۶۳	477
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ......	۱۷۱،۱۸	498
نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ......	۱۰۱	586

سورۂ آلِ عمران

	آیت	صفحہ
هُدًى لِّلنَّاسِ......	۴	172
هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَo	۱۳۸	261,262
لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ......	۷۷	297

	آیت	صفحہ
لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَo	۶۱	382
رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ......	۱۹۳	560

سورۂ نساء

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاۃَ......	۴۳	94
نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ......	۱۵۰	213
لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًاo	۶۴	269
ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاo	۱۱۰	269
وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًاo	۱۲۳	269
اِنَّ الصَّلَاۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًاo	۱۰۳	342
وَمَنْ یُّھَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ......	۱۰۰	350
فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ......	۴۱	373
وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰئِکَ......	۶۹	585
وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ......	۱۱۳	592,593

سورۂ مائدہ

لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَo	۵۰	170
فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ......	۵۲	174
یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ......	۶۷، ۴۱	251

	آیت	صفحہ
فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرَاتِ......	۴۸	389

سورۂ انعام

	آیت	صفحہ
اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ......	۵۷	93,191
فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّھۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ......	۱۲۵	145
قُلۡ اِنِّیۡ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ......	۱۵	377
قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ......	۱۶۲	576

سورۂ اعراف

	آیت	صفحہ
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ٥	۱۵۷	32
وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ......	۱۵۶	355
ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ......	۵۴	404
کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خَاسِئِیۡنَ٥	۱۶۶	476,595
خُذُوۡا مَا آتَیۡنَاکُمۡ بِقُوَّۃٍ......	۱۷۱	477
فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ......	۱۴۳	495
وَّخَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا......	۱۴۳	517,551
مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ......	۱۸۶	583

	آیت	صفحہ
سورۂ انفال		
اُولٰئِکَ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَo	۳۷	32
فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ......	۴۹	174
یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ......	۶۴،۶۵،۷۰	251
اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَاللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ......	۲۲	256
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ......	۲	386
اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا......	۲۹	447,448
سورۂ توبہ		
فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ......	۱۲۵	174
یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ......	۷۳	251
وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِo	۱۲۹	428
سورۂ یونسؑ		
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ......	۳	404
اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَائَنَا......	۷	599
اُولٰئِکَ مَأْوَاھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَo	۸	600

	آیت	صفحہ
سورۂ یوسفؑ		
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ......	۶۷،۴۰	93,191
أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا......	۱۰۹	246
لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْأَلْبَابِ......	۱۱۱	246
وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ......	۱۰۵	386
وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌo	۷۶	536
وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ......	۵۳	581
سورۂ رعد		
بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا......	۲	153
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ......	۲	404
سورۂ ابراهیمؑ		
وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَا آذَيْتُمُوْنَا......	۱۲	380
سورۂ حجر		
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُo	۹۹	390
وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَo	۸۷	428

	آیت	صفحہ
سورۂ نحل		
فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَo	۴۳	66,170
فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ......	۹۸	137
فَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِo	۵۱	311,313
سورۂ اسراء		
وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ......	۸۵	211
لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ......	۲۲	521
كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ......	۸۴	560
سورۂ طٰهٰ		
اِنِّی اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ......	۱۲	34
رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْo	۲۵	147
اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰیo	۵	406
وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًاo	۱۱۴	473

	آیت	صفحه
سورۂ انبیاء		
فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَo	۷	66,170
لَقَدْ أَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ......	۱۰	260
اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ......	۱	384
سورۂ حج		
خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ......	۱۱	159
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۵۳	174
لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ......	۴۶	498
سورۂ مؤمنون		
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِo	۱۱۶	427
سورۂ نور		
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ......	۳۵	152,153

	آیت	صفحہ
سورۂ فرقان		
ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ......	۵۹	445,446
اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ......	۴۴	476,595
اَرَاَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ......	۴۳	521
سورۂ عنکبوت		
اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡخَاسِرُوۡنَ٥	۵۲	32
سورۂ روم		
اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ......	۹	246
سورۂ لقمان		
بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا......	۱۰	153
سورۂ سجدہ		
ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ......	۴	404

	آیت	صفحہ
سورۂ احزاب		
اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ......	۷۲	48,328
فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ......	۱۲،۶۰	174
یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ......	۱،۲۸،۴۵،۵۰،۵۹	251
اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًاo	۷۲	329,594
سورۂ سبا		
قُلۡ لَّکُمۡ مِّیۡعَادُ یَوۡمٍ لَّا تَسۡتَأۡخِرُوۡنَ......	۳۰	342
سورۂ فاطر		
اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ......	۴۴	246
سورۂ ص		
قُلۡ اِنَّمَا اَنَا مُنۡذِرٌ وَّمَا مِنۡ......	۶۵	522
سورۂ زمر		
اُولٰئِکَ هُمُ الۡخَاسِرُوۡنَo	۶۳	32
قُلۡ اِنِّیۡ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ......	۱۳	377

	آیت	صفحہ
سورۂ غافر (مؤمن)		
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ......	۲۱	246
أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ......	۸۲	246
يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ......	۱۶	522
سورۂ فصلت		
ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ......	۱۱	404
سورۂ زخرف		
اِنَّا وَجَدْنَا آبَائَنَا عَلٰى أُمَّةٍ......	۲۲،۲۳	69,170
سورۂ جاثیہ		
أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ......	۲۳	141
وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَاصِرِيْنَo	۳۴	154
ذٰلِكُمْ بِأَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا......	۳۵	154
وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَo	۲۴	165
لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَo	۴،۲۰	170

	آیت	صفحہ
سورۂ محمدؐ		
اِنَّمَا الۡحَیَاۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّلَھۡوٌ......	۳۶	143
فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ مَّرَضٌ......	۲۰،۲۹	174
أَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡأَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا......	۱۰	246
سورۂ ق		
وَالۡقُرۡآنِ الۡمَجِیۡدِO	۱	427
فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَائَکَ فَبَصَرُکَ......	۲۲	525
سورۂ ذاریات		
فَفِرُّوۡا اِلَی اللّٰہِ......	۵۰	521
سورۂ نجم		
فَأَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی عَنۡ ذِکۡرِنَا......	۲۹	384
سورۂ قمر		
وَمَا أَمۡرُنَا اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمۡحٍ بِالۡبَصَرِO	۵۰	496

	آیت	صفحہ
سورۂ رحمٰن		
اَلرَّحْمٰنُo	۱	209
عَلَّمَ الْقُرْآنَo	۲	209
خَلَقَ الْاِنْسَانَo	۳	209
عَلَّمَهُ الْبَيَانَo	۴	209
سورۂ واقعه		
اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌo	۷۷	427
اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُo ......اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍo	۱-۵۰	506-509
فَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَo	۸۸	510
فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍo	۸۹	510
وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِo	۹۰	510
فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِo	۹۱	510
سورۂ حدید		
أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ......	۱۶	180
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ......	۴	404

	آیت	صفحہ
سورۂ حشر		
فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِی الْأَبْصَارِo	۲	246
لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ......	۲۱	310
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ......	۱۹	588
سورۂ ممتحنہ		
يَا أَيُّهَا النَّبِیُّ......	۱۲	251
رَبَّنَا عَلَيْکَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْکَ أَنَبْنَا وَإِلَيْکَ الْمَصِيْرُo	۴	378
سورۂ صف		
كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَo	۳	383
سورۂ جمعہ		
مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا......	۵	252
قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْا إِنْ زَعَمْتُمْ......	۶	253
سورۂ تغابن		
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا......	۷	55

	آیت	صفحہ
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ......	۱	251

سورۂ تحریم

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ......	۹،۱	251

سورۂ مدثر

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ......	۳۱	174

سورۂ تکویر

وَإِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ٥	۵	152,153

سورۂ انفطار

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ٥	۶	357

سورۂ بروج

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ٥	۱۵	427
بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ٥	۲۱	427

	آیت	صفحہ
سورۂ شمس		
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَاo	۷	402,410
سورۂ ضحٰی		
أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا...... وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْo	۶-۱۱	580
سورۂ تین		
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍo	۴	410,475
ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَo	۵	475
سورۂ تکاثر		
كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِo	۵	390
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَo	۶	390

فہرست روایات

صفحہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَالْقرْآنُ يَلْعَنُهُ...... 32,280,383,511

كَمْ مِنْ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ...... 32,281,383,512

أَكْثَرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ...... 47

اَرِحْنَا يَا بِلا لُ...... 61

فَعِنْدَهَا يَكُوْنُ أَقْوَامٌ يَتَعَلَّمُوْنَ الْقُرْآنَ لِغَيْرِ اللّٰهِ...... 62

اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيَ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْأَمَلِ...... 141

عَلَاقَةُ الْقَلْبِ مَعَ الدُّنْيَا تَمْنَعُ حَلَاوَةَالْعِبَادَةِ...... 181

اِنِّى تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِى أَهْلَبَيْتِىْ...... 195

أَلَا اَكُوْنُ عَبْداً شَكُوْراً...... 229

تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ...... 388

اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَأْخُذُ بِآدَابِ اللّٰهِ...... 388

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ...... 408

اِقْرَأْ وَارْقَ فَيَقْرَأُ ثُمَّ يَرْقٰى...... 463

مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ دُنْيَا وَطَالِبُ عِلْمٍ...... 471

اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهْراً وَ بَطْنًا وَ لِبَطْنِهٖ بَطْنًا اِلٰى سَبْعَةِ اَبْطُنٍ اَوْ اِلٰى...... 478

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ...... 588

صفحہ

حضرت امام علی علیہ السلام

لِکُلِّ شَیْءٍ آفَۃٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ...... 33

مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفاً فَقَدْ صَیَّرَنِیْ عَبْدًا...... 76

اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤمِنِ...... 84

کَلِمَۃُ حَقٍّ یُرَادُ بِھَا الْبَاطِلُ...... 94

اِنَّ ھَاھُنَا لَعِلْماً جَمّاً...... 104

قَوْلُ لَا أَعْلَمُ نِصْفُ الْعِلْمِ...... 169

وَجَدْتُکَ أَھْلًا لِلْعِبَادَۃِ فَعَبَدْتُکَ...... 338

أَوَّلُ اَلدِّینِ مَعْرِفَتُہُ...... 364

قَالَ عَلِیٌّ عَلَیْہِ السَّلَام: مَنْ أَتَی الصَّلَاۃَ عَارِفًا بِحَقِّھَا غُفِرَلَہُ...... 364

اِقْرَأْ وَارْقَ...... 463,466,479,532,545

ظَاھِرُہُ أَنِیقٌ وَ بَاطِنُہُ عَمِیقٌ...... 478

لَمْ أَکُنْ أَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَہُ...... 499,556

مَا کُنْتُ لِأَعْبُدُ رَبّاً لَمْ أَرَہُ...... 499,556

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہُ...... 499,577

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہُ وَمَعَہُ وَ بَعْدَہُ...... 499,557

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَ رَأَیْتُ اللّٰہَ مَعَہُ...... 499,558

فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ...... 521

صفحہ

لَوْ کُشِفَ الْغِطَاءُ مَاازْدَدْتُ یَقِیْناً...... 557

رَجُلٌ وَکَلَهُ اللّٰهُ اِلٰی نَفْسِه...... 582

امام محمد باقر علیہ السلام

وَمَنْ نَظَرَ اِلَی الْکَعْبَةِ عَارِفاً بِحَقِّهَا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ ذُنُوْبَهُ...... 364

هٰذِهِ الفَرِیْضَةُ مَنْ صَلَّاهَا لِوَقْتِهَا عَارِفًا بِحَقِّهَا...... 365

امام جعفر صادق علیہ السلام

اِنَّ قَلْبَ الْمُوْمِنِ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ...... 406

عَلَیْکُمْ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ فَاِنَّ دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ عَلٰی عَدَدِ آیَاتِ...... 464

امام رضا علیہ السلام

مَنْ زَارَهَا عَارِفاً بِحَقِّهَا فَلَهُ الْجَنَّةُ...... 363

فہرست دعا و مناجات

صفحہ

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی حِلْمِہٖ بَعْدَ عِلْمِہٖ...... 86

☆ عَلٰی خِدْمَتِکَ...... 142

☆ مَاذَا وَجَدَ مَنْ فَقَدَکَ وَمَا الَّذِیْ فَقَدَ مَنْ وَّجَدَکَ...... 272

☆ یَا مَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ...... 358

☆ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَسْأَلُکَ بِالرَّحْمَۃِ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَکَ...... 359

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی رَحْمَتِہٖ الَّتِیْ سَبَقَتْ غَضَبَہٗ...... 359

☆ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ...... 359

صفحہ

صفحہ

☆ سَبَقَتْ رَحْمَتُکَ غَضَبَکَ...... 359

☆ وَأَنْتَ الَّذِیْ تَسْعٰی رَحْمَتُہُ أَمَامَ غَضَبِہٖ...... 359

☆ فَإِنَّکَ فَعَّالٌ لِمَا تَشَاءُ...... 461

☆ اِلٰھِیْ وَاجْعَلْنِیْ مِمَّنْ نَّادَیْتَہٗ فَاَجَابَکَ وَلَا حَظْتَہٗ
فَصَعِقَ لِجَلَا لِکَ فَنَاجَیْتَہٗ سِرًّا...... 493

☆ بَیْنِکَ وَ بَیْنِیْ اِنِّیْ یُنَازِعُنِیْ فَارْفَعْ بِفَضْلِکَ
اِنِّیْ مِنَ الْبَیْنِ...... 503-504

☆ رَبَّنَا لَا تَکِلْنَا اِلٰی اَنْفُسَنَا طَرْفَةَ عَیْنٍ اَبَدًا...... 583

فہرست اشعار

صفحہ

شیخ سعدی

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عارفان جز خدا هیچ نیست 523

توان گفتن این با حقایق شناس
ولی خردہ گیرند اهل قیاس 524

کہ پس آسمان و زمین چیستند
بنی آدم و دام و دد کیستند؟ 524

همه هر چه هستند از آن کمترند
کہ با هستیش نام هستی برند 524-525

صفحہ

چو سلطان عزت علم بر کشد
جہان سر بجیب عدم در کشد 524

حافظ شیرازی

من ملك بودم و فردوسِ برین جایم بود
آدم آورد درین دیر خراب آبادم 526

این همه عکسِ می و نقشِ نگارین که نمود
یك فروغِ رُخِ ساقیست که در جام افتاد 496-497

مولانا روم

کار پاکان راقیاس از خود مگیر
گرچه ماند در نبشتن شیر و شیر 230,366

صفحہ

همچو مجنون کاو سگی را می نواخت
بوسه اش می داد و پیشش می گداخت 334

گِرد او می گشت خاضع در طواف
هم جُلابِ شکّرش می داد صاف 334

بو الفضولی گفت ای مجنونِ خام
این چه شَیْد است این که می آری مُدام 334

گفت مجنون تو همه نقشی و تن
اندر آ و بنگرش از چشمِ من 334

کاین طلسم بستهٔ مولی است این
پاسبان کوچهٔ لیلی است این 334

صفحہ

ھمّتش بین و دل و جان و شناخت
کاو جا بگزید و مسکن گاہ ساخت 335

او سگ فرّخ رخ کھف من است
بلکہ او ھم درد و ھم لہفِ من است 335

آن سگی کہ باشد اندر کوی او
من بہ شیران کی دھم یک موی او 335

بشنو از نی چون حکایت می کند
از جدایيھا شکایت می کند 456

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند 457

صفحہ

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق 457

هفت شهر عشق را عطار گشت
ما هنوز اندر خم یك كوچه ایم 485

چشم باز و گوش باز و این ذُکا
خیره ام در چشم بندیِ خدا 498

حکیم ثنائی غزنوی

زپئے ردو قبول عامه خود را خرمساز
زان کار عامه بنود جز خری یا خرخری
گاورہ دارند باور در خدائی عامیان
نوح را باور ندارانداز پئے پیغمبری 158-159

صفحہ

بھرتری ہری

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر 294

علامہ اقبالؒ

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں 123

اکبر الہ آبادی

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا 370

صفحہ

متفرق

شغلتنا عن ربنا کثرت کارنا
ومالنا وقت لہ پروردگارنا 124

فہرست متفرقات

	صفحہ
☆ اَلْحَسُوْدُ لَا يَسُوْدُ......	145
☆ دین ما عین سیاستِ ما است و سیاست ما عین دین ما است......	201
☆ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْن......	228-229
☆ مشك ان است كه خود بويد نه آنكه عطار گويد.	285

فہرست منابع و مآخذ

◀القرآن الکریم

◀نہج البلاغه

◀صحیفۂ سجادیه

◁الف

◀اتجاهات التفسیر فی القرن الرابع عشر

◀اثنا عشر رسالة - المحقق الدامادؒ

◀اختیار مصباح السالکین

◀اخلاق از دیدگاه قرآن، پیامبرؐ و عترتؑ

◀اخلاق در قرآن

◀ارشاد القلوب

◀اسرارِ نماز

◀اقبال الاعمال

◀الاتقان فی علوم القرآن

◀الاکلیل فی استنباط التنزیل - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی

◀الامام علیؑ بن ابی طالب علیه السلام من حبه عنوان الصحیفة

◀الامام علیؑ و نهج البلاغه

◀الامام علیؑ- أحمد الرحمانی الهمدانی

◀الامثل فی تفسیر کتابِ اللّٰهِ المُنزَل- الشَیخ نَاصِر مَکارم الشِیرازی مدظله

◀الانسان الکامل فی نهج البلاغة

◀الأخلاق عنوان الایمان و منطلق التقدم

◀الأمالی للطوسیؒ

◀الأمثال القرآنیة القیاسیة المضروبة للایمان باللّٰه - عبد اللّٰه بن عبد الرحمن الجربوع

◀البحر المدید فی تفسیر القرآن المجید

◀البرهان فی علوم القرآن

◀البلد الأمین

◀البیان فی تفسیر القرآن

◀التبیان فی تفسیر القرآن- شیخ الطائفة أبی جعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ

◀التحفة السنیة

◀التفسیر الأصفی- الفیض الکاشانیؒ

◀التفسیر الصافی- الفیض الکاشانیؒ

◀التفسير والمفسرون

◀الحدائق الناضرة - المحقق البحرانیؒ

◀الخصال

◀الرواشم السماويہ

◀السلام فی القرآن والحديث

◀العمدة - ابن البطريق

◀الفصول المهمة فی أصول الأئمة - الحر العاملیؒ

◀الفوائد الرضويه

◀الكافی - الكلينیؒ

◀الكلينی والكافی - الشيخ عبد الرسول الغفاری

◀الگوهای رفتاری امام علی عليه السّلام

◀المرشد الوجيز لقراء كتاب اللّٰه العزيز

◀المسترشد - محمد بن جرير الطبری، الشيعی

◀المفردات فی غريب القرآن - أبو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهانی، المتوفی: ۵۰۲ھ

◀المنطق - مظفرؒ

◀النظام القرآنی

◀النظرية الاجتماعية فى القرآن الكريم

◀الوجيز فى أصول العقائدوأحكام التقليد والبلوغ

◀امالى السيد المرتضیؒ

◀امام علیؑ فرهنگ عمومی و همبستگی اجتماعی

◀امثال القرآن

◀انسان و قرآن

◁ آ

◀آشنایی با قرآن - متفکر شهید استاد مرتضی مطهریؒ

◀آموزه های بنیادین علم اخلاق - محمد فتحعلی خانی

◁ أ

◀أحاديث أم المؤمنين عائشة - السيد مرتضى العسكرى

◀أحكام القرآن - القاضى محمد بن عبد اللّٰه أبو بكر بن العربى المعافرى الاشبيلى المالكى ،المتوفى: ۵۴۳ھ

◀أحكام القرآن - أحمد بن على أبو بكر الرازى الجصاص الحنفى،المتوفى: ۳۰۷ھ

◀أدعيه جامع الاحاديث

◀أسباب النزول فی ضوء روايات أهل البيتؑ

◀أسطورة العبوسة

◀ أعلام الدين فی صفات المؤمنين

◀أهل البيت فی تفاسير أهل السنة

◁ب

◀باطن و تأويل قرآن

◀بحار الأنوار- العلم العلامة الحجة فخر الامة المولى الشيخ محمد باقر المجلسیؒ

◀بررسی تطبيقی مفهوم و آثار اضطرار در حقوق مدنی

◀برگی از دفتر آفتاب

◀بصائر ذوی التمييز فی لطائف- الكتاب العزيز مجد الدين أبو طاهر محمد بن يعقوب الفيروزآبادی

◀بهج الصباغة فی شرح نهج البلاغة

◀بهجت عارفان در حديث ديگران

◀بيان المعانی [مرتب حسب ترتيب النزول]المؤلف: عبد القادر بن ملّا حويش السيد محمود آل غازی العانی،المتوفی: ۱۳۹۸ھ

◁پ

- ◀پرتوی ازاسرار نماز
- ◀پیام امام امیر المؤمنینؑ

◁ت

- ◀تحریرات فی الأصول - السید مصطفی الخمینیؒ
- ◀تذکرة الفقهاء
- ◀ترجمه تفسیر المیزان - علامه محمد حسین طباطبائی رحمة اللّٰہ علیه
- ◀ترجمه نهج البلاغه - انصاریان
- ◀تسنیم تفسیر قرآن کریم - آیة اللّٰہ جوادی آملی مدظله
- ◀تصحیح القرائة فی نهج البلاغة
- ◀تصنیف نهج البلاغة
- ◀تفسیر الامام العسکریؑ
- ◀تفسیر القرآن الکریم-السید مصطفی الخمینیؒ
- ◀تفسیر القمی - ابی الحسن علی بن ابراهیم القمیؒ
- ◀تفسیر المیزان-العلامة الطباطبائیؒ
- ◀تفسیر جوامع الجامع-الشیخ ابی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

◀تفسیر رازی

◀تفسیر کنز الدقائق-المیرزا محمد المشهدیؒ

◀تفسیر مجمع البیان - امین الاسلام أبی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

◀تفسیر نمونه - جمعی از فضلا

◀تفسیر نور الثقلین

◀تفسیر نور - حجة الاسلام و المسلمین حاج شیخ محسن قرائتی مدظله

◀تلخیص البیان فی مجازات القرآن - الشریف الرضیؒ

◀تمام نهج البلاغة

◀تنبیه الغافلین و ارشاد الجاهلین عما یقع لهم من الخطأ حال تلاوتهم لکتاب الله المبین

◀تهذیب الاحکام فی شرح المقنعة للشیخ المفید رضوان الله علیه - الشیخ الطوسیؒ

◁ج

◀جاذبه و دافعه علیؑ - شهید مرتضٰی مطهریؒ

◀جامع الاخبار

◀جامع آیات و احادیث موضوعی نماز

◀جامعه علوی در نهج البلاغه

◀جلوه تاریخ در شرح نهج البلاغه

◀جمال الاسبوع

◀جواهر القرآن - ابو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی

▷ح

◀حقائق الاصول

◀حلیة الأبرار - السید هاشم البحرانی

◀حیاة أمیر المؤمنینؑ عن لسانه - الشیخ محمد محمدیان

▷د

◀در سرزمین تبوک - آیة اللّٰه جعفر سبحانی مدظله

◀دراسات فی علم الاصول

◀دعائم الاسلام

◀دیوانِ امام خمینیؒ

◀دیوانِ حافظ شیرازی،از روی نسخهٔ تصحیح شدهٔ علامه محمد قزوینی

◀دیوانِ حکیم ثنائی غزنوی

◀دیوانِ شمس مغربی

◁ ذ

◀ذخیرة المعاد - المحقق السبزواریؒ

◁ ر

◀رجال الکشی

◀رساله سیروسلوک بحرالعلومؒ

◀روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی - شهاب الدین محمود بن عبد اللّٰه الحسینی الألوسی،المتوفی: ۱۲۷۰ھ

◁ ز

◀زهر الأکم فی الأمثال والحکم

◁ س

◀سنن النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

◀سنن النبیؐ - السید الطباطبائیؒ

◀سیرة الامام جعفر صادقؑ

◀سیمای کارگزاران علیؑ ابن ابی طالبؑ

ش

- شبی در پایتخت بهشت
- شرح أصول الكافی- مولی محمد صالح المازندرانیؒ
- شرح حكم نهج البلاغة
- شرح خطبه البیان امام علیؑ بن ابی طالبؑ
- شرح نهج البلاغه - جعفری
- شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحدید
- شرح نهج البلاغة - الحائری
- شرح نهج البلاغة - المقتطف من بحار
- شرح نهج البلاغة - عبد الحميد بن هبة اللّٰه بن محمد بن الحسين بن أبی الحديد، أبو حامد، عز الدين، المتوفی : ٦٥٦ھ
- شرح نهج البلاغة - الدخیل
- شعراء الغدير فی القرن الحادی عشر

ص

- صحائف الأبرار فی وظائف الأسحار
- صحيفة الامام علیؑ

◁ع

◀علوم طبیعت در قرآن

◀علی المرتضی(علیه السلام) نقطة باء البسملة

◀علیؑ فی الکتاب والسنة والادب

◀علیؑ والخوارج

◀علی "علیه السلام" من المهد الی اللحد

◀عوالی اللآلی-ابن ابی جمهور احسائی

◀عیون الحکم والمواعظ - علی بن محمد اللیثی الواسطی

◁غ

◀غرر الحکم و درر الکلم

◀غریب الحدیث فی بحار الانوار

◁ف

◀فضائل القرآن للقاسم بن سلام - أبو عُبید القاسم بن سلاّم بن عبد اللّٰه الهروی البغدادی

◀فضائل و سیره چهارده معصوم (ع) در آثار استاد علامه حسن زاده

آملی مدظله

◀فی رحاب القرآن

◀فی ظلال نهج البلاغة

▷ق

◀قبسات من نهج البلاغة

◀قرآن در آیینه احکام

◀قرآن در آیینه نهج البلاغه

◀قرآن در نهج البلاغه

◀قرآن کریم از منظر امام رضا علیه السلام

◀قرآن و تبلیغ

▷ک

◀کاملة دفاع عن القران الکریم

◀کان خلقه القرآن

◀کتاب الطهارة - الشیخ الأنصاریؒ

◀کشف الخفاء و مزیل الالباس - العجلونی

◀کشف الیقین - العلامةالحلیؒ

◀کلمات الرسولؐ

◀کلیاتِ اقبالؒ

◀کلیاتِ سعدی،بر اساس نسخه محمد علی فروغی

◀کیف نقرأ القرآن

▷ گ

◀گفتگو در محضر امیرالمومنین علیؑ

▷ م

◀مباحث فی علوم القرآن - صبحی الصالح

◀مبانی نقد متن الحدیث

◀متشابه القرآن

◀مثنوی معنوی،به تصحیح :رینولد ا.نیکلسون

◀مجموعۂ ورام

◀مجموعة ورام - ورام بن ابی فراس

◀مختصر بصائر الدرجات - الحسن بن سلیمان الحلیی

◀مراجعات قرآنیة

◀مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ - العلامة المجلسیؒ

◀مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل - المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ

◀مستدرک سفینة البحار - العلامة آیة اللّٰہ الشیخ علی النمازیؒ

◀مستدرک نہج البلاغة

◀مستطرفات السرائر - ابن ادریس الحلیؒ

◀مستمسک العروة-السید محسن الحکیمؒ

◀مسند الامام الرضا(ع) - الشیخ عزیز اللّٰہ عطاردی

◀مسند الامام علیؑ

◀مسند فاطمة بنت الحسین علیهما السلام

◀مشارق الشموس-المحقق الخوانساریؒ

◀مصباح الشریعة المنسوب للصادقؑ

◀مصباح الفقاهة - السید الخوئیؒ

◀مصباح المتهجد

◀مصباح کفعمی

◀معانی الاخبار

◀معترک الأقران فی اعجاز القرآن، ویُسمّی (اعجاز القرآن ومعترک الأقران) - عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی

◀معجم أحاديث المهدیؑ

◀معراج السعادة

◀مفاتيح الجنان

◀مفاهيم القرآن الجزء السادس

◀مفاهيم القرآن - العلامة جعفر السبحانی مدظله

◀مكارم الأخلاق

◀من لا يحضره الفقيه - للشيخ الجليل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسين بن بابويه القمیؒ

◀من وصايا العترة (عليهم السلام)

◀مناقب أمير المؤمنين (ع) - محمد بن سليمان الكوفی

◀مناهل العرفان فی علوم القرآن- محمد عبد العظيم الزُّرْقانی

◀منتهی المطلب - العلامة الحلیؒ

◀منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغة - الخوئیؒ

◀منهاج البراعة - الراوندی

◀منية الطالب - تقرير بحث النائينی للخوانساریؒ

◀موسوعة الامام علیؑ بن أبی طالب عليه السلام فی الكتاب و السنة والتاريخ

◀مهج الدعوات

◀مهدیؑ منتظر در نهج البلاغه

◀میزان الحکمة - الریشهری

◀مَصَاعِدُ النَّظَرِ للاشْرَافِ عَلٰی مَقَاصِدِ السِّوَرِ - ابراهیم بن عمر بن حسن الرباط بن علی بن ابی بکر البقاعی، المتوفی: ۸۸۵ھ

◁ن

◀نزول القرآن والعنایة به فی عهد النبیؐ - عبد الودود مقبول حنیف

◀نظرات معاصرة فی القرآن الکریم

◀نفحات القرآن-آیةاللّٰه العظمی مکارم الشیرازی مدظله

◀نفحات الولایة فی شرح نهج البلاغة

◀نهج البلاغة - الشیخ محمد عبده

◀نهج السعادة

◀نهج السعادة - الشیخ المحمودی

◀نهج البلاغه موضوعی

◁و

◀وسائل الشیعة - الفقیه المُحَدّثِ الشیخُ مُحمّدُ بن الحسن الحُر العاملیؒ، المتوفی سَنَة ۱۱۰۴ھ

◀وصول الأخيار الى أصول الأخبار - والد البهائى العاملیؒ

◀ولأول مرة فی تاريخ العالم

◁ ھ

◀هداية العلم فی تنظيم غرر الحكم للامام علیؑ بن أبی طالبؑ

◁ ی

◀یک هزار سخن از حضرت علی علیہ السلام

اجمالی طور پر وہ اوصاف جن کی مدد سے قرآن سے استفادہ کیلئے فہم کو آمادہ کیا جاسکتا ہے، آدابِ فہم قرآن کہلاتے ہیں لیکن دقیق معانی ادب معلوم کرنے کے لئے اس موضوع پر ہم بحث کررہے ہیں یعنی "آدابِ فہم قرآن"، لہٰذا ادب کے معانی کی شناخت کی ضرورت ہے......

مفاتیح الغیب یعنی اللہ کے خزانوں کی کنجیاں، یہی چابیاں آداب ہیں اور ان آداب ہی کے ذریعے سے انسان الٰہی خزانوں تک پہنچتا ہے لہٰذا اہلِ خرد و فہم چابی مانگ لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ خزانے کے اندر ان کی رسائی ہو جاتی ہے، خزانوں سے جتنی ضرورت ہے، جتنی بھوک و پیاس ہے وہ اس حد تک حاصل کرسکتے ہیں۔ خدا سے ادب مانگنا یعنی چابی لے لینا......

ان صفات کو ادب کہیں گے کہ جن کے اندر دو خصوصیات پائی جاتی ہوں، اول یہ کہ باعث زینتِ فعل ہوں، دوم باعثِ حصولِ غرضِ فعل ہوں۔ ان خصوصیات کے ساتھ اگر انسان سے ایک فعل سرزد ہوتا ہے اور اس فعل کے اوپر یہ صفات طاری ہوں تو نتیجے میں فعل ایک حالتِ حسنہ و حالتِ موزوں پیدا کرلیتا ہے اسی کو ادب کہتے ہیں......

کوہاٹ: عظم خان مارکیٹ، سیکنڈ فلور، کچہ پکہ، شیرکوٹ، کوہاٹ 0312-9808280

گلگت: نزد DHQ ہاسپٹل، خزانہ روڈ، گلگت 0315-4011020/ 05811450568

سیالکوٹ: نزد مسجد خدیجۃ الکبریٰ، مظفر پور سیالکوٹ 0300-7163180/0313-7925944

کراچی: شاپ D.8، ایم ایل پارک ویو، سولجر بازار، کراچی 0345-2715082/03343454643

کوئٹہ: شاپ نمبر 7، نزد گلگتی امام بارگاہ، علمدار روڈ، کوئٹہ 0300-9388400/0307-8866699

لاہور: A-2، بخاری سٹریٹ، مسلم ٹاؤن موڑ، وحدت روڈ، لاہور 042-5005761/0323-5777439

اسلام آباد: آفس نمبر 4، پلاٹ B-2، بالمقابل جامعہ امام الصادقؑ، G-9/2، اسلام آباد 051-2252016/0321-5046472